سالگرہ نمبر 2

گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

مئی 2013

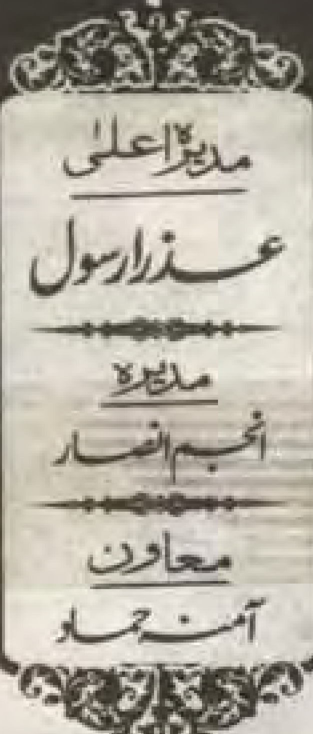
نگران اعلیٰ

معراج رسول

عنیزہ سیّد اور رفعت سراج کے سلسلے وار ناول

کہنہ مشق رائٹر ساجد احمد کی ...

شمیم فضلِ خالق، رضوانہ پرنس، نیلم احمد بشیر و دیگر قلم کاروں کی پُر اثر کاوشیں



اداریہ

افسانے

سلسلے وار ناول




پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

ناولٹ



خصوصی مضامین

مستقل عنوانات



شعبہ اشتہارات: منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 • نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391 • نمائندہ لاہور افراز علی نازش 0332-4214400 • رانا اے حمید 0323-2895528

ماڈل: رائینہ .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا

جلد 41 • شمارہ 02 • مئی 2013 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



مجھے کچھ کہنا ہے......!

ایک تازہ طبی تحقیق کے نتائج سامنے آئے ہیں کہ جن لوگوں کے دوست زیادہ ہوتے ہیں، وہ خوش رہتے ہیں، بیماریوں سے بھی دور رہتے ہیں اور دیگر لوگوں کے مقابلے میں عمر بھی زیادہ پاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ وہ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں جن کے بے لوث دوست ہوتے ہیں اور بعض دوست تو اتنی محبت کرنے والے ہوتے ہیں کہ وہ خون کے رشتوں پر سبقت تک لے جاتے ہیں۔

ہم لوگ جب کسی سے دوستی کرتے ہیں تو ایک بات ہمارے ذہن میں ضرور رہتی ہے کہ ہم کسی ایسے فرد سے دوستی کریں جو کسی نہ کسی طور پر ہم سے زیادہ بااثر ہو، جس کو کسی سے ملوا کر ہم فوقیت یا کسی قسم کی بڑائی حاصل کر سکیں جبکہ دوستی کرنے کے لیے دو افراد کی ذہنی مطابقت ہونا ضروری ہوتا ہے اور وہ دوستیاں زیادہ پروان چڑھا کرتی ہیں، جہاں ایک دوسرے کو بے لوث چاہنے کا جذبہ بھی موجود ہو...... ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ان تمام لوازمات کی موجودگی میں بھی دوستی ٹوٹ جایا کرتی ہے۔ وہ لوگ جو ایک دوسرے کی موجودگی میں خوش دکھائی دیا کرتے تھے...... ایک دوسرے کی شکلوں تک سے بیزار ہو جاتے ہیں اور اس میں مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں ہوتی...... ماہرین نفسیات کا یہ کہنا ہے کہ جھگڑا عموماً اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ایک پارٹی دوسری پارٹی پر بالادستی قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے جو کہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ اگر آپ کی کوئی دوست آپ سے روٹھ گئی ہے تو اپنی انا ایک طرف رکھ دیں اور کوشش کریں کہ صلح کا ہاتھ آپ کی جانب سے بڑھے۔ میں یہ بات بھی گوش گزار کرنا چاہوں گی کہ لڑکیوں کو لڑکیوں سے اور لڑکوں کو لڑکوں سے ہی دوستی کرنی چاہیے۔ آفس اور تعلیمی اداروں کی دوستی جو مرد و زن میں ہوتی ہے وہ اس ادارے کے تقدس کے تحت روا رکھنی چاہیے...... اور اسے اپنے گھر تک بھی نہیں لانا چاہیے۔ اگر آپ کے گھر کے ماحول میں اس بات کی اجازت ہے...... تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی اتنی احتیاط تو ضرور ملحوظ رکھیں کہ اپنے سارے راز کسی دوست کو بتا کر اس سے یہ التجا کریں کہ کسی سے کہنا نہیں...... کہ اس طرح کی باتوں کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جاؤ اور سب کہہ دو...... جی ہاں......!

مدیرہ

انجم انصار

اور (اے مسلمانو) اللہ کی نعمت جو تم پر ہے (اس کو) یاد کرو اور اللہ کے عہد کو یاد کرو جس کا تمہیں اس نے پابند کیا ہے جب تم نے (یہ) اقرار کیا کہ سمعنا واطعنا (یعنی ہم نے سنا اور ہم مطیع ہیں) اور اللہ (کے عہد کی خلاف ورزی) سے بچو بے شک اللہ دلوں کے اسرار سے (بھی) باخبر ہے (۷) اے ایمان والو انصاف پر قائم رہنے والے (اور) اللہ کے لیے (امر حق کے) گواہ بن جاؤ اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس جرم کا مرتکب نہ بنائے کہ تم (ان سے) ناانصافی کرو تم انصاف کیا کرو (اور یقیناً) انصاف پرہیزگاری سے بہت نزدیک ہے اور اللہ (کے غضب) سے بچتے رہو بے شک اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے (۸) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے ان سے اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان کے لیے (اللہ کے ہاں) بخشش ہے اور (انہیں ان کے نیک کاموں کا) بڑا (اچھا) بدلہ (ملے گا) (۹) اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہمارے احکام کو جھٹلایا وہی لوگ دوزخی ہیں (۱۰) اے ایمان والو اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جس وقت ایک قوم نے یہ چاہا کہ تمہارے اوپر دست درازی کرے پس اللہ نے ان کے ہاتھوں کو تم (تک پہنچنے) سے روک دیا اور اللہ سے ڈرتے رہو اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسا کریں (۱۱)



(سورۂ مائدہ آیت نمبر ۷ تا ۱۱)



سیدنا احمد صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۷) وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ (۸۔ الم نشرح)

ترجمہ: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب تجھے فرصت ملے تو عبادت میں محنت کیا کرو ٥ اور اپنے رب سے دل لگاؤ ٥

۳۔ طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى (۲) اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (۳) (طٰہٰ)

ترجمہ: اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نہیں اتارا (کثرت عبادت) کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ ٥ یہ تو نصیحت ہے اس کے لیے جو ڈر رکھتا ہو۔

۲۔ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا (۲) نِّصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا (۳) (المزمل)

ترجمہ: رات کو قیام کرو مگر تھوڑی سی رات ٥ یعنی نصف رات یا اس سے کچھ کم ٥

۴۔ الحدیث: (احمد صلی اللہ علیہ وسلم)

۱۔ حضرت انسؓ سے ایک طویل حدیث منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے ایک بار اپنے کلام میں فرمایا کہ بنی اسرائیل کو مطلع کر دو کہ جو شخص مجھ سے اس حالت میں ملے گا کہ وہ احمد صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر ہوگا تو میں اس کو دوزخ میں داخل کر دوں گا خواہ وہ کوئی ہو۔ موسیٰؑ نے عرض کی۔ احمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ ارشاد ہوا۔ اے موسیٰؑ! قسم ہے مجھے اپنی عزت و جلال کی میں نے کوئی مخلوق ایسی پیدا نہیں کی جو ان سے زیادہ میرے نزدیک مکرم ہو۔ میں نے ان کا نام عرش پر اپنے نام کے ساتھ آسمان زمین، شمس و قمر پیدا کرنے سے بیس لاکھ سال پہلے لکھا تھا۔ قسم ہے مجھے اپنی عزت و جلال کی کہ جنت میری مخلوق پر حرام ہے جب تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت اس میں داخل نہ ہو جائیں۔ قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اقتباس

امانت

رفعت سراج

قسط 5

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور ...... چاند کی چاندنی امانت...... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہار سو اجالا کر دیتی ہیں۔

امانت وخیانت کو واضح کرتی ایک پُردرد مگر خوب صورت تحریر



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیورو سرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ وہ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں...... اصیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتمدِ خاص تھا۔ مہر جان، رابی کی شادی سہراب خان سے طے کرتی ہیں جو عمر میں رابی سے کافی بڑا ہے۔ اس شادی پر رابی تیار نہیں ہوتی۔ کائناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور روما بیسٹ فرینڈ ہیں لیکن مہر جان کو روما کی اتنی دوستی بھی پسند نہیں۔ سب انسپکٹر جابر علی نے آج تک کبھی رشوت نہیں لی تھی۔ رزقِ حلال کی کمائی سے اپنے گھر کو چلایا اس کی بیوی صابرہ، بیٹا برہان اور بیٹیاں شبینہ اور ستارہ اسی کمائی میں گزارہ کر رہے تھے لیکن کبھی کبھی ستارہ اپنے حالات سے تنگ آجاتی ہے۔ شبینہ اپنے والد جابر علی سے چھپ کر اپنی دوست فائزہ کے گھر جاتی ہے وہاں اس کی ملاقات فائزہ کے بھائی احمر سے ہوتی ہے۔ احمر کو وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ ایس پی شیر زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریکِ کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے۔ جابر علی، صابرہ سے رشتے کی بات کرتا ہے تو صابرہ اسے گھر بلانے کو اور بیٹے برہان سے مشورے کا کہتی ہے۔

اب آگے پڑھیں

ڈاکٹر مہر جان کافی دیر سے فون پر مسلسل مصروف تھیں۔ ایک کال سے فارغ ہوتیں تو دوسری ملانے لگتیں۔ ابھی وہ چھٹی یا ساتویں کال کر کے فارغ ہوئی تھیں کہ ریسیور رکھتے ہی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے بڑی بے تابی سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تھا۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے ان کی اسسٹنٹ ڈاکٹر ناز بات کر رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحبہ کیا آپ آج لیٹ ہیں؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''نہیں، آج میں نہیں آرہی ڈاکٹر ناز...... بہت بزی ہوں، آپ دیکھ لیں کوئی نیا پیشنٹ تو نہیں آیا۔'' ڈاکٹر مہر جان نے بڑی بیزاری کی سی کیفیت میں ڈاکٹر ناز کو جواب دیا تھا۔

''ڈاکٹر صاحبہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ایک مریض آیا ہے، اس کی بہت بری حالت ہے، یوں سمجھ لیں بالکل پاگل ہو چکا ہے، اس کے گھر والے اسے زبردستی پکڑ کر اسپتال تک لائے ہیں، اتنا چیخ رہا تھا کہ پورا اسپتال گونج رہا تھا۔''

ڈاکٹر ناز بتا رہی تھی، انہوں نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

''کیوں، کیا اس کی بیٹی بھاگ گئی ہے؟'' ڈاکٹر ناز، مہر جان کا یہ جملہ سن کر بری طرح سے ٹپٹا گئی اور بولی۔

''جی ڈاکٹر صاحبہ......'' ڈاکٹر مہر جان نے اس کی بات سن کر فوراً ہی خود کو سنبھالا۔

''وہ پیشنٹ پاگل خانے کا مسئلہ ہے، میں نیورو سرجن ہوں، اس کے اٹینڈنٹ سے کہیں کہ وہ اس مریض کو پاگل خانے لے جائیں۔ ویسے بھی میں کسی سیریس پیشنٹ کو ٹائم نہیں دے پاؤں گی......'' انہوں نے فقط اتنا ہی کہا۔

''اوکے میم!'' ڈاکٹر ناز نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا تھا۔ ڈاکٹر مہر جان چند لمحے ریسیور کی طرف گھورتی رہیں پھر آہستگی سے اسے کریڈل پر رکھ دیا۔

''پتا نہیں کون بدنصیب ہے، شاید مجھ سے بھی بڑی افتاد اس پر ٹوٹی ہے، میں تو ابھی پاگل نہیں ہوئی۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

وارث علی اپنے دو دوستوں کے ساتھ بردکھوے کے لیے جابر علی کے گھر پہنچ گیا تھا۔

جابر علی نے اسے بڑی عزت کے ساتھ اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اس کی عمر اس کے چہرے سے صاف پتا چل رہی تھی۔ اسی ایک نکتے پر جابر علی سوچ میں بھی پڑ گیا تھا لیکن بہت جلد ہی وہ ایس پی کے جملوں کی زد میں آگیا۔ اس کے کانوں میں ایس پی کے جملے گونجنے لگے۔

''بہت نیک، پرہیزگار، دین دار...... ٹھیک ہے عمر سے کیا فرق پڑتا ہے، انسان کے اخلاق کے ساتھ زندگی گزرتی ہے۔ اب کسی جوان لڑکے سے کر دیں، اس کا کیا بھروسا کیسی بیٹھک ہے، کیا پتا چھپ چھپ کر نشہ کرنے والا ہو، کم از کم اس بندے کے بارے میں ہمیں سب پتا تو ہے۔'' وہ اپنے آپ کو خود ہی سمجھانے لگا۔

اس نے برہان اور صابرہ کو مطلع کر دیا تھا اس لیے برہان وقت سے پہلے ہی گھر آچکا تھا۔ اسے خود بھی کھوج لگ رہی تھی کہ اس کا باپ کیا کرنے جا رہا ہے، اس کی بہن کی تقدیر کا فیصلہ ہونے جا رہا تھا۔ ایک بے چینی نے اسے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

جب وارث علی گھر میں داخل ہوا تو برہان اپنے کمرے میں تھا...... اور ستارہ اسے بتانے آئی تھی کہ مہمان آگئے ہیں، یہ سنتے ہی وہ بڑی سرعت سے تقریباً زینہ پھلانگتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آیا تھا اور ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑا ہو کر مہمانوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے فی الحال یہ سمجھ نہیں آئی کہ ان تینوں میں سے امیدوار کون ہے۔ جابر علی کی نظر جیسے ہی بیٹے پر پڑی وہ بڑی گرم جوشی سے اس سے مخاطب ہوا۔

''آؤ...... آؤ بھئی وہاں کیوں رک گئے، دیکھو تو سہی اتنے معزز مہمان آئے ہیں، بس تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ میں نے بتایا تھا، میرا بیٹا NED یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، ماشاء اللہ بہت قابل اور لائق بچہ ہے، بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا ہے۔'' اب وہ تعارف کروا رہا تھا۔

''یہ ہیں، وارث علی۔'' وارث علی اپنا نام سنتے ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑی گرم جوشی سے مصافحے کے لیے برہان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ وارث علی کا اٹھنا تھا کہ برہان کو جیسے چکر آگئے۔ ایک اچھی عمر کا پختہ مرد اس کے سامنے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا۔ کر کھڑا تھا۔ برہان کی حالت غیر ہونے لگی۔ جی تو یہی چاہا کہ اس شخص سے مصافحہ کیے بغیر ڈرائنگ روم سے باہر چلا جائے اور واپس پلٹ کر ادھر نہ آئے لیکن صورتِ حال اتنی نازک تھی کہ اسے سیکنڈوں میں فیصلہ کرنا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے، اس نے طوہاً کرہاً وارث علی کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور آپ کے والد صاحب نے تو آپ کے سامنے ہی آپ کی اتنی تعریف کی ہے کہ بس طبیعت خوش ہو گئی۔'' وارث علی نے بھی شاید اس کی بے دلی کو محسوس کر لیا تھا۔ زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولا۔

وہ بات کر رہا تھا اور برہان ایک ٹک اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ وارث علی اس کی نظروں سے خاصا گھبرا سا گیا تھا۔ برہان نے جیسے پوری قوت اکٹھی کر کے وارث علی کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

''تشریف رکھیے......'' وارث علی جلدی سے بیٹھ گیا۔ برہان کا تو اب بیٹھنے کا پروگرام ہی نہیں تھا۔ وہ تو الٹے پاؤں وہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔ جابر علی نے ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔

''برہان جاؤ اپنی ماں سے کہو کہ وہ چائے بھجوا دیں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر چائے تیار کر لی ہے تو چائے لے آؤ۔'' برہان یہ سنتے ہی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ باہر آیا تو صابرہ اس کی منتظر کھڑی تھی اور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ جس وقت برہان ڈرائنگ روم میں گیا تھا تب سے ہی وہ اس کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ کچھ کہتا یا نہ کہتا...... صابرہ نے اس کے چہرے سے ہی سب کچھ پڑھ لینا تھا کہ وہ اس کی ماں تھی۔

برہان ماں کو سامنے دیکھ کر رکا نہیں بلکہ تیزی سے چلتا ہوا شبینہ اور ستارہ کے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ صابرہ کا دل بیٹھ گیا۔ برہان کے چہرے پر جو لکھا تھا وہ اس نے پڑھ لیا تھا وہ ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالتی ہوئی برہان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' اس کی آواز میں کمزوری نمایاں تھی۔

''امی، آپ ابا جان سے کہیں کہ ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔'' برہان نے پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا اور بڑے سپاٹ لہجے میں گویا ہوا۔

صابرہ کے دماغ میں جیسے ایک زبردست دھماکا ہوا یعنی اس کے اندیشے درست نکل آئے، کوئی گڑبڑ تو ضرور تھی جو مستقل دل میں ایک کھٹک سی ہو رہی تھی۔

''کیوں بیٹا، ایسی کیا بات ہے کہ بغیر سوچے سمجھے، بغیر چھان بین، اس رشتے سے انکار کر دیں۔'' پھر بھی اس نے پوچھا۔

''امی میں کہہ رہا ہوں ناں کہ بس آپ منع کر دیں۔ یوں سمجھیں کہ وہ مشکل سے ابا جان کا چھوٹا بھائی لگتا ہے اور مجھے کوئی خاص پڑھا لکھا بھی محسوس نہیں ہوا۔ ایک خاص اعتماد جو اچھا کام کرنے والے پڑھے لکھے انسان میں ہوتا ہے وہ مجھے اس میں نظر نہیں آیا۔ ہاں ابا جان نے چائے کے لیے کہا ہے، وہ تو میں اندر لے جاؤں گا۔ اس سے زیادہ میں آپ سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔''

صابرہ تو جیسے دُھلے ہوئے کپڑے کی طرح نچڑ کر رہ گئی تھی۔ اعصاب جواب دے رہے تھے۔ چائے تو ستارہ تیار کر رہی تھی۔ اس نے کیا کرنا تھا لیکن اسے یوں محسوس ہوا کہ قدم اٹھانا بھی ایک بھاری کام ہے۔

''عمر زیادہ ہے بیٹا...... کیا پتا کوئی بہت نیک بندہ ہو ایک دم سے کیسے انکار کر دوں...... تمہیں اپنے ابا جان کا تو پتا ہی ہے۔'' صابرہ اسی کمزور آواز میں بیٹے سے مخاطب ہوئی تھی۔

''امی اب قیامت آئے بلکہ آ ہی جائے ہم نے یہاں شادی نہیں کرنی۔ اگر آپ کو اپنی اولاد سے تھوڑی سی بھی محبت ہے تو آپ کبھی یہ رشتہ منظور نہیں کریں گی۔ آپ مجھے چائے دے دیجیے۔ میں چائے رکھ کر آ جاتا ہوں۔''

صابرہ نے جیسے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا تھا۔ اب اس میں مزید کچھ پوچھنے اور بات کرنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ تقریباً خود کو گھسیٹتی ہوئی کمرے سے باہر جا رہی تھی۔

''آ جاؤ بیٹا چائے تو تیار ہے، لے جاؤ۔'' اس نے کمرے سے نکلتے نکلتے اتنا ضرور کہا تھا۔

برہان ماں کے پیچھے ہی چل پڑا تھا۔

☆☆☆

گل جان، ڈاکٹر مہر جان کے بیڈروم کے دروازے پر دستک دے کر اندر چلی آئی تھی کیونکہ بہت دیر ہو گئی تھی، اس نے مہر جان کی آواز نہیں سنی تھی...... نہ انہیں دیکھا تھا۔ ایک تشویش کی لہر اس کے اندر اٹھنے لگی تو وہ رہ نہ سکی اور سوچا پتا تو کرے کہ آخر بی جان کیا کر رہی ہیں، اتنی خاموشی کیوں ہے؟

دروازہ کھولتے ہی اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی تھی کیونکہ اس کے سامنے ڈاکٹر مہر جان بے ہوش و حواس آدھی صوفے پر اور آدھی کارپٹ پر گری ہوئی دکھائی دی تھیں۔ گل جان دیوانہ وار بھاگتی ہوئی ان کے قریب پہنچی۔

''بی بی جان...... بی بی جان کیا ہو گیا آپ کو...... اس طرح سے کیوں لیٹی ہوئی ہیں، اٹھیے بی بی جان۔''

وہ ایک دم حواس باختہ سی ہو کر مہر جان کو جھنجوڑنے لگی لیکن ان کے وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ تب اس نے اپنے ڈوبتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھا اور زور زور سے روما کو آواز دی۔

''روما...... روما کہاں ہو تم، بیٹا خدا کے لیے جلدی سے آؤ۔ دیکھو...... دیکھو تو سہی آ کر بی جان...... کو کیا ہو گیا ہے۔'' وہ اتنی زور سے چلّائی تھی کہ یوں لگتا تھا کہ اس کی آواز گھر کی اونچی اونچی دیواروں کو چیرتی ہوئی باہر تک چلی گئی ہوگی اور اس وقت روما کے بجائے اصیل خان کمرے میں حواس باختہ سا داخل ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی جو منظر اس نے دیکھا اسے دیکھ کر جیسے وہ چکرا کر رہ گیا۔

''کیا ہوا گل جان بی بی...... ڈاکٹر صاحبہ بے ہوش ہیں؟'' وہ تیزی سے ان کے قریب آ کر بولا۔

''ہاں اصیل خان، لگتا ہے بی بی جان بے ہوش ہو گئی ہیں۔ میں نے ان کی نبض چیک کی ہے۔ شکر ہے نبض تو چل رہی ہے بس جلدی سے انہیں اسپتال لے کر چلو۔ مجھے تو...... مجھے تو طرح طرح کے وہم آ رہے ہیں۔'' گل جان گھبرائے ہوئے انداز میں بہن کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ہمت سے کام لیں گل بی بی...... بیگم صاحبہ کے ذہن پر شاید بوجھ بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ برداشت نہیں کر سکیں۔''

''اصیل خان ایک منٹ کی دیر نہیں کرو، جلدی سے کسی بھی طرح انہیں گاڑی میں لٹاؤ، فوراً اسپتال لے کر چلو، میں بھی ساتھ چلتی ہوں، مجھے یہاں چین کیسے آئے گا۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے، میں نذیر محمد کو کہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ آ کر ڈاکٹر صاحبہ کو اٹھائے، آپ حوصلہ رکھیں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اصیل خان یہ کہہ کر بڑی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

گل جان...... ڈاکٹر مہر جان کی ہتھیلیوں کو سہلانے لگی۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''بی بی جان...... بی بی جان آپ کے بغیر میں بالکل اکیلی ہوں، خود کو سنبھالیں دیکھیں تو سہی بی بی جان...... میری طرف دیکھیں تو سہی۔'' وہ پاگلوں کی طرح بے ہوش مہر جان سے باتیں کرنے لگی۔

☆☆☆

جابر علی بستر پر لیٹا تھا۔ سرہانے پیڈسٹل فین چل رہا تھا۔ وہ بہت پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

''ارے بھئی برہان کی ماں کہاں ہو تم...... ایک گلاس ٹھنڈا پانی تو پلاؤ۔'' اس نے صابرہ کو آواز دے کر پانی لانے کے لیے کہا۔

''یہ پانی لے لیں۔'' چند لمحوں بعد ہی صابرہ ایک گلاس ہاتھ میں لیے اس کے قریب آئی تھی۔

جابر علی اس کی آواز سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا کیونکہ واقعی اسے شدید پیاس لگی تھی۔ صابرہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اس نے شرعی طریقے سے تین سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

''یہ گلاس رکھ کر میرے پاس آؤ...... تم سے بات کرنی ہے۔'' وہ خالی گلاس صابرہ کو تھماتے ہوئے بولا۔

صابرہ جو غیر حاضر دماغی کی کیفیت میں کوئی روبوٹ محسوس ہو رہی تھی خالی خالی آنکھوں سے جابر علی کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے جابر علی کی بات کے کوئی معنی ہی نہیں ہوں اور وہ کچھ سمجھ ہی نہیں پائی کہ اس سے کیا کہا گیا۔

''ارے بھئی یہ ٹکر ٹکر کیا میری شکل دیکھ رہی ہو؟ جاؤ گلاس رکھ کر آؤ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے......'' اس نے ذرا بلند آواز میں کہا تو صابرہ اپنے دھیان سے چونک پڑی اور چپ چاپ گلاس رکھنے چلی گئی۔ وہ بستر پر دوبارہ لیٹ گیا تھا۔

صابرہ واپس آ کر خاموشی سے اس کے پاؤں دبانے لگی۔

”وہ...... پھر تم نے برہان سے بات کر لی ناں...... لڑکا تو اچھا ہے اور بھئی آج کے زمانے میں ایک نیک، شریف اور دین دار رشتہ ملنا بہت مشکل ہو گیا ہے، سمجھ نہیں آتی کہ ان لڑکوں کو ہو کیا گیا ہے، ہاتھ میں کڑا پہنتے ہیں، کان میں بالی...... عورتوں کی طرح چٹیا باندھتے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ...... اللہ نے مرد بنا کر دنیا میں بھیجا ہے تو مرد کو مرد نظر آنا چاہیے۔ ماشاء اللہ وارث علی میں مردانگی بھی ہے اور محنتی بھی ہے اور یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے نمازی پرہیزگار بھی ہے۔“

جابر علی بول رہا تھا۔ صابرہ سر جھکائے خاموش بیٹھی سن رہی تھی۔ جب صابرہ جواب میں کچھ نہیں بولی تو جابر علی نے اپنی بند آنکھیں کھول کر بیوی کی طرف دیکھا۔

”میں کیا کہہ رہا ہوں، ایسا لگ رہا ہے تمہیں تو سانپ سونگھ گیا۔ کچھ بولتی کیوں نہیں، جاتے ہوئے میں نے تمہیں اس کی ایک جھلک دکھائی تھی ناں......“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن شبینہ کی عمر ابھی بہت کم ہے، اس کی عمر کے حساب سے وارث علی کی عمر بہت زیادہ ہے۔“ صابرہ نے آخر ڈرتے ہوئے دل کی بات کہہ ہی دی۔

”دس بارہ سال تو تم بھی چھوٹی ہو مجھ سے۔“ جابر علی کی پیشانی پر لاتعداد گہری شکنوں کا جال بچھ گیا۔ وہ بڑے کڑے تیوروں کے ساتھ بیوی کی طرف دیکھ کر بولا۔

”دس بارہ سال کا فرق تو چل جاتا ہے کیونکہ عورت جلدی ڈھل جاتی ہے۔“ صابرہ نے جلدی سے جابر علی کی بات کاٹ کر کہہ دیا۔ بہر حال وہ ایک ماں تھی جو اولاد کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتی ہے۔ اب تو اس کی بیٹی کے مستقبل کا سوال تھا اور ساری زندگی ڈرتے رہنے سے اسے ملا ہی کیا تھا۔ اب اولاد کے حصے کا معاملہ تھا اسے یوں لگتا تھا کہ تیر چل چکا ہے آر پار کچھ تو ہونا چاہیے۔

”تم کم عقل، ان پڑھ، بے وقوف عورت ہو، باہر نکل کر دنیا دیکھو تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ کتنی بڑی نعمت اللہ پاک نے تمہارے گھر میں اتاری ہے اور تم ناشکری کر رہی ہو۔ عمر کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور تم نے ابھی خود ہی کہہ دیا کہ عورت، مرد کے مقابلے میں جلدی ڈھل جاتی ہے اور وہ کہتے ہیں ناں کہ مرد تو ساٹھا اور پاٹھا ہوتا ہے۔“

”میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ آپ کی بات غلط ہے لیکن ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیٹی کا جوڑ اچھا بنے جو بھی اس کے ساتھ ہو سج جائے۔“

”ہاں بس تم انہی سجاوٹوں کے چکر میں رہنا کوئی ایسا ویسا ڈیکوریشن پیس مل گیا ناں ساری زندگی روتے گزر جائے گی، میں کوئی اپنی اولاد کا دشمن ہوں؟“

”آپ باپ ہیں، میں ماں ہوں۔ دونوں کے سوچنے کا انداز مختلف ہے، دیکھیے ناں شبینہ تو اپنے منہ سے کچھ نہیں کہے گی یوں سمجھیں میری اس بچی کے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہے...... لیکن میں اپنی بیٹی کے جذبات کو سمجھ سکتی ہوں اس کی پسند اور ناپسند کو پرکھ سکتی ہوں۔“ صابرہ بہت نرمی سے شوہر کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اُدھر الٹ ہی معاملہ ہوا تھا۔

”چلی جاؤ تم یہاں سے تم سے مشورہ کرنا بیکار ہے اور وہ جو کہتے ہیں ناں کسی بے وقوف سے مشورہ کرنا تباہی ہے۔ چلو جاؤ مجھے نہیں کرنا تم سے کوئی مشورہ وشورہ...... بس جو میں نے طے کر لیا ہے اب وہی ہوگا۔ میں تمہاری بے وقوفیوں کی وجہ سے اپنی اولاد کو غلط ہاتھوں میں نہیں پہنچا سکتا۔ جاؤ جا کر آرام کرو، سو جاؤ۔ شادی کی

تاریخ طے ہو جائے گی تو تیاریاں شروع کر دینا۔“ جابر علی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اس نے انگلی کے اشارے سے صابرہ کو جانے کے لیے کہا۔

”شادی تو نہیں ہوگی...... میرا مطلب ہے وارث علی سے نہیں ہوگی۔“ صابرہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا تھا۔

جابر علی کا پورا وجود شدید غصے کی زد میں آ کر کسی تنکے کی طرح لرزنے لگا اس نے شعلہ بار نظریں صابرہ کے چہرے پر جما دیں۔ چند لمحے خون کے گھونٹ پیتا رہا پھر گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا جس طرف برہان کا کمرا تھا اور دبی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

”جوان بیٹے پر اترا رہی ہے، تیرا وہ بیٹا بھی اس وقت تک اس گھر میں ہے جب تک میری مرضی ہے۔“

”یہ ظلم ہوگا، برہان نے آپ کا کیا بگاڑا ہے...... گھر کے لوگ آپس میں صلح مشورہ کرتے ہی ہیں۔ سب کی بات ایک نہیں ہوتی لیکن جس پر زیادہ کا اختلاف ہو وہ بات خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔“

”ارے تم لوگ ہوتے کون ہو اختلاف کرنے والے۔ میں اس وقت کو کوستا ہوں جب میں نے تمہیں مشورے کے قابل سمجھا تھا۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔“ جابر علی اب ضبط نہ کر سکا۔ بری طرح دھاڑ کر بولا تھا.. اور اس کے دھاڑتے ہی برہان سامنے آ گیا۔ ”لے جاؤ اپنی ماں کو یہاں سے دماغ خراب کر دیا ہے تم لوگوں نے......“ جابر علی نے غصے بھری نظریں برہان کے چہرے پر جمائیں اور بولا۔

”کیا ہو گیا ہے ابا جان......؟ ایسا کیا کہہ دیا ہے ہم نے کہ آپ اتنی رات کو اتنی بلند آواز سے چیخ رہے ہیں۔ آس پڑوس کا ہی خیال کر لیا کریں۔“ برہان کو باپ کے دھاڑنے پر غصہ تو بہت آیا ہوا تھا لیکن معاملہ کنٹرول بھی اسی نے کرنا تھا۔ اسی لیے وہ بہت دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔

”تمہاری شہ پر تمہاری ماں مجھ سے ٹکرا رہی ہے، میرے فیصلوں سے اختلاف کر رہی ہے۔“ برہان نے باپ کی فقط اتنی بات سنی تھی اور فوراً ہی برجستہ گویا ہوا تھا۔

”اس لیے اختلاف کر رہی ہیں کہ ماں ہیں، ان کا بھی حق ہے۔“

”جاؤ...... جاؤ اپنی ماں کو بھی یہاں سے لے جاؤ۔ تم دونوں آئندہ مجھے نظر نہ آنا۔ میری بیٹیاں ہیں، میری ذمے داریاں ہیں، میں خود نپٹ لوں گا۔ میں خود دیکھ لوں گا۔ مجھے تم دونوں کی...... کسی سہارے کی کسی تعاون کی کوئی ضرورت نہیں، چلو نکلو یہاں سے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ صابرہ تو جیسے بھونچکی رہ گئی۔ ”کتنی آسانی سے گھر کے باہر کا راستہ دکھا دیا۔“ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی فیصلہ کُن پوزیشن اختیار کرے گا اور پچیس چھبیس سال کے تعلق کا بھی لحاظ نہیں کرے گا۔

”جاؤ بیٹا، جاؤ تم آرام کرو، بعد میں بات ہو جائے گی تمہیں اپنے باپ سے سوال جواب کرنے کی ضرورت نہیں۔“ صابرہ نے برہان کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

”رہنے دیں امی، بات آج ہی ختم ہوگی۔ چاہے اس کا نتیجہ ہمارے حق میں ہو یا ہمارے خلاف۔ اب یہ روزانہ کی چخ چخ نہیں چلے گی۔ مجھے ابا جان سے بات کر لینے دیں۔“ برہان اپنا بازو پوری قوت سے ماں سے چھڑاتے ہوئے بولا۔

جابر علی نے برہان کے تیور بھانپ لیے تھے۔ اندر سے تو وہ کافی پریشان ہوا لیکن فوراً ہی اس کا اپنا اعتماد

بحال ہوگیا جو اسے اپنی عقل اور اپنے اختیارات پر تھا۔

"کرسی لے آؤ اور میرے سامنے بیٹھ کر مجھ سے بات کرو، میں خود بھی چاہتا ہوں کہ آج جو بھی بات ہو وہ اپنے انجام کو پہنچے۔ چلو بیٹا کرسی لا کر اِدھر بیٹھو، آرام سے بات کرتے ہیں۔ دیکھتا ہوں کتنے پانی میں ہو تم۔ میری اولاد پر مجھ سے زیادہ اختیار...... یہ تو میں برداشت نہیں کروں گا۔" جابر علی اب بہت ٹھہر ٹھہر کر چبا چبا کر ایک، ایک لفظ ادا کر رہا تھا۔

"امی جائیں آپ آرام کریں۔ ضروری نہیں ہے جب میری اور ابا جان کی بات ہو تو آپ بھی اس میں حصہ لیں۔" برہان نے صابرہ کی طرف دیکھا۔

"بیٹا میں کیا کہہ رہی ہوں؟ مجھے سننے تو دو کہ تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو۔"

"امی آپ نے صرف سننا ہی ہے ناں، اس سے زیادہ آپ کچھ نہیں کر سکتیں اور صرف سننے سے آپ کی ٹینشن ہی بڑھے گی۔ حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میرے کہنے سے آپ جائیں۔ آرام کریں پلیز...... ویسے بھی ابا جان کو غصہ آجاتا ہے۔ جب آپ میری بات سے اتفاق کرتی ہیں بہتر یہی ہے کہ میرے اور ابا جان کے درمیان جو بات ہونے جا رہی ہے آپ درمیان میں نہ بولیں۔"

صابرہ نے اپنے جوان، پُراعتماد بیٹے کی طرف دیکھا پھر جابر علی کی طرف ایک نظر دوڑائی جو اپنے دونوں ہاتھوں کا بوجھ بستر پر ڈالے سر جھکائے حیرت انگیز طور پر بڑی خاموشی سے برہان کی بات سن رہا تھا۔

"جائیں امی...... پلیز جائیں مجھے ابا جان سے بات کرنے دیں۔ آپ بیچ میں بولتی ہیں تو اس وجہ سے معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔"

"اچھا بیٹا ٹھیک ہے لیکن دیکھو آرام سے بات کرنا، باپ ہیں تمہارے۔"

"امی میں نے کبھی ابا جان سے بدتمیزی نہیں کی، ہاں کوئی بات کرنے کا موقع ملا تو بات ضرور کی ہے، بات کرنے اور بدتمیزی کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے، جائیں آپ جا کر سو جائیں۔"

صابرہ نے ایک گہری سانس لی اور جیسے اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ دل کو طرح، طرح کے اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔

"یا اللہ مجھ پر رحم کرنا اب میرے اندر سہارا نہیں ہے مجھے کسی بڑی مشکل میں نہ ڈالنا۔"...... وہ دعا کر رہی تھی۔

صابرہ کے جاتے ہی برہان نے دور پڑی ہوئی ایک کرسی گھسیٹی اور باپ کے قریب بلکہ اس کے عین مقابل بیٹھ گیا۔ جابر علی اب بالکل خاموش تھا۔ جیسے وہ برہان کی پہل کرنے کا منتظر تھا۔

"ابا جان مجھے آپ سے کوئی بہت لمبی چوڑی بات نہیں کرنی لیکن آپ سے اتنا ضرور کہنا ہے کہ لوگ دشمنیوں میں تو ظلم کرتے ہیں، محبتوں میں ظلم کرنا تو بہت بڑی قیامت ہے، شبینہ آپ کے سامنے کبھی نہیں بولے گی۔ وہ کوئی بُزدلانہ حرکت بھی نہیں کرے گی۔ میرا مطلب ہے زہر بھی نہیں کھائے گی، آپ کے ہر فیصلے پر سر جھکا دے گی لیکن ایک سسکتی ہوئی زندگی اس کا مقدر بن جائے گی۔ میں اپنے ہر معاملے کو آپ پر چھوڑتا ہوں، چاہے میری گزر اوقات کا معاملہ ہو، میری فیسوں کا معاملہ ہو، میرے مستقبل، میری شادی بیاہ کا معاملہ ہو۔ آپ جو فیصلہ کریں گے میں کبھی اختلاف نہیں کروں گا۔ چاہے وہ میرے دل کو اچھا لگے یا نہیں لگے لیکن ابا جان ایک بے زبان مگر جذبات اور احساسات رکھنے والی بیٹی پر آپ کو رحم کرنا ہوگا۔ آپ نے اس شخص کی بہت تعریف کی جو مجھے اس کے سراپے میں کہیں جھلکتی ہوئی نظر نہیں آئی۔" اتنا کہہ کر برہان خاموش ہوگیا۔

"ختم ہوگئی تمہاری تقریر؟ اور تم کون سا تجربے کی اس عمر میں پہنچ گئے ہو جہاں بندے پر ایک نظر ڈالو اور پورا ایکسرے نکال کر رکھ دو۔ جا کر آرام کرو، میں نے جو فیصلہ کیا ہے تمہاری ماں کو سنا دیا ہے۔" جابر علی نے نظریں اٹھا کر برہان کی طرف دیکھا۔ اور خلافِ توقع بہت نرمی سے بات کی تھی۔

"کوئی فیصلہ نہیں ہوا ابا جان، آپ کا فیصلہ ہے کہ شادی وارث علی سے ہوگی میرا اور امی کا فیصلہ ہے کہ شادی وارث علی سے نہیں ہوگی۔"

جابر علی نے غضبناک نظروں سے برہان کی طرف دیکھا مگر چلّایا نہیں صرف اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ برہان کا بازو پکڑا اور اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔ "مرضی ہے اپنے بستر پر جا کر سو جاؤ، مرضی ہے اسی وقت کہیں اور اپنا ٹھکانا بنا لو۔ اب تم سے کوئی بات نہیں ہوگی، میں نے تمہارا ارمان پورا کر دیا۔ جو تم نے کہنا چاہا وہ میں نے سن لیا۔ اب بات ختم......"

"ابا جان آپ کو دوسروں کی بات اتنی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے، اپنے گھر والوں کی، اپنی ہی اولاد کی بات آپ کو سمجھ میں نہیں آتی۔" برہان اسی طرح نرمی اور ادب سے بات کر رہا تھا۔

"کہہ دیا ناں نہیں آتی، کرلو جو کرنا ہے، شبینہ کی شادی کے بعد مجھ پر تیل چھڑک کر آگ لگا دینا۔ ٹھیک ہے؟ یہ شادی تو ہوگی۔"

"تو ٹھیک ہے ابا جان! میں اپنی موجودگی میں تو یہ ظلم ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا اور ایک باپ کے فیصلے سے ٹکرا کر دور تک کوئی تباہی بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ شبینہ آپ کی بیٹی ہے، مجھ سے زیادہ آپ ہی کا اس پر حق ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ زندگی بھر آپ کو اپنی شکل نہ دکھاؤں۔" یہ کہہ کر برہان اپنی جگہ سے اٹھا اور باپ کے تاثرات دیکھنے کے لیے صرف چند لمحے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ایک مضبوط با قوت رشتے نے تھوڑی سی آس بندھائی تھی کہ شاید باپ اسے جاتے ہوئے روک لے مگر ایسا نہیں ہوا۔

جابر علی بالکل خاموش سر جھکائے یوں بیٹھا تھا جیسے اس کی سماعت کام نہ کر رہی ہو اور جو کچھ برہان نے کہا ہے وہ ہوا میں اُڑ گیا ہو۔

برہان نے باپ کی یہ بے نیازی دیکھی تو دکھ کی لہر کو ضبط کرتا ہوا چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ چند ضروری چیزیں سمیٹ کر اس نے اس گھر کو ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنے کا فیصلہ آخر کار کر ہی لیا تھا۔

☆☆☆

روما نے ماں کو اس حال میں دیکھا کہ اصیل خان اور ڈرائیور انہیں بہ مشکل اٹھائے پورچ کی طرف جا رہے تھے۔ اس کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چند لمحے کے لیے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آئی۔ دوڑتی ہوئی وہ باہر کی طرف بھاگی۔ دیکھا تو گل جان پہلے سے وہاں موجود تھی اور بڑی بے قراری سے اپنی گھڑی پر نظر ڈال رہی تھی۔ اس کی بے قراری اور بے تابی کا اندازہ اس بات سے تھا کہ وہ دروازہ کھولے ہوئے بالکل تیار کھڑی تھی۔ ڈرائیور نذیر محمد اور اصیل خان نے گل جان کو کار کی بیک سیٹ پر لٹا دیا۔

"گل جان بی بی آپ اس طرف سے آجائیں اور ڈاکٹر صاحبہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیں۔" اصیل خان، گل جان سے مخاطب ہوا تھا۔ گل جان بہت سراسیمگی کی کیفیت میں گاڑی کے اندر بیٹھ گئی اور بہت محبت اور احتیاط سے بے ہوش، بے خبر مہر جان کا سر آہستگی سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا...... ڈرائیور اور اصیل خان پلک جھپکتے میں اگلی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔

چوکیدار اور گن مین دروازہ کھولے منتظر تھے۔ ڈرائیور نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر گاڑی اسٹارٹ کی اور ایکسیلیٹر دبا کر تیزی سے پورچ سے باہر نکل گیا۔

روما دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ یہ منظر دیکھ کر بری طرح سہم گئی تھی جیسے قوتِ گویائی ہی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ جب گاڑی باہر نکل گئی اور چوکیدار نے گیٹ بند کر دیا تو روما ایک دم جیسے اپنے حواسوں میں واپس آ گئی۔ وہ اندر کی جانب بڑھی اور لاؤنج میں پہنچتے ہی شاہ عالم کا نمبر ملایا تھا اور حسنِ اتفاق تھا کہ فون شاہ عالم نے خود ہی ریسیو کیا تھا۔

”دادا جان...... دادا جان، اماں جان کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے،، وہ بالکل بے ہوش تھیں ابھی ہمارا ڈرائیور اور اصیل خان ان کو اسپتال لے کر گئے ہیں، خالہ جان بھی ان کے ساتھ گئی ہیں۔ میں تو خالہ جان سے کوئی بات بھی نہیں کر سکی۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا ہے، اماں جان ایک دم سے بے ہوش کیسے ہو گئیں۔ دادا جان میں بہت پریشان ہوں، میں کیا کروں؟“ روما اتنے تواتر سے بولی کہ دل کے مریض شاہ عالم نے بے ساختہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ جیسے انہیں خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہو پھر بھی اپنی تمام توانائی اکٹھی کر کے وہ بہ مشکل گویا ہوئے۔

”بیٹا...... بیٹا مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی، آپ آرام سے بات کریں، بیٹا میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”دادا جان میں کہہ رہی ہوں کہ میری اماں جان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے، وہ بے ہوش تھیں۔ خالہ جان انہیں اسپتال لے کر گئی ہیں۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے انہیں...... مجھے، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی میں کیا کروں؟“ روما اتنا کہتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کیونکہ واقعی اس وقت تو اس پر قیامت ہی گزری تھی ایک تو رابی گھر سے غائب تھی، دوسرے اب مہر جان بھی بے ہوشی میں گھر سے جا چکی تھیں۔ گھر میں سوائے دو چار نوکروں کے اور اس کے کوئی نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا تو آپ ایسا کریں میرے پاس آ جائیں۔ کوئی زیادہ دور تو نہیں گھر، آپ دوڑتی ہوئی میرے پاس آ جائیں اور گھبرانے کی ضرورت نہیں، بندہ بیمار بھی ہو جاتا ہے، کوئی بات نہیں بیٹا، آپ کی اماں جان بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ دادا جان نے اسے تسلی دی۔

”دادا جان گھر پر کوئی نہیں ہے... اگر اسپتال سے فون وغیرہ آیا تو مجھے کیسے پتا چلے گا کہ وہاں کیا سچویشن چل رہی ہے؟“ روما کی یہ بات سن کر شاہ عالم سوچ میں پڑ گئے۔ بات تو روما نے ٹھیک کی تھی۔ اتنی خطرناک سچویشن میں گھر میں کسی فرد کا ہونا بہت ضروری تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا...... میں آ جاتا ہوں، آپ بالکل پریشان مت ہونا، آپ اکیلی نہیں ہیں۔ میں صرف کائناز کا دادا نہیں آپ کا بھی دادا ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے آپ کو بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ شاہ عالم اگرچہ خود بہت گھبرائے ہوئے تھے مگر روما کو سنبھالنا اپنی اخلاقی ذمے داری بھی سمجھ رہے تھے ان کے اعصاب تو خود ان کا ساتھ چھوڑ رہے تھے کیونکہ روما نے جس انداز میں بات کی تھی اور پھر جس طرح سے وہ روئی تھی یہ سب کچھ ان کے لیے بہت ناقابلِ برداشت تھا۔ انجیو پلاسٹی ان کی ہو چکی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کے اعصاب جواب دینے لگتے تھے۔ وہ جلدی سے ریسیور رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وال کلاک کی طرف دیکھا پھر نوکر کو آواز دی۔

”شبیر میں تھوڑی دیر کے لیے گھر سے باہر جا رہا ہوں۔“

☆☆☆

رابی مری کے ایک خوب صورت ہوٹل کے کمرے میں بیٹھی اپنے موبائل سے سم نکال رہی تھی۔ موبائل سے سم نکال کر اسے ایک کاغذ میں لپیٹ کر اپنے بیگ میں ڈالا پھر موبائل کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

”اب یہ موبائل میرے کس کام کا۔ اللہ میاں سے رابطہ تو بغیر موبائل کے ہو جاتا ہے۔ باقی دنیا میں اب کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے، تعلق اور رابطے تو ایک بوجھ ہوتے ہیں جو میں نے اتار کر پھینک دیے ہیں۔ آج تو مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے اس مٹی کے جسم کا لباس بھی کہیں اتار کر پھینک دیا ہے اور میں صرف روح ہوں جو فضاؤں میں اُڑتی پھر رہی ہے۔ یہ سارے بوجھ اتار کر میں کتنی خوش اور مطمئن ہوں، کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا...... چھوڑ دیا سب کچھ...... توڑ دیا وہ گلاس جس میں مجھے زہر پیش کیا جا رہا تھا۔ اب میں محسوس کر سکتی ہوں کہ میں زندہ ہوں اور ایک وجود رکھتی ہوں...... میرے پاس خوشی ہے، نہ کوئی غم، اس وقت جو میری کیفیت ہے وہ تو کوئی غلام ہی سمجھ سکتا ہے اور ایسا غلام جس نے اپنے مالک کو منہ مانگی قیمت ادا کر کے آزادی حاصل کر لی ہو...... ڈاکٹر صاحبہ میں نے بھی آپ کو قیمت ادا کی ہے لیکن ایسی قیمت ایسی نقدی جس سے زندگی بھر آپ اپنے اس دکھ کی دوا خریدیں گی اور کوئی بھی ایسی دوا نہیں ملے گی جو آپ کے دکھ کا مداوا کر سکے، آپ لاعلاج ہی رہیں گی۔“ رابی کی آنکھوں میں ایک سفاکی کا تاثر تھا۔ جیسے اس کے زخم نئے سرے سے ہرے ہو رہے ہوں، اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تھی اور وہ چونک پڑی تھی۔

”کون ہے؟“ خاصی بدحواس ہو کر اس نے پوچھا تھا۔

”جی...... روم سروس، چائے لے کر آیا ہوں۔“ رابی نے ویٹر کی آواز سن کر سکون کی سانس لی اور بیڈ سے اتر کر دروازہ کھول دیا۔ ویٹر اندر داخل ہوا کر ٹیبل پر چائے لگا رہا تھا اور وہ ہنوز اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑی تھی اور ویٹر کے واپس جانے کا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆

شبینہ، جابر علی کے سامنے ناشتا رکھ چکی تھی۔ یہ خلافِ معمول عمل تھا۔ اس لیے جابر علی نے چونک کر پوچھا تھا۔

”تمہاری ماں کہاں ہے؟“

”امی کچن میں ہیں ابا جان۔“

”اچھا تو کیا تم آج لیٹ نہیں ہو گئیں۔ کالج جانے کا ارادہ نہیں ہے؟“

”وہ ابا جان کیا میں کالج چلی جاؤں؟“ شبینہ نے باپ کی بات سن کر سر اٹھایا پھر نظریں اٹھا کر بہت آہستگی سے سوالیہ انداز میں بولی۔ جابر علی کو جیسے اس کے سوال کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس نے الجھی الجھی نظروں سے شبینہ کی طرف دیکھا۔

”کیوں، آج مجھ سے پوچھ کر کالج جاؤ گی؟ مجھے تمہاری بات کی سمجھ نہیں آئی۔“ جابر علی نے الجھی الجھی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ ابا جان میں سمجھی کہ شاید مجھے بھی کالج نہیں جانا۔“ شبینہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”بھئی وہ میں نے تمہارے کالج جانے پر پابندی نہیں لگائی۔ مجھے تم سے کوئی شکایت ہے نہ تم پر کوئی غصہ...... سچی بات ہے مجھے تو تم ہی اپنی اولاد لگتی ہو۔“ جابر علی کو جیسے اب سب کچھ سمجھ آ گیا وہ بڑا بدمزہ سا ہو کر بولا۔

صابرہ کچن میں کھڑی سن رہی تھی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ یوں جیسے بھرے بازار میں اس کے سر سے چادر اتار کر پھینک دی ہو۔ اس نے درد کی ٹیسوں کو دبا کر پھر اپنا کام شروع کر دیا اور سوچنے لگی ... یہ تو میرا مقدر ہے۔ آخر میں اپنے مقدر پر کب سمجھوتا کروں گی۔"

باہر خاموشی چھا گئی تھی اس کا مطلب تھا کہ شبینہ، جابر علی کو ناشتا دینے کے بعد وہاں سے چلی گئی ہے۔ صابرہ کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ جابر علی کے سامنے سے گزر کر برہان کے کمرے میں جائے اور پتا کرے کہ آخر وہ ابھی تک ناشتا کرنے کے لیے نیچے کیوں نہیں آ رہا پھر اس نے آخر کار ہمت کر ہی لی اور کچن کے دروازے میں کھڑی ہو کر ستارہ کو آواز دینے لگی۔

"ستارہ دیکھو بیٹا...... بھائی ابھی تک نیچے نہیں آیا، دیر ہو جائے گی تو ناشتے کے بغیر ہی چلا جائے گا۔"

"جی امی...... میں دیکھتی ہوں، میرا خیال ہے آج بھائی کا یونیورسٹی جانے کا پروگرام نہیں ہے، ورنہ وہ تو اس ٹائم تک تو چلے جاتے ہیں۔" ستارہ کی آواز اس کے کمرے سے آئی تھی۔

"لیکن پھر بھی بیٹا پتا تو کرو ناں، کہیں ایسا تو نہیں اس کی طبیعت خراب ہو......"

وہ جابر علی پر نظر ڈالے بغیر کچن میں آ کر اپنا کام کرنے لگی۔

"بہت فکر رہتی ہے اپنے لاڈلے کے ناشتے کی۔ ارے کھاتے ہوئے مرتے دیکھا ہے، آج تک کسی بھوکے کو مرتے نہیں دیکھا۔" جابر علی ناگواری سے بڑبڑا رہا تھا۔ صابرہ پھر ضبط کے کڑے مرحلے سے گزری اور ایک ٹھنڈی سانس سینے سے خارج کی۔

"امی میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ بھائی جان چلے گئے ہوں گے۔ وہ چلے گئے ہیں، کمرے میں نہیں ہیں۔" چند لمحوں بعد ہی ستارہ تقریباً بھاگتے ہوئے کچن میں آ گئی تھی۔ صابرہ کے ہاتھ میں چائے کا برتن تھا۔ جو اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ وہ تو اندھیرے سے اٹھی بیٹھی تھی۔ برہان اس کے سامنے سے گزرے بغیر کیسے جا سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر ستارہ کی طرف دیکھا۔

"ارے بیٹا وہ شاید نہا رہا ہوگا۔ تم کمرا خالی دیکھ کر چلی آئیں۔"

"امی واش روم کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ اوپر بھائی جان نہیں ہیں۔" صابرہ نے کانپتے ہاتھوں سے چائے کا برتن رکھا اور بڑی مشکل سے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالا۔ یہ بہت انہونی بات تھی۔ برہان اسے خدا حافظ کہے بغیر کیسے جا سکتا تھا؟

"میں خود دیکھتی ہوں۔ تم ہر وقت جلدی میں رہتی ہو۔" وہ پریشانی کی کیفیت میں کچن سے باہر نکل گئی اور بڑی تیزی سے جابر علی کے سامنے سے گزر گئی۔

جابر علی نے جاتی ہوئی صابرہ کی طرف گردن موڑ کر دیکھا تھا اور ایک بڑی تلخ مسکراہٹ اس کی طرف روانہ کی تھی۔

صابرہ نے برہان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے باتھ روم میں جھانکا، باتھ روم تو واقعی خالی تھا۔ وہ بدحواس سی ہو کر چاروں طرف کمرے میں نظر دوڑانے لگی۔

برہان اپنے کمرے کے علاوہ کہاں جا سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ شبینہ اور ستارہ کے کمرے میں لیکن ستارہ تو خود اپنے کمرے سے تھوڑی دیر پہلے باہر آئی تھی اگر وہ اس کے کمرے میں ہوتا تو وہ اسے بتاتی کہ برہان اس کے کمرے میں ہے لیکن وہ تو اس کی آواز سنتے ہی اوپر دوڑ گئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ستارہ کو بھی نہیں پتا کہ وہ کس

وقت گھر سے نکلا ہے۔

صابرہ کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ گرنے کے انداز میں برہان کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ یہ بات بہت ہی انوکھی اور نرالی تھی کیونکہ جب سے برہان نے اسکول جانا شروع کیا تھا آج تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جب اس نے ماں کو خدا حافظ نہ کہا ہو۔

"مجھے بتائے بغیر برہان کب چلا گیا، کیسے چلا گیا، میں تو نیچے کام کرتی پھر رہی ہوں۔ وہ وہاں سے گزرتا تو میں اسے دیکھتی، دروازہ کھلتا تو مجھے آواز آتی۔ کہیں وہ رات کو تو کہیں نہیں چلا گیا۔ کہیں جابر علی نے تو اس سے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ اسے گھر سے تو نہیں نکال دیا۔" یہ خیال آتے ہی جیسے اس کے پورے وجود میں بجلیاں سی دوڑنے لگیں۔ ایک صدمے اور غم کی قوت تھی جس نے اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ گرتی پڑتی نیچے آئی تھی۔

جابر علی ناشتا ختم کر کے اٹھ چکا تھا اور واش بیسن پر کھڑا ہاتھ دھو رہا تھا۔ صابرہ کو اب ہر مصلحت سے نجات مل چکی تھی۔ وہ دیوانہ وار دوڑتے ہوئے جابر علی کے پاس آئی تھی۔

"برہان کہاں ہے؟" اس کے انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ذہنی توازن کھو چکی ہے۔

"مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو؟ مجھے کیا بتا کر جاتا ہے؟ اس نے جیتے جی باپ کو تو مار ہی دیا ہے بس اب تو اس کی ماں ہے اور وہ ہے۔" جابر علی نے بڑے غصے سے اس کی طرف گھورا تھا۔

"وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے جابر علی۔"

"تو نخرے دکھا رہا ہوگا، ناشتا کیے بغیر چلا گیا یونیورسٹی!" جابر علی نے اسی اکھڑ پن سے جواب دیا اور تولیے سے ہاتھ پونچھنے لگا۔

"میں تو یہیں ہوں صبح سے...... جو بھی اِدھر سے جائے گا تو مجھے نظر آئے گا وہ میرے سامنے سے گزرے گا۔" صابرہ بدحواس ہو کر جلدی جلدی بول رہی تھی۔ اس پر تو جیسے ایک وحشت سی طاری تھی۔ دل ڈوبتا جا رہا تھا۔

"بھئی ہو سکتا ہے تم واش روم میں ہو، ہو سکتا ہے تم نماز پڑھ رہی ہو اس ٹائم چلا گیا ہو۔" جابر علی نے جیسے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"پھر گیٹ کھلتا ہے، بند ہوتا ہے، آواز تو آتی ہے ناں!"

"اپنے دماغ کا علاج کراؤ، پتا نہیں کہیں پہنچی ہوئی ہوگی۔ اب اتنا پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے، اس کے موبائل پر فون کرو پتا چل جائے گا کہاں ہے وہ۔ پوچھ لینا کہ ناشتے کے بغیر کیوں چلا گیا۔" وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا جہاں سے اس نے اپنی چھڑی، ٹوپی اور ضروری چیزیں اٹھانا تھیں۔

صابرہ کو اس نے تسلی یا دلاسا نہیں دیا تھا مگر ایک راستہ سجھا دیا تھا۔ جو مارے بدحواسی کے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا۔ وہ جلدی سے ستارہ کے کمرے کی طرف بھاگی کیونکہ اسے برہان کا موبائل نمبر زبانی یاد نہیں تھا۔

"ستارہ بیٹا جلدی سے بھائی کا نمبر ملاؤ، پوچھو تو وہ کس وقت چلا گیا اور بغیر بتائے کیوں چلا گیا۔ ایسی بھی کیا مصیبت آ رہی تھی۔"

ستارہ نے ماں کی طرف دیکھا اور خاموشی سے لاؤنج میں چلی آئی۔ جہاں فون سیٹ رکھا ہوا تھا کیونکہ ان دونوں بہنوں اور ماں کے پاس موبائل نہیں تھا۔ جابر علی کی اجازت نہیں تھی کہ وہ موبائل فون استعمال کریں۔ ستارہ نے برہان کا نمبر ملایا، دوسری طرف موبائل کے پاور آف ہونے کی ریکارڈنگ چل رہی تھی۔

''امی بھائی جان کا موبائل تو آف ہے۔'' ستارہ نے فکر مندسی ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔
''ہائے میں مر گئی۔ کہاں ہے میرا بچہ......'' صابرہ نے دو ہتڑ سینے پر مارے۔
جابر علی نے گھر سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔ صابرہ کی آواز سنی تو وہیں سے آواز لگائی۔
''لڑکیوں اپنی ماں کو ٹھنڈا پانی پلاؤ، ایسا نہ ہو بیٹے کے غم میں آج ہی دنیا سے رخصت ہو جائے۔'' یہ کہہ کر وہ گیٹ پار کر گیا تھا۔ ستارہ، شبینہ اور صابرہ نے گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ جیسے رکی ہوئی سانسیں اپنے سینے سے خارج کیں۔
''امی آپ پریشان نہ ہوں، بھائی جان اتنے غیر ذمے دار نہیں ہیں، ہو سکتا ہے ان کے فون میں بیٹری ختم ہو گئی ہو کیونکہ جب بیٹری ختم ہو جاتی ہے تو فون خود بخود آف ہو جاتا ہے۔ آپ تھوڑی ہمت سے کام لیں، بھائی جان آپ کو خود فون کریں گے۔''
صابرہ کے پاس شبینہ کی بات کا جیسے کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے تو اندیشے اور وسوسوں نے اس بری طرح سے گھیر لیا کہ جیسے وہ کسی گھنے جنگل میں راستہ بھٹک گئی ہو اور اب اس اندھیرے جنگل سے نکلنے کے لیے دیوانہ وار اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

برہان ایک سستے سے خستہ حال ہوٹل میں بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے بھی تھے اور گہری سوچ کا عکس بھی...... وہ سوچ رہا تھا۔ ''امی کو بتا کر نکلتا تو کبھی اس گھر سے نہ نکل پاتا۔ جب میں اپنی بہنوں کے لیے کچھ کر نہیں سکتا تو مجھے ان کے سامنے رہنے کا کوئی حق بھی نہیں ہے اور میں جانتا ہوں کہ ابا جان کے فیصلے کو بدلنے کے لیے قوت میرے پاس نہیں...... زیادہ مزاحمت کرتا تب بھی یہی ہونا تھا، آخر کار گھر سے تو نکلنا تھا۔'' اس نے چائے کے دھبوں سے اٹے ہوئے کپ پر نظریں جما دیں، اب اسے سوچنا تھا کہ اسے کس راستے پر چلنا ہے اور منزل کہاں ہے۔

☆☆☆

گل جان بڑی بے قراری سے اسپتال کے کاریڈور میں ٹہل رہی تھی۔ مہر جان کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹرز یہی کہہ رہے تھے کہ اُن کے دماغ کی کوئی نس پھٹ گئی ہے اور خون جم گیا ہے۔ انہیں برین ہیمرج ہوا ہے، صورتِ حال بہت نازک اور خطرناک تھی۔ اسی لیے گل جان ایک سیکنڈ کے لیے بھی کرسی پر بیٹھ نہیں پا رہی تھی۔ مسلسل کھڑے کھڑے اور ٹہلتے ٹہلتے اس کے پاؤں سن ہو کر بے جان ہو رہے تھے۔ اصیل خان اسے سامنے سے آتا دکھائی دیا تو وہ بھاگ کر اس کے قریب گئی۔
''وہ رپورٹ آ گئی؟ کچھ اور رپورٹس بھی تو آنا تھیں ناں......!''
''نہیں بس سی ٹی اسکین کی رپوٹ آ گئی ہے۔ وہی کافی ہے۔ آپریشن ہی ہوگا۔''
''آپریشن!'' گل جان نے دہل کر اصیل خان کی طرف دیکھا۔ ''میں نے سنا ہے کہ دماغ کے آپریشن میں بہت خطرہ ہوتا ہے، بہت نازک آپریشن ہوتا ہے۔''
''جی گل جان بی بی...... میں نے بھی یہی سنا ہے لیکن اس آپریشن کے بعد بے پناہ لوگ دوبارہ سے زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں، اچھے ہو جاتے ہیں۔ آپ اللہ سے اچھی امید رکھیں۔'' یہ کہہ کر اس نے آئی سی یو کی طرف قدم بڑھا دیے۔

گل جان اپنی جگہ بے حس وحرکت کھڑی رہ گئی۔ دماغ تو جیسے اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ سامنے کوئی رنگ کوئی منظر نہیں تھا۔ یہاں سے لے کر وہاں تک تاریکی کی چادر تن گئی تھی۔

☆☆☆

روما، شاہ عالم کے پہلو میں بیٹھی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ شاہ عالم کا ہاتھ اس کے سر پر تھا اور چہرے پر انتہائی دکھ کے تاثرات۔

''بیٹا گھر میں کوئی تو ایسی بات ہوئی ہوگی۔ جس کا ان کے ذہن پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ یہ برین ہیمرج وغیرہ اتنی آسانی سے نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا حملہ ہوتا ہے جس کے سامنے بعض اوقات انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ جو اس کی برداشت سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور انسان کے حواس ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔''

روما نے ہچکیاں لیتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر وہ صرف دادا جان، دادا جان کر کے ہی رہ گئی۔ شاہ عالم نے بڑی ہمدردی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ روما انہیں بہت عزیز تھی کیونکہ روما میں ان کی پوتی کی جان اٹکی رہتی تھی۔

''بیٹا اب بس کر دو، اس طرح سے نہیں روتے اور ناامیدی کو کفر کہا گیا ہے۔ حالات کیسے بھی ہوں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی اماں جان بالکل ٹھیک ہو کر اپنے پاؤں سے چلتی ہوئی گھر واپس آئیں گی۔'' ان کے لہجے میں یقین کی وہ کیفیت تھی جو انہوں نے لمحے بھر میں روما کے وجود میں منتقل کر دی تھی۔

''دادا جان سچ بتائیں برین ہیمرج ہونے والے کو کوئی خطرہ تو نہیں ہوتا۔ میرا مطلب ہے وہ...... سروائیو survive تو کر جاتے ہیں ناں؟'' روما نے جلدی سے آنسو پونچھے اور بھیگی بھیگی آنکھوں سے شاہ عالم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ارے بیٹا یہ تو اب معمول کی بات ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر تو اسے اب کوئی کام ہی نہیں سمجھتے۔ ہاں پرانے وقتوں میں کیونکہ میڈیکل نے ترقی نہیں کی تھی اور وسائل بھی محدود تھے۔ تب یہ چھوٹے چھوٹے حادثے بڑے حادثے بن جاتے تھے۔'' انہوں نے بہت محبت بھری نظروں سے روما کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ قوتِ یقین کے بل بوتے پر روما کے اندر امید کے بے شمار چراغ روشن کرنا چاہ رہے تھے۔

''دادا جان، اماں جان بہت غصہ کرتی ہیں، ہمیں ڈانٹتی ہیں، سب کچھ کرتی ہیں، انہوں نے ہمیں سب کچھ دیا بھی تو ہے۔ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی...... حتیٰ کہ باپ کی بھی نہیں۔'' وہ سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں بیٹا تمہاری ماں خاتونِ آہن ہیں، مردوں کے لیے لفظ جواں مردی استعمال ہوتا ہے، میں تمہاری ماں کے لیے یہ لفظ استعمال کرتا ہوں۔ آفرین ہے ڈاکٹر صاحبہ پر کتنا بڑا اسپتال چلا رہی ہیں اور پورے گھر کی ذمے داریاں ان کے کندھوں پر ہیں...... بہرحال کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس سے انہیں بہت صدمہ پہنچا...... ورنہ اتنی باہمت خاتون اس طرح سے گرنے والی نہیں۔'' روما نے اب کسی حد تک اپنے حواس کنٹرول کر لیے تھے۔ اور کچھ شاہ عالم کی قوتِ یقین نے اس کے اندر توانائی بھر دی تھی اب اس کے اپنے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے چوری، چوری شاہ عالم کی طرف دیکھا اور بہت جھجکتے ہوئے بولی۔

''دادا جان...... وہ رابی آپا ناں...... گھر سے چلی گئی ہیں تو شاید اس وجہ سے اماں جان کو شاک لگا ہے۔''

روما نے بڑے عام سے انداز میں بہت بڑا دھماکا کیا تھا...... وہ تو اس کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہی رہ گئے۔

''کیا کہہ رہی ہو بیٹا...... ؟ رابی کہاں چلی گئی ہے؟ بتا کر تو گئی ہوگی ناں؟'' وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکے۔

''دادا جان اگر بتا کر جاتی تو اماں کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ سارا مسئلہ یہی ہے۔ میں نے کائناز کو تو بتا دیا تھا اور اسے کہا تھا کہ وہ آپ کو نہ بتائے کیونکہ آپ بھی تو بوڑھے ہیں ناں اور آپ کی اینجیوپلاسٹی بھی ہو چکی ہے...... تو کائناز نے اس وجہ سے آپ کو نہیں بتایا ہوگا۔''

شاہ عالم نے حیرت سے روما کی طرف دیکھا اُن کے لیے یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی کہ کائناز اُن سے اتنی بڑی خبر چھپا گئی۔ اس کے پیٹ میں تو کچھ رکتا ہی نہیں ہے۔ البتہ انہیں یاد آ رہا تھا کہ صبح وہ بہت چپ، چپ تھی اور ناشتا بھی اس نے برائے نام کیا تھا...... انہوں نے پوچھا بھی تھا لیکن وہ ٹال مٹول کے انداز میں جواب دے کر کالج چلی گئی تھی۔

''یہ تو بہت بڑا حادثہ ہے، شاید ہی اس سے بڑا کوئی حادثہ ہوتا ہوگا۔ جب بیٹی بغیر بتائے گھر کی دہلیز پھلانگتی ہے تو یہ حادثہ موت سے بڑا حادثہ ہوتا ہے۔ حد ہوگئی...... ڈاکٹر صاحبہ کتنی ہی مضبوط اور ذمے دار... سہی انسان بھی ہیں اور ایک عورت بھی اور پھر تنہا عورت...... میں نے تو آج تک آپ کے گھر میں کسی مرد رشتے دار کو نہ آتے دیکھا نہ جاتے۔''

''دادا جان ہمارا...... تو کوئی ہے ہی نہیں تو ہمارے گھر کون آئے گا؟'' روما نے بڑی برجستگی اور بے ساختگی سے کہا تھا۔

شاہ عالم روما کی معصومیت پر دیکھتے ہی رہ گئے۔ کچھ ایسے سوالات ذہن میں ابھرے تھے جو وہ سمجھتے تھے کہ روما سے کیے جائیں تو بہت معیوب بات ہوگی۔ انہوں نے ایک طویل سانس اپنے سینے سے آزاد کی اور اپنے دکھ کو ضبط کرتے ہوئے روما سے گویا ہوئے۔

''بیٹا جب ہم کسی حادثے کے بعد زندہ نظر آتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حادثہ ہماری قوت سے بڑا نہیں۔ ہمیں اس موقع پر اللہ سے رحم کی بھیک مانگنی چاہیے۔ خدا کرے کوئی معجزہ ہو جائے اور بات سنبھل جائے۔'' وہ بڑی دلسوزی سے خود کلامی کی کیفیت میں کہہ رہے تھے۔ روما نے تو بیٹھے بٹھائے ان سے سکون اور چین کی بچی کھچی گھڑیاں بھی چھین لی تھیں۔ ان کا بوڑھا ذہن تو برف ہو رہا تھا۔ ساکن و جامد۔

☆☆☆

رابی شام ہونے سے ذرا پہلے ہوٹل سے باہر آئی تھی۔ اس کا رخ مری کے پنڈی پوائنٹ کی طرف تھا۔ دور، دور تک لوگوں کا جمِ غفیر نظر آ رہا تھا۔ ٹولیوں، گروپوں میں بکھرے ہوئے لوگ یوں نظر آ رہے تھے جیسے یہاں آنے کے بعد ان کی ساری فکریں ہلکے پھلکے اڑتے بادلوں کے ساتھ ہی اُڑ گئی ہوں۔ وہ بے سوچے سمجھے سیدھی روڈ پر چلتی چلی جا رہی تھی۔ دائیں بائیں مختلف اشیا فروخت کرنے والے پتھارے لگائے بیٹھے تھے۔ کوئی خالص شہد لیے بیٹھا تھا کسی کے پاس ہاتھوں کے رنگین پنکھے، ٹوکریاں اور چھابیاں تھیں کہیں کوئی طوطے سے فال نکال رہا تھا۔ کہیں کوئی شکرے کو کندھے پر بٹھا کر تصویریں کھنچوا رہا تھا۔ ایک عجیب گہما گہمی تھی۔ چاروں طرف لوگ مست و مگن نظر آ رہے تھے۔ رابی چلتے چلتے نسبتاً ایک ڈھلوانی جگہ پر پہنچ گئی جہاں جگہ جگہ بے ترتیب گھاس اگی ہوئی تھی۔ وہاں اس نے ایک ضعیف عورت کو چادر بچھا کر کچھ ثقافتی شاہکار لیے بیٹھے دیکھا۔ بڑھیا کے پاس مٹی کے برتن ہاتھ کے پنکھے، شیشے کے کام کے خوب صورت بیگ، بچوں کے کھلونے وغیرہ نظر آ رہے تھے۔

رابی کو جانے اس ضعیف عورت میں کیا نظر آیا تھا کہ وہ کشاں، کشاں اس کی طرف کھنچی چلی آئی تھی۔

بڑھیا اب تک کی ہونے والی سیل گن رہی تھی۔ ہاتھ میں کچھ نوٹ تھے اور چادر پر کافی سارے سکے۔
''اماں یہ پنکھا کتنے کا دے رہی ہو، ویسے آج کل تمہارے پنکھے تو بہت بکتے ہوں گے، لوڈشیڈنگ جو اتنی ہو رہی ہے۔''
''دو سو روپے کا۔'' بڑھیا نے جو اپنے کام میں بے انتہا مستغرق تھی، چونک کر سر اٹھایا پھر بڑی بے نیازی سے بولی۔
''اتنا مہنگا؟'' رابی نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔
بڑھیا نے دور پھیلے ہوئے پنکھے ہاتھ بڑھا کر قریب کر لیے یوں جیسے اسے یہ خطرہ ہو کہ رابی کوئی پنکھا بغیر قیمت دیے اٹھا کر بھاگ جائے گی۔
''میں تو بہت سستے دیتی ہوں، آپ اِدھر اُدھر گھوم کر دیکھ لو۔ اس سے کم پیسوں کا ملے تو مجھ سے آ کر کہنا، میں زیادہ منافع نہیں لیتی اس پنکھے پر مجھے دس پندرہ روپے ملیں گے۔ لینا ہے لو ورنہ راستہ دیکھو۔'' بڑھیا نے دکانداروں والی مصنوعی خوش اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ ایک طرح سے پتھر پھوڑے تھے۔
رابی دوسری چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی تھی۔ اسے ان چیزوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ کچھ اور سوچ رہی ہے۔ بڑھیا نے دیکھا کہ اس کی گاہک تو اس کی جھاڑ سن کر بھی اسی طرح سے بلکہ بڑی تسلی سے بیٹھی ہے اس نے خود بخود اپنے لہجے میں نرمی پیدا کر لی۔
''بیٹا جو بھی چیز لو گی بہت مناسب دام لگیں گے۔ میں اپنے روز کا خرچہ نکالتی ہوں، میں نے کون سا بینکوں میں مال جمع کرنا ہے۔ آج مری کل دوسرا دن......''
''اماں تم بہت خوش قسمت ہو، تمہیں تو مزید جینے کی فکر ہی نہیں اور نہ سرمایہ ختم ہونے کی۔'' رابی نے بڑھیا کی طرف بڑی ستائش بھری نظروں سے دیکھا۔ بڑھیا رابی کی بات سن کر مسکرا دی۔ جیسے اسے رابی کی بات بہت اچھی لگی ہو۔
''بیٹا اکیلی گھوم رہی ہو، ماں، باپ کے ساتھ آئی ہو یا بال بچوں کے ساتھ؟''
رابی ایک دم گڑبڑا گئی مگر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ ''اماں اکیلا ہی سمجھیں۔ میرا دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔'' رابی کی بات سن کر بڑھیا نے یوں سر اٹھا کر رابی کی طرف دیکھا جیسے اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے بم پھوڑ دیا ہو۔
وہ رابی کو بہت حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک خوب صورت جوان لڑکی جو دیکھنے سے لگتا تھا کہ کسی بہت امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔
''کوئی نہیں ہے......؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے بیٹا ماں، باپ نہیں رہتے تو دنیا میں اور بھی رشتے ہوتے ہیں، چچا، تایا پھوپی، ماموں کوئی تو ہوگا ناں!''
''کوئی نہیں ہے اماں یقین کرو۔'' رابی کے اس جواب پر بڑھیا نے پھر فکرمندی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے حلق سے نیچے یہ بات اتر نہیں رہی تھی مگر جزبز سی ہو کر رہ گئی اور خود کو مزید سوال کرنے سے روک لیا۔
''اماں تم کہاں رہتی ہو؟'' اس نے بڑھیا کی گم صم سی کیفیت دیکھ کر نئی بات شروع کر دی۔
''بیٹا زیادہ دور نہیں رہتی۔ یہ سامنے پہاڑی پر گھر نظر آ رہے ہیں ناں وہیں پر میری جھونپڑی ہے۔'' بڑھیا نے ایک گہری سانس لے کر گہری نظروں سے رابی کی طرف دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''جھونپڑی؟'' رابی کی بات سن کر بڑھیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
''بیٹا زمین پر چادر بچھا کر یہ چیزیں بیچ رہی ہوں، تمہارا کیا خیال ہے میں کسی محل میں رہتی ہوں گی۔''
''وہ نہیں، نہیں اماں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میرا مطلب تھا یہاں تو بڑا خراب موسم ہوتا ہے، آپ کو تو بڑا مسئلہ ہوتا ہوگا۔'' اس نے جلدی سے وضاحت کی۔
''وہ نہیں بیٹا، مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا کیونکہ میں نے پیسے جمع کر کے اپنا گھر کچا پکا کر لیا، اب بارش آندھی سے بچت ہو گئی ہے، ہاں پہلے ذرا سی بارش سے سارے گھر میں پانی پانی نظر آتا تھا۔'' بڑھیا نے جواب دیا۔
''اماں تم کب سے اکیلی ہو اور تم نے یہ گھر اور سب کچھ اکیلے ہی بنایا ہے؟''
''وہ نہیں بیٹا! شوہر مر گیا، کچی جھونپڑی تو اسی نے بنا کر دی تھی بعد میں، میں نے محنت مشقت کر کے گھر پکا کر لیا۔''
''تو کیا آپ اب بالکل اکیلی ہیں؟'' رابی پتا نہیں کیوں سوال پر سوال کیے جا رہی تھی۔ ایک کمزور تنہا بوڑھی عورت اسے انجانے میں بہت حوصلہ بخش رہی تھی۔
''بیٹا اب تو شام ڈھل رہی ہے، تم اکیلی جوان جہاں لڑکی اِدھر اُدھر گھوم رہی ہو، اِدھر طرح طرح کے لوگ گھومتے ہیں، تمہارا اپنا ٹھکانا کہاں ہے؟'' رابی بڑھیا کے سوال پر چونک پڑی اور زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''اماں یہ لو تم دو سو روپے بلکہ ایسا کرو یہ دو پنکھے دے دو اور پانچ سو روپے لے لو۔'' رابی نے خواہ مخواہ ہی بڑھیا سے دو پنکھے لے لیے۔ اسے بھلا پنکھوں کی کیا ضرورت تھی اور اس کا کون سا گھر تھا۔ جہاں وہ یہ ڈیکوریشن پیس کے طور پر ہی سجا لیتی۔ بڑھیا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اس نے لپک کر پانچ سو کا نوٹ پکڑا اور بولی۔
''بیٹی بہت بڑا دل ہے تمہارا پیسہ تو بہت سوں کے پاس ہوتا ہے لیکن اللہ دل کسی کسی کو دیتا ہے۔ میں تم سے فالتو میں منافع نہیں لوں گی۔ لو یہ پکڑو اپنے باقی کے پیسے۔'' بڑھیا نے بڑی زبردست خودداری کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک ان پڑھ بوڑھی ضعیف عورت، رابی کو پتا نہیں کیوں اتنا متاثر کر رہی تھی۔ وہ اس کی طرف کئی لمحے دیکھتی رہی۔ یوں جیسے اس کا ذہن کہیں دور چلا گیا ہو، کتنی خوش قسمت ہے یہ عورت...... جبر اور دباؤ سے دور مکمل خود مختاری کی زندگی...... یہ تو دنیا ہی میں جنت میں رہتی ہے۔ رابی نے سوچا اور قدم بڑھانے لگی۔ بڑھیا نے پھر اسے ٹوکا۔
''بیٹا یہ اپنا سو کا نوٹ پکڑو۔'' رابی اس سے کئی گز کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے بڑھیا کی طرف مڑ کر دیکھا اور بولی۔
''اماں میں نے کہا ناں یہ تم رکھ لو، یہ سمجھو تمہارا آج کا منافع ہے۔ میں کل پھر آؤں گی تمہارے پاس۔''
رابی یہ کہہ کر اس راستے پر چل پڑی جو اسے ہوٹل کی طرف لے جا رہا تھا۔
بڑھیا حیرت کی تصویر بنی اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

☆☆☆

صابرہ کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ شبینہ اور ستارہ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اُن کے چہروں پر ایسی بے بسی نظر آ رہی تھی جیسے وہ اس بات سے مایوس ہوں کہ وہ ماں کو سنبھال لیں گی۔ صابرہ کبھی لیٹتی تھی کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی اور پاگلوں کی طرح ہذیانی انداز میں بولنا شروع کر دیتی تھی۔
''وہ مجھے بتائے بغیر کبھی گھر سے نہیں گیا...... وہ پانچ منٹ کے لیے بھی گھر سے جاتا ہے تو مجھے بتا کر جاتا ہے۔ مجھے...... مجھے اس کے پاس لے کر جاؤ، مجھے اس کے پاس لے کر جاؤ، ورنہ میں مر جاؤں گی۔ اپنے باپ کو فون کرو، ارے وہ پولیس کے محکمے میں ہے کس دن کام آئے گا تمہارا یہ محکمہ، اپنے باپ کو فون کر کے کہو

مجھ سے ملیے

میرا نام کاجل شاہ ہے، میرا جنم دن سات جولائی ہے۔ میں نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے ساتھ عربی ٹیچر ٹریننگ کورس کیا ہے۔ شادی سے پہلے دو سال تک ملتان کے ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کی پھر شادی کے بعد ملازمت چھوڑ دی۔ میرے مشاغل میں اچھی کتابیں پڑھنا، تصویریں بنانا یعنی مصوری، کہانیاں لکھنا، مختلف اسٹارز کے بارے میں جاننا، ہاتھ کی ریکھاؤں کے بارے میں معلومات رکھنا، ڈیکوریشن پیس بنانا شامل ہیں۔ ہنر میں سلائی، کڑھائی، بُنائی، کٹائی، صفائی کھانا بنانا اور گھر کے دوسرے کام وغیرہ۔ میں نے دیوانگی کی حد تک گلاب، موتیا اور خوشبو میں کچے آنگن کی مٹی کے علاوہ کسی بھی چیز کی خوشبو کو محسوس نہیں کیا۔ پسندیدہ لباس ساڑی اور شلوار قمیص ہیں، موسم مجھے خزاں کا پسند ہے۔ پسندیدہ شہر اپنا ملتان ہے۔ میری زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ جب میں پہلی مرتبہ براڈ کاسٹنگ ہاؤس، ملتان گئی، میری ایک خواہش ہے کہ میرے بال بہت لمبے ہوتے۔ اپنی پسندیدہ عادت یہ ہے کہ دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دینا اور خواہش یہ کہ دوسرے بھی میرے ذاتی معاملات میں دخل نہ دیں۔ 90ء سے لکھنا شروع کیا اور مختلف ڈائجسٹوں میں شائع ہوتی رہی ہوں اور اب پاکیزہ کی اتنی تعریف سنی ہے کہ اب اس میں بھی آغاز کر رہی ہوں اور اس تعارف سے ہی میرا آغاز ہو رہا ہے، میں آزاد نظمیں لکھتی ہوں، کہانیاں ملتان کے اخبار سنگ میل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مجھے غصہ بہت کم آتا ہے، غصے کی حالت میں خاموش رہتی ہوں اور خود کو مصروف رکھتی ہوں، دوسری صورت میں، میں بولتی ہوں اور دوسروں کو خاموش رہنا پڑتا ہے، میں اکثر لوگوں کی زیادتیاں بھول جاتی ہوں۔ گھر میں مجھے بلّو کہا جاتا ہے، مادری زبان سرائیکی ہے، عزیز ترین ہستی ایک تو چھوٹی بہن اور میری بیٹی پاکیزہ کوئی مجھے کچھ کہہ دے تو اسے شاید معاف کردوں لیکن اگر کوئی میری بہن یا بیٹی کے متعلق کچھ کہے تو میں بہت مشکل ہے کہ اسے معاف کروں۔

کاجل شاہ، ملتان

میرے بچے کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ ورنہ میں جان دے دوں گی شبینہ۔“

”امی بات تو سنیں، بھائی کوئی چھوٹے سے بچے تو نہیں ہیں۔ ماشاءاللہ جوان ہیں، اپنے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں اور وہ ان پڑھ جاہل بھی نہیں ہیں۔ آپ کیوں اتنی ٹینشن لے رہی ہیں۔“

شبینہ جیسے بولتے بولتے رو دی۔

”بیٹا اس نے تو گھر سے نکل کر ماں کو فون تک نہیں کیا۔ ارے میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔ خدانخواستہ کچھ ہو نہ گیا ہو ورنہ وہ فون تو کرتا ضرور...... دیکھو موبائل تو اس کے پاس ہوتا ہے۔ بتا کر نہیں گیا بعد میں فون کر دیتا۔ بتا تو دیتا وہ ہے کہاں۔ مجھے ایک پل چین نہیں آ رہا۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں ننگے پاؤں، ننگے سر اس گھر سے نکل جاؤں، ارے کس کام کی ایسی زندگی کہ اولاد کی شکل کو ترستی رہوں۔“

ستارہ نے ایک دم ماں کے ہاتھ تھام لیے اور بہت محبت سے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

”امی خود کو سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے اور اچھا ہوا بھائی چلے گئے یہاں سے۔ یہاں تو صبح، دوپہر، شام صرف ظلم کی کہانی ہے، وہ اس ماحول سے دور رہیں گے تو کچھ کر کے دکھا ہی دیں گے۔“ صابرہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے تھپڑ مارنے کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر ستارہ کو گھورا تھا۔

”تیری اس زبان نے گھر میں آگ لگا دی ہے۔ خاموش ہو جا، بالکل باپ پر گئی ہے کچھ نہیں سوچتی بولتے ہوئے۔“

ستارہ احتیاط کے ضمن میں ماں کے قریب سے اٹھ گئی کہ کہیں واقعی صابرہ اس کے تھپڑ ہی رسید نہ کر دے مگر وہ بولنے سے باز نہیں آئی۔

”امی، بچہ باپ پر ہی جاتا ہے، ظاہری بات ہے ماں پر جائے گا یا باپ پر ہی جائے گا۔“

”ستارہ تم یہاں سے چلی جاؤ، دیکھ رہی ہو کہ امی کی حالت کتنی خراب ہے پھر بھی بولے چلے جا رہی ہو بولے جا رہی ہو۔“ شبینہ، ستارہ کی بات سن کر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور بڑی بے بسی کی کیفیت میں بولی۔ ستارہ نے غصے بھری نظروں سے شبینہ کی طرف دیکھا اور باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ جاتے ہوئے بھی وہ بڑبڑا رہی تھی۔

”سب کو غصہ آ رہا ہے، سب اپنا اپنا غصہ اتار رہے ہیں، میں اپنا غصہ اتارتی ہوں تو یہ غیر قانونی ہو جاتا ہے۔ جیسے باقی تو سب قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے کام کر رہے ہیں۔“

”بیٹا اس لڑکی کی وجہ سے آج میرا بیٹا گھر سے بے گھر ہو گیا، دیکھو تم اسے سمجھا لو، اس کو بتا دو کہ ماں مر گئی تو اس کی یہ بدزبانی برداشت کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ماں سے بڑا دل کسی کا نہیں ہوتا اور ماں کے سوا اتنی باتیں کوئی سن بھی نہیں سکتا۔ یہ دنیا بڑی بے مروت ہے، ذرا لحاظ نہیں کرتی۔“ صابرہ نے شبینہ کی طرف دیکھا اور بڑی بے بسی کی کیفیت میں بولی۔

”امی آپ تو سمجھتی ہیں ناں کہ آپ ہمارے لیے کتنی ضروری ہیں، خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گا۔ آپ خود کو سنبھالیں، میرا دل کہتا ہے بھائی جان آپ کو تھوڑی دیر میں ضرور فون کریں گے۔ انہیں خود بھی احساس ہو رہا ہوگا۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ اس وقت آپ کتنی تکلیف سے گزر رہی ہوں گی۔“ شبینہ نے صابرہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گال سے لگاتے ہوئے بڑے پیار سے بولی۔

”بیٹا اسی بات کا تو دکھ ہے کہ رات سے اگر گیا ہوا ہے تو اب تک اسے ماں کا خیال نہیں آیا۔ اسے احساس نہیں ہوا کہ جس ماں کو اُدھر چھوڑ کر آیا ہوں وہ جیتے جی مر جائے گی۔ اتنا سنگدل تو میرا بچہ نہیں ہے۔ مجھے تو طرح، طرح کے وہم آ رہے ہیں۔ مجھے خدا کے واسطے...... خدا کے واسطے مجھے اس کی آواز تو سنا دو...... اس کا نمبر ملاؤ کیا پتا اب اس نے بیٹری چارج کر لی ہو، دیکھو ہو سکتا ہے اس وقت اس کا فون کام کر رہا ہو، جلدی کرو۔“

”امی آپ لیٹی رہیں، میں دیکھتی ہوں اگر بھائی نے فون اٹینڈ کر لیا تو میں آپ کو بلا لوں گی۔ آپ بس آرام کریں۔“ شبینہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بہت زیادہ فکر مند نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

جابر علی، ایس پی کے کمرے میں بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ ایس پی کے چہرے پر پورے اطمینان کی کیفیت تھی۔ جیسے اسے اپنی کامیابی پر یقین ہو رہا ہو۔

”وہ سر آپ سے ایک ریکویسٹ ہے۔“ جابر علی چائے کے گھونٹ بھرتا ہوا سوچ رہا تھا سوچتے سوچتے اس نے اپنا سر اٹھا کر ایس پی کی طرف دیکھا اور ہچکچاتے ہوئے گویا ہوا۔

”بولو، بولو، جابر علی۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کچھ تکلف ہے؟ ایسی کیا بات ہے جو ہچکچاتے ہوئے بول رہے ہو۔“ ایس پی جو بڑی گہری نظروں سے اس کے تاثرات جانچ رہا تھا۔ جلدی سے بولا۔ بلکہ ایس پی نے جابر علی کا ایک طرح سے حوصلہ بڑھایا۔

”سر میں ایک تنخواہ دار آدمی ہوں اور ابھی تک بچوں کی شادی کے لیے کچھ نہیں جوڑ پایا۔“

"اچھا تم اس وجہ سے فکر مند ہو، بھئی تم نے یہ بات مجھ سے پہلے کیوں نہیں کر ڈالی۔ وارث علی کو تمہارے گھر کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے، وہ تو تمہارے گھر سے تنکا اٹھانا بھی پسند نہیں کرے گا۔ ارے اس کا گھر بھرا پڑا ہے، اسے آنے والی کے جہیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم اتنی نیک کردار بیٹی اسے دے رہے ہو، کوئی بڑے سے بڑا جہیز بھی اس بچی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جو بندہ اپنی نیک خصلت، نیک کردار بیٹی کسی کو دے دیتا ہے۔ وہ تو سمجھو اپنا خزانہ خالی کر دیتا ہے۔" ایس پی ایک قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اس کے قہقہے نے جابر علی کو الجھا سا دیا۔

ایس پی کی بات سن کر جابر علی نے جیسے ایک سکون کی گہری سانس کھینچی۔ بات بہت مختصر تھی اور اختصار میں ہی اس کے لیے بے پناہ آسانیوں کی خوش خبری تھی۔ وہ جیسے اندر سے کھل اٹھا۔ ایک بہت بڑا بوجھ اس کے سر سے ہٹ گیا تھا۔

"بہت بہت شکریہ، سر آپ نے مجھے بالکل ریلیکس کر دیا ہے۔"

"بھئی تم جہیز کی بات کر رہے ہو، اب میری سنو وارث علی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں تم سے یہ بھی کہہ دوں کہ تم کھانے وانے کے چکر میں بھی مت پڑنا۔ ہم خود کسی ہوٹل میں بندوبست کر لیں گے۔ نکاح گھر پر ہوگا۔ ڈنر کسی ہوٹل میں اور وہ بھی نام تمہاری طرف سے ہوگا۔"

جابر علی نے چونک کر سر اٹھایا جیسے اس کی خودداری بلبلا کر رہ گئی تھی۔

"سر میں جھوٹے نگینوں کے تاج اپنے سر پر سجانا نہیں چاہتا۔ آپ وارث علی سے کہیں کہ وہ ولیمے کا ڈنر جدھر مرضی دے۔ بڑے ہوٹل میں دے یا چھوٹے ہوٹل میں دے اس کی مرضی لیکن میں اس کا اتنا بڑا احسان لے کر بیٹی نہیں دے سکتا۔ کچھ تو میری خودداری کا خیال کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس محکمے میں میری عمر گزر گئی ہے۔ آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ میں نے کبھی کسی سے دس روپے بھی لیے ہوں۔ مجھے تو کوئی یہاں بھی چائے پلا دیتا ہے تو میں چائے کے پیسے خود دے دیتا ہوں۔" وہ بڑی آہستگی سے گویا ہوا۔

"جابر علی میں تمہاری انا اور خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ تم اطمینان رکھو۔ میں تمہیں پورا محکمہ اور جہاں، جہاں تم آج تک ٹرانسفر ہو کر گئے ہو وہ سب لوگ تمہاری ایمانداری کو جانتے ہیں اور اس وجہ سے پورا محکمہ تمہاری عزت کرتا ہے۔" ایس پی جابر علی کی بات سن کر مسکرا دیا اور اپنے شاطرانہ انداز چھپاتے ہوئے بڑی ہمدردی سے گویا ہوا۔

جابر علی نے انکساری کے انداز میں سر جھکا لیا۔

"تم فکر نہ کرو میں وارث علی سے کہہ دوں گا کہ بھئی جابر علی نکاح والے دن شربت پلائے یا ہائی ٹی...... یا اپنے حساب سے کھانا کرے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"سر آپ کے تعاون سے اتنا بڑا مرحلہ بہت آسان دکھائی دے رہا ہے، اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو، سب کام بخیر و خوبی انجام پا جائیں۔" جابر علی کے چہرے پر سکون اور خوشی کی کیفیت جھلکنے لگی اس نے چائے کا خالی کپ پرچ میں رکھا اور ایس پی کی طرف دیکھ کر مسکرایا جیسے شکریہ ادا کر رہا ہو۔

ایس پی نے بہت دل سے آمین کہا تھا...... جابر علی اٹھنے لگا تو ایس پی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کے لیے کہا۔ جابر علی اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے ایس پی کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ جابر علی جب ساری باتیں طے ہو چکی ہیں تو نکاح کی تاریخ بھی دے دو۔"

"نکاح کی تاریخ؟" جابر علی چونک کر ایس پی کی شکل دیکھنے لگا۔ "سر وہ نکاح کی تاریخ تو میں گھر والوں

سے مشورہ کر کے ہی آپ کو بتا سکوں گا۔"

"جانے دو جابر علی، چلتی تو تمہاری ہے۔ تم فضول میں گھر والوں کو مشورے کے لیے تکلیف دیتے ہو۔ جہاں تم انہیں اتنی تکلیفوں سے بچا رہے ہو، اس تکلیف سے بھی بچا لو۔ یہیں آج کی تاریخ میں یہ معاملہ بھی ایک طرف ہو جائے۔" ایس پی ہنس دیا اور شریر انداز میں بولا۔

"پھر بھی سر، اطلاع تو گھر میں ہونی چاہیے ناں۔ تھوڑی بہت تیاری تو ہمیں بھی کرنا ہوگی۔" اس نے ذرا جھجکتے ہوئے جواب دیا حالانکہ دل تو چاہ رہا تھا کہ کہہ دے کل آ جائیں میں نے کون سا بازاروں میں بچی کو لے کر پھرنا ہے یا خریداری کرنا ہے۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے جابر علی میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا کیونکہ میرے فون کا انتظار وارث علی کر رہا ہوگا۔"

"جی سر انشاء اللہ تعالیٰ آج یہ تمام معاملات طے ہو جائیں گے۔ آپ فکر نہیں کریں۔"

"او کے چلو پھر اب ہم اپنا، اپنا کام کرتے ہیں...... ٹھیک ہے۔" جابر علی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ایس پی کو سلیوٹ کیا اور ایڑیوں کے بل دروازے کی سمت گھوم گیا۔ اس کی پیٹھ ہوتے ہی ایس پی کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

☆☆☆

شاہ عالم ہنوز روما کے ساتھ اس کے گھر میں موجود تھے۔ کائناز بھی کالج سے آنے کے بعد وہیں چلی آئی تھی۔ وہ اپنی سہیلی کے غم پر اس سے زیادہ نڈھال نظر آ رہی تھی لگتا تھا کہ وہ رو دے گی۔

روما کا تو پہلے ہی رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ دو حادثے یکے بعد دیگرے اس گھر پر قیامت بن کر ٹوٹے تھے۔ رابی کا بغیر بتائے گھر سے چلے جانا اور پھر اس کے بعد ڈاکٹر مہر جان کا کومے میں چلے جانا۔ وہ تو یہ محسوس کر رہی تھی جیسے کسی اجنبی جگہ پر تنہا کھڑی ہو اور گھر تک جانے والا راستہ سمجھ نہیں آ رہا ہو۔ شاہ عالم اور کائناز اسے بڑی ہمدردی سے سنبھالنے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے۔

"روما دیکھو، رونے سے کچھ نہیں ہوگا تمہارے رونے کی وجہ سے میرا دل چاہ رہا ہے بس میں بھی رونا شروع کر دوں۔ روما مجھ سے تمہارا رونا دیکھا نہیں جا رہا۔ خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔" کائناز اسے گلے سے لگائے چپ کرا رہی تھی مگر اس کی ہچکیاں تھم کے نہیں دے رہی تھیں۔ اسی وقت پورچ میں کار کے ہارن کی آواز گونجی تھی اور روما نے چونک کر کائناز کے کندھے سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرائی تھی۔

"مجھے لگتا ہے اماں جان آ گئی ہیں۔" یہ کہہ کر روما دیوانہ وار پورچ کی طرف دوڑی تھی۔

شاہ عالم نے کائناز کی طرف دیکھا مگر اس سے پیشتر کہ وہ کوئی بات کرتے وہ روما کے پیچھے سرپٹ بھاگی تھی۔

پورچ میں کھڑی کار سے گل جان اتر رہی تھی۔ روما نے گل جان کی پشت پر دیکھا اسے گل جان کے سوا اور کوئی دکھائی نہیں دیا۔ نہ اصیل خان، نہ مہر جان...... وہ بھاگتے ہوئے گل جان کے گلے سے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"آپ اکیلی کیوں آئی ہیں، اماں کہاں ہیں؟ کیسی طبیعت ہے ان کی؟" گل جان نے بہت محبت اور نرمی سے روما کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بیٹا آپ کی اماں جان اسپتال میں ایڈمٹ ہیں، سب لوگ دعا کر رہے ہیں، آپ بھی دعا کریں۔" وہ

ایک ٹھنڈی آہ بھر کے بولی۔
کائنازان کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی تھی اور وہ بھی بڑی آس بھری نظروں سے گل جان کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن گل جان کے چہرے پر چھائی مایوسی اور تشویش نے اسے ہراساں کر دیا۔
''خالہ جان کیا اماں جان بے ہوش ہیں، ڈاکٹرز کیا کہہ رہے ہیں، خدانخواستہ کوئی سیریس بات تو نہیں، یہ رابی آپا نے کیا کر دیا، اب...... اب دیکھیں تو سہی کیا ہوگا، اس گھر پر پہلے ہی کون سی خوشیاں برس رہی تھیں، کہ ہماری قسمت میں یہی رہ گیا ہے، خالہ جان...... ہم زندگی بھر اسی طرح روتے رہیں گے۔'' یہ کہہ کر روما پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گل جان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے اگرچہ اس نے چاہا تھا کہ روما کے سامنے کمزور نہ پڑے اس کی آنکھیں نہ بھیگیں...... مگر روما کی بات سن کر اس کے دل پر زبردست چوٹ پڑی تھی، اختیار کھو بیٹھی تھی۔ بھرّائی ہوئی آواز میں صرف اتنا بولی۔
''بیٹا بارہ برس بعد تو گھوڑی کے دن بھی پھرتے ہیں، یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ جو آج ہے وہ ہمیشہ ایسا رہے گا۔ تم اپنا مقدر لکھوا کر لائی ہو، ضروری نہیں جو رابی کا، میرا تمہاری اماں جان کا مقدر تھا وہ تمہارا بھی ہو، ہر بچہ اپنا نصیب لکھوا کر لاتا ہے۔'' وہ روما کو سمجھانے کے انداز میں کہہ رہی تھی۔
''یہ بھی تو ہوسکتا ہے خالہ جان میرا مقدر سب سے زیادہ خراب ہو۔'' روما ہچکیاں روک کر بولی۔
گل جان نے دہل کر روما کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا...... کائناز آگے بڑھی اور روما کو گل جان سے الگ کرنے لگی۔
''کیا بے وقوفی کر رہی ہو روما، خالہ جان تو خود پہلے ہی اتنی پریشان ہیں، تم ایسی باتیں کر کے انہیں مزید پریشان کرو گی۔ خدانخواستہ ان کی بھی طبیعت خراب ہو گئی تو پھر کیا ہوگا۔ خود کو سنبھالو۔''
''ماشاء اللہ تم چھوٹی سی عمر میں کتنی سمجھدار ہو کائناز...... اسے بھی کچھ عقل کی باتیں سمجھاؤ، یہ تو بچوں سے بھی گئی گزری ہے۔ ایسی الٹی سیدھی باتیں کرتی ہے کہ دل بیٹھ، بیٹھ جاتا ہے۔ میں دعائیں مانگ، مانگ کر تھک گئی ہوں کہ یا اللہ اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے، یا اللہ اس کے حال کو بدل دے۔'' گل جان نے کائناز کی طرف دیکھا اور بڑے شفیق لہجے میں بولی۔
''خالہ جان بس آپ اپنے آپ کو ایسے ہی بہلاتی رہیں، کہاں سے آئیں گی خوشیاں؟ اب تو رابی آپا بھی اس گھر سے چلی گئی ہیں، ساری زندگی کے لیے مسئلہ چھوڑ کر...... اب ہمارا کام ہی کیا رہ گیا ہے۔ بس بیٹھ کے روتے رہیں گے۔'' روما کہہ رہی تھی۔ کائناز نے پیار بھرے انداز میں ایک دھپ روما کی کمر پر لگائی۔
''تمہیں سمجھ نہیں آرہی، اپنی پریشانی کم کرنے کے بجائے خالہ جان کی پریشانیاں بڑھا رہی ہو، کیوں مایوس کر رہی ہو، خود بھی حوصلہ کرو اور خالہ جانی کو بھی حوصلہ دو۔''
''کہاں سے لاؤں حوصلہ؟ کسی اچھی خبر کی امید بھی تو ہو۔ دیکھ تو رہی ہو، کیا ہو رہا ہے اس گھر میں۔'' روما نے اپنے آنسو پونچھے اور کائناز کی طرف دیکھا۔ گل جان نے روما کا بازو پکڑا اور اپنے سینے سے لگالیا۔
''بیٹا کیا خبر کل کچھ اچھا ہو جائے۔ رابی کو تلاش تو کر رہے ہیں اور تمہیں پتا ہے، تمہاری اماں جان کا بڑا اثر رسوخ ہے، انہوں نے پورے ملک میں ٹیلیفون گھما دیے تھے۔ آج کل میں رابی کا پتا چل جائے گا، انشاء اللہ۔''
''بس بھی کریں خالہ جان اب تو ہم خود کو بہلا بہلا کر بھی تھک گئے۔ آج تک اس ملک میں کسی مجرم کو سزا ہوتے دیکھی ہے آپ نے، کوئی سچ مچ کا مجرم پکڑا ہوا دیکھا ہے، خبریں آجاتی ہیں کہ مجرم پکڑا گیا اگر پکڑ لیتے

ہیں تو سزا کیوں نہیں دیتے ہیں، کچھ نہیں ہوتا یہاں، فضول میں اپنے آپ کو بہلانا اور سمجھانا ہے۔"

"خدا کے لیے خالہ جان کا پیچھا چھوڑو، چلو آؤ میرے ساتھ تمہیں میں کچھ کھلاتی ہوں، تمہارا نوکر بتا رہا تھا کہ تم رات سے بھوکی بیٹھی ہو، چلو آؤ۔" کائناز نے اب روما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بہت دلسوزی سے گویا ہوئی اور پھر گل جان کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"خالہ جانی، دادا جان بھی آ گئے تھے۔ میں تو کالج گئی ہوئی تھی اور کالج سے میں نے روما کو فون بھی کیا تھا مگر اس کا سیل فون آف تھا تو میں سمجھ گئی کہ شاید یہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی سو رہی ہوگی اس لیے میں نے لینڈ لائن نمبر پر فون نہیں کیا وہ تو جب میں گھر آئی تو پتا چلا کہ روما نے دادا جان کو فون کیا تھا اور دادا جان، روما کے پاس ہیں، بس میں بھی کپڑے چینج کر کے یہاں آ گئی اگر آپ کو اسپتال میں رہنا ہے اور آنٹی کو آپ کی ضرورت ہے تو آپ بڑی بے فکری سے وہاں رہ سکتی ہیں، میں اور دادا جان، روما کے پاس ہیں۔"

گل جان نے کائناز کی طرف دیکھا، بزرگوں کے انداز میں تسلی دیتی ہوئی کم عمر اور معصوم سی لڑکی جیسے گل جان کے دل میں اتر گئی۔ اسے یوں لگا کہ جیسے اس بحرانی وقت میں ان دادا پوتی کا وجود کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔

"جیتی رہو بیٹا...... اللہ تمہیں ہر طرح کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔" وہ آگے بڑھی اور اس نے کائناز کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اب وہ تینوں اندر کی طرف جا رہی تھیں۔ جہاں شاہ عالم ان کا انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆

برہان اپنے کلاس فیلو اور اپنے بہترین دوست نعمان کے ساتھ اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا بات کر رہا تھا۔ وہ نعمان کو اپنا سارا دکھ درد کہہ کر ہلکا ہو گیا تھا۔ نعمان کے چہرے پر دوست کے لیے ہمدردی، اپنائیت اور فکر مندی کے تاثرات نقش تھے۔ وہ ایک ٹک برہان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یار اس ملک میں تو پولیس افسروں کے بچے شہزادوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں، من مانیاں کرتے پھرتے ہیں یوں لگتا ہے کہ جیسے سارا شہر ان کی جیب میں ہو اور تم اپنے آپ کو دیکھو، کچھ بھی نہیں ہے تمہارے پاس، ایک چھت تھی وہ بھی نہیں رہی۔" چند لمحے سوچنے کے بعد وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

"لیکن میں ان میں سے نہیں ہوں نعمان جو خود پر ترس کھا کر زندگی گزار دیتے ہیں اور آتے جاتے لوگوں کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے ان میں سے کوئی نجات دہندہ کوئی فرشتہ نکل کر باہر آئے گا اور اس کے سارے مسئلے پلک جھپکتے میں حل کر دے گا۔ ایسا نہیں ہوتا میری امی کہتی ہیں ہنستے کے ساتھ دنیا ہوتی ہے رونے والا اکیلا ہوتا ہے، میں وہ اکیلا انسان بن کر اس دنیا میں زندگی نہیں گزاروں گا۔"

نعمان کی آنکھوں میں ستائشی تاثرات بہت واضح تھے۔ اب اس نے برہان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی بے ساختگی سے کہا تھا۔

"یار تمہاری باتوں نے تو مجھے ایک نئی سوچ دی ہے اور تمہاری خودداری نے مجھے متاثر کیا ہے، تمہیں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ زندگی کتنی مشکل ہے، تم تو جانتے ہی ہو میں چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں، سب لوگ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میری زندگی میں تو فی الحال کوئی مشکل نہیں آئی کہ کوئی مجھے حوصلے اور ہمت کا سبق دے لیکن تمہاری دوستی میں بہت جلدی میں نے بڑا قیمتی تجربہ حاصل کر لیا۔"

برہان بے معنی سے انداز میں مسکرایا۔

"ہاں نعمان، ہمیں زندگی فرمائش سے یا بھیک میں نہیں ملی ہے۔ میں کیوں کسی کو اتنا اختیار دوں کہ وہ

میری تمام صلاحیتوں کو زنگ لگا دے۔ مجھے جیتے جی مار دے اور میرے انسان ہونے کا حق چھین لے۔ سچی بات یہ ہے نعمان...... مجھے اپنی آخرت بھی بہت عزیز ہے۔ میں اپنے باپ کے سامنے ایک حد تک اپنی آواز بلند کر سکتا ہوں لیکن اپنے باپ کو باپ کے حق سے محروم کرنے کا حق نہیں رکھتا۔"

"ویری گڈ...... تمہاری سوچ بہت پوزیٹو ہے برہان......" نعمان نے بے ساختہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"بس اسی لیے میں اس گھر سے چلا آیا اگر امی کے سامنے نکلتا تو وہ جان دے دیتیں مگر مجھے گھر سے قدم باہر نہیں نکالنے دیتیں اور میں واضح طور پر سمجھ رہا تھا کہ میں ابا جان کو نہیں روک سکتا، نہیں روک پاؤں گا، آخر میں ان کا بیٹا ہوں کیونکہ میں ان کے مزاج کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں، وہ فارمیلٹی کی حد تک تو صلح مشورہ کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنا ذہن پہلے ہی بنا چکے ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اس لیے میں نے وہ گھر چھوڑ دیا۔ جب میں ابا جان کے کسی عمل کو روکنے کی طاقت، قدرت نہیں رکھتا اور آخرت کا خوف مجھے باپ کے ساتھ انتہا پر جانے سے منع کرتا ہے تو میرا اپنی ماں بہنوں کے سامنے رہنا بڑا بے معنی سا ہے۔ میں کیوں ان کو جھوٹی آس دلاؤں کہ جوان بیٹا اور جوان بھائی ان کے ساتھ ہے جبکہ میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"برہان تمہارے حالات سن کر اتنا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اگر تم خود نہ نکلتے تو نکال دیے جاتے۔" نعمان نے بہت آہستہ آواز میں اپنے دل کی بات برہان تک پہنچائی تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو نعمان لیکن میں سچ مچ اپنی مرضی اور اپنے فیصلے سے گھر سے نکلا ہوں، اس خوف سے نہیں کہ میں نکال دیا جاؤں گا کیونکہ میرا باپ بری طرح سے نکالتا تو میری ماں مرجاتی۔"

"تم نے اپنی امی کو فون کر کے بتا دیا کہ تم خیریت سے ہو؟" برہان، نعمان کی یہ بات سن کر چونک پڑا اور اس کی توجہ اپنے موبائل کی طرف گئی جو ابھی تک بند تھا۔

"نہیں، میں نے جان بوجھ کر انہیں فون نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرے اندر حوصلہ نہیں ہو رہا کہ میں اپنی ماں کو کہوں کہ اب میں اس گھر میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ وہ میرا انتظار نہ کریں۔"

"لیکن برہان اتنا تو سوچو ماں پر کیا بیت رہی ہوگی، کم از کم انہیں یہ اطلاع تو ضرور پہنچ جانی چاہیے کہ تم خیریت سے ہو الحمدللہ۔"

"ہاں صبح، صبح مجھے خیال آیا تھا پھر میں نے سوچا تھا کہ گھر والے سمجھ رہے ہوں گے میں بغیر بتائے یونیورسٹی کے لیے نکل گیا ہوں لیکن امی کو پتا ہے کہ میں امی کو بتائے بغیر گھر سے نہیں جاتا۔"

برہان نے یہ بات خود کلامی کے انداز میں کہی تھی۔

"تو پھر دیکھو ناں ماں کتنی پریشان ہوگی۔ تم آنٹی کو فون کر کے بتاؤ کہ تم میرے پاس ہو اور تم نے ناشتا بھی کر لیا ہے اور دوپہر کا کھانا بھی کھالیا ہے۔"

"میں اس ردِعمل کو کیسے فیس کروں گا جب امی سنیں گی کہ میں نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے، کہیں انہیں کچھ ہو نہ جائے۔" برہان چند لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ بہت اندیشے اور وسوسے اس کے لفظوں میں سرائیت کیے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"اگر تم انہیں بتا دو گے ناں تو انشاء اللہ وہ خود کو سنبھال لیں گی اگر تمہاری طرف سے انہیں کوئی اطلاع

نہیں گئی تو خدانخواستہ انہیں کچھ ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، میں امی کو فون کرتا ہوں۔" موبائل جیب سے نکالتے ہوئے برہان نے الجھی الجھی کیفیت میں نعمان کو تسلی دی تھی کہ وہ اس کی بات مان رہا ہے۔ اس نے اپنا موبائل نکال کر آن کیا۔

نعمان جان بوجھ کر وہاں سے اٹھ گیا تاکہ وہ اپنی ماں سے کھل کر بات کرے۔

☆☆☆

صابرہ اپنے بستر سے اٹھ چکی تھی لیکن کمرے میں اس طرح سے ٹہل رہی تھی جیسے وہ کسی بجلی کے تار سے بندھی ہوئی ہو اور برقی رو اُسے اِدھر سے اُدھر دوڑا رہی ہو، ٹہلتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ بھی مسلتی جارہی تھی۔ بڑی اضطراری کیفیت تھی۔ شبینہ اس کے لیے فریش جوس نکال کر لائی تھی کیونکہ گھنٹوں گزر گئے تھے اور صابرہ کے منہ میں کوئی کھیل تک نہیں گئی تھی۔

"امی میری چھوٹی سی بات مان لیں، اس کے بعد میں آپ سے ضد نہیں کروں گی، بس یہ جوس پی لیں۔ دیکھیں امی جس طرح بھائی جان آپ کے لیے ضروری ہیں اسی طرح آپ بھی ہمارے لیے ضروری ہیں، ہمارا بھی تو خیال کریں ناں!"

صابرہ نے دونوں ہاتھ بلند کیے اور انکار کے انداز میں ہلانے لگی۔

"خدا کے واسطے شبینہ چلی جاؤ یہاں سے مجھے اکیلا چھوڑ دو، میں، میں اپنے حواسوں میں نہیں ہوں، میرا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا۔ بیٹا بھوک محسوس ہو تو منہ میں کچھ ڈالوں ناں میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں مجھے بھوک پیاس کچھ نہیں لگ رہی...... بلکہ مجھے تو کسی چیز کا بھی احساس نہیں، ڈر، خوف، بھوک، پیاس سب سے میری جان چھوٹ گئی ہے، میرا ذہن تو صرف اپنے بچے میں لگا ہوا ہے۔ اب مجھے مزید نہ ستاؤ۔" اسی وقت فون کی گھنٹی بجی صابرہ کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اس نے شبینہ کی طرف بڑی بے ساختگی سے دیکھا تھا۔

"جلدی سے جاؤ، دیکھو شاید برہان کا فون ہے۔" شبینہ ایک سائڈ پر رکھی ہوئی چھوٹی سی ٹیبل پر جوس کا گلاس رکھ کر دوڑ گئی۔

ستارہ اپنے کمرے میں تھی۔ فون تو وہ بھی دیکھ سکتی تھی لیکن بے صبری اور بے قراری نے شبینہ کے پیروں میں بجلیاں سی باندھ دی تھیں۔ اس نے بھاگ کر ریسیور اٹھالیا تھا۔ دوسری طرف سے واقعی برہان بات کر رہا تھا۔

"بھائی جان آپ خیریت سے تو ہیں ناں؟ آپ بغیر بتائے کہاں چلے گئے امی اس وقت...... امی اس وقت بہت زیادہ پریشان ہیں، یوں سمجھیں کہ وہ اس وقت اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی ہیں، کسی کی بات نہیں سن رہیں۔ صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ آپ کو امی کا خیال تو کرنا چاہیے تھا۔ امی کو تو بتا کر چلے جاتے۔" شبینہ کو تو جیسے ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ وہ ایک سانس میں بولتی چلی گئی۔

صابرہ کے کان تو جیسے آنے والی فون کال پر ہی لگے ہوئے تھے۔ جیسے ہی اس نے شبینہ کے منہ سے یہ الفاظ سنے اور اسے یقین ہوا کہ واقعی شبینہ کی بات برہان سے ہو رہی ہے۔ وہ دیوانہ وار، بھاگتے ہوئے باہر آئی تھی اور اس نے جھپٹ کر شبینہ کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا تھا۔

"برہان، میرا بچہ، ماں صدقے، ماں واری، بیٹا...... بیٹا ماں سے اتنی ناراضی کہ مرنے کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔" اس نے اتنی بے ساختگی اور بے ربطی سے بات کی تھی کہ برہان کے ذہن سے تمام الفاظ پرندوں کی طرح اُڑنے لگے اور اسے لفظوں کو سنبھالنا، پکڑنا، ترتیب دینا دشوار ہو گیا سمجھ ہی نہیں آئی کہ بات کس طرح

سے شروع کرے۔

''بیٹا چپ کیوں ہو؟ بات کیوں نہیں کرتے۔''

''امی میں بالکل خیریت سے ہوں، ٹھیک ٹھاک ہوں، آپ یقین کریں میں آپ سے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں نے ناشتا بھی کیا تھا اور میں نے دوپہر کا کھانا بھی کھالیا اور اب اپنے دوست کے گھر بیٹھ کر بہت آرام سے آپ سے بات کررہا ہوں، آپ خود کو سنبھالیں کیونکہ آپ صرف میری ہی نہیں شبینہ اور ستارہ کی بھی ماں ہیں، میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں آپ کے لیے اپنی بہنوں کے لیے کچھ نہیں کرسکتا اس لیے امی کہ جو آپ نے مجھے تعلیم دی ہے کہ باپ کی ناراضی خدا کی ناراضی ہے، میرا باپ اپنے عمل کا جواب دے گا اور میں اپنے عمل کا، میں جوان بیٹا ضرور ہوں مگر زندہ باپ کے ہوتے ہوئے ان کی جگہ نہیں لے سکتا میں ایک حد تک ان کو روک سکتا ہوں مزاحمت کرسکتا ہوں لیکن خدانخواستہ ان کا اٹھتا ہوا ہاتھ نہیں روک سکتا اور نہ خود ان پر اپنا ہاتھ اٹھا سکتا ہوں، میرے ہوتے ہوئے بھی ابا جان کے فیصلے پر عمل درآمد ہونا تھا اور میرے نہ ہونے کے بعد بھی انہی کا فیصلہ صادر ہوگا۔'' صابرہ آنکھیں پھاڑے برہان کی بات یوں سن رہی تھی جیسے برہان کی طرف سے لفظ نہ آرہے ہوں کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اتارا جارہا ہو۔

''بیٹا ماں کا ذرا خیال نہیں کیا، یہ نہیں سوچا ماں پر کیا بیتے گی' ماں پر کیا گزرے گی۔''

''امی آپ کو مزید مشکلوں میں ڈالنے سے بچانے کے لیے میں نے وہ گھر چھوڑا ہے۔ میں بزدل نہیں ہوں، بے ہمت بھی نہیں ہوں لیکن میں کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ سامنے باپ ہے، کوئی غیر ہوتا تو اچھی طرح پوچھ لیتا۔''

''بیٹا بس کرو، ماں پر رحم کردو، ذرا سوچو ماں تمہارے بغیر کیسے وقت گزارے گی، جوان بیٹے سے بڑی آس بڑی امید ہوتی ہے، بڑا حوصلہ رہتا ہے، مجھ پر رحم کردو میرا بیٹا، رحم کردو اس ماں پر۔''

''امی میں نے آپ پر رحم ہی کیا ہے کیونکہ خدانخواستہ میری برداشت جواب دے جاتی تو ایک چھوٹی قیامت بڑی قیامت میں تبدیل ہوجاتی اور پھر کچھ ایسے نقصان بھی ہوسکتے تھے شاید جن کا ازالہ ہی نہ ہو پاتا۔ میری دنیا بھی برباد ہوجاتی اور آخرت بھی...... امی میں بالکل خیریت سے ہوں' ٹھیک ہوں، بھوکا پیاسا بھی نہیں ہوں اور میں اپنا کوئی آرام دہ ٹھکانا بنالوں گا ہوم ٹیوشن کر کے اپنا گزارہ کرلوں گا۔ آپ میری بالکل فکر نہ کریں اور میں آپ سے فون پر بات بھی کرتا رہوں گا، میں آپ سے دور نہیں ہوں امی۔'' برہان ماں کو بہلانے لگا۔

''نہیں بیٹا نہیں، میں کوئی بچی نہیں ہوں کہ تم مجھے بہلالو گے۔ ارے یہ ایک ماں کا دل ہے، اپنی اولاد پر نظر نہ پڑے تو چین قرار نہیں آتا۔ میں تو صبح، صبح تمہیں خدا حافظ کہتی ہوں تمہاری پیشانی چومتی ہوں تو سارا دن میرے اندر ایک قوت ایک طاقت دوڑتی رہتی ہے، میں گھر میں بھاگتے دوڑتے کام کرتے نہیں تھکتی اور ہر وقت گھر سے گئے بچوں کی آہٹوں پر میرے کان لگے رہتے ہیں، یہی تو میری زندگی ہے......'' صابرہ بلک بلک کر رو دی تھی۔

جاری ہے



بال و پر

شہناز وسیم

''ارے رخسانہ بھئی، کچھ لوگ ہمارے گھر ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آگئے ہیں۔ ذرا ان کا خیال رکھنا۔'' میرے میاں عزیز احمد کی خوشی سے چہکتی ہوئی آواز باہر برآمدے سے آئی۔ میں کمرے میں اپنی بچی کو فیڈر پلا رہی تھی۔ ان کی آواز سن کر لپک کر باہر آئی، انہوں نے مجھے کندھوں سے پکڑا اور برآمدے کے ستون سے لپٹی اوپر جانے والی پھولوں کی بیل کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ دیکھو۔'' میں خوش ہو کر وہ منظر دیکھنے لگی پھر مڑ کر اپنے میاں سے کہا۔

''ارے اس کی تیاریاں تو میں دس پندرہ دن سے دیکھ رہی ہوں۔'' وہ بہت محنت، لگن اور پیار سے اپنا گھر بنا رہی تھی۔ دن میں سیکڑوں بار وہ باہر جاتی اور اندر آتی ہر مرتبہ اس کی چونچ میں گھاس پھونس یا تنکا ہوتا اور آج گھر مکمل ہو چکا تھا۔ وہ بڑے مزے سے اپنے چڑے کے ساتھ اِدھر اُدھر چنبیلی کی بیل پر رقص کرتی پھر رہی تھی اس کو لبھا رہی تھی۔ اس کی چہکار سے میں سمجھ رہی تھی کہ وہ بہت خوش ہے...... بہت ہی زیادہ خوش تھی اپنا گھر بنا کر۔ وہ اپنے چڑے سے یقیناً یہی کہہ رہی ہوگی کہ ہم اپنے گھر میں بہت پیار سے رہا کریں گے۔ ہمارے بچے ہوں گے انہیں ہم بہت پیار سے پالیں گے۔ دونوں مل کر بچوں کے لیے کھانا لایا کریں گے۔ میں پُرخیال انداز میں بچوں کے لیے چڑیا، چڑے کی چہکار سن کر خوش ہو رہی تھی کہ میرے میاں نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے متوجہ کیا۔

''بھئی بہت ہی باذوق ہیں یہ چڑیا اور چڑے صاحب......! چنبیلی کی پھولوں سے لدی ہوئی بیل پر اپنا گھر بنایا ہے۔ تم ان کا خیال رکھنا۔ میں برآمدے کے دروں میں دو چھوٹی کونڈیاں لٹکا دوں گا تم یاد سے دانہ پانی ڈالتی رہنا۔ میں آج ہی باجرے اور کونڈیوں کا انتظام کرتا ہوں۔ تم صرف ان کا خیال رکھنا جو ہمارے ساتھ رہنے آگئے ہیں۔'' میں نے تائید میں گردن ہلا دی۔ میں بہت خوش تھی۔ خوشی کس طرح انسان کے خون میں گردش کرتی ہے۔ کس طرح جسم سے کرنوں کی طرح پھوٹتی ہے۔ اس کا مجھے صحیح صحیح اندازہ ہو رہا تھا۔ میرے میاں اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے تو میں نے ناشتے کے برتن سمیٹے اور برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پر بیٹھ کر دوپہر کے کھانے کے لیے سبزی بنانے لگی یہاں سے چڑیا کا گھونسلا صاف نظر آرہا تھا۔ جو لمحہ لمحہ نگرانی کے لیے بہت خوب تھا۔

☆☆☆

مجھے اس گھر میں آئے پانچ سال ہوئے تھے۔ میرے میاں جانی عزیز احمد بہت پیار اور عزت سے مجھے بیاہ کر اس گھر میں لائے تھے اور اپنے پیارے سے گھر کی یہ چھوٹی سی راجدھانی مجھے سونپ کر بے فکر ہو گئے تھے۔ میں یہاں سیاہ سفید کی مالک بنی ہوئی تھی، وہ کسی کام یا چیز میں کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ یہ گھر ان کے ماں باپ کا تھا وہ اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ ایک بہن تھی جس کی شادی ہو چکی تھی وہ جب بھی آتی مجھے بے حد خوشی ہوتی۔ میرا دل چاہتا وہ ابھی نہ جائے بہت سارے دن میرے پاس رہے مگر میری ہی طرح اسے بھی اپنے گھر میاں اور بچوں سے بے حد پیار تھا۔ وہ تھوڑے دن رہ کر ہی واپس چلی جاتی۔ مجھے اپنی نند نگہت سے بے لوث محبت تھی۔ ایک تو وہ تھی ہی بہت اچھی...... دوسرے مجھے ہر اس چیز سے بے حد پیار تھا جس کا تعلق میرے میاں جانی سے ہو اور نگہت سے میرے میاں کو بہت محبت تھی تو مجھے بھی وہ بہت لاڈلی تھی، دراصل مجھے اللہ میاں نے جس پیار اور محبت کی مٹی سے بنایا تھا اسی کا اثر تھا کہ میرے خون کے ہر قطرے میں محبت اور خلوص ہر شے کے لیے تیرتی پھرتی تھی۔ مجھے اپنے گھر کے کاموں سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ جب میں اپنے گھر، اپنی بچی اور اپنے میاں کا کام کرتی تو میرا انہماک دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے لگتا میں کام نہیں بلکہ عبادت کر رہی ہوں اور میرے شوہر عزیز تو تھے بھی بہت اچھے...... بہت اچھے اور نیک اطوار کے حامل، سب کا خیال رکھنے والے، سب کے کام آنے والے۔ گفتار کے غازی کردار کے دھنی والا حساب تھا۔ لوگ عزیز کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ وہ جب بھی کسی سے بات کرتے تھے تو مخاطب کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اسی

کے ہیں۔ اسی لیے جب انہوں نے یہ بتایا کہ کچھ لوگ ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آگئے ہیں ان کا خیال رکھنا تو مجھے اپنے شوہر پر بڑا فخر محسوس ہوا کہ وہ اللہ کی مخلوق سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ میں نے چڑیا اور چڑے کا دل وجان سے دھیان رکھنا شروع کردیا۔ ان کے دانے پانی کی خبر رکھتی۔ مجھے ایسا لگتا جیسے چڑیا اور چڑا بھی میرے گھر میں خوش ہیں۔

☆☆☆

گرمی اپنے عروج پر تھی حبس کا عالم تھا۔ میں کھانا پکا کر فارغ ہوئی تو برآمدے میں آگئی۔ نہ جانے کہاں سے کالی، کالی گھٹاؤں نے آکر پورا آسمان ڈھک دیا لگتا تھا جل تھل ہونے ہی والی ہے۔ میں نے چنبیلی کی بیل کی طرف دیکھا۔ چڑیا بڑے مزے سے گھونسلے کے منہ پر بیٹھی تھی وہ آسمان کو تک رہی تھی۔ لگتا تھا موسم کا البیلا پن اسے بھی اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ اس نے اپنے پروں کو پھلایا ہوا تھا۔ گول مٹول سی ہو رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں اس کے بدن میں ایک حرکت سی ہوتی اور وہ ''چوں'' کرکے اپنی دلکش راگنی سے فضا میں جلترنگ سا بجادیتی۔ چنبیلی کے پھولوں کی مسحور کن مہک، چڑیا کا چہچہانا، آسمان سے ٹپ ٹپ موٹی موٹی بوندوں کا گر کر زمین میں جذب ہوکر مہکنا، مجھے مکمل طور پر اپنے سحر میں گرفتار کرچکا تھا۔ کسی شاخ کے پتوں سے نکل کر چڑا اپنی چڑیا کے پاس آبیٹھا۔ دونوں نے مل کر اپنی چہکار سے فضا کا سکوت توڑ دیا تھا۔ مجھے ان دونوں پر بے حد پیار آیا پھر وہ دونوں نیچی پرواز کرکے پانی کی کونڈی کے کنارے پر بیٹھ گئے اور پھر اندر اتر کر نہانے لگے اور اس قدر پانی کی چھینٹیں اُڑائیں کہ نیچے کا سارا فرش گیلا ہوگیا۔ وہ دونوں بے حد خوش تھے ایک شاخ سے دوسری شاخ تک اڑان بھر رہے تھے۔ وہ اپنے چڑے کو بھرپور ادائیں دکھا رہی تھی۔ اسے لُبھا رہی تھی اور وہ بھی اس کی محبت میں سرشار لگتا تھا۔ اچانک میرے میاں کی دلکش آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''بھئی لگتا ہے ان دونوں میں بھی اتنا ہی پیار ہے جتنا کہ ہم دونوں میں۔'' میں نے مڑ کر دیکھا نہ جانے کب سے عزیز احمد میرے پیچھے کھڑے ہوکر اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

☆☆☆

دن دبے پاؤں گزرتے رہے، ہم دونوں کو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ آتے جاتے چنبیلی کی بیل پر نگاہ ضرور جاتی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

فجر کی اذان کے ساتھ ہی میری آنکھ کھلی۔ میں نے بچی کو الگ کرکے دھیرے سے بستر چھوڑ دیا۔ ابھی میں وضو ہی کر رہی تھی کہ عزیز نے مجھے آواز دی۔

''رخسانہ ذرا باہر آنا۔'' میں برآمدے میں آگئی۔

''دیکھو تو ذرا غور سے سنو، لگتا ہے کئی ننھے مہمان دنیا میں آچکے ہیں۔ سن رہی ہوناں۔ یہ معصوم آوازیں۔'' یہ آوازیں گھونسلے سے آرہی تھیں میں خوشی سے بے تاب ہوکر اور دیوانہ وار آگے بڑھی۔

شی.....ش شی، ابھی نہیں۔ ابھی ان کے ماں باپ کو خوش ہونے دو۔ وہ ہم دونوں سے زیادہ خوش ہوں گے۔'' میں نے بہ مشکل خود کو روکا پھر مجھ سے صبر نہ ہوا فوراً زینہ چڑھ کر اوپر گئی وہاں سے گھونسلے کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے دیکھا بغیر پروں کی چھوٹی چھوٹی گلابی رنگ کی بوٹیاں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں اور وہ، بہت پیار سے اپنی چونچ کی مدد سے ان کو سنبھال رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ممتا کا فخر تھا، اپنی متاعِ جان کو وہ دنیا کی نظروں سے چھپا کر اپنے پروں کے اندر سمیٹ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ چڑیا نہیں، میں ہوں۔ میں بھی تو اپنی بچی سے اتنا ہی پیار کرتی ہوں۔

بچوں کی وجہ سے ان کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ ایک، ایک لمحے میں وہ دونوں باری باری باہر جاتے

اور آتے۔ بچوں کے لیے کھانا لے کر آتے۔ جیسے ہی وہ گھونسلے میں آتے گھونسلے کے اندر کی دنیا میں ہلچل مچ جاتی...... آوازوں سے بھر جاتی، پیلی پیلی باچھوں والی منی منی چونچیں اسپرنگ کی طرح اوپر نیچے گردش میں آجاتیں۔

میرا کام بھی بڑھ گیا تھا۔ بار بار زینہ چڑھ کر اوپر جاتی اور انہیں دیکھتی۔ شام کو سارے دن کا احوال میاں کے گوش گزار کرتی۔ وہ بھی بہت دلچسپی اور توجہ سے سنتے۔ کئی سوال کرتے جن کے میں جواب دیتی۔ جیسے جیسے وقت گزرا ان کے جسم بڑے ہونے لگے۔ ان کی ماں انہیں اتنا کھلاتی کہ ان کے پھولے ہوئے پیٹ کی کھال تنی ہوئی نظر آتی تھی غرض یہ کہ پورا خاندان خوش نظر آتا۔

ایک دن میں دوپہر کا کھانا بنا رہی تھی کہ اچانک میرے پیر کے پاس کوئی شے آکر گری، جھک کر دیکھا تو چھوٹے چھوٹے پروں میں چھپا چڑیا کا بچہ تھا۔ وہ اسے اُڑنا سکھا رہی تھی ظاہر ہے ابھی بچوں کے پاس مہارت نہیں تھی اس لیے بار بار گر رہے تھے۔ وہ یہ عمل روز دُہراتی، بچے اب اچھی اڑان بھرنے لگے تھے۔ ایک دن مجھے نہ جانے کیا شرارت سوجھی میں نے بچوں کو پکڑ کر لال، پیلا اور ہرا رنگ ان پر مل دیا تاکہ مجھے پہچان رہے کہ اتنی بہت سی چڑیوں کے جھنڈ میں یہ ہماری چڑیا کے بچے ہیں۔ ایک صبح جب میں بیدار ہوئی تو چڑیا اور چڑا دونوں بہت اداس گھونسلے کے پاس بیٹھے تھے۔ کبھی اس شاخ پر بیٹھتے کبھی اس شاخ پر۔ ان کے اڑنے میں بے چینی صاف عیاں تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا بچے کہیں بھی نظر نہیں آئے۔

لاکھ چاہو مگر پھر وہ رکتے نہیں
جن پرندوں کے بھی بال و پر آگئے

ننھے پنچھیوں نے گھونسلا چھوڑ دیا تھا اور ایک نئی دنیا دریافت کرنے کے لیے اڑان بھر چکے تھے۔ نئی محبتوں اور نئے ساتھیوں کی تلاش میں نکل چکے تھے۔ میں دل گرفتہ ہوکر نیچے اتر آئی۔ گیٹ کے سامنے اندر کی جانب پوسٹ مین خط ڈال کر چلا گیا تھا۔ یہ میری اماں کا خط تھا، فون اور انٹرنیٹ کی سہولت کے باوجود میری اماں آج بھی مجھے خط لکھتی تھیں۔ میں نے کمرے میں جاکر خط کھولا جیسے جیسے میں خط پڑھتی گئی میری آنکھوں کے کٹورے بھرتے چلے گئے۔ اماں نے شکوہ کیا تھا۔

''پیاری بیٹی رخسانہ!

نئی دنیا میں مگن ہوکر شوہر، بچی اور گھر کو پاکر تم اپنی ماں کو بھول گئیں جس کی آنکھیں آج بھی تمہیں ڈھونڈتی ہیں جس کے لب پر آج بھی تمہارے لیے دعاؤں کے خزانے ہیں۔'' میں نے اپنی بچی کو اٹھا کر کلیجے سے لگالیا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگی۔

ابھی تو یہ میرے پاس ہے جب اس کے بال و پر آجائیں گے تو یہ بھی مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی اپنے جیون ساتھی کی محبت میں مجھے بھلادے گی، ایک نئی دنیا کی تلاش میں ہم دونوں کو چھوڑ جائے گی، ایک نئی محبت دریافت کرنے کے بعد ہمیں فراموش کردے گی۔ میں نے کھڑکی پر بیٹھی چڑیا کو دیکھا مجھے اپنی ماں اور چڑیا کا غم ایک سالگا۔

⚹

عورت کیا ہے......؟

☆ ماں کے روپ میں رحمت ہے۔
☆ بہن کے روپ میں شرافت ہے۔
☆ بیٹی کے روپ میں باوفا دوست ہے۔
☆ ویرانے میں چمن ہے۔
☆ اندھیرے میں نور اور روشنی میں امید کی کرن ہے۔
☆ بیوی کے روپ میں شوہر کا سکون ہے۔

مرسلہ: ہانیہ عزیز، کراچی

ناولٹ

کہیں دیپ جلے کہیں دل

قیصرہ حیات

آٹھواں حصہ



ماں جی، بیٹا، بہو کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا کرنے میں مصروف تھیں۔ ماں جی بہت محبت سے ردا کی طرف دیکھ رہی تھیں اور چیزیں اٹھا اٹھا کر اس کے آگے کر رہی تھیں۔

”بہو کی خوشی میں ماں جی نے مجھے بھلا دیا ہے، ایک بار بھی کچھ نہیں پوچھ رہیں۔“ روحیل نے مسکرا کر ردا کی طرف دیکھ کر شکایتی لہجے میں کہا۔

”ہاں...... بیٹا یہ تو ہے، اپنی، اپنی اہمیت کی

بات ہوتی ہے اور میری بہو اب میرے لیے تم سے بھی زیادہ اہم ہے۔'' ماں جی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ماں جی......!'' روحیل نے مصنوعی خفگی سے کہا تو تینوں مسکرانے لگے۔

''بیٹا...... ابھی تم دونوں ردا کی مما کے گھر چلے جاؤ، ویسے کے بعد یہ بھی ایک رسم ہوتی ہے اور میں نے ردا کی مما سے وعدہ کیا تھا کہ صبح تم دونوں کو بھیج دوں گی۔'' ماں جی نے روحیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نہیں...... مما...... مجھے یوں جانا پسند نہیں۔'' روحیل نے خفگی سے منہ بنا کر کہا۔

''بیٹا...... ان کی خوشی کی خاطر تم آج چلے جاؤ اور کل میں، فضیلت اور عبید کے ساتھ تمہیں لینے آجاؤں گی۔'' ماں جی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تو کیا مجھے رہنا بھی پڑے گا اور آپ گھر میں اکیلی......؟ نہیں، نہیں...... میں نہیں جاؤں گا، یہ کہاں ہوتا ہے ماں جی؟'' روحیل نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

''فضیلت میرے پاس ہی ہوگی...... اور تمہیں ہر حال میں جانا ہوگا۔ یہ میرا حکم ہے۔'' ماں جی نے ٹھوس لہجے میں کہا تو ردا خاموشی سے دونوں کی باتیں سنتی رہی۔

''اگر نہ گیا تو......؟'' روحیل نے منہ بنا کر کہا۔

''پھر میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔'' ماں جی نے سخت لہجے میں کہا۔

''افوہ...... ماں جی۔'' روحیل نے جھنجلا کر جواب دیا۔

''بیٹا! ان رسموں میں بھی محبت ہوتی ہے، تم جاؤ اور دیکھنا وہاں تم کتنا انجوائے کرو گے۔'' ماں جی نے مسکراتے ہوئے کہا تو روحیل بھویں چڑھانے لگا۔ ماں جی اور ردا اسے دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

☆☆☆

بیٹی داماد کے آنے سے وہ سب گھر والے بہت خوش تھے۔ سب لوگ کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ردا نے فینسی سوٹ کے ساتھ جیولری پہن رکھی تھی اور ہلکے میک اپ میں بھی وہ بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔ سب لوگ کھانا کھاتے ہوئے ایک دوسرے سے مذاق کر رہے تھے۔ روحیل نے بار بار مسکراتے ہوئے ردا کو دیکھا تو شمیلہ معنی خیز انداز میں آنکھیں گھما کر انہیں دیکھنے لگی اور اس کے چہرے پر خفگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''میرے ساتھ تو بہت برا ہوا ہے۔ ردا میرے گھر کیا گئی ہے، میری ماں جی نے تو مجھے بھلا ہی دیا ہے۔ انہیں تو یاد بھی نہیں کہ ان کا کوئی بیٹا بھی ہے۔ بس ہر وقت بہو یاد رہتی ہے۔'' روحیل نے مسکراتے ہوئے کہا تو ردا مسکرانے لگی۔

''ردا خوش قسمت ہے جسے آپ کی ماں جی جیسی ساس ملی ہیں۔'' خدیجہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو شمیلہ نے چونک کر سب کو دیکھا۔

''ہم نے ہمیشہ ردا کو ایک سوئٹ ڈول کی طرح ٹریٹ کیا ہے اور میری بہن نے بھی کبھی ہمیں مایوس نہیں کیا...... اس جیسی پیاری بہن شاید ہی دنیا میں کوئی ہو۔'' فہام نے مسکراتے ہوئے روحیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اور اس کا پلس پوائنٹ یہ ہے کہ اس نے ہماری محبت کو کبھی ایکسپلائٹ نہیں کیا۔ she is very humble and down to earth'' عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے، ارے یہ کیا آپ سب میری اتنی تعریفیں کیوں کر رہے ہیں۔'' ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میری گڑیا ہے ہی تعریف کے قابل۔'' فہام نے مسکراتے ہوئے کہا تو سب مسکرانے لگے۔

''شمیلہ...... اچھا سا قہوہ تو پلاؤ، ہم لوگ باہر لان میں بیٹھتے ہیں۔ آؤ بھئی روحیل!'' فہام نے

شمیلہ کی طرف دیکھ کر کہا پھر روحیل سے بولا۔

''ہاں بھائی آپ لوگ چلیں میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔'' روحیل بولا۔ جب وہ واش روم سے باہر نکلا تو شمیلہ قہوے کی ٹرے پکڑے باہر ہی جا رہی تھی۔ زاہدہ نے پہلے سے ہی قہوہ تیار کر لیا تھا۔

''آپ لوگ لکی ہیں، جنہیں ردا ملی ورنہ ہماری ردا کے پرپوزلز بھی بہت تھے اور چاہنے والے بھی بہت!'' معنی خیز انداز میں شمیلہ نے اس سے کہا تو روحیل چونک پڑا۔

''کیا مطلب......؟'' روحیل نے ایک دم مڑ کر شمیلہ کی طرف دیکھ کر کہا تو اسی وقت ردا مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔

''ارے، آپ کہاں رہ گئے بھائی بلا رہے ہیں۔'' ردا نے مسکراتے ہوئے روحیل کی طرف دیکھ کر کہا تو شمیلہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

روحیل نے چونک کر ردا کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ روحیل لان کی طرف چلا گیا تو ردا بھی پیچھے پیچھے چلی گئی۔

سب لوگ لان میں بیٹھے کافی دیر باتیں کرتے رہے اور قہوہ پیتے رہے مگر روحیل ذرا چپ چپ رہا۔

☆☆☆

کافی دیر بعد وہ لوگ اندر آئے، روحیل سلیپنگ ڈریس پہن کر واش روم سے باہر نکلا۔ ردا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی جیولری اتار کر اپنا میک اپ صاف کر رہی تھی...... روحیل کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ آکر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ردا نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں سے اسے دیکھا۔

''کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں، کھانا کھانے کے دوران تو آپ اچھے موڈ میں تھے اور اب......؟'' ردا نے سب کچھ چھوڑ کر اس کے قریب آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں...... بس یونہی......'' روحیل نے گہری سانس لے کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یونہی...... کیا مطلب......؟'' ردا نے چونک کر پوچھا۔

''سب لوگ تم سے کتنی محبت کرتے ہیں، سوچتا ہوں...... میں تم سے اتنی محبت کر پاؤں گا یا نہیں۔'' روحیل نے اپنی شرٹ کے بازو فولڈ کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی......؟ آپ اپنی محبت کا comparison کسی اور سے مت کریں۔ میرے لیے آپ کی محبت اور وں جیسی نہیں۔'' ردا نے مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' روحیل نے چونک کر پوچھا۔

''آپ کی محبت سب سے ڈفرنٹ اور منفرد ہے۔'' ردا مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیا مجھ جیسی محبت...... زندگی میں آپ سے کسی اور نے کی ہے؟'' روحیل معنی خیز انداز میں پوچھنے لگا۔

''کیا مطلب......؟'' ردا نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

''آئی مین کہ سب لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں، یہاں تک کہ اجنبی لوگ بھی...... اب مما نے بھی تو آپ کو پہلی ملاقات میں پسند کر لیا۔ آئی مین...... میرے علاوہ شاید کوئی اور بھی آپ کی زندگی میں آیا ہوگا۔'' روحیل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' ردا نے ایک دم بوکھلا کر حیرت سے کہا۔

''اِٹس نیچرل...... ہر لڑکی کی زندگی میں شادی سے پہلے کوئی نہ کوئی مرد ضرور ہوتا ہے۔ جسے وہ پسند کرتی ہے۔'' روحیل نے اس کی طرف بغور دیکھ کر کہا۔

''نہیں...... میری زندگی میں آنے والے پہلے

مرد صرف آپ ہیں اگر میں کسی کو پسند کرتی تو اس سے ضرور شادی کرتی کیونکہ میرے بھائیوں اور مما نے کبھی ..... مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔'' ردا نے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' روحیل نے چونک کر اسے دیکھا اور گہری سانس لی۔

''لیکن...... آپ کے ذہن میں یہ سب کیوں آیا؟'' ردا نے قدرے روہانسی ہو کر پوچھا۔

''یونہی...... آپ کے گرد اتنی زیادہ محبتوں کو دیکھ کر ویسے اگر آپ نے مائنڈ کیا ہے تو سوری۔'' روحیل نے ایک دم موڈ بدل کر مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' ردا نے مسکرا کر کہا۔

☆☆☆

فضیلت لاؤنج میں موجود بکھری چیزوں کو سمیٹ رہی تھی۔ ٹیبل پر پڑا ماں جی کا موبائل بجنے لگا۔

''آپا! روحیل کا فون آرہا ہے......'' فضیلت نے ماں جی کو آواز دیتے ہوئے کہا تو ماں جی جلدی سے لاؤنج میں آئیں۔

''روحیل بیٹا! خیریت تو ہے۔'' ماں جی نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ماں جی میں بہت بور ہو رہا ہوں۔ آپ کب ہمیں لینے آئیں گی؟'' روحیل نے منہ بنا کر جھنجلاتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں بور ہو رہے ہو...... بیٹا ہم لوگ شام کو آئیں گے۔'' ماں جی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا...... شام کو......؟ نہیں، نہیں آپ ابھی آئیں۔ میں بہت بور ہو رہا ہوں، ورنہ میں خود آجاتا ہوں۔'' روحیل نے خفگی سے کہا۔

''خبردار جو تم آئے...... کیا ایک دن بھی تم اپنی سسرال میں نہیں رہ سکتے۔ ردا کہاں ہے، اس کے ساتھ باتیں کرو۔'' ماں جی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اپنی مما کے ساتھ بزی ہے۔'' روحیل نے بتایا۔

''تو اس کے بھائیوں کے ساتھ گپ شپ کرلو، وہ لوگ کیا کہیں گے۔ عجیب بدتہذیب داماد ہے۔ بیٹا جہاں جاتے ہیں، وہاں کے طور طریقوں کے مطابق ٹائم گزارتے ہیں۔'' ماں جی اسے محبت سے سمجھانے لگیں۔

☆☆☆

کومل، یمنیٰ کو بار بار فون کر رہی تھی مگر یمنیٰ جان بوجھ کر اس کی کال نہیں اٹینڈ کر رہی تھی۔ اس نے کئی بار یمنیٰ کو فون کیا، رسپانس نہ ملنے پر اس نے حمنہ کو فون کیا۔

''حمنہ ڈیر! کیسی ہو یار......؟ میں یمنیٰ کو اتنی بار کال کر رہی ہوں مگر وہ میری کال نہیں لے رہی......'' کومل نے اس سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ بزی ہو گی......'' حمنہ نے آہستہ آواز میں بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''راکٹ کے ساتھ...... یار یہ راکٹ بھی کیا چیز ہے...... یمنیٰ جیسی sensible لڑکی کا دماغ ماؤف کر دیا ہے۔'' کومل نے ہنستے ہوئے کہا۔

''محبت کبھی ایسے ہی پاگل کر کے رکھ دیتی ہے۔ کومل...... کیا تمہیں کسی سے کبھی محبت نہیں ہوئی؟'' حمنہ نے جان بوجھ کر اسے کریدنا چاہا۔

''یار...... میں تو باز آئی اس اسٹوپڈ ایکٹویٹی سے...... پہلے اسٹڈیز کمپلیٹ کروں گی پھر سوچوں گی محبت کے بارے میں...... اگر ٹائم ملا تو۔'' کومل نے ہنستے ہوئے کہا تو حمنہ کے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے۔

''آزر تمہیں کیسا لگتا ہے؟'' اچانک حمنہ نے سوال کیا۔

''کون...... راکٹ......؟ ایک دم اسٹوپڈ یار...... اب پلیز یہ مت کہنا کہ کومل کیا تم اس سے محبت کرتی ہو...... !نیور...... ایور...... یار مجھے اس نے

کبھی بلک نہیں کیا اور ویسے بھی وہ یمنیٰ کے ساتھ کمیٹڈ ہے مجھے کیا ضرورت ہے دونوں کے درمیان آنے کی۔'' کومل اپنی ہی لے میں قدرے بے پروائی سے بولی تو حمنہ چونکی گویا اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا ہو۔

''اینی ویز...... میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے کہ میں آج رات پشاور جا رہی ہوں۔ ڈیڈی کی پوسٹنگ آگئی ہے اور انہیں وہاں فوراً چارج لینا ہے ویسے بھی کل سے کالج میں بھی چھٹیاں ہو رہی ہیں تو مما نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا ہے۔ آئی ایم ناٹ شیور ایگزامز کہاں سے دوں گی...... لیکن ہم سب جا رہے ہیں، یمنیٰ کو میرا اسلام دینا...... اس دن اس کا موڈ کچھ آف لگ رہا تھا۔ یار...... اسے کلیئر کرنا...... آئی ایم ویری فیئر پرسن...... او کے ٹیک کیئر......'' کومل نے مسکراتے ہوئے فون بند کیا تو حمنہ سوچ میں پڑ گئی۔

''کومل جھوٹ نہیں بولتی۔'' وہ بہت تھوڑے ٹائم کے لیے ان کے پاس آگئی تھی مگر اس نے اپنی اچھی باتوں اور عادتوں سے سب کے دل موہ لیے تھے۔ تمام کلاس فیلوز اور ٹیچرز بھی اسے پسند کرتے تھے۔ وہ لائق اسٹوڈنٹ ہونے کے علاوہ بہت خوش مزاج بھی تھی۔

''کومل نے کبھی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ وہ یمنیٰ کو ڈاج نہیں کر سکتی اور آزر کے ساتھ بھی کبھی اسے اتنا فرینک ہوتے نہیں دیکھا پھر آزر نے کیوں کومل کے بارے میں اتنی بڑی بات کہہ دی۔'' حمنہ کا دماغ سوچ سوچ کر تھک گیا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، کام کرتے، پڑھتے ہوئے اس کا ذہن انہی باتوں میں الجھا رہتا...... اور وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔

☆☆☆

کومل کا تعلق انتہائی بااثر فیملی سے تھا۔ اس کے فادر آرمی میں جنرل تھے، ایک چچا ڈی آئی جی پولیس اور ایک منسٹر جبکہ ایک ماموں بھی سول سرونٹ تھے۔ اس کے سب کزنز ایجوکیٹڈ اور انتہائی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اس کے نانا کی اپنی فیکٹری تھی...... اور وہ شہر کے کامیاب بزنس مین سمجھے جاتے تھے۔ کلاس کے اکثر اسٹوڈنٹس اس کے بیک گراؤنڈ سے متاثر تھے اور اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بہت باتیں ہوتی رہتی تھیں مگر کومل کو اس بات کا ذرا سا احساس برتری نہ تھا۔ وہ بہت نارمل رہتی اور ہر ایک سے اچھی طرح بات چیت کرتی۔ ان کا کالج شہر کا مہنگا ترین کالج تھا۔ اس لیے اس میں پڑھنے والے سب اسٹوڈنٹس زیادہ تر اچھی فیملیز سے آتے تھے۔

حمنہ کو اس کے جانے کا بہت افسوس ہو رہا تھا مگر اس سے زیادہ یہ افسوس تھا کہ آزر نے اس پر الزام لگایا تھا اور کومل اس الزام سے بالکل بے خبر تھی...... اور جاتے ہوئے یمنیٰ نے بھی اس سے بات نہیں کی تھی۔

☆☆☆

کالج میں اینول ایگزامز سے پہلے اسٹوڈنٹس کو پریپ لیو دے دی گئی تھی اور سب پڑھائی کرنے میں مصروف تھے۔ اس لیے ایک دوسرے سے ملاقات بھی کم ہو رہی تھی...... حمنہ کو کچھ نوٹس کی ضرورت تھی تو وہ یمنیٰ کے گھر آئی۔ وہ کچھ بجھی بجھی سی تھی اور آنکھوں میں شکوہ بھی تھا۔ وہ نوٹس لے کر جانے لگی تو یمنیٰ اس کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

''تم کچھ خفا خفا سی لگ رہی ہو، کیا بات ہے، طبیعت خراب ہے یا مجھ سے ناراض ہو......؟'' یمنیٰ نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''تم سے ناراض ہوں۔'' حمنہ نے صاف گوئی سے بتایا۔

''کیوں......؟'' یمنیٰ نے چونک کر پوچھا۔

''تم نے کومل کے ساتھ اچھا نہیں کیا...... وہ

اب ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی گئی ہے اور جانے سے پہلے وہ تمہیں فون کرتی رہی، تم نے اس کی کال ہی نہیں لی۔'' حمنہ نے خفگی سے جواب دیا۔

''میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے ڈاج کیا۔'' یمنیٰ غصے سے بولی۔

''یہ جھوٹ ہے، اس نے جاتے ہوئے بھی صاف گوئی سے مجھے بتایا کہ اس کا آزر کے ساتھ کوئی افیئر نہیں تھا۔'' حمنہ نے بتایا۔

''کیا تم نے اسے ساری بات بتادی۔ جو آزر نے مجھے بتائی تھی؟'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... میں نے indirectly پوچھا تھا مگر اس نے صاف انکار کردیا اور میرا خیال ہے کومل ٹھیک کہتی ہے۔'' حمنہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

''تمہارا خیال ہے آزر نے جھوٹ بولا؟'' یمنیٰ نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں......'' حمنہ نے قطعیت سے جواب دیا۔

''آزر مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا...... میں اس پر اپنے آپ سے بھی زیادہ ٹرسٹ کرتی ہوں۔'' یمنیٰ نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''تم اس کی محبت میں اندھی ہو رہی ہو۔ یمنیٰ اپنی آنکھیں کھولو آزر اتنا reliable بھی نہیں...... کیا تم وہ دن بھول چکی ہو جب آزر تم سے misbehave کرتا تھا۔'' حمنہ نے اسے یاد دلایا۔

''اور وہ اس کے لیے مجھ سے کئی بار معافی بھی مانگ چکا ہے۔'' یمنیٰ نے کہا۔

''تم آزر پر ٹرسٹ کر سکتی ہو...... میں نہیں۔'' حمنہ نے جواب دیا۔

''اس لیے کہ تم کومل پر زیادہ ٹرسٹ کرتی ہو۔'' یمنیٰ نے کہا۔

''ہاں اور کیا......'' حمنہ نے جواب دیا۔

''اگر میں تمہاری بات پر یقین کر بھی لوں تو ایک لمحے کے لیے یہ سوچو کہ آزر کو کومل پر اتنا بڑا الزام لگانے کی کیا ضرورت تھی؟'' یمنیٰ نے پوچھا۔

''اب اس بات کی حقیقت کیا ہے اور آزر ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نہیں جانتی مگر یمنیٰ اس نے ہم فرینڈز میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اگر آج اس نے کومل کے ساتھ کیا ہے کل کو وہ تمہارے ساتھ اور میرے ساتھ بھی ایسا کچھ کر سکتا ہے۔ کیا تم اس کی محبت میں مجھے بھی چھوڑ دو گی...... ؟ آنکھیں کھولو...... اور اس پر اتنا زیادہ ٹرسٹ مت کرو، مجھے تو آزر پر شدید غصہ آرہا ہے۔'' وہ غصے سے دانت کچکچا کر بولی تو یمنیٰ کو ایک دم اپنا خواب یاد آگیا۔

''آزر...... حمنہ...... اور وہ۔'' وہ حمنہ کی طرف بغور دیکھنے لگی جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''اب میں چلتی ہوں لیکن پھر بھی تمہیں کہوں گی کہ آزر پر اتنا اعتبار مت کرو......'' حمنہ نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ یمنیٰ اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

''جمال احمد، رشتہ بہت اچھا ہے۔ خاندانی لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں اور ہم کئی پشتوں سے انہیں جانتے ہیں۔ کیا تم نے یمنیٰ کو سمجھایا نہیں؟'' اماں جی نے بیٹے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا جو اس روز خود گاؤں چلے گئے تھے کہ اماں جی سے مل کر انہیں منع کر دیں گے۔

''نہیں...... میں نے یمنیٰ سے اس سلسلے میں بات ہی نہیں کی۔'' انہوں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔ پہلے یمنیٰ سے بات کیے بغیر رشتے کی بات نہیں چلائی اور اب اس سے بات کیے بغیر ہی رشتے کے لیے منع کر رہے ہو۔ آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟'' اماں جی نے خفگی سے پوچھا۔

''اماں جی، شاید وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ میں نے اسے باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ ایسے میں اس سے بات کرنا فضول ہے۔'' جمال احمد نے صاف گوئی سے بتایا تو اماں جی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''کیا یمنیٰ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟'' اماں جی حیرت سے بڑبڑائیں۔

''ہاں اور اس صورتِ حال میں لڑکی کے سامنے کسی بادشاہ کا بھی رشتہ رکھا جائے تو وہ کبھی ہاں نہیں کرے گی کیونکہ اس کے دل میں تو کوئی اور ہے اور میں یمنیٰ پر کسی قسم کی زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ زندگی اس کی ہے اور اس کو کیسے گزارنا ہے یہ بھی اس کا ہی فیصلہ ہونا چاہیے۔'' جمال احمد نے کہا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ بچے اتنے سمجھدار کب سے ہونے لگے کہ جو فیصلے کریں گے وہ ٹھیک ہوں گے۔ بیٹا بچے جذباتی ہوتے ہیں۔ ان کے پاس والدین کا تجربہ نہیں ہوتا۔ تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو جو یمنیٰ پر اتنا اعتبار کر کے اسے کھلی چھٹی دے رہے ہو۔'' اماں جی خفگی سے بولیں۔

''اماں جی، یمنیٰ بہت سمجھدار ہے۔ وہ کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کرے گی۔'' جمال احمد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''محبت بہت اندھی ہوتی ہے، بڑے بڑوں کی عقلوں پر پردے ڈال دیتی ہے اور تم اتنا اس پر اعتبار مت کرو۔ وہ ابھی بچی ہے اور اسے بچی ہی سمجھو۔'' اماں جی نے جمال احمد کو سمجھایا تو وہ خاموش ہو گئے اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

''بیٹا میں تو کہتی ہوں کہ تم ایک بار اس لڑکے سے ملاقات کرو جسے وہ چاہتی ہے، اس کا خاندان کیسا ہے اور وہ خود کیسا ہے پھر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرو۔ آج کل کے لڑکے لڑکیوں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ محبت کسی سے کرتے ہیں اور شادی کسی اور سے یہ نہ ہو کہ وہ ہماری بچی کا بھی وقت برباد کر رہا ہو۔'' اماں جی نے انہیں سمجھایا۔

''ٹھیک ہے، میں اس سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' جمال احمد نے جواب دیا۔

''اور میں بھی ابھی اس رشتے سے انکار نہیں کرتی۔ تمہارے جواب کے بعد پھر میں انہیں کوئی جواب دوں گی۔'' اماں جی نے کہا تو جمال احمد خاموش ہو گئے۔

☆☆☆

یمنیٰ نے ایگزامز کی تیاری کرنے کے لیے آزر سے بات چیت کافی کم کر دی تھی۔ رات بھر وہ زیادہ تر اپنی اسٹڈیز میں بزی رہتی۔ آزر کو یوں لگتا تھا جیسے یمنیٰ اس سے ناراض ہو گئی ہو۔ وہ جب بھی اس سے بات کرتا تو یمنیٰ اِدھر اُدھر کی سرسری سی باتیں کر کے ختم کر دیتی اور آزر کو بہت خفگی سی محسوس ہوتی۔ اسے نہ جانے کیوں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ یمنیٰ اس سے دور جا رہی ہے۔ یمنیٰ کے اس رویے کی وجہ سے وہ قدرے aggressive ہونے لگا تھا۔ اسے یہ شک سا ہونے لگا کہ کومل کی وجہ سے یمنیٰ اس پر اعتبار نہیں کر رہی اگرچہ یمنیٰ نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ صرف اسے کومل کے جانے کے بارے میں بتایا تھا اور وہ خاموش ہو گیا تھا۔

رات گہری ہو رہی تھی اور آزر کا پڑھنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹا یمنیٰ کے بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا۔ ایک دم ایک ابال سا اٹھا اور اس نے یمنیٰ کا نمبر ملایا۔ وہ پڑھنے میں مصروف تھی۔

''کیا کر رہی ہو؟ میں تمہیں کتنا مس کر رہا ہوں۔ تمہیں شاید اس کا اندازہ نہیں۔'' آزر نے قدرے جذباتی ہو کر کہا۔

''آزر پلیز ایگزامز ہونے والے ہیں مجھے اسٹڈی کرنے دو۔'' یمنیٰ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''ایگزامز، ایگزامز...... تم نے کیا پڑھائی کو سر پر سوار کر لیا ہے۔ زندگی میں اسٹڈی ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔'' آزر نے خفگی سے کہا۔

"لیکن میرے لیے یہ سب کچھ ہے۔" یمنیٰ نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"میں آبزرو کر رہا ہوں تمہارا رویہ کچھ بدل رہا ہے۔" آزر نے کریدنا چاہا۔

"نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں۔ ایگزامز کے بعد میں تم سے بات کروں گی۔" یمنیٰ نے کہا۔

"نہیں، مجھے آج اور ابھی تم سے باتیں کرنی ہیں۔ بہت زیادہ باتیں۔" آزر ضد کرنے لگا۔

"آزر پلیز آج نہیں۔ مجھے نوٹس مکمل کرنے ہیں۔" یمنیٰ نے کہا۔

"نہیں...... اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو آج میں کوئی انکار نہیں سنوں گا۔" آزر نے اتنے ٹھوس لہجے میں کہا تو یمنیٰ خاموش ہو گئی۔

"اوکے، کیا کہنا چاہتے ہو؟" یمنیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے گہری سانس لے کر پوچھا۔

"مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو اور شاید اسی لیے مجھے avoid بھی کر رہی ہو؟" آزر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" یمنیٰ نے جواب دیا۔

"یمنیٰ مجھے صاف، صاف بتاؤ۔ حمنہ نے تمہیں میرے بارے میں کیا کہا ہے؟" آزر نے کہا۔

"حمنہ نے......؟" یمنیٰ نے چونک کر انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"یس آف کورس۔ حمنہ تمہاری بیسٹ فرینڈ ہے اور تم دونوں ضرور میرے بارے میں ڈسکس کرتی ہو گی۔ آئی ایم شیور حمنہ نے تم سے ایسا ضرور کچھ کہا ہے کہ تمہارے attitude میں اتنا چینج آ گیا ہے۔" آزر نے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

"یمنیٰ مجھے فرینکلی بتاؤ، بات کیا ہے۔ تمہیں میری محبت کی قسم۔" آزر نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"حمنہ کا خیال ہے کہ کومل نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ کومل پر بہت ٹرسٹ کرتی ہے۔" یمنیٰ نے صاف گوئی سے اسے بتایا۔

"اور تم...... کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔ کیا میں نے جو کچھ تمہیں بتایا وہ سب جھوٹ ہے؟" آزر نے انتہائی غصے سے چلا کر کہا۔

"معلوم نہیں، حقیقت کیا ہے۔" یمنیٰ نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"تمہارے خیال میں، میں جھوٹ بول رہا ہوں اور کومل پر الزام لگا رہا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت ہے یہ سب کرنے کی۔ میں اتنا گھٹیا اور خبیث انسان نہیں۔" آزر چیخ چیخ کر اپنی سچائی کا یقین دلانے لگا اور یمنیٰ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

"اگر تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تو میں تمہیں ٹھوس ثبوت دے سکتا ہوں پھر تمہیں یقین آ جائے گا کہ کون سچا ہے۔" آزر نے کہا۔

"کیسے ثبوت؟" یمنیٰ نے چونک کر پوچھا۔

"وہ ثبوت جنہیں دیکھ کر تمہیں خود بہ خود یقین آ جائے گا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ کل تم میرے ڈیفنس والے گھر میں آنا تو میں تمہیں سب کچھ دکھاؤں گا۔ کومل کیا کچھ کرتی رہی ہے اور اس نے مجھے کس کس طرح ٹریپ کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ ثبوت بھی دوں گا جو اس نے تمہارے بارے میں میرے دل میں نفرت ڈالنے کے لیے بھیجے تھے۔ تم سوچ نہیں سکتیں کہ کومل کیا تھی۔ اوہ مائی گاڈ...... تمہیں میں کیسے یقین دلاؤں تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھو گی پھر تمہیں یقین آئے گا اور یہ سب کچھ تمہیں ابھی دکھانا بہت ضروری ہے ورنہ ہم دونوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جائیں گے۔" آزر نے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

"تم آؤ گی یا نہیں؟" آزر نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

"کل بتاؤں گی۔" یمنیٰ نے جواب دیا۔

"نہیں، تمہیں ہر صورت میں آنا ہو گا۔ اگر تم نہ آئیں تو میں ہمیشہ کے لیے تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ یمنیٰ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

صبح آفس جانے سے پہلے جمال صاحب، یمنیٰ کے کمرے میں آئے تو وہ بیڈ پر بیٹھی پڑھنے میں مصروف تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ بری طرح چونکی۔

"ڈیڈی آپ......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا...... اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"الحمدللہ فائن۔" اس نے جواب دیا۔

"بیٹا مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے، دراصل آپ کے لیے ایک پروپوزل آیا ہے۔" جمال صاحب نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"پروپوزل......؟" اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں، وہ ابا جان کے دوست کا بیٹا ہے اور امریکا میں ڈاکٹر ہے۔" انہوں نے نرم لہجے میں اسے بتایا۔

"نہیں...... ڈیڈی میں یہ پروپوزل accept نہیں کر سکتی۔" یمنیٰ نے جواب دیا۔

"کیوں......؟ اس انکار کی کوئی ٹھوس وجہ بھی ہونی چاہیے۔" جمال صاحب نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... وہ...... میں؟" وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟" انہوں نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو یمنیٰ نے ایک دم چونک کر ان کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"کون ہے وہ......؟ کیا نام ہے اس کا...... اور

اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟" جمال صاحب نے گہری سانس لے کر سنجیدگی سے پوچھا۔

"آزر عظیم...... میرا کلاس فیلو ہے، اس کے parents امریکا میں سیٹلڈ ہیں، فادر بزنس مین ہیں۔" یمنیٰ نے آہستہ آہستہ بتانا شروع کیا تو وہ ایک دم چونکے۔

"آزر عظیم...... نام سنا ہوا لگتا ہے، آئی تھنک...... یہ وہی لڑکا ہے ناں جسے الیکشن کمپیئن میں کالج سے expel کیا گیا تھا؟" انہوں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا تو یمنیٰ ایک دم بوکھلا گئی۔

"ہاں...... آزر وہی ہے...... لیکن پاپا...... اب اس نے اپنے آپ کو بہت چینج کر لیا ہے، now he is a different person وہ اپنے کیے کی مجھ سے کئی بار معافی مانگ چکا ہے۔" یمنیٰ آزر کے فیور میں اس قدر جذباتی ہو کر بول رہی تھی کہ جمال صاحب نے ایک بار چونک کر اسے گہری نظروں سے دیکھا تو وہ خاموش ہو گئی۔

"ٹھیک ہے، اسے کسی روز گھر پر انوائٹ کرو، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"ک...... کیوں......؟" یمنیٰ نے چونک کر پوچھا۔

"اماں جی نے تمہارے لیے جو پروپوزل بتایا ہے، آزر سے ملنے کے بعد میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔" جمال صاحب نے کہا۔

"لیکن ڈیڈی...... ابھی تو ہم سب ایگزامز کی تیاری کر رہے ہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"ٹھیک ہے ایگزامز کے بعد...... کسی روز انوائٹ کرنا۔" انہوں نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے لیکن یمنیٰ نے محسوس کیا کہ آزر کے بارے میں سن کر ڈیڈی خوش نہیں ہوئے تھے۔

"لیکن اب ڈیڈی آزر سے مل کر ضرور خوش ہوں گے۔" اس نے مسکرا کر سوچا اور اپنے دل کو تسلی

دینے لگی۔

☆☆☆

''مما کیا آپ ریڈی ہیں، میں آپ کو ائیرپورٹ ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' توقیر نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا جو واپس امریکا جا رہی تھیں۔

''میں بہت کچھ سوچ کر آئی تھی مگر تم مجھے پھر یونہی پریشان اور مایوس بھیج رہے ہو۔'' نجمہ نے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تھینک یو...... آپ امریکا سے اسپیشلی میرے لیے آئیں۔'' اس نے بڑی محبت سے انہیں تھام کر کہا۔

''تم اپنے اور میرے رشتے کو بہت فارمل لیتے ہو، کاش کبھی تمہیں اندازہ ہو کہ جب اولاد بیمار یاد تھی ہوتی ہے تو ماں کے دل پر کیا گزرتی ہے۔'' نجمہ نے آہ بھر کر اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔

''آئی ایم سوری...... آپ میری وجہ سے بہت اپ سیٹ رہتی ہیں۔'' توقیر نم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

''توقیر...... وہاں امریکا میں میرا دل نہیں لگتا، پلیز بیٹا پاکستان چلو...... ہم دونوں مل کر وہاں رہتے ہیں، اب رشنا بھی کینیڈا جانے والی ہے، اس کے ڈاکومینٹس کمپلیٹ ہو گئے ہیں، ورنہ وہی میرے پاس پاکستان میں رہ جاتی۔'' نجمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر التجائیہ انداز میں کہا تو توقیر خاموش ہو گیا۔

''تمہاری اس خاموشی کا میں کیا مطلب سمجھوں؟'' انہوں نے خفگی سے اسے دیکھ کر کہا۔

''میرے پاس آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں۔'' توقیر ان کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''پھر ٹھیک ہے آئندہ نہ میں تم سے کوئی بات کروں گی اور نہ ہی کسی بات کے لیے اصرار کروں گی۔'' نجمہ نے غصے سے کہا اور اپنا شولڈر بیگ اور ہینڈ کیری پکڑ کر باہر جانے لگیں۔

''مما پلیز...... یوں ناراض ہو کر نہ جائیں۔'' اس نے پریشان ہو کر ان کے پیچھے بھاگتے ہوئے کہا۔ نجمہ اپنی آنکھوں کو ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے آگے بڑھتی چلی گئیں۔

☆☆☆

ردا کمرے میں موجود نہیں تھی۔ روحیل بیڈ کی بیک کے ساتھ ٹیک لگائے ٹی وی چینل پر ایک مووی دیکھنے میں مصروف تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑا ردا کا موبائل بجنے لگا تو روحیل نے ایک ٹک دیکھ کر اسے اٹھایا unknown نمبر دیکھ کر کان سے لگا کر ہیلو کہا۔

''ہیلو...... آئی تھنک آپ روحیل بھائی ہیں ناں!'' رشنا خوشگوار لہجے میں بولی۔

''جی...... آپ کون؟'' روحیل نے چونک کر سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں رشنا...... ردا کی فرینڈ ہوں، آج میں کینیڈا جا رہی ہوں، ردا سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ کہاں ہے وہ؟'' رشنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کچن میں۔'' روحیل نے کہا۔

''ردا اور کچن میں؟'' رشنا نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے، وہ میرے لیے چائے بنانے گئی ہے۔'' روحیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اٹس امیزنگ...... مجھے اس نے کبھی خود سے چائے بنا کر نہیں پلائی مگر آپ کے لیے وہ خود چائے بنانے گئی ہے۔'' رشنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بھئی، وہ آپ سے محبت بھی تو بہت کرتی ہے، اتنی محبت اپنے بھائیوں کے علاوہ شاید ہی کسی اور سے کرتی ہو۔'' رشنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟'' روحیل نے چونک کر پوچھا۔

''جناب، میں پانچ سالوں سے اس کی

دوست ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ اس کی زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہیں، جس سے ردا نے شدید محبت کی ہے، آپ بھی میری فرینڈ کی محبت کی بہت ویلیو کیجیے گا۔ اتنی سویٹ لڑکی بہت نصیب والوں کو ملتی ہے۔'' رشنا نے مسکراتے ہوئے کہا تو روحیل کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اسی وقت ردا ٹرے میں چائے کے دو مگ رکھ کر لائی۔

''تمہاری فرینڈ رشنا کی کال ہے۔'' روحیل نے جلدی سے موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... رشنا!'' ردا مسکراتے ہوئے بولی اور وہ فون لے کر اس سے باتیں کرنے لگی جبکہ روحیل مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے چائے پینے لگا۔

☆☆☆

فہام لاؤنج میں کھڑا موبائل پر حیدر علی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔

''یار، فہام اگر پاسبل ہو تو مجھے اپنے موبائل میں وہ میسج دکھادو، جو فرحان نے تم لوگوں کو کیے ہیں۔''

''کیوں...... خیریت تو ہے؟'' فہام نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں، ہاں خیریت ہی ہے، ایکچوئیلی فرحان اس بات کو نہیں مانتا کہ اس نے کسی کو رانگ کالز یا میسج کے ذریعے پریشان کیا ہے۔'' حیدر نے اسے بتایا۔

''لیکن یار...... اس سے تو ساری بات کھل جائے گی کہ ہم نے ہی اس کی شکایت کی ہے......'' فہام نے حیرت سے کہا۔

''یار...... اب تم پولیس والوں کو اتنا بے وقوف بھی نہ سمجھو کہ ہم ساری بات اس پر ظاہر کردیں گے۔ اِن فیکٹ میں ان میسجز کے ذریعے پوری ڈیٹیل لینا چاہتا ہوں، میں اپنی پوری کوشش سے ابھی اس کی ضمانت نہیں ہونے دے رہا...... تم بے فکر رہو کوئی... گڑبڑ نہیں ہونے دوں گا۔'' حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوکے...... میں آتا ہوں۔'' فہام نے ک
جبکہ حاتم اس کے پیچھے کھڑا تمام باتیں سن رہا تھا
فہام مڑا تو حاتم کو سامنے پا کر چونک گیا۔

''اوہ...... حاتم تم......؟'' فہام نے سر پر ہا
پھیرتے ہوئے کہا تو حاتم نے بغور اس کی جانب دیکھا۔

''مجھے تمہارا وہ موبائل چاہیے...... جس پر
تمہیں میسجز آتے رہے ہیں۔''

''کیوں......؟'' حاتم نے چونک کر پوچھا۔

''بس ضرورت ہے۔'' فہام نے کچھ سوچ
ہوئے کہا۔

''کس کو......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جب میں کہہ رہا ہوں تو تمہیں argu e
کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم مجھے وہ موبائل دو
اب کے فہام خفگی سے بولا۔

''آپ مجھ سے وہ شخص کیوں چھپانا چاہ رہے
ہیں، کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں؟'' حاتم نے عجیب
انداز سے کہا۔

''اعتبار بہت ہے...... مگر مجھے تمہارے غص
اور جذباتی پن سے ڈر لگتا ہے، جس پر تمہیں خود کو
کنٹرول نہیں ہوتا...... اس لیے تم مجھے وہ موبائ
دے دو اور خاموش رہو۔'' فہام نے گہری سان
لے کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ حا
خاموش ہوگیا اور اسے موبائل دے دیا۔

فہام پولیس اسٹیشن گیا تو حیدر علی اس کا ہی منتظ
تھا۔ فہام نے اسے موبائل دیا اور وہ موبائل لے ک
میسجز چیک کرنے لگا اور اس کے چہرے پر خفگی ک
تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''فرحان بہت ہی گھٹیا انسان ہے، اس ن
بڑی گہری چال چلی ہے اور چال بھی اس انداز
چلی ہے کہ وہ آسانی سے پکڑا نہ جاسکے۔'' حیدر
اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' فہام نے چونک کر پوچھا۔

''یہ موبائل تم میرے پاس چھوڑ جاؤ...... بعد میں تمہیں بتاؤں گا جو میں نے سوچ رکھا ہے۔'' حیدر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''تھینک یو یار...... تم نے بہت cooperate کیا۔ شادی پر بھی اپنے گارڈ بھیجے......'' فہام نے مسکرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بہن میری کچھ نہیں لگتی؟'' حیدر مسکراتے ہوئے بولا۔

''آف کورس......'' فہام نے مسکراتے ہوئے کہا تو فہام باہر جانے لگا۔

''چلو اکٹھے چلتے ہیں، مجھے بھی ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔'' حیدر نے اس کے ساتھ باہر جاتے ہوئے کہا اور دونوں کاریڈور میں سے گزرے۔ وہ باتیں کرتے جارہے تھے۔ فرحان کو ایک سپاہی ہتھکڑی لگائے دوسری جانب لے کر جارہا تھا۔ فرحان نے ایک دم چونک کر فہام کو دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے معنی خیز انداز میں آنکھیں گھمانے لگا۔

''اوہ...... تو یہ کارستانی تمہاری ہے۔'' فرحان نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا اور اس نے انتقامی انداز میں فہام کی طرف دیکھا...... سپاہی نے اسے لے جاکر لاک اپ میں بند کردیا۔

فہام، حیدر علی کے ساتھ باتیں کرتا ہوا باہر چلا گیا اور پھر اس سے ہاتھ ملا کر اپنی گاڑی کی جانب چلا گیا۔ فہام مطمئن تھا کہ حیدر علی فرحان کو ایسی سزا ضرور دے گا جس کا وہ مستحق ہے...... لیکن فہام کو دیکھ کر فرحان کے اندر جو آگ بھڑکی تھی وہ اس کی جلن سے انتہائی مضطرب ہو کر دیوار پر مکے مارنے لگا۔

☆☆☆

''بیگم صاحبہ! ہماری ردا بی بی کتنی خوب صورت لگ رہی ہیں، بالکل پری لگ رہی ہیں۔ اتنی پیاری جیسے چاند کی ملکہ۔'' زاہدہ نے مسکراتے ہوئے تصویریں دیکھ کر خدیجہ بیگم سے کہا۔ وہ دونوں بیٹھی ردا کی شادی کی تصویریں دیکھ رہی تھیں جبھی شمیلہ چائے کا مگ پکڑے لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔

''اور روحیل بھائی بھی کتنے خوب صورت لگ رہے تھے۔ شادی پر سب یہی کہہ رہے تھے کہ چاند سورج کی جوڑی لگتی ہے دونوں کی۔'' زاہدہ ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

''ہاں...... اللہ نظرِ بد سے بچائے۔'' خدیجہ مسکرا کر دعائیہ لہجے میں کہنے لگیں۔ ''اللہ میری بچی کا نصیب اچھا کرے۔''

''انشاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ ردا بی بی ہیں ہی بڑی نصیب والی۔ جہاں جاتی ہیں محبتیں ہی سمیٹتی ہیں، یہاں تھیں تو سب کی آنکھوں کا تارا تھیں اور اب ساس ملی ہیں کہ بلائیں لیتے نہیں تھکتیں۔ اتنی محبتیں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔'' زاہدہ نے اچانک شمیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''زاہدہ...... یہ تم مجھے دیکھ کر کیوں بات کررہی ہو؟'' شمیلہ خفگی سے بولی۔

''ک...... ک...... کب؟'' زاہدہ نے بوکھلا کر کہا۔

''میں اچھی طرح تمہاری باتوں کا مطلب جانتی ہوں۔ آپ ان دو ٹکے کی نوکرانیوں کو اپنے ساتھ ملا کر میرے خلاف محاذ بنا رہی ہیں ناں!'' شمیلہ نے ساس کی طرف دیکھ کر غصے سے کہا۔

''یہ گھر ہے بیٹی کوئی میدانِ جنگ نہیں...... جہاں میں محاذ بناؤں گی، تم فضول باتیں سوچنا چھوڑ دو۔'' انہوں نے ایک دم چونک کر خفگی سے کہا۔

''ہاں...... میں بھی فضول اور...... میری باتیں بھی فضول...... سب سے اچھی تو آپ اور آپ کی ردا ہے یا پھر یہ نوکرانیاں......'' شمیلہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''جو کچھ آپ میرے ساتھ کرتی ہیں، اللہ کرے آپ کی ردا کے ساتھ بھی ہو۔ وہ بھی خوش نہ رہے۔'' شمیلہ نے اٹھتے ہوئے غصے سے کہا۔

''خبردار...... جو ردا کا نام لیا......'' خدیجہ نے

اسے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا تو وہ وہاں سے چلی گئی۔

''بیگم صاحبہ! میرا تو دل ڈرنے لگا ہے، ان کی حاسد نظریں کہیں ردا بی بی کو......'' زاہدہ نے گھبرا کران کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اللہ نہ کرے...... یہ لو ردا کا صدقہ نکال دینا...... اللہ میری بچی پر رحم کرے اور حاسدین کی بد نظر سے بچائے۔'' خدیجہ نے گھبرا کر پیسے نکالتے ہوئے کہا اور زاہدہ گھبرا کر اٹھ گئی۔

☆☆☆

ماں جی لاؤنج میں جانماز بچھائے مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ روحیل قدرے تھکے ہوئے انداز میں لاؤنج میں داخل ہوا اور آ کر فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر پانی پینے لگا۔ ماں جی جانماز لپیٹ کر اس کے پاس آ گئیں۔

''روحیل تم دوپہر کو گھر سے گئے تھے اور اب آرہے ہو، کہاں تھے تم......؟'' ماں جی مصنوعی خفگی سے بولیں۔

''آفس میں۔'' روحیل نے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔

''کیوں، تم تو چھٹیوں پر ہو۔'' ماں جی نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ ڈاکومنٹس کا مسئلہ تھا اور بہت ارجنٹ کام بھی تھا۔'' اس نے کہا۔

''جو بھی تھا، تمہیں ردا کو اکیلے چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ بے چاری سارا دن اندر باہر پھرتی رہی۔'' ماں جی نہایت خفگی سے بولیں۔

''تو کیا ہوا؟'' روحیل بے رخی سے بولا۔

''بیٹا، ردا نئی نویلی دلہن ہے، یہ تو اس کے ناز نخرے اٹھانے کے دن ہیں، بہو جب سسرال آتی ہے تو شوہر اور سسرال کی محبت اس کے لیے خوب صورت یادیں بن جاتی ہیں اور یہی یادیں اس کے دل میں شوہر اور سسرال کی قدر پیدا کرتی ہیں۔'' ماں جی نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''افوہ...... ماں جی...... آپ کن چکروں میں پڑ گئی ہیں، مجھے یہ ناز نخرے اور چونچلے اٹھانا بالکل پسند نہیں۔'' روحیل نے جھنجلا کر کہا۔

''پسند ہیں یا نہیں...... مگر تمہیں یہ سب نخرے اٹھانے ہیں، میری خاطر......'' ماں جی نے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... گاڈ! اب بتائیے کیا کرنا ہے؟'' وہ سوالیہ انداز میں بولا۔

''فی الحال تو تم بہو کو لے کر باہر جاؤ، اسے گھماؤ پھراؤ، کہیں کھانا کھلاؤ...... لانگ ڈرائیو پر جاؤ، اسے بہت بہت انجوائے کراؤ۔ شاپنگ کراؤ۔''

ماں جی نے کہا تو روحیل ہنس دیا۔

''آپ کو اکیلے چھوڑ کر...... نہیں، نہیں۔'' روحیل فوراً بولا۔

''تم میری فکر نہ کرو، میں پہلے بھی تو گھر میں اکیلی رہتی تھی ناں، تم اسے لے کر جاؤ۔'' ماں جی نے کہا تو ردا اسی وقت اپنے کمرے سے باہر نکلی۔

''ردا! جلدی سے تیار ہو جاؤ، روحیل تمہیں گھمانے کے لیے باہر لے کر جارہا ہے۔'' ماں جی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر روحیل کی طرف دیکھا۔

''اوکے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔'' روحیل نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا تو ردا مسکرا کر اندر چلی گئی۔

''بیٹا! ایسی باتوں سے محبت بڑھتی اور مضبوط ہوتی ہے۔'' ماں جی نے مسکراتے ہوئے کہا تو روحیل بھی مسکرانے لگا۔

☆☆☆

ردا اور روحیل ایک ریسٹورنٹ میں کینڈل لائٹ ڈنر کرنے میں مصروف تھے۔ ردا بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ روحیل مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور کھانا کھاتے ہوئے دونوں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔

''ردا...... میں نے ماں جی کے ساتھ بہت ہارڈ اور ٹف لائف گزاری ہے، سوچتا تھا زندگی یونہی گزر جائے گی مگر تمہارے آنے سے ہمارے گھر میں ایک پلیزنٹ چینج آیا ہے۔'' روحیل مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیسا چینج......؟'' ردا مسکراتے ہوئے بولی۔

''ماں جی...... بہت خوش دکھائی دینے لگی ہیں، ورنہ ہر وقت اداس رہتی تھیں۔ میں انہیں خوش رکھنے کی بہت کوشش کرتا تھا مگر کبھی ایسے خوش نہیں کر سکا جیسے تم نے کر دیا ہے۔'' روحیل مسکراتے ہوئے بولا۔

''ماں جی...... ہیں بھی تو بہت اچھی......'' ردا مسکراتے ہوئے بولی۔

''اور...... تم؟'' روحیل نے جان بوجھ کر اسے ستانے کی خاطر پوچھا۔

''یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔'' ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... دل تو کچھ اچھا، اچھا ہی بولتا ہے، تمہارے بارے میں۔'' روحیل نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور ٹیبل پر پڑے پھولوں میں سے ایک خوب صورت پھول نکال کر ردا کو دیا تو اس نے مسکرا کر پھول پکڑ لیا۔ کچھ فاصلے پر ایک آدمی کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے مسلسل ردا کو گھور رہا تھا۔ اچانک روحیل کی نظر اس پر پڑی تو وہ بری طرح چونکا۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' روحیل نے ایک دم موڈ بدل کر سنجیدگی سے کہا۔

''اوکے......!'' ردا نے مسکرا کر اٹھتے ہوئے کہا اور وہ اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر اس کے ہمراہ باہر نکلی جبکہ روحیل اس آدمی کو مسلسل گھورتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے جبکہ ردا اس صورتِ حال سے بے خبر اپنی دھن میں مسکرا رہی تھی۔

روحیل گاڑی ڈرائیو کررہا تھا مگر اس کا موڈ کچھ آف تھا۔ ردا اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی جبھی فہام کا فون آگیا اور ردا ان سے بات کرنے میں مصروف ہوگئی۔

''ارے...... نہیں نہیں فہام بھائی آپ کی سوئٹ ڈول آپ کو بھلا کیسے بھول سکتی ہے۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا۔'' ردا مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''اتنے روز سے نہیں آئی ہو، تمہارے بغیر میں بہت اداس ہورہا ہوں۔'' فہام نے فرطِ محبت سے کہا۔

''فہام بھائی اور میں بھی آپ کے بغیر بہت، بہت زیادہ اداس ہوں۔'' ردا نے مسکرا کر آنکھیں پھیلا کر بچوں کی طرح کہا تو روحیل نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ اس طرح کی باتیں چاہے وہ اپنے بھائی سے ہی کررہی ہوتی اسے اچھی نہ لگتیں۔

''اچھا بتاؤ، اس وقت تم کہاں ہو؟'' فہام نے پوچھا۔

''میں اور روحیل باہر ڈنر کے لیے آئے تھے۔ اب گھر واپس جارہے ہیں۔'' ردا نے مسکرا کر روحیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تو پھر ہماری طرف سے ہوکر جاؤ ناں...... تمہیں دیکھنے کو میرا دل بہت بے چین ہورہا ہے۔'' فہام جذباتی انداز میں بولا۔

''اوکے...... ایک منٹ ٹھہریں۔'' ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''فہام بھائی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آنے کو کہہ رہے ہیں۔'' ردا نے موبائل سائڈ پر کرکے روحیل سے پوچھا۔

''نہیں، نہیں...... ماں جی گھر پر اکیلی ہیں۔'' روحیل سپاٹ لہجے میں بولا۔

''فہام بھائی! میں آج نہیں آسکتی، ماں جی گھر پر اکیلی ہیں، ویسے بھی کافی دیر ہوچکی ہے۔'' ردا نے بھائی کو بتادیا۔

''اوکے...... پھر کل آجانا۔'' فہام نے نرمی سے کہا۔

''اچھا۔ میں کوشش کروں گی آپ اپنا خیال رکھیے گا۔'' ردا نے روحیل کی طرف ایک نظر دیکھ کر بھائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم بھی اپنا بہت خیال رکھنا...... میری چندا......'' فہام محبت بھرے لہجے میں بولا تو ردا نے مسکراتے ہوئے موبائل آف کردیا۔

''فہام بھائی میرے بغیر بہت اداس ہورہے تھے۔'' ردا نے افسردگی سے کہا۔

''ردا! اب تم شادی شدہ ہو اور اب تم میں سے یہ بچپنا ختم ہوجانا چاہیے۔'' روحیل قدرے تنبیہی لہجے میں بولا۔ ''تمہاری فیملی کی تمہارے ساتھ بہت زیادہ اٹیچمنٹ ہے اور ہر منٹ کے بعد ان کی فون کالز آنا...... ان کا تمہیں اور تمہارا ان کو مس کرنا...... یار یہ سب کیا ہے، مجھے بہت آکورڈ لگتا ہے، پلیز اب اپنے لائف اسٹائل میں چینج لاؤ...... اب مجھے اور ماں جی کو تمہاری توجہ کی زیادہ ضرورت ہے۔'' روحیل نے کندھے اچکا کر خفگی سے کہا تو ردا خاموش ہوگئی۔

☆☆☆

سب لوگ ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے کھانا کھارہے تھے۔ زاہدہ پانی کے گلاس اور سوئٹ ڈش لاکر رکھ رہی تھی۔ فہام بھی موبائل آف کرکے کھانا کھانے لگا۔

''ردا سے بات کررہا تھا۔ وہ دونوں ڈنر کرنے باہر گئے ہوئے تھے۔'' فہام نے ماں کو بتایا۔

''ہم سے بھی مل کر چلی جاتی...... کئی روز سے اسے دیکھا نہیں تو دل بہت اداس ہورہا ہے۔'' انہوں نے بیٹی کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا تو تھا...... مگر روحیل کی ماں جی گھر پر اکیلی تھیں۔ یار عاصم! کوئی آؤٹنگ کا پروگرام ہی بناؤ۔ ردا اور روحیل کے ساتھ انجوائے کریں گے۔'' فہام نے عاصم کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیوں ناں...... beach کا پروگرام بنائیں۔ مزہ آئے گا۔'' عاصم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' فہام مسکراتے ہوئے بولا تو شمیلہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

''شمیلہ! کیا خیال ہے، اس سنڈے کو پروگرام ٹھیک رہے گا؟'' فہام نے شمیلہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں، ہاں، ایز یو وش...... اچھا ہے، سب مل کر خوب انجوائے کریں گے۔'' وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں...تو بس ٹھیک ہے۔ میں سب ارینجمنٹ کرلوں گا۔'' فہام نے کہا اور جلدی سے ردا کا نمبر ملانے لگا۔ وہ دونوں ابھی گھر نہیں پہنچے تھے۔ ردا کے ہاتھ میں پکڑا موبائل پھر بجنے لگا۔ فہام کی کال آرہی تھی، ردا نے روحیل کی طرف دیکھا اور روحیل نے ایک ٹک اس کے موبائل کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ کافی بیلز کے بعد کال ڈراپ ہوگئی۔ ردا کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور اس نے موبائل آف کرکے بیگ میں رکھ لیا اور شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

''ردا کال اٹینڈ نہیں کررہی...... آئی تھنک بزی ہوگی۔ مما! کل آپ اسے فون کرکے سنڈے کے پروگرام کے بارے میں بتادیجیے گا اور آپ ان کی ماں جی کو بھی ساتھ چلنے کا کہہ دیجیے گا۔ بہت اچھی خاتون ہیں وہ۔'' فہام نے موبائل آف کرکے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں، کل میں خود اُن سے بات کروں گی۔'' خدیجہ مسکراتے ہوئے کہنے لگیں۔

☆☆☆

ماں جی نماز کی چادر اوڑھے لاؤنج میں آئیں ان کے ہاتھ میں میڈیسنز کا لفافہ تھا۔ وہ فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں۔ جبھی ردا اور روحیل قدرے تھکے ہوئے انداز میں لاؤنج میں داخل ہوئے۔ ردا قدرے خاموش لگ رہی تھی۔

''بیٹا! تم لوگ اتنی جلدی آگئے...... میں تو ابھی نماز اور وظائف پڑھ کر فارغ ہوئی ہوں اور تم لوگ آبھی گئے۔'' ماں جی نے دونوں کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا کہیں گھومنے پھرنے نہیں گئے؟'' ماں جی نے ردا کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے گھبرا کر روحیل کی طرف دیکھا۔

''آپ گھر پر اکیلی تھیں، اس لیے ہم صرف کھانا کھا کر آگئے۔'' روحیل جلدی سے بتانے لگا۔

''کیا بات ہے، ردا کا چہرا کیوں اُترا ہوا ہے؟'' ماں جی نے ردا کو دیکھ کر کہا۔

''ک...... کچھ نہیں...... ماں جی! میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔'' ردا نے ہڑبڑا کر جلدی سے کہا۔

''جاتے وقت تو تم بہت خوش تھیں۔'' ماں جی اس کی طرف بغور دیکھ کر بولیں۔

''روحیل! کیا تم نے ردا سے کچھ کہا ہے؟'' انہوں نے روحیل سے پوچھا۔

''نہیں...... میں نے کیوں کچھ کہنا تھا، آپ ردا سے خود ہی پوچھ لیں۔'' اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ بس میں تھک گئی ہوں۔'' ردا جلدی سے بولی۔

''اچھا...... جاؤ، آرام کرو۔'' ماں جی نے ردا کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا تو اس نے زبردستی مسکرا کر ماں جی کو دیکھا اور کمرے میں چلی گئی۔

''بیٹا! بہو کو خوش رکھنے کی کوشش کیا کرو، بہت اچھی لڑکی ہے۔'' انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیوں...... اس نے کوئی شکایت کی ہے؟'' روحیل نے چونک کر پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں...... مگر نہ جانے کیوں مجھے اس کے چہرے کی اداسی دیکھ کر کچھ محسوس ہورہا ہے۔'' ماں جی گہری سانس لے کر بولیں۔

''آپ کا وہم ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... اللہ تم دونوں کو خوش رکھے۔'' ماں جی دعائیہ لہجے میں بولیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں اور روحیل بھی اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔

☆☆☆

ردا واش روم سے نائٹ ڈریس پہن کر باہر نکلی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹاول تھا۔ جس سے وہ اپنا چہرہ پونچھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بھی سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور اپنا کوٹ اتار کر ہینگر میں لٹکایا۔ ردا خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''ماں جی...... تمہارے چہرے پر چھائی اداسی کو دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں۔'' روحیل گہری سانس لے کر بولا۔

''میں نے تمہیں اپنی فیملی کے ساتھ limited terms رکھنے کو کہا ہے۔ اس میں اتنا اپ سیٹ ہونے کی کیا بات ہے؟'' روحیل نے کہا۔

''کیا آپ نہیں جانتے کہ میرے بھائیوں کی مجھ میں جان ہے۔ وہ میرے ساتھ کتنا اٹیچڈ ہیں۔'' ردا نمناک لہجے میں بولی تھی۔

''یہی تو میں تمہیں سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ وہ phase گزر چکا ہے۔ اب تم صرف میری ہو اور میں اپنی محبت میں بہت پوزیسو ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں میرے علاوہ کوئی اور دیکھے بھی۔'' روحیل نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن...... روحیل......'' ردا اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''تمہیں صرف میں ہی دیکھوں، میں ہی چاہوں اور میں ہی محبت کروں۔'' روحیل نے قدرے پوزیسو انداز میں کہا تو وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''تیسرا کوئی بھی ہو، میں اسے برداشت نہیں کر سکوں گا۔ بس میری اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔'' روحیل نے تحکمانہ انداز میں کہا تو ردا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''میری اتنی شدید اور بھرپور محبت کو تم اپنے لیے اِک انعام سمجھو، اتنی محبت کسی خوش نصیب عورت کو ہی ملتی ہے۔ so cheer up now'' روحیل نے مسکرا کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ بھی بھیگی پلکیں اٹھا کر اسے مسکرا کر دیکھنے لگی۔

☆☆☆

حمنہ کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر کتابیں اور نوٹس کھول کر پڑھنے لگی تھی کہ اس کی ملازمہ یمنیٰ کے ہمراہ اچانک کمرے میں داخل ہوئی۔

''بی بی جی...... آپ کی مہمان......'' ملازمہ نے حمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یمنیٰ! تم اور یہاں......؟'' حمنہ نے انتہائی حیرت سے چلّاتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... میں بہت جلدی میں ہوں، تمہیں لینے آئی ہوں۔'' یمنیٰ نے گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے کہا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''کہاں......؟'' حمنہ نے حیرت سے پوچھا۔

''بس تم جلدی سے چلو۔ راستے میں بتاؤں گی۔'' یمنیٰ نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔

''یمنیٰ! میں ایگزامز کی تیاری کر رہی ہوں اور میں اپنی اسٹڈیز کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔'' حمنہ نے خفگی سے کہا۔

''یار...... ایگزامز میرے بھی ہیں مگر وہ کام اتنا ضروری ہے کہ مجھے بھی اپنی اسٹڈیز چھوڑ کر آنا پڑا ہے۔'' یمنیٰ نے جواب دیا۔

''ایسا بھی کیا ضروری کام ہے؟'' حمنہ نے جھنجلا کر پوچھا۔

''ہے ناں...... بہت ضروری۔'' یمنیٰ نے منہ

بنا کر جواب دیا۔

''وہ تمہارے لیے ضروری ہوگا...... میرے لیے نہیں، سوری میں نہیں جا رہی۔'' حمنہ نے اپنی کتاب پکڑتے ہوئے کہا۔

''وہ تمہارے لیے بھی اہم ہے اگر نہ ہوتا تو میں تمہیں کبھی لینے نہیں آتی۔ حمنہ بس سمجھنے کی کوشش کرو، کیا میں اتنی اسٹوپڈ ہوں کہ کسی فضول اور غیر اہم کام کے لیے تمہیں ڈسٹرب کرنے آتی۔ why don't you understand کیا تم مجھ کر پر ٹرسٹ نہیں کرتیں؟'' یمنیٰ نے خفگی سے کہا تو حمنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''او کے...... میں برقع پہن لوں۔'' حمنہ نے اس کا موڈ آف دیکھتے ہوئے کہا۔

''برقع چھوڑو...... بس دوپٹا اچھی طرح لے لو۔'' یمنیٰ نے اس کا برقع اس سے لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں اس کے بغیر کبھی باہر نہیں گئی۔'' حمنہ نے اس کے ہاتھ سے برقع واپس لیا۔

''کم آن یار...... چھوڑو اسے، ہم کون سا پیدل جا رہے ہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' یمنیٰ نے اس کے ہاتھ سے برقع چھینتے ہوئے بیڈ پر پھینکا۔

''افوہ...... تم کیا کر رہی ہو یمنیٰ؟ میں برقع پہنے بغیر نہیں جاؤں گی۔'' اس نے سختی سے کہا اور برقع جلدی جلدی پہننے لگی۔ وہ اپنی چچی کو بتا کر گاڑی میں آ بیٹھی۔

''یار...... اب تو بتاؤ، ہم کہاں جا رہے ہیں اور تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے؟'' اس نے یمنیٰ کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا جو انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔

''آزر کے پاس......!'' یمنیٰ نے کہا۔

''کیا...... آزر کے پاس...... مگر کیوں؟'' حمنہ نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''وہ ہمیں کومل کے خلاف ثبوت دے گا...... اس نے مجھے بلایا تھا مگر تمہیں اس لیے لے کر جا رہی ہوں کہ تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آئے گا۔ اب تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟'' یمنیٰ نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

''کم آن یار...... تم کن چکروں میں پڑی ہو، ہمارے ایگزامز ہونے والے ہیں، ہمارا ٹائم کتنا قیمتی ہے اور تم...... آزر سے clarification لینے جا رہی ہو اگر تم مجھے پہلے بتاتیں تو میں کبھی نہیں آتی۔'' حمنہ نہایت خفگی سے بولی۔

''اسی لیے میں نے تمہیں نہیں بتایا۔ آزر بھی بہت اپ سیٹ ہے اور اچھا ہے آج سب کچھ کلیئر ہو جائے گا۔'' یمنیٰ نے کہا تو حمنہ خاموش ہو گئی۔

''یار کیا ضروری تھا، آج ہی جانا...... سچ میرا جانے

کا بالکل دل نہیں چاہ رہا...... اتنا ٹائم ویسٹ ہو جائے گا۔" حمنہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھر سے بولی۔

"ہم جلدی واپس آجائیں گے......" یمنیٰ نے جواب دیا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی...... وہ آزر کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھی کہ اچانک اس کی گاڑی بند ہوگئی...... وہ پریشان ہو کر اسے بار بار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر وہ اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ یمنیٰ نے باہر نکل کر بونٹ اٹھا کر اس کا انجن چیک کرنے کی کوشش کی مگر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"کیا ہوا؟" حمنہ نے پریشانی سے پوچھا۔

"معلوم نہیں...... اسے کیا ہوگیا ہے، پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ ٹھہرو میں آزر کو فون کرتی ہوں، وہی آکر اسے دیکھ لے گا۔" یمنیٰ نے اپنے موبائل پر آزر کا نمبر ملا دیا اس پر بیلز جا رہی تھیں مگر وہ کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔

"حمنہ! پلیز تم آزر کو بلا لاؤ، دیکھو وہ سامنے اس کا گھر ہے۔ وہ فون نہیں اٹھا رہا۔ شاید اس کا موبائل سائلنٹ پر ہے۔" یمنیٰ نے اس سے اصرار کیا۔

"میں......؟" حمنہ نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، میں اتنی دیر گاڑی دیکھتی ہوں۔" یمنیٰ نے کہا۔

"نہیں...... نہیں میں اکیلے نہیں جاؤں گی۔" حمنہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کم آن یار...... بی کونفیڈنٹ، وہ تمہیں کھا نہیں جائے گا اور میں ادھر ہی ہوں، گاڑی ٹھیک ہوگی تو میں بھی اُدھر ہی آجاؤں گی۔" یمنیٰ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تم بھی میرے ساتھ چلو۔" حمنہ نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔

"یار تمہیں کیا ہوگیا ہے، کیسے بی ہیو کر رہی ہو...... بی کونفیڈنٹ...... یو آر میچور اینڈ سینسیبل۔" یمنیٰ نے خفگی سے کہا تو حمنہ آزر کے گھر کی جانب بڑ گئی۔ اسی لمحے یمنیٰ کے کزن شہیر کا کراچی سے فو آگیا جو انگلینڈ میں سیٹلڈ ہو چکا تھا اور کراچی آیا تھا۔ اس نے بہت عرصے کے بعد یمنیٰ کو فون کیا تھا اتنے عرصے بعد شہیر کا فون سن کر وہ بہت ایکسا ہوگئی اور گاڑی میں بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگی۔

☆☆☆

حمنہ نے ایک وسیع و عریض کوٹھی کے گیٹ بیل بجائی تو ایک تیم شحیم چوکیدار نے گیٹ کھول حمنہ کی طرف دیکھا۔

"کیا...... آزر صاحب، گھر پر ہیں؟" حم نے گھبرائے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، وہ اوپر اپنے کمرے میں ہیں، آ اوپر چلی جائیں، وہ آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ چوکیدار نے کہا۔

"میرا انتظار......؟" حمنہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... انہوں نے کہا تھا ایک لڑکی آئے گ اسے اوپر بھیج دینا...... کیا تم وہ لڑکی نہیں ہو چوکیدار نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"ہاں...... مگر وہ......" حمنہ نے رک رک کہا۔ نقاب سے جھانکتی اس کی آنکھیں اس کے اند کی پریشانی کا پتا دے رہی تھیں۔

"آپ، آپ انہیں یہیں بلا دیں۔" حمنہ آہستہ سے کہا۔

"صاحب کا جو حکم ہے وہ آپ کو بتا دیا ہے کہنا ہے اسے اوپر جا کر کہو۔" چوکیدار نے کہا اور سیٹ پر جا بیٹھا۔ حمنہ کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کرے، وہ قدرے پریشانی سے ہونٹ کاٹتی ہو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئے گھر میں داخل ہوگئی لاؤنج میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ چوکید نے اسے اوپر جانے کو کہا تھا لاؤنج میں سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑ

ہوئی اوپر چلی گئی۔ اوپر جا کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ سارے کمروں کے دروازے بند تھے۔ صرف ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ اس نے آہستہ آواز میں آزر، آزر پکارا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے کو مزید کھول کر اندر داخل ہوگئی وہ آزر کا ہی کمرا تھا۔ ہر طرف آزر کے پورٹریٹس آویزاں تھے۔ اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"آزر، آزر کہاں ہو؟" حمنہ نے اسے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پکارا۔ آزر نے ایک دم ڈریسنگ روم سے نکل کر دروازے کو لاک لگایا۔ اس نے نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا اور کافی زیادہ ڈرنک کر رکھی تھی۔ اس نے پیچھے سے آکر حمنہ کا نقاب زور سے کھینچا۔

"یہ، یہ تم کیا کر رہے ہو...... میں، میں حمنہ ہوں۔" حمنہ نے انتہائی گھبرا کر کہا۔ خوف کے مارے اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی مگر آزر اتنا وحشی ہو رہا تھا کہ اس نے اس کی ایک بات نہ سنی۔ وہ چلاتی رہی اسے دھکے دیتی رہی۔ دروازے کی طرف بھاگتی رہی مگر آزر تو اس وقت درندہ بنا ہوا تھا۔ حمنہ نے اپنا موبائل بیگ سے نکال کر یمنیٰ کو فون کرنا چاہا مگر آزر نے موبائل اس کے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیا۔ حمنہ اللہ رسول کے واسطے دیتی رہی مگر اس نے اس کی ایک نہ سنی۔ وہ بلند آواز سے چلاتی رہی مگر کسی نے اس کی پکار نہ سنی۔ آزر اتنا aggressive ہو رہا تھا کہ وہ یمنیٰ کے تمام بدلے اس سے لینا چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

شہیر سے باتیں کرتے ہوئے یمنیٰ کو وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔ وہ اس سے اس کے حالات کے بارے میں پوچھتی رہی اور وہ اس سے خوب گپ شپ لگاتا رہا۔ کال ختم کرنے کے بعد اس نے چونک کر ٹائم دیکھا۔

نماز

☆ نماز کب کام آئے گی......؟

☆ فجر۔ مرتے وقت۔

☆ ظہر۔ قبر میں

☆ عصر۔ منکر نکیر کے سوالات کے وقت۔

☆ مغرب۔ حساب کتاب کے وقت۔

☆ عشا۔ پل صراط پر۔

مرسلہ: نفیسہ آرا، یو اے ای

بھترین تحفه

دنیا کا سب سے اچھا تحفہ وقت ہوتا ہے کیونکہ اگر آپ کسی کو اپنا وقت دیتے ہیں تو آپ اسے اپنی زندگی کا وہ پل دیتے ہیں جو کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔

از: ماہ نور قیصر، راول پنڈی

"حمنہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آئی؟ اتنی دیر ہوگئی؟" اس نے پریشانی سے سوچا اور گھبرا کر حمنہ کو فون کیا مگر connect نہ ہو سکا۔ اس نے آزر کو بھی فون کیا وہ بھی کال نہیں لے رہا تھا۔ یمنیٰ پریشان ہو کر گاڑی کو لاک کرتے ہوئے اس کے گھر کی طرف گئی اور گیٹ بیل بجائی چوکیدار نے گیٹ کھول کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"آزر صاحب کہاں ہیں؟" یمنیٰ نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟" چوکیدار نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک لڑکی کچھ دیر پہلے یہاں آئی تھی، وہ کہاں ہے؟" یمنیٰ نے غصے سے پوچھا۔

"یہاں کوئی لڑکی نہیں آئی۔" چوکیدار نے جواب دیا۔

"کیا کہا...... یہاں کوئی لڑکی نہیں آئی۔ وہ یہاں ہی آئی تھی۔ آزر کہاں ہے، میں خود اس سے پوچھتی ہوں۔" یمنیٰ نے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے اندر جانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم، تم اندر نہیں جا سکتیں۔" چوکیدار نے پھر اسے روکنے کی کوشش کی۔

"کیوں...... تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟" یمنیٰ نے غصے سے کہا۔

"صاحب کا یہی حکم ہے، کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔" بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا آزر نے ایسا کہا ہے مگر کیوں......؟" یمنیٰ نے چونک کر پوچھا اور اندر جانے لگی۔ چوکیدار نے اسے زبردستی روکنے کی کوشش کی۔

"میں نہیں جانتا مگر آپ اندر نہیں جا سکتیں۔" چوکیدار نے غصے سے کہا تو یمنیٰ نے کراٹے کرتے ہوئے ٹانگ اس کے پیٹ میں ماری۔ وہ وہیں تڑپنے لگا اور یمنیٰ تیزی سے اوپر چلی گئی۔ آزر کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے بار بار دستک دی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ اندر سے چیخنے اور کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یمنیٰ گھبرا گئی اور اس نے جوڈو کے ٹرکس اختیار کرتے ہوئے دروازے کو دو تین جھٹکے دیے تو دروازہ کھل گیا۔ حمنہ کا برا حال تھا۔ اسے دیکھ کر یمنیٰ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"یو چیٹر......" یمنیٰ نے زور سے تھپڑ آزر کے چہرے پر لگایا تو اس نے گھوم کر یمنیٰ کو دبوچنے کی کوشش کی۔

"آج...... میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا، آج تم سے اپنے سارے بدلے لوں گا میں... چڑیل، کالی چھچھوندر تو نے مجھے ہرانے کی کوشش کی تھی۔ آج تجھے سارا حساب چکانا پڑے گا۔" آزر نے اس پر جھپٹنا چاہا مگر یمنیٰ نے گھما کر ٹانگ اس کے پیٹ میں ماری وہ گر کر تڑپنے لگا۔ حمنہ بری طرح رو رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ یمنیٰ نے اس کا برقع اس کی طرف پھینکا۔

"ہمت کرو، پلیز...... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" یمنیٰ نے حمنہ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا اور آزر کو گریبان سے پکڑ کر مارنے لگی۔

"گھٹیا انسان...... تم نے مجھ سے محبت کا ڈراما رچایا۔ اتنا عرصہ مجھ سے کھیل کھیلتے رہے۔ ایکسپلائٹ کرتے رہے۔" یمنیٰ نے غصے سے کہا۔

"تم...... اور محبت کے قابل......؟ اپنی شکل دیکھی ہے آئینے میں...... تمہاری کالی شکل کی طرف کوئی دیکھنا تو کیا تھوکنا بھی پسند نہیں کرے۔ چمگادڑ...... کالی چڑیل......" آزر نے اسے تھپڑ مارنا چاہا تو یمنیٰ نے جوڈو کے ٹرکس کرتے ہوئے ٹانگ اس کے سر پر ماری۔ آزر وہیں گر گیا۔

"حمنہ چلو...... یہاں سے۔" یمنیٰ نے اسے سہارا دیتے ہوئے اٹھایا۔ آزر بہ مشکل اٹھ کر ان کی طرف لپکا۔

"ابھی میں حمنہ کی وجہ سے جا رہی ہوں مجھے اس کی فکر ہے مگر میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ مت سمجھنا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔ میں تمہیں نہ مرنے دوں گی نہ جینے دوں گی۔ یاد رکھنا۔" یمنیٰ نے حمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے نم آنکھوں سے کہا۔

"کیا کر لو گی تم...... میں تمہیں یہاں سے جانے دوں گا تو پھر ہے ناں......!" آزر نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"تم......!" یمنیٰ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور اس کی آواز کانپنے لگی۔ اس نے بہ مشکل اپنے آپ کو نارمل رکھتے ہوئے حمنہ کو بازو سے اٹھایا اور تیز تیز چلتی ہوئی باہر نکلنے لگی تو آزر پھر ان کے پیچھے آنے لگا۔ یمنیٰ نے دو تین ٹانگیں گھما کر اس کے پیٹ میں ماریں۔ وہ تڑپنے لگا وہ جلدی سے حمنہ کے ہمراہ گیٹ تک آئی۔ چوکیدار گیٹ پر نہیں تھا۔ وہ گیٹ کھول کر باہر نکل گئی۔ حمنہ کو گاڑی میں بٹھایا اور ایمبولینس کو کال کیا۔ تھوڑی دیر بعد ایمبولینس آ گئی۔ اس نے حمنہ کو ایمبولینس میں بٹھایا اور خود بھی اس کے ہمراہ بیٹھ کر اسے اسپتال لے جانے لگی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے، حمنہ کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہ رہے تھے اور وہ انتہائی تکلیف سے کراہ رہی تھی۔

"حوصلہ کرو...... پلیز مجھے معاف کردو۔ میں ہی تمہاری مجرم ہوں۔" یمنیٰ نے حمنہ کا ہاتھ پکڑ کر نم آنکھوں سے کہا تو حمنہ بری طرح سسکنے لگی۔ یمنیٰ بھی رونے لگی۔

"عمر......" وہ بہ مشکل بولی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یمنیٰ اسے دلاسا دینے کی کوشش کرتی مگر حمنہ کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔ اس کا نقاب بری طرح بھیگ چکا تھا۔ اچانک ایمبولینس ریلوے پھاٹک کے پاس رکی۔ ٹرین جب قریب پہنچنے والی تھی تو حمنہ نے انتہائی تیزی سے ایمبولینس کا دروازہ کھولا اور سرپٹ بھاگتے ہوئے ٹرین کے سامنے چلی گئی۔ یمنیٰ اس کے پیچھے بھاگی اور وہاں پر موجود لوگوں نے بھی اس کے پیچھے بھاگنا چاہا مگر تب تک حمنہ ٹرین کے نیچے آچکی تھی۔ ٹرین کے جانے کے بعد سب لوگ موقع پر اکٹھے ہو گئے، حمنہ کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ اس کے برقع کے چیتھڑے اِدھر اُدھر اڑ رہے تھے۔ ہر طرف خون اور گوشت کے لوتھڑے تھے۔ نہ اس کا جسم باقی بچا تھا نہ اس کا سر اور نہ دھڑ...... یمنیٰ پاگلوں کی طرح چلانے لگی۔ اپنے سر کے بال نوچنے لگی۔ "حمنہ، حمنہ......" کہہ کر چلاتے ہوئے وہ ریلوے ٹریک پر بھاگ رہی تھی۔ لوگوں نے بہ مشکل اس کو ایمبولینس میں بٹھایا اور اسے اسپتال لے گئے۔

☆☆☆

"یمنیٰ ...... اور اسپتال میں...... یہ، یہ کیسے ممکن ہے؟" جمال صاحب نے فون پر حیرت سے چلاتے ہوئے کہا۔ جب ایمن نے انہیں روتے ہوئے فون کر کے آفس میں اطلاع دی۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں...... اسپتال سے فون آیا ہے، خدا کے لیے مجھے اس کے پاس لے جائیں ورنہ میں مر جاؤں گی۔" ایمن نے سسکتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں ابھی آرہا ہوں۔" جمال صاحب نے کہہ کر فون بند کر دیا اور ایمن رونے

آنسو

☆ محبت مسکراہٹ سے شروع ہو کر آنسوؤں پر ختم ہوتی ہے۔

☆ آنسو ہر موسم کے ساتھی ہیں۔

☆ قدرت کے آگے آنسوؤں کا ڈھیر لگاتا جا، کوئی آنسو تو اسے پسند آجائے گا۔

☆ جہنم کی آگ کو وہی آنسو بجھا سکتے ہیں جو وقتِ سحر مومن کی آنکھ سے ٹپکتے ہیں۔

☆ دنیا عاقل کی موت اور جاہل کی زندگی پر ہمیشہ آنسو بہاتی ہے۔

☆ توبہ کرنے والے کا ایک آنسو دوزخ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

☆ مصیبت کے وقت آنسو بہانا بہادری نہیں ہے۔

☆ مظلوم کی آنکھوں سے نکلا آنسو ظالم کے لیے سیلاب ثابت ہو سکتا ہے۔

مرسلہ: کرن فیاض...... راول پنڈی

لگیں۔ وہ بے صبری سے ان کا انتظار کرنے لگیں۔ یمنیٰ کا نمبر ملایا مگر موبائل ہی آف تھا۔

ٹیلفون کی بیل بجی تو ایمن نے فوراً ریسور اٹھایا۔

"ہیلو...... کون......؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ کیا...... آپ مسز جمال ہیں؟" دوسری جانب کسی عورت نے پوچھا۔

"جی...... جی...... میں بول رہی ہوں۔" ایمن نے دھڑکتے دل کے ساتھ جواب دیا۔

"کیا میں آپ کی بیٹی یمنیٰ سے بات کر سکتی ہوں۔ میں اس کی دوست حمنہ کی چچی بات کر رہی ہوں۔" عورت نے کہا۔

"یمنیٰ تو اس وقت اسپتال میں ہے۔" ایمن نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

"کیا...... لیکن وہ تو دوپہر کو بالکل ٹھیک تھی...... ہمارے گھر آئی اور حمنہ کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ اب

رات ہونے کو ہے، حمنہ کبھی اتنی دیر تک گھر سے باہر نہیں رہی۔ اس کے چچا اور میں ہم سب بہت پریشان ہو رہے ہیں، پلیز یمنیٰ سے پوچھ کر بتائیں کہ حمنہ کہاں ہے؟'' چچی نے فکر مندی سے کہا۔

''میں اور میرے شوہر ابھی اسپتال جا رہے ہیں، وہاں سب معلوم کر کے آپ کو انفارم کر دوں گی۔'' ایمن نے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد جمال صاحب آ گئے تو وہ ان کے ہمراہ اسپتال پہنچیں۔ یمنیٰ icu میں تھی اور اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے نیند کے انجکشنز دیے تھے۔

''یمنیٰ کو اسپتال کون لایا؟'' جمال صاحب نے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے انکوائری کرتے ہوئے پوچھا

''ایمبولینس کا ڈرائیور......'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''وہ اب کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' جمال صاحب نے کہا۔ ڈاکٹر نے ایمبولینس کے ڈرائیور کو بلایا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔

''آپ نے یمنیٰ کو کہاں سے پک کیا اور آپ کو کس نے اطلاع دی۔ کیا یمنیٰ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔ مجھے ساری بات تفصیل سے بتائیں۔'' جمال صاحب نے کہا۔

''بی بی کی دوست کی طبیعت خراب تھی۔ شاید اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔ ریلوے پھاٹک پر میں نے گاڑی روکی تا کہ ٹرین گزر جائے مگر ان کی دوست نے ٹرین کے نیچے آ کر خود کشی کر لی اور بی بی اس کو دیکھ کر اتنی بدحواس ہوئیں کہ پاگلوں کی طرح بھاگتی رہیں اور پھر گر گئیں۔'' ڈرائیور نے بتایا تو جمال صاحب اور ایمن پریشان ہو گئے۔

''کیا...... اس لڑکی نے خود کشی کر لی...... مگر کیوں......؟'' ایمن نے گھبرا کر پوچھا۔

''معلوم نہیں...... شاید اسے کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔'' ڈرائیور نے بتایا۔

''اونو......'' جمال صاحب بڑبڑائے اور پھر خاموش ہو گئے۔

''آپ لوگوں نے ان لوگوں کو کہاں سے پک کیا تھا۔'' جمال صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''ڈیفنس کے ایک علاقے سے۔ میرے پاس اس کا ایڈریس لکھا ہے۔'' ڈرائیور نے اپنی جیب سے ایڈریس نکال کر دیا۔

''اور اس لڑکی کی لاش کہاں ہے؟'' ایمن نے پریشانی سے پوچھا۔

''لاش کیا سر...... اس کا تو نام و نشان باقی نہیں رہا...... سوائے خون کے...... جو ریل کے پٹڑیوں پر لگا تھا۔ وہ بے چاری تو......'' ڈرائیور آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

''یا خدایا...... یہ سب کیا ہو گیا ہے۔'' ایمن روتے روتے بولیں اور ان کا موبائل بجنے لگا۔

''میں انہیں کیا جواب دوں......؟ حمنہ کی چچی کا فون آ رہا ہے۔'' ایمن نے تاسف سے کہا۔

''کچھ نہ کچھ تو بتانا پڑے گا، تم انہیں اسپتال بلاؤ اور پھر آرام سے سمجھا دینا۔ میں اس جگہ جاتا ہوں۔ جہاں کا ایڈریس اس نے دیا ہے۔'' جمال صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا اور ایمن پریشانی سے انہیں دیکھنے لگیں۔ ان کا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ انہوں نے پریشانی سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے موبائل کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر بات کرنے لگیں۔

''آپ اسپتال آ جائیں۔'' ایمن نے آہستہ آواز میں اسپتال کا نام بتا دیا۔

''کیا حمنہ اسپتال میں ہے، اسے کیا ہوا ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے ناں؟'' اس کی چچی بہت بے صبری سے پوچھتی رہیں مگر ایمن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہیں اور موبائل آف کر دیا۔

(باقی آئندہ)



اس شب کی سحر نہیں

رضوانہ پرنس

نمرہ جیسے خوشی سے حواس باختہ ہوئی جا رہی تھی۔ چہرے پر اتنے خوب صورت رنگ بکھر رہے تھے کہ عباد کی نگاہیں اس پر سے ہٹ ہی نہیں پا رہی تھیں لیکن وہ عباد کی وارفتہ نظروں سے بے نیاز اُن چمکتی دمکتی چوڑیوں کو ہاتھوں میں لیے اُلٹ پلٹ کر بار بار دیکھ رہی تھی۔ کبھی ان چوڑیوں کو ہاتھوں میں پہنتی اور کبھی اتار دیتی۔ آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے جھلملا رہی تھیں۔ بالکل ایک ایسی معصوم بچی کی

طرح ایکسائٹڈ ہورہی تھی وہ جسے اس کا من پسند کھلونا مل گیا ہو...... پھر اچانک وہ اٹھی اور عباد کے نزدیک آکر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''عباد آپ کتنے اچھے ہیں۔ میں کتنی لکی ہوں عباد...... میں کیسے شکریہ ادا کروں آپ کا۔'' جذبات میں وہ بے ربط جملے بول رہی تھی اور عباد مسکراتے ہوئے یک ٹک اس کے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے شانوں پر بکھری اس کی سیاہ زلفوں کو محسوس کررہا تھا۔ حسین آنکھوں میں چمکتے آنسوا سے موتیوں سے بھی زیادہ جھلملاتے ہوئے لگ رہے تھے۔ وہ اپنی نمرہ کی اس خوشی کی خاطر کتنے دنوں سے اوور ٹائم کررہا تھا۔ اس کے علاوہ چھٹی والے روز تین چار بڑے گھروں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کی ذمے داری بھی اس نے اپنے سر پر لی ہوئی تھی۔

نمرہ کتنی خفا خفا رہنے لگی تھی اس کی اس مصروفیت سے بلکہ کافی سرد مہری بھی آگئی تھی اس کے مزاج میں لیکن عباد اسے کچھ بھی بتا کر اپنے خوب صورت سرپرائز کو خراب نہیں کرنا چاہ رہا تھا سو اس کی ناراضی سہتا رہا۔ جانتا تھا کہ نمرہ کی یہ خفگی، یہ غصہ، یہ لڑائی جھگڑا کچھ ہی دنوں کی بات ہے جب وہ اپنی ویڈنگ اینورسری پر اپنی آنکھوں میں مدتوں سے چھپے ایک خواب کو حقیقت کے روپ میں بالکل اچانک دیکھے گی تو اس خوشی کا تو شاید کوئی بھی نعم البدل نہیں ہوگا اور آج ایسا ہی تو ہوا تھا۔

حسب توقع پچھلے ماہ اسے بونس بھی مل گیا تھا جس کی ہوا بھی اس نے نمرہ کو نہیں لگنے دی تھی کہ یہ پیسے بھی اس نے اپنے اس خوب صورت سرپرائز میں شامل کردیے تھے۔

☆☆☆

نمرہ جب بیاہ کر عباد کے اس چھوٹے سے فلیٹ میں آئی تو شادی کی دوسری ہی رات اس نے بہت معصومیت سے عباد سے شکایت کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اگر آپ سونے کا سیٹ دینے کے بجائے بس دو چار سونے کی چوڑیاں بری میں چڑھا دیتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔''

''اچھا...... کیا تمہیں ہمارا دیا ہوا سیٹ پسند نہیں آیا؟'' عباد نے کچھ افسوس سے پوچھا۔

''ارے نہیں، ایسی بات تو بالکل نہیں ہے دراصل امی نے بھی اچھا خاصا بھاری سیٹ خرید ا جبکہ میں نے انہیں کتنا منع کیا تھا کہ اس کے بجائے مجھے خالی چوڑیاں بنوادیں لیکن وہ مانی ہی نہیں اور چوڑیوں کے لیے پیسے ہی نہیں بچے۔'' وہ بھولپن سے بتاتے ہوئے کچھ رنجیدہ سی ہوگئی۔

''اوہو تم مجھے اگر پہلے ہی بتا دیتیں تو میں سیٹ کے بجائے چوڑیاں ہی آپا سے کہہ کر بری کے لیے بنوالیتا۔'' وہ دل ہی دل میں اس کے بھولپن پر نثار ہوتے ہوئے بولا۔

''واہ، کیسے بتا دیتی میں...... امی نے تو ڈیٹ فکس ہونے کے بعد مجھ سے موبائل بھی لے کر رکھ لیا تھا کہ کہیں آپ مجھے فون نہ کریں حالانکہ میری فرینڈز اپنی منگنی یا شادی طے ہونے کے بعد اپنے منگیتروں کے ساتھ باقاعدہ شاپنگ پر بھی گئی تھیں۔'' وہ اپنی امی کی باقاعدہ شکایت کرنے بیٹھ گئی تو عباد کو اپنی دلہن کی اس معصومیت پر بے طرح پیار آگیا۔

''تمہاری یہ ہی ادائیں، معصومیت بھرا حسن اگر مجھے پاگل کردیتا ہے تو اس میں میرا نہیں صرف اور صرف تمہارا قصور ہے۔'' عباد کے بہکے ہوئے لہجے پر نمرہ کو ایک دم سے اپنے دلہن ہونے کا احساس ہوا تھا اور اس نے شرم آمیز گھبراہٹ کے ساتھ بے اختیار چہرہ جھکا لیا۔ نمرہ کا تعلق ایک بہت ہی متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ تین بہنیں تھیں بھائی کوئی نہ تھا ابا ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھے اور بس سفید پوشی کے ساتھ ہی گزارہ ہورہا تھا۔ نمرہ اپنی بہنوں میں سب سے بڑی تھی ابھی وہ کالج میں آئی ہی تھی کہ اس

کی ایک مِس کو وہ اپنے بھائی کے لیے پسند آگئی۔ بہانے سے ایک بار عباد کو بھی اس کا دیدار کرادیا اور عباد کی رضامندی پا کر وہ بنا وقت ضائع کیے نمرہ کے گھر رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ رشتہ اچھا تھا عباد ایک فرم میں منیجر کی پوسٹ پر کام کررہا تھا۔ فیملی میں صرف وہی دو بہن بھائی تھے۔ ماں باپ کا انتقال ہوچکا تھا، بڑی بہن شادی شدہ اپنے گھر میں خوش باش اور بھائی کی جاب کے بعد اس کا گھر بسانے کی فکر میں تھی۔ کالج کی پرنسپل کی گارنٹی نے مزید سونے پر سہاگا کا کام کیا کہ وہ ذاتی طور پر بھی اس فیملی سے واقف تھیں سب سے اہم بات یہ تھی کہ لڑکے والوں کی طرف سے جہیز کی قطعی کوئی فرمائش نہیں تھی... بلکہ عباد نے سختی سے منع ہی کردیا تھا سو مہینے کے اندر اندر ہی نمرہ دلہن بن کر عباد کی زندگی میں آگئی۔ عباد کی بے رنگ زندگی میں جیسے رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ اس چاندی جیسی لڑکی نے آکر اس کے فلیٹ میں ہر طرف چاندنی سی بکھیر دی تھی۔ وہ خود بھی تو کسی سے کم نہیں تھا۔ چاند سورج کی جوڑی کا خطاب تو ان دونوں کو شادی والے روز ہی مل گیا تھا۔ نمرہ نے بہت پیار اور لگن سے اپنے گھر کی نئے سرے سے سیٹنگ کی جس میں عباد نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ بازار سے چھوٹی موٹی چیزیں خرید کر اپنے گھر کو سجاتے ہوئے وہ اس خوشی کو ایسے انجوائے کرتی گویا وہ لاکھوں کا سامان خرید لائی ہو اور عباد کو اس کی یہ ادا بھی بہت اچھی لگتی۔ عباد کے دل میں اب صرف ایک ارمان رہ گیا تھا کہ وہ نمرہ کی گوری گوری کلائیوں میں کانچ کی چوڑیوں کی جگہ سونے کی چوڑیاں پہنا کر اپنی محبوب بیوی کی وہ خواہش پوری کردے جس کا اظہار اس نے شادی کے دوسرے ہی دن بہت معصومیت سے کیا تھا لیکن پھر اپنی اس آرزو کو خاموش دکھ بنا کر اپنے دل کے اندر کہیں چھپا لیا تھا...... لیکن وہ اپنی ان آنکھوں کا کیا کرتی جو اس کے دل میں چھپی اس تمنا کو بنا کہے ہی عباد تک پہنچا دیتی تھیں۔ بازار میں کسی جیولر کی شاپ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی نظریں بے ساختہ شوکیس میں لگی ہوئی چوڑیوں سے الجھ جاتیں، کسی تقریب میں عورتوں کے ہاتھوں میں جگمگاتی سونے کی چوڑیوں کو دیکھتے ہوئے جو حسرت اس کی آنکھوں میں اترتی وہ جیسے عباد کے دل کو مسل ہی ڈالتی...... سو آج اپنی پہلی ویڈنگ اینورسری پر وہ اپنی جانِ من کو اس کی زندگی کی ایک بہت ہی بڑی خوشی دے کر سرخرو ہوگیا تھا۔ کتنی یادگار بن گئی تھی ان کی شادی کی یہ پہلی سالگرہ......

''عباد اگر رات کو آپا کی فیملی اور امی، ابا نہ آرہے ہوتے تو میں کبھی کچن میں نہ جاتی بس چوڑیاں پہنے ایسے ہی بستر پر بیٹھی انہیں دیکھتی رہتی۔'' وہ کلائیوں میں پڑی چوڑیوں کو کھنکھناتے ہوئے بولی تو عباد ہنس دیا۔

''میرا تو پہلے ہی دل چاہ رہا تھا کہ آج کا یہ... یادگار دن صرف ہم دونوں کا ہو لیکن تم ہی نے سب کو ڈنر پر انوائٹ کرلیا۔'' عباد نے اس کے چہرے پر آئی لٹ کو چھیڑتے ہوئے کہا تو وہ دھیمے سے مسکرا دی۔

''مجھے کیا پتا تھا کہ آپ اتنا بڑا سرپرائز دینے والے ہیں۔ کتنی چھپا کر رکھی تھیں یہ چوڑیاں آپ نے کہ مجھے بھنک بھی نہ پڑی۔ خیر رات جب آپا اور امی کو یہ چوڑیاں دکھاؤں گی ناں تو وہ حیران رہ جائیں گی۔'' وہ ایک بار پھر ایکسائٹڈ ہوگئی تو عباد نے اسے اپنی مضبوط بانہوں میں سمیٹ لیا۔

''میں تمہاری اس خوشی پر قربان نہ ہوجاؤں تو کیا کروں، سچ نمرہ میرا بس چلے تو میں ہر ماہ تمہیں ایسے ہی خوب صورت سرپرائز دیتا رہوں اور تمہارے چہرے پر بکھری خوشی کو اپنے دل میں اتارتا رہوں۔''

''نہیں بس یہ ایک خوشی ہی میری پوری زندگی کے لیے کافی ہے، ان خوب صورت لمحوں کو میں ہمیشہ

اپنے دل میں چھپا کر رکھوں گی۔'' نمرہ نے ہنستے ہوئے اس کے سینے پر سر رکھ دیا تب ہی موبائل کی بجتی بیل نے دونوں کو چونکا دیا...... دوسری طرف آپا تھیں جو بتا رہی تھیں کہ رات کو وہ بھی نہاری بنا کر لا رہی ہیں۔ ان سے بات کرنے کے بعد عباد نے شرارت سے نمرہ کو دیکھا۔

''یار اتنے خوب صورت رومینٹک ماحول میں آج پہلی بار نہاری کا ذکر ایک کونین کی گولی کی طرح لگا ہے۔'' جواب میں نمرہ کی ہنسی کی جلترنگ سے کمرا گونج اٹھا۔

☆☆☆

''افوہ عباد ساڑھے چھ بج رہے ہیں، پلیز یہ میچ دیکھنا بند کردیں اور شرافت سے اٹھ جائیں، آٹھ بجے تک سب لوگ پہنچ بھی جائیں گے۔'' نمرہ نے کچن سے جھانک کر کوئی تیسری مرتبہ اسے یاد دہانی کرائی۔

''یار اتنا انٹرسٹنگ میچ آرہا ہے کتنے دنوں بعد پاکستان فارم میں نظر آرہا ہے ایسی زیادتی تو نہ کرو میرے ساتھ۔'' وہ صوفے پر مزید دراز ہوتے ہوئے بولا تو وہ کچن سے باہر آکر ٹی وی کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ ہے عباد اگر آپ کا تھوڑا سا میچ مس ہوجائے گا تو کیا ہوا...... میں بھی تو نہیں دیکھ پا رہی ناں حالانکہ میرا سارا دھیان اس میچ میں لگا ہوا ہے۔'' وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑاکا بیویوں جیسے انداز میں بولی تو عباد کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

''اسی لیے تو کہہ رہا تھا کہ آج کا دن صرف اور صرف ہم دونوں کا ہی ہونا چاہیے تھا۔''

''افوہ عباد سارا دن تو ہم دونوں نے ساتھ گزارا ہے اب کچھ گھنٹے کچھ اپنے اتنے چاہنے والے رشتوں کو بھی دینے چاہئیں وہ بھی ہماری خوشی شیئر کرنا چاہ رہے ہیں۔'' وہ کچھ خفگی سے بولی گرین کلر کے کپڑوں میں وہ بہت کھلی کھلی اور فریش نظر آرہی تھی۔ گوری گوری کلائیوں میں کھنکتی سونے کی چوڑیاں جیسے اپنی قسمت پر ناز کررہی تھیں۔ عباد کا پتا نہیں کیوں دل چاہنے لگا کہ وہ یونہی اس کے سامنے کھڑی اس سے لڑتی، خفا ہوتی رہے اور وہ اسے دیکھتا رہے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟'' وہ اس کی وارفتگی محسوس کرکے کچھ بلش کرگئی آج وہ تیار بھی تو بہت جی جان سے ہوئی تھی اور پھر چوڑیوں کی خوشی نے چہرے پر مزید چمک بکھیر دی تھی۔ عباد بھی وائٹ شلوار قمیص میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ نمرہ نے چپکے سے اس کی نظر بھی اتار دی تھی۔ مہمانوں کے آنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا اور وہ کب سے عباد سے بیکری جاکر کیک لانے کا کہہ رہی تھی جو اس نے کل ہی آرڈر کردیا تھا۔

''ایمان سے نمرہ آج تم کچھ زیادہ ہی پیاری لگ رہی ہو، تم پر سے نظریں ہٹانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔'' عباد نے ایک دم ہی ٹی وی آف کردیا اور اٹھ کر بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

''ارے عباد، آپ کو کیا ہوگیا ہے؟'' وہ کسمسا کر اس کی بانہوں سے باہر آتے ہوئے بولی، آنکھوں میں حیا کے رنگ اتر آئے تھے۔ عباد کی اتنی والہانہ محبت پر خود اپنے آپ پر غرور آرہا تھا۔

''اچھا پھر تم بھی میرے ساتھ چلو۔ یہ تمہاری فیورٹ بیکری اتنی دور ہے کہ مجھے بائیک سے جانا پڑے گا۔ تم ساتھ ہوگی تو مجھے بوریت نہیں ہوگی۔'' عباد کا دل جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں، صرف پانچ منٹ کی ڈرائیو پر ہے بیکری اور پھر وہ آپ نے کھانے کا آرڈر دیا ہے۔ ہوم ڈیلوری والے کسی بھی وقت کھانا لے کر آگئے تو پھر......؟'' نمرہ کی بات میں وزن تھا، عباد نے دوپہر کو ہی ایک ریسٹورنٹ سے کھانا آرڈر کردیا تھا کہ آج وہ ہر پل اپنی دلہن کے ساتھ گزارنا

چاہ رہا تھا۔

''اوکے بیوی تو ہم چلتے ہیں۔'' وہ بادل ناخواستہ دروازے کی جانب بڑھا۔

''خدا حافظ......'' نمرہ نے شرارت سے اس کے سامنے اپنی چوڑیوں کو کھنکایا۔

''یہ چوڑیاں کھنک کھنک کر تھک جائیں گی انہیں تھوڑا سا ریسٹ دے دو۔'' عباد ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

''چوڑیاں بے شک تھک جائیں لیکن میں اپنی خوشی کا اظہار کرتے نہیں تھکوں گی۔'' نمرہ کی شوخ آواز اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے سنی اور مسکراتے ہوئے نیچے آکر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔ تبھی ایک گیند آکر اس کی بائیک پر گری اس نے گیند اٹھا کر سامنے دیکھا تو چار سالہ ننھا عابی بھاگتا ہوا اس کے سامنے آگیا۔

''انکل میری گیند......!'' اس نے معصومیت سے ہاتھ آگے پھیلا دیا۔

''اونہوں پہلے مجھے پیار کراؤ پھر گیند ملے گی۔'' عباد نے بے اختیار اسے گود میں اٹھا کر پیار کرلیا۔ گول مٹول سا ننھا عابی ساری بلڈنگ کے لوگوں کی آنکھوں کا تارا تھا پھر عابی کی فرمائش پر عباد نے کمپاؤنڈ میں ہی اسے بائیک کا ایک چکر دلایا اور جب وہ گیٹ کی طرف جارہا تھا تو کمپاؤنڈ میں بکھری رونق بچوں کا کھیلتے ہوئے شور وغل کتنی خوب صورت سی خوشی بکھری ہوئی محسوس ہوئی تھی اسے۔ انسان کے اندر کا موسم اچھا ہو تو ہر چیز حسین لگتی ہے اس نے مسکراتے ہوئے بائیک آگے بڑھا دی تھی۔

☆☆☆

کیک بہت خوب صورت بنا ہوا تھا خاص طور پر نمرہ نے اپنا اور عباد کا نام جس اسٹائلش طریقے سے کیک کے اوپر لکھوایا تھا وہ لکھے ہوئے نام بے حد اچھے لگ رہے تھے۔ عباد چند لمحے ان ناموں کو دیکھتا رہا، کل نمرہ نے اس بیکری میں کتنی دیر لگائی تھی۔ کیک سلیکٹ کرنے کے بعد سیلز مین کو کتنی تفصیل سے سمجھایا تھا کہ ناموں کو کیسے اور کہاں کیک پر لکھنا ہے۔

''جی سر...... پھر میں اس کو پیک کردوں؟'' سیلز مین نے اس کی محویت کو توڑتے ہوئے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا...... ابھی اس نے پے منٹ کرنے کے لیے جیب سے والٹ نکالا ہی تھا کہ شدید دھماکے کی آواز نے جیسے اس کے کان کے پردے پھاڑ دیے۔ پوری بیکری بری طرح سے ہل گئی۔ شوکیس میں رکھی کھانے کی اشیا دھڑ دھڑ کرتی نیچے گر گئیں۔ شیشے کا دروازہ چھناکے سے ٹوٹ چکا تھا۔ بیکری میں موجود سب ہی لوگ سراسیمہ ہوکر باہر کی طرف بھاگے۔ عباد بھی کیک بھول کر بے حد پریشانی کے عالم میں باہر آگیا۔ ایک خوف کا سماں تھا چار سو۔

''کہیں قریب ہی کوئی بہت بڑا بم بلاسٹ ہوا ہے۔'' لوگ آپس میں بات کررہے تھے۔

''ہاں، ہاں وہ دیکھو کتنے گہرے دھوئیں کے بادل اٹھتے نظر آرہے ہیں۔'' کسی نے سامنے دیکھتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بتایا تو عباد کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسی طرف تو اس کا فلیٹ تھا۔

''اُف جب یہاں تک اتنی شدت کی آواز آئی ہے تو یہ بلاسٹ تو شاید میری بلڈنگ کے بالکل نزدیک ہوا ہے۔ نمرہ کتنا ڈر گئی ہوگی کاش وہ میرے ساتھ ہی آجاتی۔'' عباد نے یہ سب سوچتے ہوئے تیزی سے...... بائیک اسٹارٹ کی اور اسے ہوا کی طرح اُڑاتا ہوا جب اپنی بلڈنگ کے نزدیک پہنچا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ حیرت، خوف اور شدید صدمے نے جیسے اس کے حواس معطل کردیے۔ وہ بالکل ساکت سامنے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کمپاؤنڈ جہاں اب سے کچھ دیر قبل زندگی تھی، رونقیں تھیں، خوشیاں رقص کررہی تھیں، ہنسی تھی، قہقہے تھے، بچوں کا شور شرابہ تھا، دکانیں گاہکوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اب وہاں ہر طرف ملبہ ہی ملبہ

نظر آ رہا تھا۔ بالکل سامنے فرسٹ فلو پر ہی تو اس کا فلیٹ تھا۔ اس کی جنت، اس کا آشیاں جس میں وہ اپنی نمرہ کے ساتھ رہتا تھا اور جسے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہنستا بولتا چھوڑ کر آیا تھا۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے فلیٹ کا تو نام ونشان ہی مٹ چکا تھا۔ روشنی سے معمور وہ جگہ اب اندھیروں میں ڈوب چکی تھی۔ جگہ جگہ آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور ان کی روشنی میں لٹے پٹے ہراساں اور خوفزدہ لوگ چیختے چلاتے اپنے پیاروں کو آوازیں دیتے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ وہ بری طرح سے کانپنے لگا، اس کی بائیک ایک طرف گر چکی تھی لیکن اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔

''نمرہ، نمرہ!'' دفعتاً وہ پوری قوت سے چیختا، چلاتا اس طرف دوڑا جہاں اس کی دنیا آباد تھی۔ اندھیرے میں مختلف اشیا سے ٹکراتا ہوا وہ دیوانہ وار صرف نمرہ کو ہی پکار رہا تھا۔ کتنے انسانی جسم اس کے پیروں کے نیچے آئے وہ گھبرا گھبرا کر اپنے موبائل کی روشنی میں ان کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگتا کہ کہیں نمرہ تو نہیں۔ اس کا رُواں رُواں نمرہ کی زندگی کی دعا کر رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے تبھی کسی چیز سے ٹکرا کر وہ زمین پر گر پڑا تو اس کا ہاتھ ایک ننھے سے سر پر پڑا اور پھر خوف اور وحشت سے جیسے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ موبائل کی روشنی میں سامنے ننھے عابی کا صرف سر پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ لرزتا ہوا زمین سے اٹھا، دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ پتا نہیں عابی کے ماں باپ کہاں تھے کس حال میں تھے ہر طرف لوگوں کی چیخ وپکار اور آہ وزاری کی آوازوں نے ماحول کو مزید وحشت ناک بنا دیا تھا۔ کوئی اپنے بچوں کو پکار رہا تھا، کوئی اپنے بھائی کو پکار رہا تھا کسی کا شوہر نہیں مل رہا تھا اور کسی کو اپنی ماں کی تلاش تھی۔ سامنے ہی اسے ایک عورت پڑی ہوئی نظر آئی جس کے سینے سے اس کا بچہ چمٹا ہوا تھا مگر اب وہ دونوں مر چکے تھے۔ عباد چلا چلا کر رونے لگا۔

''یا اللہ یہ کیا ہوگیا...... یہ کیسے منظر ہیں، ارے میرے مالک مجھ پر رحم کرنا۔ میری نمرہ کو کچھ نہ ہو۔'' وہ پوری آواز سے روتا ہوا نمرہ، نمرہ پکار رہا تھا۔ دیوانوں کی طرح ہاتھوں سے ملبہ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید وہ اندر دبی ہوئی ہو تبھی اس کے پڑوس کی حمیدہ باجی اپنے آٹھ سالہ بیٹے کو بہ مشکل تمام گود میں لادے چیختی ہوئی اس کے پاس آگئیں۔

''عباد بھیا، چلو جلدی سے میرے بچے کو اسپتال لے چلو، دیکھو آنکھیں نہیں کھول رہا...... شاید بے ہوش ہوگیا ہے۔ اس کی ٹانگ بالکل کٹ گئی ہے عباد اسے جلدی سے اسپتال پہنچا دو آج سلطان بھی حیدر آباد گئے ہوئے ہیں۔ ایک منٹ کی بھی دیر نہ کرو، میرا بچہ شاید بچ جائے۔'' وہ دیوانوں کی طرح چلا رہی تھیں۔ بہت سے لوگ جو جی جان سے ان مظلوموں کی مدد کرنے میں لگے ہوئے تھے ان میں سے کچھ لوگ حمیدہ باجی کے نزدیک آگئے۔ عباد کو تو خود اپنا ہوش نہیں تھا لیکن حمیدہ باجی کی بے قراری دیکھ کر ان نے لرزتے ہاتھوں سے شہزاد کو تھاما تو موت کی ٹھنڈک نے ایک لمحے میں بتا دیا کہ شہزاد اب اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔ اس نے برستی آنکھوں سے اس ماں کی جانب دیکھا جو اپنے بچے کی زندگی بچانے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔

''ارے تم لوگ دیر کیوں کر رہے ہو، دیکھو سامنے ایمبولینس کھڑی ہے جلدی لے چلو میرے بچے کو۔'' حمیدہ باجی نے بہت بے کسی سے رو کر کہا۔ مدد کے لیے آنے والے لوگوں نے شہزاد کو عباد کی گود سے لیا جو صرف رو رہا تھا، ایک عجیب ہذیانی سی کیفیت ہو رہی تھی اس کی، شہزاد ہر روز شام کو ایک گھنٹا نمرہ سے انگلش پڑھنے آتا تھا اور اس دوران عباد اس کی پیاری' پیاری باتوں سے خوب لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ نمرہ لاکھ آنکھیں دکھاتی لیکن وہیں براجمان رہتا۔ لوگوں نے شاید حمیدہ باجی کو ان کی زندگی کی بے حد تلخ حقیقت بتا دی تھی تبھی تو ان کی چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔

عباد ڈوبتے ہوئے دل سے آگے بڑھا تو سامنے اسے اپنا وہ صوفہ سیٹ بُرے حال میں نظر آیا جس پر لیٹا وہ کچھ دیر پہلے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح صوفے کے قریب آیا۔

''میری نمرہ بھی یہیں کہیں ہوگی۔ وہ یقیناً ملبے میں دب گئی ہے۔ کتنی تکلیف میں ہوگی وہ۔ ارے کوئی ہے جو میری مدد کرے۔ میری بیوی اندر دبی ہوئی ہے۔'' وہ ایک بار پھر پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ کسی ہمدرد نے اسے ٹارچ پکڑا دی تھی۔

''ابو، ابو!'' کوئی لڑکی روتے ہوئے اپنے باپ کو پکار رہی تھی لیکن عباد کو اب کسی آواز کا ہوش نہیں تھا۔

''آخر ملبہ اٹھانے کی مشین کیوں نہیں آرہی...... ارے کوئی فوج کو بلائے، گورنمنٹ کہاں ہے، کیوں نہیں بھیج رہی کسی کو۔ میری نمرہ ملبے میں دبی ہوئی ہے۔'' وہ بچوں کی طرح روتے ہوئے پاس جمع ہوئے لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ ہاتھوں سے ملبہ بھلا کیسے اٹھا سکتا تھا اور صرف عباد ہی نہیں بے شمار لوگ روتے چلاتے اپنے پیاروں کو ڈھونڈ رہے تھے۔

''ارے یہ کون ظالم لوگ ہیں جو اتنی بے دردی سے معصوم لوگوں پر اتنی بڑی قیامت توڑ گئے۔ کیا ان کے بچے نہیں ہیں؟ کیا ان کے گھروں میں ان کی مائیں، بیٹیاں، بہنیں کبھی ان کا انتظار نہیں کرتیں؟ معصوم بچوں اور عورتوں کو اسلام تو کیا کسی بھی مذہب میں مارنا جائز نہیں...... لیکن ان لوگوں کو تو عورتوں اور بچوں پر بھی رحم نہیں آیا۔ زندگی سے پیار کرنے والے جوان ایک پل میں موت کے اندھیروں میں اتر گئے۔ لمحوں میں بسے بسائے گھر جو کتنی محنت کے بعد خریدے گئے ہوں گے، بنائے گئے ہوں گے بالکل کھنڈر بن گئے۔ یہ کون لوگ ہیں مالک' اتنے معصوم بے گناہ لوگوں پر قیامت توڑ کر کیسے سکون کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ کیا انہیں نیند آجاتی ہوگی؟ کیا کھانے کا ہر لقمہ انہیں خون میں ڈوبا ہوا نہیں نظر آتا ہوگا۔ یا اللہ انہیں نیست ونابود کردے.... میرے مولا انہیں عبرت ناک سزا دے... انہیں کیوں زندہ رکھا ہوا ہے تو نے!' ہر دل سے بددعاؤں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ گورنمنٹ جو اپنے وطن کے لوگوں کی محافظ ہوتی ہے وہ ان معصوم لوگوں پر پڑنے والی قیامت سے بے نیاز تھی اور اس قیامت کی رات میں لاشوں، زخمیوں اور ملبوں کے درمیان وہ لوگ ان مظلوموں کی مدد کر رہے تھے جو اس وقت کسی ایک مسلک کے نہیں تھے بلکہ دردمند دل رکھنے والے تھے۔

اس وقت صرف ایک مذہب کہ جس کا نام انسانیت تھا اس کے ناتے مدد کر رہے تھے۔ عباد کی جیب میں رکھا ہوا موبائل بار بار بج رہا تھا لیکن اسے تو جیسے کوئی آواز ہی نہیں آرہی تھی۔ وہ تو دیوانہ وار نمرہ کو پکارتے ہوئے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ تبھی ایک صاحب نے اس کی توجہ موبائل کی بجتی بیل کی طرف کرائی۔

''دیکھیے صاحب، ہوسکتا ہے موبائل پر کوئی آپ کی بیگم کے بارے میں کچھ بتانا چاہ رہا ہو۔'' عباد نے چونک کر اس آدمی کی طرف دیکھا۔

''ارے ہاں' آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہوسکتا ہے وہ اپنے ابا کے گھر چلی گئی ہو یا پھر آپا کے پاس...'' وہ موبائل جیب سے نکالتے ہوئے کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ دوسری طرف نمرہ کے ابا ہی تھے۔

''ارے عباد تم فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے۔ تم لوگ کہاں ہو، نمرہ کیسی ہے؟'' انہوں نے بہت بے تابی سے پوچھا تو عباد کا دل مایوسی سے بیٹھ گیا۔

''انکل میں برباد ہوگیا...... ارے میں ختم ہو رہا ہوں، انکل میری نمرہ مل ہی نہیں رہی۔'' وہ زور زور سے رونے لگا۔ دوسری طرف سے بھی چیخوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ فون اس کے ہاتھ سے

چھوٹ گیا۔ آنسو سے تر چہرے کے ساتھ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، ایک عورت اِدھر سے اُدھر دوڑتے ہوئے نہ جانے کس کو پکار رہی تھی۔ کتنے لمبے چوڑے مرد بچوں کی طرح روتے ہوئے پتا نہیں اپنے کن پیاروں کو ڈھونڈ رہے تھے۔

کچن کا سامان ہر سو بکھرا ہوا تھا۔ سجے سجائے فلیٹ کیسے کھنڈر کا سا سماں پیش کر رہے تھے۔ اس کا چھوٹا سا فلیٹ بھی تو نمرہ نے کتنی خوب صورتی سے سجایا تھا۔ آج ہی تو اس نے اپنی جانِ جاں کو چوڑیاں پہنا کر اس کی زندگی کی ایک بڑی آرزو کو پورا کیا تھا۔ وہ ہنستی کھلکھلاتی زندگی سے بھرپور لڑکی پتا نہیں اس وقت کہاں تھی کن حالوں میں تھی...... شاید وہ زخمی ہوگئی ہو اور اسے اسپتال پہنچا دیا گیا ہو۔ ایک نئی سوچ نے امید کا چھوٹا سا دیا روشن کر دیا اس نے عجلت میں زمین پر پڑا اپنا موبائل اٹھایا اور آپا کو فون کیا۔

"ارے عباد میرے بھائی یہ کیا ہوگیا۔ نمرہ ملی کہ نہیں؟" آپا اس کی آواز سن کر تڑپ کر رو دیں۔

"آپا میں کیا کروں، اگر نمرہ نہیں ملی تو شاید میں بھی نہیں بچوں گا۔ خدا کے لیے آپا آپ ہر اسپتال میں جائیں شاید وہ زخمی ہو... مجھے جلدی سے خوش خبری سنائیں آپا ورنہ میں مر جاؤں گا۔" وہ بے قراری سے رو دیا۔ آپا نے جواب میں کیا کہا اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ بس دیوانوں کی طرح ٹارچ کی روشنی ہر سو ڈال رہا تھا۔ یہ شامِ غریباں جیسی کیفیت کیسی طویل ہوگئی تھی۔

ایسی راتیں بھی ہم نے دیکھی ہیں
جن کی صدیوں سحر نہیں ہوتی

ٹارچ کی روشنی میں اسے ایک بالکل نیا اور ننھا منا سا جوتا نظر آیا تو دل کٹنے لگا۔ تبھی بالکل اچانک اسے ایک کونے میں ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس نے بے اختیار ٹارچ کی روشنی اس طرف پھینکی تو جیسے ایک لمحے کو وہ ناقابلِ یقین کیفیت میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ اس شخص کی گود میں نمرہ کا ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ جس میں پہنی ہوئی سونے کی وہ چار چوڑیاں اسے صاف نظر آ رہی تھیں جسے وہ شخص اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کمینے......" عباد پوری قوت سے چلاتا ہوا اس شخص کے قریب آگیا تو وہ آدمی گھبرا کر کھڑا ہوگیا اور اس کی گود میں رکھا ہوا وہ ہاتھ زمین پر گر گیا۔ عباد نے پھٹی پھٹی نظروں سے اس ہاتھ کی جانب دیکھا جو اس کی نمرہ کا تھا۔ لیکن وہاں نمرہ کہیں نہیں تھی۔ صرف نمرہ کا یہ ہاتھ...... عباد تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ شخص گھبرا کر پیچھے ہٹا اور اس سے پہلے کہ وہ بھاگتا عباد نے جنونی انداز میں اسے پکڑ لیا۔

"تجھے یہ چوڑیاں چاہیے تھیں ناں، میں تجھے سب دے دوں گا۔ اپنی نمرہ کو میں اور چوڑیاں بنوا دوں گا بس تو یہ بتا دے کہ وہ کہاں ہے۔ اسی وقت جلدی بتا دے ذلیل انسان' ورنہ میں ابھی تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔" وہ جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ وہ آدمی بہت خوفزدہ ہوگیا۔

"مجھے معاف کر دیں جی، میں بہت غریب آدمی ہوں مجھے تو کونے میں یہ ہاتھ پڑا ملا تھا۔ باقی مجھے کچھ نہیں پتا۔" وہ آدمی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا۔ عباد کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اس نے نمرہ کے ہاتھ کو اٹھا کر سینے میں چھپا لیا۔ دیوانہ وار وہ اس کے ہاتھ کو پیار کر رہا تھا۔

"نمرہ دیکھو تمہاری چوڑیاں کھنک کر تھک گئیں۔ نمرہ میری جان۔" وہ اتنی بے کسی سے رو رہا تھا کہ آس پاس جمع ہونے والے لوگ بھی اس اندوہ ناک منظر کو دیکھ کر رو پڑے۔ نمرہ کے بے جان ہاتھ میں پڑی سونے کی چوڑیاں موت کے اس ٹھنڈے اندھیرے میں جیسے اپنی کھنک سے محروم ہو کر عباد کے ساتھ آنسو بہا رہی تھیں۔



محبت تمام شد

فاتنہ رابعہ

"اوہ میرے خدایا......!" سامعہ نے سر تھام لیا...... پورے سات ماہ اور تین دن سے اقصیٰ کی شادی کی تیاری میں ہلکان...... چھوٹی، چھوٹی جزئیات کا خیال رکھا۔ دن کا آغاز تمام نمٹانے والے کاموں کی پلاننگ سے ہوتا اور اختتام جائزے پر۔

ایم این اے کی اکلوتی بیٹی کی شادی اس میں کوئی کمی نہ رہنے پائے، جس طرح سے وہ اس تقریب کو مثالی اور یادگار بنانے کے لیے کوشاں تھیں شادی سے ہفتہ قبل اس کے تعریفی کلمات ان تک پہنچنا شروع ہوگئے تھے۔

"میں مسز چٹھہ بات کر رہی ہوں۔" سیل فون پر کال آئی۔

"السلام علیکم بھابی کیسی ہیں آپ؟" سامعہ کو خوشگوار سی حیرت ہوئی، جب سے چٹھہ صاحب چیمبر آف کامرس کے صدر منتخب ہوئے تھے گھاس ہی نہیں ڈالتے تھے...... مسز چٹھہ نے اس تاثراتی کیفیت سے نکالا۔

"میں کل الحسنات جیولرز پر گئی تھی، وہاں بالکل نیو اسٹائل میں چوڑیاں دیکھیں بہت پسند آئیں پتا چلا آپ کی ڈیزائننگ ہے، جیولر آپ کی چوائس کی بہت تعریف کر رہا تھا، کیا میں آپ کے ہاں آسکتی ہوں؟ اصل میں میرے بیٹے کی شادی ہے کوئی گولڈ سیٹ پسند نہیں آ رہا تھا۔"

"ضرور، ضرور یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے۔" سامعہ نے مسکرا کر کہا ایسے ہی درجنوں تبصرے انہیں

پورے شہر کے کونے کونے سے ملتے تھے۔ سامعہ کی چوائس، سامعہ کے کلر کمبی نیشن، سامعہ کا آرٹسٹک اور کری ایٹو ٹچ بس یہی فقرے کانوں میں رس گھولتے تھے...... پھر...... پھر یہ غلطی کہاں ہوئی؟ کیوں ان کے ذہن میں اس کا خیال نہیں آیا؟

''سمو دودھ پلائی کس سے کروانی ہے؟'' ایک لمحے کے لیے تو ان کا دماغ چکرا گیا تھا۔ جب ان کی نند ثروت نے دولھا کو اسٹیج پر بلانے کے بعد ان کے کان میں کہا۔

''اُف!'' دودھ پلائی کی رسم کا ان کے ذہن میں کیوں خیال نہیں آیا۔

''ک...... کیا...... دو...... دودھ پلائی؟'' زبان شاید ہکلائی تھی۔

''ہاں تو کیا دولھا کو دودھ نہیں پلانا؟'' نند نے ہنس کر کہا۔

''یہ کیا ہوا؟'' جب پچھلے ہفتے انہوں نے کالونی کی تمام بچیوں کو ہائی ٹی پر انوائٹ کیا تھا تو بارات کا استقبال ہی بس ایجنڈا تھا۔ ''پھولوں کے گجرے کس، کس نے پہنانے ہیں۔''

''بکے کس نے پکڑانا ہیں!''

''پھولوں کے ہار کس نے اور کس کو پہنانے ہیں!''

''پھولوں کی پتیاں کس، کس پر ڈالنی ہیں۔''

''دیکھو ماہا کوئی کمی نہ رہ جائے۔'' انہوں نے جی ایم کی بیٹی ماہا کو اس استقبالیہ ٹیم کا نگراں بناتے ہوئے کہا۔

اور واقعی جب شادی کی تقریبات کا ہفتہ قبل آغاز قرآن خوانی سے ہوا تو سب حق دق رہ گئے۔

''یہ...... یہ واہ! کیا زبردست سرپرائز ہے۔''

سفید چاندنیاں وائٹ پینٹ والا ہال دروازے کھڑکیاں چھت فانوس پینٹنگز ہر چیز سفید تھی۔ اس تقریب کے لیے سامعہ نے ان تمام بچیوں کو وائٹ سوٹ بنوا کر دیے تھے۔ وہ اور اقصیٰ دونوں سفید پریاں بنی ہوئی تھیں۔

شیفون کے سفید سوٹ جس پر سفید موتیوں ا نگوں کا کام تھا۔ سفید ہینڈ بیگ' وائٹ پرل کی جیولر اور یہ سب حسب توقع تھا۔ کارڈ پر یہ فرمائش کی گئی تھی یہاں تک کہ سیپاروں کی جلدیں تک سفہ کروائی گئی تھیں۔

سفید موتیے کی لڑیاں دروازے پر لہرا کر سر کا استقبال کر رہی تھیں...... بعد میں کھانا تک سفہ چائنا کراکری میں دیا گیا۔ دوسرے دن کی تقریبار کا نام ''مغلیہ'' تھا جس میں انڈین فلموں کی شادی طرز پر اقصیٰ کو مایوں بٹھایا گیا۔

یہ تقریب کل کی تقریب سے بھی زیادہ حیرا کُن رہی...... اس تقریب کے کارڈز پر مدعوین انوکھی فرمائش تھی کہ مغلیہ طرز کے لباس پہن آئیں...... غیر شادی شدہ لڑکیوں کو پشواز اور تنگ چوڑی دار پاجامہ جبکہ شادی شدہ کو راجستھانی لہنگے پہن کر آنے کا کہا گیا۔

مردوں نے حیدر آبادی لباس، تنگ پاجا۔ شیروانیاں پہنی تھیں۔

انڈین فلم ''مغل اعظم'' نے اتنا تو بتا دیا تھا سب کو کیسے استقبالیہ کلمات ادا کرنا ہیں۔ ماتھے ہاتھ لے جا کر کورنش بجا لا کر...... ادب آداب لحاظ...... تشریف رکھیے۔ وغیرہ...... وغیرہ......

بہت حسین تقریب تھی...... امیر خسرو اور سین کی روحیں بھی وجد میں آگئی ہوں گی۔

تین گھنٹے کی تقریب...... ہر گانا نگینے کی طر فٹ بہت سی داد و دہش لے کر لذتِ طعام دے مہمانوں کو ایک ملکہ کی طرح انہوں نے رخصت کر

تیسرے دن کی تقریب کا عنوان ''حنا'' تھا۔

مہندی ہو تو ایسی...... واہ......!

ہال کے در و دیوار تک پر مہندی کے درخت ٹہنیاں اپنی مخصوص خوشبو کا اثر دے رہی تھیں۔

انڈین فلموں کے وہ تمام گانے جو مہندی کی تقریب میں ہوتے ہیں آج سب کو سر دُھننے پر مجبور کر رہے تھے۔ سبز اور پیلے جوڑوں پر انہی دو رنگوں کی کانچ کی چوڑیاں پروئی گئی تھیں۔

ایک اور بات...... روزانہ کی تقریب کا مینیو الگ ہوتا...... دیسی اور بدیسی سب کے ذوق کو مدِنظر رکھا جاتا...... شوگر فری سویٹ کا ایسے وسیع پیمانے پر انتظام پہلی دفعہ دیکھنے میں آیا...... ڈائٹ کولا، کولیسٹرول فری کوکنگ آئل کا خیال رکھا گیا تو چٹ پٹے مرغن کھانوں والے بھی مایوس نہ ہوئے۔ جس نے کھایا...... پہلے یہی پوچھا کھانا کہاں سے بنوایا؟ شادی ہال میں پہنچنے سے قبل ہی سب شرکا کے لیے گودے کی مٹھائی کے پیک پہنچ چکے تھے۔

پیسہ پانی کی طرح بہانے کا سنا تھا، دیکھا اب...... کسی بھی تقریب میں کوئی ایک ایسا نہیں تھا کہ جو کمی ڈھونڈ پاتا...... زبردست، واہ، بہت خوب، یہ کلمات سرٹیفکیٹ تھے جو سامعہ اور اس کے شوہر جہانگیر چودھری ایم این اے کا ڈھیروں خون بڑھا رہے تھے...... مہینوں کی پلاننگ، ان تھک محنت اور ٹیم ورک سے ہر چیز خوب سے خوب تر ہو گئی...... پھر دودھ پلائی کی رسم کیوں ذہن سے نکل گئی۔

''چہ چہ...... اب کیا کروں؟'' ایک دم ذہن میں کوندا سا لپکا۔

''نند کی بیٹی تو بہت چھوٹی ہے، دیور کی بیٹی زارا کیا خوب رہے گی۔ ہے بھی بڑی چارمنگ، اوور کونفیڈنٹ...... ہے تو اولیول کی طالبہ لیکن لاکھوں میں ایک......'' زارا کا نام آتے ہی ساری کوفت دور ہوئی اور یکسو ہو کر زارا کی طرف بڑھیں...... داماد اسٹیج پر چڑھ چکا تھا اور فوٹو گرافرز کی فوج ظفر موج فوٹو شوٹ کے لیے موجود تھی۔

☆☆☆

ویسے تو نکاح کی پیڈ بہت زبردست تھی، پیکنگ ایسی شاندار کہ بندہ دیکھتا رہ جائے...... چاہو تو ڈیکوریشن پیس بنا کر سجا لو۔

سامعہ کی اپنی سمدھن سے ایک دفعہ ہی ملاقات ہوئی تھی بس ٹیلی فونک رابطہ تھا، وہ کینیڈا میں بڑے بیٹے کے پاس ہوتی تھیں اب شادی پر واسطہ پڑا تو مقابلے کی ہی لگیں۔ رفعت پراچہ ان کی سمدھن بیٹے کی بارات کے ساتھ سفید شیفون بریزے کے سوٹ میں ایسے سُبک خرامی سے آئیں کہ جس نے دیکھا بس حسن، وقار اور نزاکت کے اس مجسمے کو دیکھتا رہ گیا۔

سامعہ کا سر فخر سے مزید بلند ہو گیا...... اُدھر بھی کمی کسی چیز کی نہ تھی...... زوہیب کی سی اے کی ڈگری...... ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب...... چار کنال کی امریکن اسٹائل کوٹھی...... اور پراچہ صاحب کے پلازے اور سینما ہاؤس۔

بس صرف ایک اُڑتا پھرتا چھوٹا سا ننھا منا فقرہ رشتہ کروانے والے نے یہ کہا تھا کہ لڑکے کا مزاج کچھ تیز سا ہے...... جسے سن کر سب سے پہلے تو سامعہ ہنسی تھیں پھر جہانگیر صاحب نے خوب مذاق اڑایا...... اس لیے کہ ان کا تعارف بھی اپنی شادی کے وقت سسرال میں انہی لفظوں میں پہنچا تھا۔ اسٹیج پر پہنچتے ہی سلامیوں کے ساتھ دودھ پلائی کی رسم شروع ہوئی...... بغیر کسی گھبراہٹ کے بڑے اعتماد کے ساتھ زارا اسٹیج پر آئی۔

''دولھا بھائی! دودھ پلائی۔'' بلیک نیٹ کی لانگ شرٹ...... انتہا درجے کی خوب صورت کندھوں تک کی اسٹیپ کٹنگ کو بڑی ادا سے جھٹک کر اس نے دولھا کو مخاطب کیا اور دودھ کا گلاس پیش کرتے ہوئے کہا۔

''ارے واہ...... دولھا بھی اور ساتھ بھائی بھی، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' زوہیب ہنسا۔

''جی نہیں اپنے دولھا کو تو میں کبھی بھائی نہیں کہوں گی۔'' زارا نے نہلے پر دہلا مارا۔

"او......او......" زوہیب نے سیٹی بجائی۔ "میری دلہن آپ کی باجی اور میں آپ کا بھائی...... یہ تو ہمارا نکاح توڑ دیا آپ نے...... اب کیا کریں؟"

"وہ زوہیب بھائی......" ایک لمحے کے لیے زارا ہکلا گئی۔

"افوہ پھر بھائی......" زوہیب بدمزہ ہوا۔

"بس بھائی کے اگلے والا رشتہ کافی ہے۔" اس نے سرگوشی کی اور ساتھ ہی گرم سلگتا ہاتھ زارا کی کمر پر رکھ دیا۔

زارا کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی...... اس کی ساری بے باکی ختم ہوگئی۔

"دودھ پلائی تو لیتی جائیں۔" کسی کا فقرہ سنائی دیا۔

"ناک آؤٹ ہوگئی ہیں ہمارے ہیرو سے......" لڑکے والوں نے ہنس کر کہا۔

چند منٹ کے بعد صورتِ حال سے بے خبر سامعہ اور ثروت نے زارا کو پھر بھیجا۔

"پاگل...... شادی بیاہ میں تو بہت کچھ چلتا ہے۔ دودھ پلاؤ...... اور دودھ پلائی بھی لے کر آؤ۔" کچھ کچھ خفا سی زارا پھر اسٹیج پر آئی۔

"دودھ لے لیجیے دولہا صاحب۔" اس نے چبا چبا کر کہا۔ دودھ لیتے ہوئے وہی فلمی سچویشن...... جان بوجھ کر گلاس کے بجائے زارا کا ہاتھ دبا لیا۔

"زوہیب بھیا...... پلیز دودھ پلائی دیں۔"

"صرف دودھ پلائی...... ہم تو آج بہت کچھ دینے پر آمادہ ہیں، آپ مانگ کر تو دیکھیں۔"

"فی الحال تو نیلا نوٹ دے دیجیے۔" اس نے کہا۔

"ارے، ایک نیلا نوٹ کیا ناک آؤٹ ہوگئی ہیں؟" زوہیب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ پانچ ہزار کے کئی کڑکڑاتے نوٹ بغیر گنے اس کے آگے کیے۔ "لیجیے آپ نے تو ہرے نیلے نوٹ کا کہہ کر ہری جھنڈی دکھائی تھی ہم نے جذبات سے بھر یہ کڑک نوٹ آپ کے حوالے کیے۔"

"آج سے میرا دل اور یہ نوٹ آپ ہوئے......" دولہا کے ساتھی نے قہقہہ لگایا اور کہا۔

"اوہ...... اوہ......" لڑکوں نے ہوٹنگ وا انداز میں سیٹی بجائی۔ زارا گھبرا کر اسٹیج سے اتری...... ایسی سچویشن تو اس نے فلموں اور ڈرامو میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آ تھا۔ اسٹیج سے نیچے اترتے، اترتے دولہا کے دوست نے ٹشو اسے پکڑایا۔

زارا نے بغیر نظر ڈالے اسٹیج سے چھلانگ لگا دی۔

"اوئے کیا تو دولہا کے نوٹوں کی قیمت پوری کر چاہتا تھا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔" کسی من چلے بھرپور تبصرہ کیا۔ اس طویل ڈائیلاگ سیشن سے اقص نے پہلو بدلا۔ نہ جانے کیوں اسے کچھ عجیب سا لگا تھا۔

"کیا آج وہ اتنی خوب صورت نہیں کہ اس سے نظریں ہٹیں اور زارا پر ٹک جائیں۔" ا سوچوں میں اس سوچ کے اضافے کے ساتھ اقص زوہیب کے ساتھ رخصت ہوگئی۔

شادی کا ایک، ایک لمحہ مووی میکر کی مو میں موجود تھا۔

☆☆☆

شادی کے اگلے دن ہی یہ نیا نویلا جوڑا بنکاک یا پیرس کے بجائے کاغان، ناران روانہ ہوگیا۔ دونوں کو سی آف کرنے کے لیے سامعہ موجود تھیں۔ ان کی نظریں بار بار اقصیٰ کے چہرے کو ٹٹول ر تھیں...... دل میں بس ایک ذرّے جتنا شک سر ا رہا تھا۔

"کہیں اقصیٰ ناخوش تو نہیں......؟" ا شک کا گلا دبا کر انہوں نے ڈھیروں ڈھیر دعاؤ کے ساتھ رخصت کیا اور جہاز ٹیک آف کرنے تک ائرپورٹ پر موجود رہیں۔ وہاں پانچ چھ دن کے قیا

میں اقصیٰ کا صرف دو دفعہ فون آیا اور حال احوال پوچھنے تک ہی رہا...... اب ان کو پتا چلا کہ بیٹیاں بیٹیاں کم ماں کی سہیلیاں زیادہ ہوتی ہیں...... کئی تقریبات پر فیتے کاٹے...... مہمانِ خصوصی بنیں، دوبارہ جم جوائن کیا لیکن لمبے پہاڑ سے دن کٹنے میں نہیں آرہے تھے...... وہ باؤلی باؤلی سی بنی گھر میں گھومتیں۔ ہر پانچ دس منٹ کے بعد سیل فون پر اقصیٰ کا نمبر نکالتیں پھر اپنے آپ کو جاہل، اِل مینرڈ باور کر کے سیل فون ایک طرف رکھ دیتیں۔

''بھلا زوہیب کیا کہے گا یہاں بھی ٹپک پڑیں۔''

☆☆☆

ائرپورٹ پر قدم رکھتے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ فلائٹ پہنچ چکی ہے...... بے تابی سے سامعہ آگے بڑھیں۔

''اقصیٰ بیٹا۔'' انہوں نے لپک کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''زوبی بیٹا! آپ کیسے ہیں؟'' انہوں نے دور کھڑے داماد کے پاس جا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا۔

''اٹس او کے آنٹی......'' زوہیب ایک قدم اور پیچھے ہوگیا۔

اقصیٰ کے چہرے پر واضح ناگواری کی لہر آئی۔

انہوں نے خوش دلی سے دونوں کو ساتھ چلنے کو کہا۔

''نو آنٹی...... ڈرائیور باہر ہے۔'' خدا حافظ کہے بغیر بیگ ہاتھ میں اٹھائے وہ آگے بڑھ گیا۔

''یہ کیا بات ہے؟'' بے ساختہ ان کے منہ سے جملہ نکلا، جسے انہوں نے دانتوں تلے ہی دبا لیا۔ سامعہ بری طرح ہرٹ ہوئیں۔ کہیں زوہیب سن نہ لے...... اقصیٰ نے مڑ کر ماں کو دیکھا۔

اب ناگواری کی واضح لکیر ان کے ماتھے پر تھی...... ماں سے گلے ملنے کے لیے وہ آگے ہوئی۔

''جلدی کرو، دیر ہورہی ہے مجھے۔'' تیکھے لہجے میں زوہیب نے کہا...... اقصیٰ ہڑبڑا کر جلدی سے آگے بڑھ گئی۔



☆☆☆

''آنٹی اقصیٰ سے کہیں تیار ہوجائے، میں پہنچنے والا ہوں۔'' زوہیب نے ساس کو کال کی۔

''لیکن بیٹے وہ تو سو رہی ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' انہوں نے بڑے مسکین لہجے میں کہا۔

''لیکن وہ ہے کہاں، اس نے سیل آف کیا ہے۔'' وہ لفظ چبا چبا کر بولا۔

''بیٹے بتایا تو ہے وہ سو رہی ہے۔'' لہجے کو حتی الامکان نرم بناتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''تو یہ آواز کس کی باتوں کی آرہی ہے۔'' کڑوے لہجے میں اس نے کہا۔

''کون سی آواز......؟'' حیرانی سے انہوں نے پوچھا۔

''جو آپ سنانا نہیں چاہتیں...... اور فون اسی لیے آف کیا ہے کہ درمیان میں ڈسٹربنس نہ ہو۔'' سپاٹ سے انداز میں زوہیب نے کہا۔

''او میرے خدا......! یہ تو ٹاک شو چل رہا ہے۔''

''کس سے؟'' زہرخند لہجے میں زوہیب بولا۔

''ٹی وی پر، سنواؤں؟'' قدرے سخت لہجے میں انہوں نے کہہ کر سیل ٹی وی اسکرین کے آگے کیا۔

غصے سے دوسری طرف سے فون آف ہوگیا۔

اس دومنٹ کی کال میں بہت سے پیغام تھے...... بہت سے ڈراؤنے پہلو تھے۔ اقصیٰ کی زندگی کے مستقبل کے...... ابھی تو اُسے شادی کے بعد میکے آئے صرف دوسرا دن تھا، ہنی مون سے واپسی پر دس بارہ دن کے بعد تین چار دن کی اجازت لے کر آئی تھی۔

''ماما...... میری طبیعت سخت خراب ہے، کچھ نیند لینے کے بعد میں آپ کے اور پاپا کے ساتھ چائے لوں گی، اچھی سی......'' آتے ہی اس نے کہا۔ سامعہ نے نظر اٹھائی نہ تبسم نہ تکلم خالی چہرہ۔ شروع دنوں کے کوئی ارمان اس کے چہرے کو گل و گلنار نہیں کر پار ہے تھے۔

باتوں باتوں میں اتنا پتا چلا کہ زارا کے ساتھ اور بھی بہت سی لڑکیاں ڈسکس رہتی ہیں۔

''ہماری کلاس میں ایسے تو ہوتا ہے۔'' بجھے بجھے انداز میں انہوں نے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں ماما...... عورت کے اندر مرد کو ناپنے کا جانچنے، پرکھنے کا پیمانہ لگا ہوتا ہے، وہ بتا دیتا ہے کہ کون مرد کس عورت کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔''

''یہ چار دن کی شادی شدہ زندگی کے مشاہدات ہیں آگے کیا ہوگا؟'' سامعہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ سامعہ نے اپنے آنسو پونچھے... اور دکھی دل سے سوچا۔

اس فون کال نے تو اس کے صرف عورت کے بارے میں نہیں بیوی کے بارے میں تاثرات واضح کردیے تھے۔

''اُف......'' انہوں نے اپنے دل سے اٹھنے والی ٹیسوں پر بے اختیار کہا اور درد سے بے حال جھکتی چلی گئیں۔



☆☆☆

ہارٹ کیئر سینٹر کے آئی سی یو میں دو دن رہنے کے بعد ان کو اسپتال کے پرائیوٹ روم میں منتقل کیا گیا تو ان کے ذہن میں ایک ہی سوچ تھی۔

اقصیٰ! اقصیٰ کا شوہر...... اس کی بد مزاجی شک، طبیعت کی تیزی۔

''پتا نہیں اقصیٰ کیسے زندگی بسر کرے گی؟'' اگر حکومتی اختیارات یا مال کی وجہ سے مزاج بدلے جاسکتے تو وہ الہ دین کے جن کی طرح زوہیب کی ہر دماغی ٹھیک کردیتیں۔

''پلیز آپ سوچیے مت......'' سسٹر آکے انہیں ریلیکس کرتی۔

''کیسے نہ سوچوں...... ماں ہوں، اقصیٰ میرے وجود کا ٹکڑا ہے آنسو پینے سے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا۔''

گھنٹے بھر کی ہدایات لے کر وہ واپس گھر آگئیں، ان چھ سات دنوں میں زوہیب بس ایک دفعہ اسپتال آیا تھا۔ وہ ڈر کے مارے اقصیٰ سے شکوہ بھی نہ کرسکیں۔

''وہ اس سے دکھی ہوگی...... اور اس کے دکھ سے میں دکھی ہوجاؤں گی......'' آنسوؤں نے تو جیسے ان کی آنکھوں کو اپنا مسکن بنالیا...... موتیوں کی لڑی کی طرح بہہ نکلتے۔

اقصیٰ نے ماں کی حالت دیکھ کر اپنے آپ کو مطمئن اور پُرسکون ظاہر کرنے کے لیے دل لگی کے چھوٹے چھوٹے فقرے بولنا شروع کیے لیکن سامعہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

اس کا چہرہ اس کی باتوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا اور دونوں ماں بیٹی اس بات کو بخوبی جانتی تھیں۔ بس صدمہ تھا صرف ایک بات کا، دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ کاش......

اے کاش شادی کی تیاریوں میں سوئی کی نوک جتنی چیز کا باریک بینی سے خیال رکھنے والی سامعہ نے جہیز میں کشمیر کی شال، اٹلی کے جوتے، چینیوٹ کے فرنیچر خریدنے والی ماں نے پی سی ہال کی بکنگ سے باراتیوں کے استقبال کے لیے ہر چیز یادگار فراہم کرنے والی عورت نے داماد کے لیے برانڈڈ تھری پیس سوٹ سے انتیس لاکھ کی نئی گاڑی کے منفرد ماڈل منتخب کرنے والی ماں اور بیٹی نے بس مزاج ذرا تیز ہے کو مدِنظر کیوں نہیں رکھا؟ محبوب ﷺ خدا نے اخلاق (دین) کو ہی تو پہلے سامنے رکھنے کی تلقین کی تھی۔ اب اگر پتا چلا بھی کہ چیزوں کی دو چار دن واہ واہ ہوجائے گی قابلِ رشک ٹھہرائی جائیں گی فنا ہوجائیں گی، پر مزاج تو سدا یہی رہے گا اور بہت سی محنتوں، مشقتوں کے بعد فطرت نے تبدیلی کا لبادہ اوڑھا بھی تو گئے دنوں کا حساب کون دے گا؟





شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 2

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر و شر، نیکی او ربدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

''جب ایک بار زندگی میں غلطی ہو جائے تو پھر اس پر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، غلطی کے نتائج جو بھی سامنے آئیں ان میں سے مثبت کی طرف نظر کرنا بہتر ہوتا ہے۔'' محمود دُرّانی نے اپنے مخصوص ٹھہرے لہجے میں مہرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اگرچہ اس بے وقت کی بڑبڑاہٹ کا پس منظر نہیں جانتے تھے جو مہرین نے ان کے دفتر سے واپس آنے کے بعد سے اب تک شروع کر رکھی تھی مگر اس کا مفہوم و مقصد ضرور سمجھ گئے تھے۔

''یہ لڑکا ہر جگہ مجھے شرمندہ کروانے کا تہیہ کیے بیٹھا ہے اگر اس کے انداز اتنے واضح نہ ہوتے تو سعدیہ کی کیا مجال تھی کہ کُرید کر اس کے بارے میں مجھ سے سوال کرتی۔'' مہرین کے لہجے میں غصہ اور بے بسی دونوں موجود تھے۔

''میرا نہیں خیال کہ وہ دانستہ ایسا کرتا ہے۔'' محمود نے بیٹے کی طرف داری کی جرأت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس کے مزاج سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اتنا ہی بے ساختہ اور سادہ ہے کہ بنا کر یا بڑھا کر کوئی بات اپنے بارے میں کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔''

''وہ جیسا بھی ہے اسے کیا ضرورت پڑی ہے دوسروں کو یہ تاثر دینے کی کہ وہ ہم سب گھر والوں سے، اپنے ماں باپ سے، اپنے بہن بھائیوں سے بالکل مختلف مزاج اور الگ شخصیت کا حامل ہے۔ صرف اس لیے کہ......'' مہرین کے غصے اور بے بسی نے ان پر مکمل طور پر قابو پالیا اور وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکیں۔

''صرف اس لیے کہ اسے اس کی ماں کے بجائے اس کی نانی نے پالا ہے۔ اس کی تربیت نانی کے ہاتھوں ہوئی ہے اور یہ کہ اس کی ماں اور نانی کے مزاج میں بہت فرق تھا اس لیے وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ایک بالکل مختلف شخصیت رکھتا ہے۔'' محمود نے کمالِ تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے نرمی سے مہرین کی ادھوری چھوڑی بات کو مکمل کیا۔

''ہوں......'' مہرین نے ہنکارا بھرا۔

''تو مائی ڈیئر وائف......'' محمود نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ''یہ کون سی بڑی بات ہے، ہمارے خاندان والے، ہمارے عزیز و اقارب کون نہیں جانتا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ حمزہ آپ کی گود میں نہیں اپنی نانی کے ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے، اس نے اپنی زندگی کے کئی سال اپنے ماں باپ کے گھر سے ایک بالکل مختلف ماحول میں گزارے ہیں اس لیے اس کی شخصیت اور مزاج ہم لوگوں سے چنداں مختلف ہے۔ اس میں شرمندہ ہونے یا ناراض ہونے والی بات کون سی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حمزہ کو آپ نے بی اماں کے حوالے جب کیا اس وقت آپ کتنی مجبور تھیں۔ آپ کی خرابیٔ صحت اور پہلے سے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ نے آپ کو ایسا کرنے کے لیے مجبور کیا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بی اماں کون سا کوئی غیر خاتون تھیں۔ آپ کی اپنی والدہ تھیں، ایسے وقت میں انہوں نے کیسے آپ کا ساتھ دیا، ان کی عمر زیادہ نہ تھی، بہت ہمت والی اور ایکٹو خاتون تھیں، ایک بچہ پالنا ان کے لیے مشکل نہیں تھا سو انہوں نے حمزہ کو بہت اچھے انداز میں پالا۔ مہرین، میں سمجھ نہیں پا رہا کہ اس جھنجلاہٹ کی وجہ کیا ہے؟''

''آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ وجہ کیا ہے۔'' مہرین نے خفگی سے کہا۔ ''ہمارے سب رشتے دار ہمارے اسٹیٹس اور رہن سہن سے خار کھاتے ہیں حالانکہ یہ اللہ کا دیا ہوا ہے مگر کیونکہ ان کی رسائی میں نہیں ہے اس لیے اپنے دلوں کے پھپھولے یوں پھوڑتے ہیں کہ حمزہ کی شخصیت کے مختلف ہونے کا ذکر کر کے اسے ہمارے گھر کے ماحول میں مِس فٹ خیال کرتے ہیں اور وہ لڑکا جو میرا اپنا سگا بیٹا ہے ان کی باتیں سن کر مجھے خود سے اور بھی دور

کھڑا نظر آتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ بی اماں نے اسے حد درجہ محنت کر کے اتنا مختلف بنا بھی دیا۔ میرے اور اس کے مزاج میں ہم آہنگی آہی نہیں پائی۔ میں مشرق کی بولوں تو اس کا جواب مغرب کا ہوتا ہے، میں زمین کی کہوں، وہ آسمان کی سناتا ہے۔ اسے ہمارا رہن سہن، ہمارے طور طریقے پسند نہیں، اس گھر میں اسے اپنا آپ مِس فٹ ہی لگتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں وہ گھر سے باہر رہنے کو کتنی ترجیح دیتا ہے۔ گھر میں رہتا بھی ہے تو یوں جیسے کوئی اجنبی، جیسے کوئی مہمان، یہ بہت زیادہ ہے، بہت زیادہ۔'' مہرین کے دل کی بات زبان پر آنے لگی۔

''اوہ تو اصل بات یہ ہے۔'' محمود کو احساس ہوا کہ مہرین کی جھنجلاہٹ کے پیچھے اصل مسئلہ کیا تھا۔ ''اسے ابھی ہمارے پاس آئے کتنا عرصہ ہوا ہے۔'' وہ انہیں سمجھانے لگے۔ ''کسی دوسرے ماحول میں جا کر سیٹ ہونے میں ٹائم تو لگتا ہے، اتنے سارے فرق اور تضاد کے باوجود یہ حقیقت تو جھٹلائی نہیں جا سکتی ناں کہ وہ آپ کا بیٹا ہے اور آپ ہی کا بیٹا رہے گا۔ باقی شخصیتوں کے تضاد اور فرق کو اتنا بڑا مسئلہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ ایسا تو ایک ہی گھر میں پلنے بڑھنے اور ایک ہی ماں کے ہاتھوں پرورش پانے والے بچوں کے درمیان بھی ہو سکتا ہے۔''

محمود اپنے تئیں ایسی باتیں کر رہے تھے جو مہرین کو اپنے ذہن میں سمائی بات جھٹک دینے میں معاون ثابت ہو سکتی تھیں لیکن مہرین خود جانتی تھیں کہ ایسا محض کہہ دینا آسان تھا اصل حقیقت مختلف تھی۔ حمزہ کا مزاج اسے کبھی اس ماحول میں سیٹ ہونے کی اجازت نہیں دینے والا تھا۔ انہیں کبھی کبھی شدید خواہش ہوتی کہ وہ وقت کا پہیا الٹا گھما دیں اور اس زمانے میں پہنچ جائیں جب حمزہ کو انہوں نے بی اماں کے حوالے کیا تھا۔ جب ان کی کم عمری، ذمے داریوں، اوپر تلے کے تین بچوں اور صحت کی خرابی نے ان کی عقل ماردی اور ہوش اُڑا دیے تھے۔ ایسے میں بی اماں انہیں کیسا فرشتہ محسوس ہوئی تھیں مگر اتنے سال گزر جانے کے بعد جب وہ ایک خوشحال، آسودہ اور پُرسکون زندگی گزار رہی تھیں، انہیں خیال آتا تھا کہ اگر اتنا عرصہ پہلے بھی وہ شعور اور سمجھ میں اتنی ہی پختہ ہوتیں جتنی اب تھیں تو کبھی حمزہ کو خود سے جدا نہ کرتیں۔ انہیں اب پچھتاوا محسوس ہوتا اور حمزہ کی موجودہ شخصیت سے اختلاف بھی۔

☆☆☆

نادیہ نے زندگی کو ان تصورات سے مختلف پایا تھا جو لڑکپن اور اوائلِ جوانی میں ذہن میں آتے تھے۔ انہیں اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالنے کا کوئی خاص شوق تھا نہ ہی انہیں اس کی فرصت ملتی تھی مگر کبھی کبھار ایسا ہوتا تھا کہ راتیں طویل ہو جاتیں اور نیند دور بھاگ جاتی تھی۔ نیند کی خواہش کرتے کرتے ذہن کی رو بھٹکنے لگتی اور بہت سی پرانی یادیں اور پرانی باتیں یاد آنے لگتیں۔ کبھی کبھار یہ یادیں اور باتیں احتساب کا درجہ اختیار کر لیتیں۔ ایک۔ ایک لمحے کا شمار ہونے لگتا۔ کب کہاں کیا غلط ہوا؟ کب، کہاں، کیا نہیں ہونا چاہیے تھا جو ہوا اس کے بجائے کیا کرنا چاہیے تھا؟ کہاں، کہاں ایک درست فیصلہ حالات کو بہتر شکل دے سکتا تھا؟ کہاں، کہاں جذبات سے کام لینے سے زندگی کا نقشہ بدل گیا؟ کہاں عقل نے ساتھ نہیں دیا؟ اور کہاں حالات کو مقدر جان کر سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ رات کی گھڑیاں بیتتی جاتیں اور احتساب کا دورانیہ بڑھتا جاتا۔

پھر انہیں خیال آتا کہ زندگی میں جو مختلف کردار انہیں نبھانے پڑے انہیں، انہوں نے کیسا نبھایا۔ انہیں اپنی ہر پرفارمنس میں غلطیاں نظر آتیں، کبھی وہ ایک بیٹی اور ایک بہن تھیں۔ انہوں نے ان دونوں حیثیتوں کو بری طرح لیٹ ڈاؤن کر دیا۔ ان دونوں حیثیتوں کو لیٹ ڈاؤن کرنے کے پیچھے کسی کی بیوی بننے کی خواہش کو دخل تھا۔ وہ سعید کیانی کی محبت میں گرفتار ہو گئیں، یہ ان دنوں ہوا جب وہ دونوں میڈیکل کے فائنل ایئر میں

تھے۔ چار سال تک اکٹھے پڑھنے اور اٹھنے، بیٹھنے کے بعد اُن پر انکشاف ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چا لگے تھے۔ نادیہ کے لیے یہ ایک انوکھا انکشاف تھا مگر سعید کیانی کے اظہار پر انہیں بالکل بھی برا نہیں لگا بلکہ محسوس ہوا کہ وہ خود بھی ایسا ہی چاہتی اور سوچتی تھیں۔ ہاؤس جاب کے دوران ان کی ذہنی ہم آہنگی بہتر گئی اور انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ ایک دوسرے کے بغیر ان کی زندگی ناممکن تھی۔

سعید نے اپنے بھائی کے ذریعے ان کے ہاں شادی کا پیغام پہنچایا جسے بری طرح مسترد کردیا گیا۔ نادیہ شبیر محبت کرتے ہوئے بہت سے زمینی حقائق فراموش کر بیٹھی تھیں۔ انہیں بھول گیا تھا کہ ان کے خا میں ذات پات، خاندان اور پس منظر کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ ذات، برادری سے باہر شادی کر ناقابلِ معافی سمجھا جاتا تھا، اسی لیے زیادہ تر اپنے خاندان میں ہی شادی کرنے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ سعید ایک بالکل مختلف ذات اور برادری سے تعلق رکھتے تھے، ان کے بھائی کی تو ایک سے دوسری بات بھی نہیں گئی۔ وہ زمانہ ایسے حالات کو من وعن تسلیم کرلینے کا تھا مگر نادیہ کے ذہن ودل نے بغاوت کردی۔ انہوں اپنے والدین اور بھائیوں کے سامنے صاف الفاظ میں احتجاج کیا اور فیصلہ سنا دیا کہ وہ ہر صورت سعید کیانی شادی کریں گی۔ درمیان کے عرصے میں حالات نے کئی پلٹے کھائے، سعید کے گھر والوں نے نادیہ کے وال کی مرضی کے بغیر شادی کرنے سے انکار کردیا مگر ان دونوں کو پھر بھی من مرضی کرنے سے نہ روکا جاسکا۔ اور بغاوت کورٹ میرج پر منتج ہوئی اور ان دونوں کا اپنے والدین سے تعلق ختم ہوگیا جس طرح یہ کہانی نئ تھی اسی طرح اس کے نتائج وعواقب بھی نئے نہیں تھے۔ کورٹ میرج کے بعد زندگی میں قدم جمانے کا م آیا۔ دونوں نے ایوب میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا تھا، اس شہر سے دونوں ہی واقف تھے سو دونوں اسی شہر میں قیام کا فیصلہ کرلیا۔ دونوں کے خیال میں انہوں نے ایک جائز کام غلط طریقے سے کیا تھا۔ دو کے ذہنوں پر اس کا بوجھ تھا، اس ذہنی بوجھ نے دونوں کو ہی سماجی زندگی سے دور کردیا۔ لوگ ان کے با میں سو طرح کی باتیں سوچ سکتے تھے، وہ اتنے تنہا کیوں تھے، کوئی ان سے ملنے کیوں نہیں آتا تھا؟ ان والدین اور عزیز واقارب کہاں تھے؟ سعید سے زیادہ نادیہ کے ذہن پر اس کا بوجھ تھا، سعید کا ساتھ دنیا کی بڑی نعمت تھا مگر اس نعمت کے حصول کے لیے جو کچھ انہوں نے گنوایا اس نقصان کا تخمینہ لگانا ناممکن تھا۔ ا نے خود کو اپنے کام میں بری طرح مصروف کرلیا۔

شادی کے تین سال بعد ان کے ہاں علینہ آگئی‘ دونوں کے لیے یہ موقع بھی خوشی اور افسوس کا احساس لے کر آیا۔ خدا تعالیٰ نے انہیں ایک نعمت سے نوازا تھا مگر اس نعمت کی خوشی منانے کے لیے اکیلے تھے۔ ان کے چند ایک انتہائی قریبی دوستوں نے ان کے والدین سے رابطہ کرنے اور انہیں منا کوشش کی مگر ناکام رہے۔ یہ زندگی جس کے لیے دونوں نے ہی بڑی قربانی دی، دونوں کے لیے سب ہونے کے باوجود دونوں کو بوجھ ...محسوس ہونے لگی۔

”یا تو کوئی بڑا قدم اٹھاؤ نہیں، جب اٹھالو تو پچھتاؤ نہیں۔“ نادیہ کی ایک پرانی دوست نے ایک سے کہا تھا مگر وہ ان الفاظ کی روح کو قبول نہ کر پائی تھیں۔ پچھتاوؤں نے ان کے دل میں گھر کرلیا افسردہ اور ناخوش رہنے لگی تھیں مگر خدا کا شکر ہر حال میں کس قدر ضروری تھا، اس کا خیال انہیں اس وق جب صرف بتیس سال کی عمر میں سعید اچانک ہارٹ فیلئر کا شکار ہوگئے۔ یہ اتنی غیر متوقع بات تھی کہ نادیہ ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی گنگ رہ گئے جو انہیں صرف جانتے تھے۔

”پچھتاوے، دکھ اور افسوس اپنے وقت پر ہی اچھے لگتے ہیں۔ وقت نکل جائے تو انسان کو ہر حال میں خوش رہنے کی عادت ڈال لینی چاہیے ورنہ بڑا نقصان ہوجاتا ہے۔“

اس وقت انہیں سعید کی کہی ہوئی ایک پرانی بات بھی یاد آئی مگر انہیں لگنے لگا تھا کہ اب ان کی زندگی میں پچھتاوؤں کے سوا کچھ رہ نہیں گیا تھا۔ اس موقع پر بھی ان کو ان کے لواحقین نے نہیں پوچھا تھا گو یہ خبر دونوں کے گھرانے تک پہنچ چکی تھی۔ حالات کی اس سختی نے نادیہ کو حد درجہ بے حس بنا دیا تھا۔ انہیں اپنی زندگی میں کچھ خاص دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ایک خاص قسم کی میکانکی زندگی گزارنے کی عادی ہونے لگی تھیں۔ اس مشینی زندگی کے اثرات ان کے اس مختصر گھر اور علینہ پر کس طرح اثر انداز ہورہے تھے یہ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ انہیں صرف اتنا یاد تھا کہ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ پچھتاوؤں کا شکار ہوگیا تھا اور باقی کا حصہ اپنی بقا کی جنگ لڑتے گزر جانا تھا۔ زندگی میں ان کا بہت بڑا نقصان ہوگیا تھا اور اس نقصان نے ان کے دل پر بہت بری طرح اثر کیا تھا۔ زندگی اسی ڈھنگ سے گزر رہی تھی اور اس کو اسی طرح گزر جانا تھا مگر ان کو شاید کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ان کی اس ذہنی تنہائی نے علینہ کو کس قدر تنہا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ڈرامے کے کسی کردار سے بھی انصاف نہیں کرسکی تھیں۔ بیٹی کی حیثیت سے انہوں نے ماں باپ کو لیٹ ڈاؤن کردیا تھا، بیوی کی حیثیت میں انہوں نے وہ مختصر وقت پچھتاوؤں میں گزار دیا اور ماں کے کردار تک آتے، آتے بے حسی ان کے گرد گھیرا تنگ کرچکی تھی۔ وہ سوچتی تھیں، یاد کرتی تھیں، پچھتاتی تھیں مگر خود کو بدل ڈالنے کا عہد کبھی نہ کرپائیں، طویل تاریک اور سرد راتیں یونہی بیتتی چلی گئیں۔

☆☆☆

بینش نے کپڑے دھو کر نچوڑے اور رنگ برنگے کپڑوں سے بھری نیلے رنگ کی بالٹی اٹھائے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چھت پر دھوپ تیز تھی، اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کندھے پر رکھے خشک کپڑے سے اس نے الگنی جھاڑی اور بالٹی میں رکھے کپڑے ایک، ایک کرکے جھٹک، جھٹک کر سوکھنے کے لیے پھیلانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے اردگرد کے منظر کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ اونچی نیچی چھتوں والے بے شمار گھر ایک دوسرے کے ساتھ جڑے کھڑے تھے۔ یوں جیسے صدیوں سے یونہی ایک دوسرے کے سہارے کھڑے ہوں۔ ان گھروں کے مکینوں کے دکھ سکھ، خوشیاں اور غم ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ دلوں میں کدورتیں کم پیار زیادہ تھا۔ نسل در نسل خاندانوں کی دوستیاں اور تعلق ہوتے رہے تھے، مکینوں کے چہرے بدلتے رہے تھے مگر تعلقات کی نوعیت ہمیشہ سے ایک سی تھی۔ بینش کو یہ ماحول اور اس سے منسلک روایات اور تاریخ بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ ان سے مانوس اور وابستہ تھی۔ وہ یہاں رہنے والے اپنے ہم عمر ان لوگوں کو بھی جانتی تھی جو اس ماحول سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے جنہیں یہ سب گھٹا ہوا اور فرسودہ لگتا تھا۔ ان پیچ در پیچ تنگ گلیوں سے باہر کا ماحول انہیں کشادہ اور ہوادار لگتا تھا، پرانے شہر کو چھوڑ کر وہ اس علاقے میں نو آباد نئے شہر کی طرف کوچ کر جانا چاہتے تھے جہاں کھلی سڑکیں، کھلی ہوا، جدید بستیاں، پُر آسائش کھلے گھر اور زندگی کی تمام جدید سہولیات میسر تھیں۔ یہاں رہنے والے کئی مکینوں نے اس کوچ کا اہتمام کر بھی لیا تھا اور نئی زندگی کی طرف پرواز کرچکے تھے مگر لوئر مڈل کلاس طبقے کے وہ خاندان جن کی زندگیاں اپنی بقا کی جنگ لڑتے گزر جاتی ہیں اب بھی یہیں مقیم تھے اور انہی کے دم سے ان گلی محلوں کی دنیا آباد تھی۔ یہاں رونق تھی، شور تھا، رنگ اور ہنگامے تھے۔ بینش کو رنگ بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ سے دھوئے ہوئے کپڑوں کے رنگوں میں کھوئی ہوئی اور مسحور تھی جب اس کی نظر آسمان

پر اُڑتی رنگ برنگی پتنگوں پر پڑی، یہ ایک سحر انگیز منظر تھا، بسنت کے دن ختم ہو چکے تھے، بہار اپنی آمد کے آثار چھوڑ کر جا چکی تھی۔ دن طویل اور روشن ہو رہے تھے، فضا میں حدت بڑھ رہی تھی مگر ان گلی محلوں میں رہنے والے بچوں پر موسم کی خنکی اور حدت سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اس گرم دوپہر میں بھی پتنگیں اُڑا رہے تھے۔ بینش کو بلند فضاؤں میں اُڑتی رنگ برنگی پتنگیں بھی بہت پسند تھیں۔

''تم بھی ایک بڑا گڈا منگوالو شیدے پتنگ ساز کی دکان سے۔'' اسے یوں محو دیکھ کر سامنے والے گھر کی بالکنی میں آئی بانو نے کہا۔ وہ سبزی کے چھلکوں کی ٹوکری پکڑے ہوئے تھی جسے اس نے کھلے دل سے نیچے گلی میں الٹا دیا تھا۔ نیچے بہت نیچے یہ چھلکے کسی راہ گیر کے سر پر پڑیں یا کسی نالی کو بند کرنے کا سبب بنیں اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ اگر گلی میں چلتا کوئی راہ گیر سر اٹھا کر اس عزت افزائی پر مغلظات بکنے لگتا تو بھی بانو کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے ان مغلظات کا جواب دینا بخوبی آتا تھا۔

''مجھے گڈے اُڑانے نہیں آتے بانو۔'' بینش نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہاں تمہیں ضدیں کرنی آتی ہیں اپنی اماں سے کہ تم نے کالج میں آگے پڑھنا ہے۔'' بانو نے اسے یاد دلایا۔

''یہ کوئی بری بات ہے کیا؟'' بینش نے بالٹی میں موجود پانی کو ایک سائڈ پر گراتے ہوئے کہا۔

''پر جب تمہاری اماں اور بھائی تمہیں آگے نہیں پڑھانا چاہتے تو تم کیسے پڑھو گی؟'' بانو نے جیسے اس کا مذاق اڑایا۔

''قسمت میں ہوا تو ضرور پڑھ لوں گی، نہیں ہوا تو نہیں پڑھوں گی۔'' بینش کے لہجے میں اطمینان تھا۔ بانو کو اس کے اس اطمینان سے ہمیشہ سے چڑ تھی۔

''جو مرضی کرلو، مجھے نہیں لگتا کہ تم اس سے آگے پڑھ سکوگی۔'' اس نے بینش کو کسی حقیقت کا احساس دلانا چاہا۔ بینش زیرِلب مسکرائی اور بالٹی اٹھا کر نیچے کی طرف چل دی۔ ''میں نے کریلے پکائے ہیں آج پیاز، ٹماٹر ڈال کر، کھاؤ گی...... بھیجوں؟'' اسے پیچھے سے بانو کی آواز آئی۔ بینش نے مسکرا کر پیچھے کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ آپس کی تمام تلخیوں کے باوجود ان کے درمیان پیار اور خلوص کا رشتہ قائم تھا۔

نیچے آکر اس نے صحن میں رکھی واشنگ مشین دھوئی، واشنگ پاؤڈر، نیل اور صابن سمیٹ کر صحن دھونے لگی۔ ابھی اسے بہت سے دوسرے کام بھی کرنے تھے۔ اماں نے ابھی تک اسے سبزی نہیں لاکر دی تھی اور اسے دوپہر کا کھانا بھی بنانا تھا۔ اس کے دونوں بھائی ٹھیک ڈیڑھ بجے نماز اور کھانے کے وقفے کے لیے دکان بند کر کے آجاتے تھے اور اس وقت تک کھانا تیار ہوجانا لازمی تھا۔ اس نے بیٹھک میں جاکر گلی میں کھلنے والی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا، تنگ اور طویل گلی خالی تھی، اماں کا دور دور تک کچھ پتا نہیں تھا، اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب تک جو وہ واپس نہیں آئیں تو ابھی کچھ دیر اور بھی واپسی کی توقع نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ یقیناً کسی سے طویل گفتگو میں مصروف ہو چکی تھیں۔ اس نے مایوسی سے کھڑکی بند کی اور اندر کمرے میں جاکر فون کا ریسیور اٹھا کر بھائی کی دکان کا نمبر ملانے لگی۔ اسے اب بھائی کو صورتِ حال بتا کر پکانے کے لیے کچھ منگوانا تھا۔

☆☆☆

مہر زاد کو اپنے مزاج پر قابو پانے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آرہی تھی اور یہ بات اس کے اپنے لیے بھی حیران کن تھی۔ اس کے باپ کا ترکے میں چھوڑا ہوا نظام پیچیدہ اور بے اصولیوں پر مبنی تھا۔ اس نظام کی پشت پر صدیوں پر محیط اقتدار اور حاکمیت کا احساس کھڑا تھا۔ وہ اس تاریخ کو کھولنا نہیں چاہتا تھا، وہ اچھی طرح

جانتا تھا کہ اس تاریخ میں سیکڑوں مظلوموں کی آہیں، سسکیاں اور دکھ رقم تھے۔ اسے اس تاریخ کو پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اسے بغیر دیکھے، پڑھے ہی اس کا بھرپور احساس تھا، وہ اپنے باپ کے قتل کے بعد جب یہاں پہنچا تھا اس وقت بھی اس کو آنکھیں اور ذہن آنے والے دنوں کو دیکھ اور ادراک کر رہی تھیں۔ اسے بخوبی علم تھا کہ وہ چند گھنٹوں کے اندر تھنگ سے ایوری تھنگ بنا دیا جائے گا، اس کے سر پر وہ اونچا شملہ سجا دیا جائے گا جو علاقے کی سرداری کی علامت تھا۔ اس کے پاس اس روز اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ وہ چند لمحے کے لیے اس بدقسمتی پر افسوس کرلیتا کہ ایک سردار کی میت کو دفن کرنے سے پہلے ہی دوسرے سردار کی سرداری کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ اسے اتنا بھی وقت نہیں ملا کہ اپنے مرے ہوئے باپ کے سرہانے کچھ دیر بیٹھ کر اس سے ایک خاموش مکالمہ ہی کرلیتا۔ وہ شاید اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس ابدی حقیقت سے جاملا تھا جسے اس نے اپنی پوری زندگی فراموش کیے رکھا تھا اور اب وہ ان لمحوں کی طرف جا رہا تھا، جہاں اسے سر جھکا کر عمر بھر سر اٹھا کر زندگی گزارنے کا حساب دینا تھا۔ وہ یہ سب کرنا چاہتا تھا مگر اس وقت ساری غیر مرئی حقیقتیں کہیں پس منظر میں چلی گئی تھیں اور پیش منظر میں لوگوں کا ہجوم تھا، بادشاہ گر تھے، میڈیا تھا، روشنیاں تھیں، سوال جواب تھے اور نعرے تھے۔ ''جب تک سورج چاند رہے گا مراد خان تیرا نام رہے گا۔ زندہ ہے مراد خان زندہ ہے، شہید ہے شہید ہے مراد خان شہید ہے۔'' جس نظام کے ہاتھوں وہ لوگ ستائے ہوئے تھے اور پسی ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور تھے اسی نظام کے ایک امین کی غیر فطری موت پر انہیں اس جذباتی انداز میں مشتعل کر دیا گیا تھا کہ وہ لمحوں میں اس کی جان کا انتقام لینے پر تیار ہوگئے تھے۔ علاقے کے بادشاہ گروں کو اپنے فن میں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے لمحوں میں صورتِ حال کو بھانپ لیا تھا اور شام ہونے سے پہلے، پہلے سردار مہر زاد خان کو ایک تمثیلی کردار کے مانند دنیا کے سامنے لے آئے تھے یوں کہ نہ دیکھنے والوں کو کوئی اعتراض تھا اور نہ ہی مہر زاد نے اس معاملے پر دوسری سوچ سوچی تھی۔ نظام چلانے والے دنیا سے چلے جاتے تھے، نظام زندہ رہتا تھا، اس نظام کے امین اس علاقے سے باہر بھی ایک کردار رکھتے تھے۔ ملکی سیاست پر ان کو ہمیشہ سے ایک خاص قسم کا اختیار حاصل رہا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ کی جڑوں میں ان کے بندے بیٹھے تھے جن کا کام مراعات کے عوض ان کی کاٹھی مضبوط کرنا تھا۔ اپنے باپ کے مرنے کے چند گھنٹوں کے بعد سردار مہر زاد خان ملکی سطح پر ایک نئے لیڈر کی حیثیت میں متعارف ہو چکا تھا۔

مگر مہر زاد کو اس بات پر خود بھی حیرت محسوس ہوئی تھی کہ اس اچانک بدلی ہوئی صورتِ حال نے اس کے ذہن و دل پر کچھ خاص اثر نہیں چھوڑا تھا۔ اپنی اماں سے گفتگو سے پہلے وہ شاید کبھی جان نہ پاتا کہ اسے اس ماحول سے ایک خاص طریقے سے کیوں دور رکھا گیا تھا گو اس کی اٹھان اور پرورش ویسے ہی کی گئی تھی جیسے ہمیشہ سے یہاں کے سرداروں کی روایت تھی مگر شاید اماں کی سائیکی کا اثر اتنا تھا کہ اسے اس ماحول میں یوں رچنے بسنے کا موقع نہیں ملا تھا جو یہاں کی روایت تھی مگر اس کے باوجود اسے یوں زندگی کی تمام تر روش بدل جانے سے بھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ دوستوں کے اس ہجوم میں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا، دوست بہت کم اور مارِ آستین زیادہ تھے۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ دوستوں کے اس ہجوم میں اس کے باپ کے قاتل بھی موجود تھے اور وہ لوگ بھی جن کے لیے اس کی اپنی جان لینے پر تیار ہوجانا چنداں مشکل نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شطرنج کی جو بساط یہاں بچھی تھی اس کے مُہرے کن کن لوگوں کے اشارے پر حرکت کرتے تھے، شہ مات کون دیتا تھا اور بادشاہ کو چاروں طرف سے نرغے میں لے کر چت کون کرتا تھا۔ دوستوں کے اس

ہجوم میں کوئی بھی دوست نہ تھا، اس نے چند دنوں کے اندر فیصلہ کرلیا تھا اور اپنے من کے اندر اپنی دنیا بسالی۔ یہ بھی اسے مشکل نہیں لگا تھا۔ من کی اس دنیا میں اسے مشورہ دینے والا بھی اس کا دل تھا، خطرات سے آگاہ کرنے والا بھی اس کا دل تھا اور ان سے بچانے والا بھی اس کا دل تھا۔ چند ہفتوں کی ذاتی مشق کے بعد اسے اس کام میں بھی مہارت حاصل ہوگئی کہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اٹھتا، بیٹھتا تھا۔ سب کے مشورے لیتا تھا سب سے گفتگو کرتا تھا مگر مانتا اپنے دل کی تھا، یوں کہ اس کے گرد موجود بادشاہ گروں کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ یہ وہ بادشاہ گر تھے جن کی مجبوری تھی کہ اس خاندان کا بیٹا ہی نظام کا سردار ہوسکتا تھا، علاقے کے لوگ کسی اور قبیلے اور خاندان سے تعلق رکھنے والے کو اپنا سردار ماننے پر کبھی تیار نہیں ہوسکتے تھے اس لیے انہیں اسی خاندان کے وارث کو اختیارات سونپنا پڑتے تھے مگر اس بار ان کے دلوں میں ایک خاص امید تھی۔ ان کا خیال تھا کہ کم عمر، ناتجربہ کار، مغرب پسند سردار مہرزاد خان کو ان تمام معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی، وہ اسے علامت کے طور پر پیش کر کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے میں کامیاب ہوجائیں گے مگر ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ یہ نیا سردار آنے والے وقت میں ان کے لیے سب سے ٹیڑھی کھیر ثابت ہونے والا تھا۔ وہ جانتا تھا، سمجھتا تھا، معاملات کو سلجھا سکتا تھا اور مسائل سے نبٹ سکتا تھا۔ جو زندگی کو میدانِ جنگ سمجھتے ہوئے محاذ کا سامنا کرنے کے فلسفے کا پیروکار تھا جسے سامنے سے آئے ہوئے وار کا مقابلہ کرنا اچھا لگتا تھا اور جو پشت پر کھائے ہوئے زخم کو اپنی توہین سمجھتا تھا، جو حملہ کرنا اور حملے کا سامنا کرنے کے علاوہ دفاع کی پالیسیز کو بھی اچھی طرح سمجھتا تھا اور جسے یہ بھی معلوم تھا کہ ایسی شخصیت کا مالک ہوتے ہوئے اسے عمر بھر دوستوں سے زیادہ دشمنوں سے واسطہ پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

اسے کوکنگ کے پروگرام میں شامل ہونا بہت اچھا لگتا تھا۔ کوکنگ اس کا جز وقتی مشغلہ تھا۔ ایم بی اے فنانس کی ڈگری رکھنے والے اس نوجوان کے پاس کوکنگ کورسز کے ڈھیروں ڈھیر سرٹیفکیٹس تھے۔ اس کا یہ انوکھا شوق اس کے گھر والوں اور دوستوں کسی کو بھی پسند نہیں تھا مگر اس کا کیا، کیا جاتا کہ یہ شوق اس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے کچھ عرصہ پہلے ہی واپس وطن لوٹا تھا، اس کی ڈگری نے اسے ایک بڑے ادارے میں فوراً ہی بہت اچھی جاب دلوادی تھی۔ جاب اور اس پرانے مخصوص ماحول میں ایڈجسٹ کرنے کے بعد اس نے اپنے مشغلے کے حوالے سے منظر پر نمودار ہونا شروع کردیا۔ وہ ایک پانچ ستارہ ہوٹل کی طرف سے منعقد کیے گئے کھانا بنانے کے مقابلے میں شریک ہوا اور اس نے پہلا انعام جیت لیا۔ یوں یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ جلد ہی اس کا نام اس حوالے سے معروف ہونے لگا اور وہ ٹی وی چینلز پر بلایا جانے لگا۔ ایک ایوننگ شو میں آدھے گھنٹے کے لیے مخصوص کوکنگ پروگرام میں باقاعدہ شرکت کرنا اسے یہ بھی ایک آرٹ معلوم ہوتا تھا جب وہ مہارت سے سبزیاں کاٹ رہا ہوتا اور انہیں پکاتے ہوئے ان کے کلر اور ٹیکسچر کو برقرار رکھنے کی تلقین کررہا ہوتا اور بنے ہوئے کھانے کو پیش کرنے کے طریقے سکھا رہا ہوتا تو اسے اپنا آپ کسی بڑے آرٹسٹ سے کم نہیں لگتا تھا۔ اسے آہستہ آہستہ اندازہ ہورہا تھا کہ پروگرام کے دوران اس کی گفتگو اس کے اسٹائل اور اس کے کام سے لوگ خصوصاً خواتین متاثر ہورہی تھیں، وہ خواتین خصوصاً کم عمر لڑکیوں میں مقبول ہورہا تھا۔ پروگرام سے پہلے اور خاص طور سے پروگرام کے دوران آنے والی فون کالز اور پروگرام کے بعد ملنے والی ای میلز، خطوط اور فون اسے اپنی نظر میں ہی خاصا اہم بنارہے تھے۔ مگر وہ اس سب کو انجوائے کررہا تھا۔ اسے نہ تو اس کام کو مستقل پیشہ بنانے کا شوق تھا اور نہ ہی اپنی بڑھتی ہوئی مقبولیت پر مغرور

ہونے کا اس کا کوئی ارادہ تھا۔ اسے پروگرام کے دوران آنے والی کالز اٹینڈ کرنے اور پوچھے جانے والے سوالات کے جواب دینے میں مزہ آتا تھا۔ خواتین اور لڑکیوں کی کھنکتی ہوئی پُرمسرت آوازیں، اکثر متوقع اور کبھی کبھار غیر متوقع سوال اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ وقت کے ایک، ایک لمحے کو انجوائے کرنے کا قائل تھا اور یہی اس کی شخصیت کی کشش کا باعث تھا۔

مگر اس روز جب وہ اپنے پروگرام میں دو جاپانی ڈشز بنانا سکھا رہا تھا۔ اسے ایک بہت ہی غیر متوقع کال موصول ہوئی تھی۔ اس کے کان میں لگے ائرپیس پر آپریٹر کی آواز آئی۔ ”سر لائن پر مس علینہ سعید فرام ایبٹ آباد۔“

”اوہو!“ بے اختیار اس کے منہ سے الفاظ نکلے تھے اور سبزی کاٹتے ہوئے پہلی بار اس کا ہاتھ چوکا تھا۔ شکر تھا کہ اسے کوئی زخم نہیں آیا تھا۔

”آن ائر مت کیجیے، ان کی بات کو صرف مجھ تک محدود رہنے دیجیے۔“ اس نے ہلکے سے آپریٹر سے کہا تھا اور بعد میں وہ کئی منٹ اس بات پر شکر ادا کرتا رہا کہ بروقت اسے یہ بات سوجھ گئی تھی، ورنہ اس فون کال کے لائیو ہوجانے کی صورت میں کیا ہوجاتا، وہ یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کال میں گفتگو کا آغاز ہی... غیر متوقع انداز میں ہوا تھا۔

”آپ کو علم ہے کہ آپ کتنے بڑے گدھے ہیں۔“ دوسری طرف سے نسوانی آواز میں کہا جارہا تھا۔ ”خواتین کے لیے مخصوص کام کرتے ہوئے شرم نہیں آتی آپ کو، بڑی بڑی باتیں کیا کرتے تھے ایک زمانے میں آپ۔ اب کبھی غور سے خود کو دیکھا ہے، یہ سبزیاں اور گوشت کاٹتے بھونتے کیسے للّو لگ رہے ہوتے ہیں جناب، شرم نہیں آتی آپ کو، ہاں آپ کو نہیں آتی ہوگی مگر ہم تو شرم سے ڈوب، ڈوب جاتے ہیں کہ کبھی ہم بھی تم سے تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔“

”کال کٹ گئی یا پھر شاید ٹھیک طریقے سے کنیکٹ ہی نہیں ہوئی۔“ اس نے اپنی ساتھی میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مشتاق بھائی آپ ان کو میرا ذاتی نمبر دے دیجیے اگر دوبارہ کال آئے کیونکہ پروگرام کا وقت ختم ہونے والا ہے، دوبارہ شاید ان کی کال ملے نہ ملے۔“ اس نے آپریٹر کو بہ آواز بلند ہدایت کی اور ان الفاظ کے ساتھ ہی کال واقعی کٹ گئی۔ وہ بال بال بچا تھا، مگر اس کا دل خوشی سے سرشار تھا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد وہ آواز اس کے کانوں میں آئی تھی جسے وہ اپنے بچپن کی ساتھی کہا کرتا تھا۔ وقت نے اس آواز کی مالک پر خاصا اچھا اثر ڈالا تھا یہ اس کے لہجے کے اعتماد نے اسے بتایا تھا۔ اچانک اس کا دل پروگرام کو جلد از جلد وائنڈ اپ... کرنے کے بعد آپریٹر سے اس کالر کا نمبر لینے کو چاہنے لگا تھا۔ فہد رضا کو اتنے برسوں میں پہلی مرتبہ کسی نسوانی آواز نے اپنی طرف کھینچا تھا۔

☆☆☆

تاؤ شریف کو زرنگار کے لیے آنے والی پے منٹ پر حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر جس چیز نے اسے درحقیقت حیران کیا تھا وہ زرنگار کا یہ پے منٹ قبول کرلینا تھا۔ وہ گھبرا گیا تھا۔ وہ زرنگار سے بات کرنا چاہتا تھا اسے سمجھانا چاہتا تھا، اس نو وارد کی پے منٹ زرنگار کے لیے اعزاز کی بات کیوں نہ ہو، اسے قبول کرلینے کے بعد زرنگار امراؤ بیگم کی کوئی بات ٹال نہ سکے گی، پھر کسی پے منٹ کو واپس نہ بھجوا سکے گی اور پھر وہ سلسلہ شروع ہوجائے گا جسے زرنگار سے منسلک کرتے ہوئے تاؤ شریف جیسے شخص کے لیے بھی انتہائی اذیت کا باعث تھا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ اس سنہری محل کے اصول بھی یہ تھے اور اس کا چلن بھی یہ ہی تھا۔ ان اصولوں

سے انحراف کسی کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ امراؤ بیگم زرنگار کے بھلے کتنے ہی نخرے کیوں نہ اٹھا رہی تھی ایک روز خود اسے اس کے لیے آئی پے منٹ پکڑنا ہی تھی مگر یہ کام جتنا مؤخر ہوتا جا رہا تھا تاؤ شریف کا اطمینان بڑھتا جا رہا تھا مگر اب زرنگار نے پے منٹ کو خود شرفِ قبولیت بخشا تھا اور اس افتتاحی رات کو وہ پاگل کر دینے کی حد تک حسین نظر آ رہی تھی، اس نے دل لگا کر تیاری کی تھی، اس کا لباس اور بناؤ سنگار اس کی ذاتی توجہ کا مظہر تھے۔ امراؤ بیگم اپنے اس حسین ترین ہیرے کی بلائیں لیتے نہ تھکتی تھی۔ اس ہیرے کی آمد نے اس کے سینے کی قدر بڑھا رکھی تھی اور یہی ہیرا آئندہ آنے والے سالوں میں اس کے لیے چین ہی چین لکھنے والا تھا۔ اس نووارد اور اس کے دو ساتھیوں کی آمد پر ان کی تواضع خوش رنگ مشروب سے کی گئی تھی۔ تاؤ شریف اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا تھا اور براہِ راست نووارد کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کم عمر تھا۔ اس کے چہرے پر زمانہ سازی اور تجربے کا کوئی خاص عکس نظر نہ آتا تھا ہاں مگر اس کے چہرے پر ایک مخصوص قسم کا رعب داب تھا۔ جسے محسوس کرتے ہی کوئی بھی مرعوب ہو سکتا تھا۔ تاؤ شریف کی گھاگ نظروں نے محسوس کیا کہ اس کا تعلق کسی بڑے خاندان سے تھا جو محض کھاتا پیتا نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک اہم تاریخ تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیا تھی اس نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر امراؤ بیگم کی پالی اِدھر اُدھر پھرتی حسین و جمیل، شوخ و شنگ تتلیوں کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کی منتظر نظریں بار بار اسی جانب اٹھتی تھیں جہاں سے زرنگار کی آمد متوقع تھی۔ امراؤ بیگم اس کے شوق کو تاؤ دینے کے چکر میں تھی اسی لیے دانستہ زرنگار کو بلانے میں تاخیر کر رہی تھی۔ اس تاخیر پر نوجوان کی نظروں میں الجھن اترنے لگی تھی اور بے چینی بھی۔ وہ بار بار اپنے موبائل کو آن کر کے وقت دیکھتا تھا۔ زرنگار کی آمد پر روشنیوں کی لو مدھم کر دی گئی۔ اس کی آمد کو اس ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کا تصور بھی امراؤ بیگم نے ہی سوچا ہوگا، تاؤ شریف نے قیافہ لگایا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ زرنگار کی موجودگی میں اس وقت روشنیوں کی کوئی حقیقت رہی بھی نہیں تھی۔ وہ سراپا روشنی لگ رہی تھی۔ اس کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو ماحول پر چھا گئی تھی اور کچھ دیر پہلے اٹھنے والی آوازیں ایک دم خاموش ہو گئی تھیں پھر فضا میں موسیقی کی آواز ابھری، سازندوں کو موسیقی کے بارے میں پہلے سے ہی ہدایات دے دی گئی تھیں۔ زرنگار کیسا گاتی تھی، اس کے گلے میں کتنا سُر تھا، اس کا معیار کیا تھا، تاؤ شریف نے محسوس کیا کہ اس نووارد کے لیے یہ سب چیزیں غیر اہم تھیں۔ وہ زرنگار کا گانا سننے یہاں نہیں آیا تھا، اس کے چہرے پر کسی اور لگن کے آثار تھے مگر وہ اس آغاز کو ماحول کا اصول سمجھ کر صبر سے بیٹھا تھا۔ زرنگار کی وہ محفلِ موسیقی جو سراسر امراؤ بیگم کے ذہن کی اختراع تھی ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی اور اس کے بعد زرنگار کو نووارد کے ساتھ اس آراستہ و پیراستہ کمرے میں بھیج دیا گیا جو اُن کے لیے خاص طور سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کمرے کے بند ہوتے دروازے کو دیکھتے دیکھتے تاؤ شریف کے دل کی دھڑکن بند سی ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بارات، نکاح اور رخصتی کے وہ منظر ناچنے لگے تھے جو اس نے مہذب اور قانونی لوگوں کے ہاں دیکھے تھے۔ اس کا دل رونے لگا تھا۔ فرق کچھ بھی نہیں تھا مگر بہت فرق تھا۔ اس نے یہ منظر بھی بہت دیکھ رکھے تھے مگر زرنگار کے تصور کے ساتھ ہی وہ قانونی غیر قانونی، روایتی غیر روایتی کے موازنے میں پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی سرخ پڑتی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے خشک کرتے ہوئے اپنے ساز سمیٹے اور ان پر مخملیں کپڑا ڈال دیا۔

"بہت بڑی آسامی ہے خانزادہ مہر زاد مراد خان!" اس کے کانوں میں قریب کھڑے اسلم کی آواز پڑی۔

"زرنگار اور امراؤ بیگم کی قسمت چند سالوں کے لیے تو کھل گئی سمجھو۔"

''خانزادہ مہر زاد مراد خان!'' تاؤ شریف نے اپنے دل میں دہرایا۔ ''اس کا شملہ اونچا، عزت بڑی بلند۔'' اس نے سوچا۔

''فرق کیا پڑے گا؟'' وہ اپنے کمرے میں پہنچنے تک سوچتا رہا۔ ''فرق تو بہت پڑے گا۔'' پھر اس کے نے جواب دیا۔ ''مگر کیسے؟'' یہ سوال بہت دیر تک اس کے دل میں اٹھتا رہا...... وہ اس کا جواب جاننا بھی نہ دینا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

''میری سمجھ میں نہیں آتا حمزہ تم پر آفت کیا آن پڑی ہے۔'' وہ نگین تھی جو پچھلے پندرہ منٹ سے مسلسل حمزہ سے بحث کر رہی تھی، وہ اسی صبح لاہور پہنچا تھا اور آفس بھگتانے کے بعد نگین کی طرف آیا تھا۔ ''کون ہے یہ لڑکی میرال کے لیے تم نے میرے اتنے سوئٹ اور سہل پسند میاں کو گھن چکر بنا رکھا ہے، وہ مسلم ٹاؤن والے صاحب سے پوچھتے ہیں تو وہ انہیں اکبری دروازے کے کسی محلے کا پتا پکڑا دیتے ہیں، وہاں جاتے ہیں تو انہیں بتایا جاتا ہے موصوفہ کے آثار ٹاؤن شپ میں پائے جانے کے امکان ہیں اور ٹاؤن شپ والے چوبرجی کے کسی قدیم محلے کے پتے کی چٹ پکڑا دیتے ہیں۔ وہاں سے راز کھلتا ہے کہ کبھی وہ یہاں آئی تھی اب تو یقیناً فیصل ٹاؤن کی کسی کوٹھی میں رہتی ہوگی۔ تم یہ بتاؤ کہ تم میرے میاں کو لاہور کا جغرافیہ پڑھانے کے چکر میں تو نہیں ہو؟''

نگین کے لہجے میں شکوہ کم اور اپنائیت بے حد زیادہ تھی، حمزہ خاموشی سے بیٹھا اس کی بات سن رہا تھا۔ اس کی خاموشی نے نگین کو ایک دم چونکا دیا اور اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں تھکن کے آثار تھے، وہ پہلے کی نسبت کمزور اور افسردہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا دل گھبرا گیا وہ جس بات کو اس طرح مذاق کے رنگ میں کر رہی تھی اس بات میں کوئی بہت اہم بات تھی، اسے اچانک احساس ہوا، وہ حمزہ کو بہت اچھی طرح جانتی تھی، وہ کسی بات کی وجہ سے بہت بری طرح الجھا ہوا تھا، وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اس نے اپنی تکرار روک دی اور خاموش ہوتے ہوئے اس بات کی منتظر ہوئی کہ حمزہ اسے خود کچھ بتائے گا مگر پندرہ منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے سنجیدہ سے لہجے میں معذرت کی۔

''مجھے افسوس ہے نگین، اشعر کو میری وجہ سے اتنی زحمت ہوئی، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ انہیں اتنا ترد کرنا پڑے گا۔'' نگین کو اس کی اس بات نے بری طرح چونکا دیا۔ حمزہ کا انداز خاصا بدلا ہوا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا وہ یقیناً کہتا۔ ''کتنے جوتے گھس گئے تمہارے میاں صاحب کے، بتاؤ میں نئے دلوا دوں گا۔'' مگر اس وقت اس نے غیر متوقع اور خلافِ مزاج جواب دیا تھا۔

''حمزہ کیا بات ہے؟'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نگین نے پوچھا۔ ''اچھا اگر تمہارا دل شیئر کرنا نہیں چاہ رہا تو نہ سہی مگر اتنے سنجیدہ اور خاموش تو مت نظر آؤ ناں پلیز!''

''ایسا کچھ نہیں ہے نگین، میں صرف تھکا ہوا ہوں۔'' حمزہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''آرام کروں گا، ذہن فریش ہو جائے گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

''تم یہیں رہو آج ہمارے پاس، وہاں اپنے فلیٹ میں کہاں اکیلے پڑے رہو گے۔'' اس نے اپنائیت سے کہا۔

''تمہارے گھر میں اتنے لوگ ہیں یار، تمہاری سسرال والے ہیں، یہ مناسب نہیں لگتا، میں ٹھیک ہو جاؤں گا اور اب تو یہیں ہوں ملاقات ہوتی رہے گی، تم فکر مت کرو۔'' حمزہ نے رسان سے کہا۔

''حمزہ۔'' نگین نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''تم وعدہ کرو جب دل کو مناسب لگے۔ مجھے ضرور بتاؤ گے۔''

''او کے۔'' حمزہ زبردستی مسکرایا۔ ''تم جانتی ہو تمہارے علاوہ کسی اور کو بتا تا بھی نہیں ہوں۔''

''مجھے امید ہے کہ تم مجھے ضرور بتاؤ گے۔ میں تمہیں یوں اداس نہیں دیکھ سکتی۔'' نگین نے اسے احساس دلانا چاہا کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔

حمزہ کے جانے کے بعد نگین پر افسردگی چھا گئی۔ وہ ہفتے کا دن تھا اور اگلے دن چھٹی تھی۔ دن کے بیشتر کام وہ نمٹا چکی تھی اس لیے دوپہر کے وقت میں اسے اتنی فرصت تھی کہ وہ کچھ دیر کے لیے تنہا بیٹھ سکے۔ وہ اکیلے بیٹھ کر سوچنا چاہتی تھی کہ وہ کون سی اتنی اہم ہستی تھی جس نے حمزہ کو یوں پریشان کر رکھا تھا اور جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

تنہا بیٹھتے ہی اسے بہت سے پرانے دن یاد آنے لگے تھے۔ اس کا اور حمزہ کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ حمزہ اس کی سگی پھپو کا بیٹا تھا جو اسلام آباد میں رہتی تھیں مگر حمزہ، نگین کے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں نگین کی دادی جو حمزہ کی نانی تھیں کے پاس رہتا تھا وہ لوگ انہیں بی اماں کہتے تھے۔ حمزہ کا یہاں ہونا بھی ایک کہانی تھی۔ حمزہ کی امی کے ہاں اوپر تلے تین بچے میجر آپریشن سے ہوئے تھے، تیسرا بچہ حمزہ تھا۔ جس کی پیدائش کے بعد وہ شدید بیمار ہو گئیں ان کے پاس پہلے سے دو بچوں کا ساتھ تھا، ایسے میں ان کی بی اماں یعنی نگین کی دادی ہی ان کے کام آئیں وہ ننھے حمزہ کو اپنے پاس لے آئیں۔ یہاں اس چھوٹے سے بچے کو پالنے میں ان کی بہو یعنی نگین کی امی نے بھی بڑا ساتھ دیا تھا۔ حمزہ تھوڑا بڑا ہوا تو اس کی اماں نے اسے اپنے پاس واپس لے جانا چاہا مگر اب حمزہ نے جانے سے انکار کر دیا وہ بی اماں کے ساتھ اپنی اماں کے گھر ہو آیا تھا اور اسے وہاں چند دن رہنا بھی اچھا نہیں لگا تھا، کجا مستقل وہاں رہنے کا تصور، اس نے اپنی اماں کو صاف انکار کر دیا وہ ان کے ساتھ ہرگز نہیں جائے گا۔

''میں نے بھانپ لیا ہے مہرین، اسے وہاں رہنا ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔'' نگین کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کی دادی اور پھوپی کے درمیان اس سلسلے میں کیا بحث ہوئی تھی۔

''ساری غلطی اور حماقت میری ہے۔'' مہرین نے بی اماں کو بے ساختہ جواب دیا تھا۔ ''میں ہی پاگل تھی جو بچے کو اچھے، کھلے اور صاف ماحول میں پالنے کے بجائے یہاں ان گلی محلوں میں بھیج دیا۔ یہ گلی اور محلے کا کلچر ہے جو اس کے مزاج میں رچ بس گیا ہے۔ یہ ہی اسے وہاں نہیں ملا جب ہی وہاں جانے سے بدکتا ہے۔''

''تمہارے بچوں اور حمزہ کے مزاج اور تربیت میں فرق آ گیا ہے مہرین، تم سمجھ نہیں پائیں۔'' بی امان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔

''تربیت؟'' وہ غصے سے بولی تھیں۔ ''تربیت نام کی کوئی چیز ہوتی ہے اس کی، سارا دن تو چھتوں کو پھلانگتا، پتنگیں اور کنچے لوٹتا پھرتا ہے۔ دوست اس کے ایک سے ایک چنڈال اور جنگلی ہیں، نہ آپ ان محلوں سے نکلیں نہ ناصر (نگین کے والد) ان کے بچے بھی یہ ہی کچھ کرتے پھرتے ہیں اور یہ حمزہ بھی ان کی مکمل کاپی بن کر رہ گیا ہے۔''

''اب تو بن گیا بہن جو بننا تھا اس کو، تمہیں اتنے سال میں خیال نہیں آیا کہ یہاں رہ رہا ہے، کیا بن رہا ہے، کیسے پل بڑھ رہا ہے، اب جب اتنا بڑا اور سمجھ دار ہو گیا تو تمہاری ممتا پھوٹ پڑی۔'' بی اماں عجیب سے صدمے کی کیفیت میں نظر آ رہی تھیں۔

""مجھے آپ پر پورا بھروسا تھا، میرا خیال تھا کہ آپ کو اس بات کا خیال رہے گا کہ میرے دوسرے جس ماحول میں پل بڑھ رہے ہیں ویسا ہی ماحول آپ حمزہ کو بھی دیں گی تاکہ ان کی شخصیتوں میں کوئی تضاد نہ آئے مگر آپ نے تو اسے پورے کا پورا ہی کشمیری محلے کے کلچر کے رنگ میں رنگ دیا۔""

مہرین کو اندازہ ہی نہیں ہورہا تھا کہ وہ بی اماں کو کتنی تکلیف دے رہی تھیں۔

""پھر ایسا کرو کہ لے جاؤ اسے۔"" بی اماں نے دکھ سے کہا۔ ""نہیں جاتا تو زبردستی لے جاؤ، یہ تو زیادتی کی بات ہے کہ بچے کو اس کی ماں کی پسند کے مخالف تربیت دی جائے۔""

""مجھے یہیں رہنا ہے، میں کبھی اسلام آباد نہیں جاؤں گا۔"" حمزہ نے سخت اور دُرشت لہجے میں کہا۔ "مجھے نے یہیں رہنا ہے۔"" اس نے ایک ہی رٹ لگالی، وہ بی اماں کے پلو کے ساتھ لگ گیا۔

""اس عمر میں اسے یہاں سے لے جانا اس کی سائیکی خراب کرنے کے مترادف ہے، بہتر ہے کہ یہیں چھوڑ دیا جائے، بی اماں کی تربیت میں کوئی خرابی نہیں ہے، ہاں ماحول کا فرق ضرور ہوسکتا ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ آپ خود بھی اسی ماحول میں رہتی تھیں اور یہیں آپ نے پرورش پائی ہے، بی اماں کے ہاتھوں ہی آپ کی تربیت ہوئی ہے۔ یہ بھی قدرت کا فیصلہ ہے کہ حمزہ کو یہاں رہنا تھا اور بہتر ہے کہ اب وہ یہیں رہے۔"" حمزہ کے ابا نے سارے حالات کو بھانپ لینے کے بعد بہت سکون کے ساتھ اپنی بیوی کو سمجھایا تھا۔

""ٹھیک ہے، ٹھیک ہے آپ کا ہے کو میری حمایت کریں گے۔"" مہرین نے سر جھٹک کر کہا۔ ""آپ کو تو بھی انہی گلی محلوں کی زندگی پسند ہے۔""

بحث جہاں بھی ختم ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہی نکلا کہ حمزہ، بی اماں کے پاس ہی رہا، یہ بات نگین کے ڈھیروں خوشی کا باعث تھی، اس کا حمزہ کے ساتھ بچپن کا ساتھ تھا۔ وہ اکھٹے کھیلتے، اکھٹے پڑھتے تھے۔ ان کی ایک جیسی تھی، ان کی دلچسپیاں ایک جیسی تھیں، حمزہ عمر میں اس سے کچھ ہی ماہ بڑا تھا، اسی لیے ان دونوں کی آپس میں اتنی گاڑھی چھنتی تھی۔

نگین کو اپنی دادی کا گھر بہت پسند تھا، قدیم طرزِ تعمیر پر بنا وہ کشادہ کمروں اور اونچی چھتوں والا گھر ان دنوں بھی بہت اچھا لگتا تھا جب طرزِ تعمیر نے نئی کروٹ لے لی تھی اور لوگ اسی کے مطابق جدید گھر بنا رہے تھے۔ بی اماں کے گھر کے صحن میں ایک طرف بنے نیچے سے شیڈ کے نیچے ایک بڑا سا حمام ہر وقت موجود رہتا تھا۔ جس کے پانی کو ضائع نہ کرنے کی تلقین بی اماں ہر وقت کرتی رہتی تھیں مگر نگین اور حمزہ کو جب بھی موقع ملتا وہ اس کی ٹونٹی نیچے پلاسٹک کا ٹب رکھ کر اس میں کاغذ کی کشتیاں بنا کر چلاتے رہتے تھے۔ کبھی جو بی اماں کی نظر پڑ جاتی تو خوب ڈانٹ پڑتی مگر یہ مشغلہ اتنا پسندیدہ تھا کہ وہ دونوں ڈانٹ کھانے اور یہ سمجھنے کے باوجود کہ پانی ضائع کرنا ہے، یہ کام اکثر کرتے تھے۔ گرمیوں کی دوپہروں اور شاموں اور سردیوں کی صبحوں اور راتوں میں نگین کو وہ بے حد یاد آتا تھا۔ اس کا اپنا گھر بی اماں کے گھر کے بالکل ساتھ تھا لیکن اس کے ابا نے اس میں کئی ترامیم کر قدرے جدید شکل دے رکھی تھی پھر بھی نگین کا دل اپنے گھر سے زیادہ بی اماں کے گھر ہی لگتا تھا۔

دوپہر کے وقت محلے کے بچے اسکول کا ہوم ورک کرنے اور سپارہ پڑھنے کے لیے بی اماں کے گھر ہوتے تھے اور یہ وقت حمزہ اور نگین کے لیے بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ جب دونوں ہائی کلاسز میں پہنچ گئے تو بی اماں ان پر اعتماد بڑھ گیا وہ ان بچوں کی رہنمائی کے لیے ان دونوں کو ان کے پاس بٹھا دیتیں۔ نگین کو بچپن سے استانی بننے کا بہت شوق تھا اور یہ شوق پورا کرنے کا اس سے بہتر موقع کیا ہوسکتا تھا۔ وہ ان بچوں پر رعب

جماتی، کسی چھوٹے موٹے ڈنڈے سے کام لیتی اور استانی بن جانے کا ٹھیک مزہ لیتی۔ حمزہ اس کی سنجیدہ شکل اور حرکتیں دیکھ دیکھ کر ہنستا اور وہ اس سے لڑتی کہ وہ بچوں پر اس کا رعب ختم کررہا ہوتا تھا۔ نگین سوچنے بیٹھتی تو ایسی ہی ہزاروں باتیں اسے یاد آتیں جن سے اس کی وابستگی تھی مگر جو بات اسے ہر بات سے زیادہ عزیز تھی وہ حمزہ کے ساتھ گہری ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وہ اپنے دل کی بات ایک دوسرے سے کیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ ایک دوسرے کی خوشی اور دکھ کو بغیر پوچھے، بتائے چہرے سے دیکھ کر ہی بھانپ لیتے تھے۔ حمزہ کے بارے میں نگین کا خیال تھا کہ وہ خاصا introvert تھا مگر اپنے دل کی بات وہ نگین سے ضرور کرتا تھا۔

''تمہیں کبھی افسوس ہوتا ہے کہ تم اپنے اماں ابا کے پاس رہنے کے بجائے یہاں رہتے ہو؟'' ایک بار نگین نے سنجیدگی کے ساتھ اس سے پوچھا تھا۔

''شاید کبھی کبھی میں اس بات کو محسوس کرتا ہوں۔'' وہ صاف گوئی سے کام لیتا۔ ''مگر جو زندگی یہاں ہے اس سے محروم رہنا بھی بدقسمتی ہوتی۔''

''وہ کیسے؟'' نگین کو اس جواب پر حیرت ہوتی۔

''بی اماں کی شخصیت میں بڑا فسوں ہے نگین۔'' اس روز وہ بات کرنے کے موڈ میں تھا اس لیے اس نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔ ''ایسے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں۔ تم نے دیکھا وہ ماموں کے اتنے قریب رہتے ہوئے بھی اس عمر میں اکیلی رہتی ہیں۔ یہ گھر ایک اکیلے بندے کے لیے بہت بڑا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں میرا ان کا ساتھ نہ ہوتا جب بھی وہ یہاں اکیلی ہی رہ رہی ہوتیں۔ تمہیں پتا ہے وہ یہاں اکیلے رہنے کو کیوں ترجیح دیتی ہیں۔''

''کیوں؟'' نگین نے دلچسپی سے سنتے ہوئے پوچھا۔

''کیونکہ اس گھر کے در و دیوار میں ان کا مزاج رچ بس گیا ہے۔ اس گھر کے ماحول میں ایک مخصوص ٹھہراؤ اور تحمل ہے جو بی اماں کی ذات کا حصہ ہے۔ میں نے یہ ماحول کہیں اور نہیں دیکھا۔ ان کی شخصیت کا صبر، حوصلہ اور تحمل اس گھر کی فضا پر چھایا رہتا ہے۔ وہ خوش رہتی ہیں، تنگ نہیں پڑتیں، غصے میں نہیں آتیں، تم نے دیکھا اس گھر کے کونے کونے میں خوشی کا اور شکر گزاری کا احساس ٹپکتا ہے۔'' نگین کو محسوس ہوا اس کا کہا ایک ایک حرف سچ تھا۔ اسے یہ ساری کیفیات محسوس ہونے لگیں۔

''یہ سب بہت rare ہے۔ میں نے اپنی کسی خالہ کے کسی ماموں کے اور اماں کے مزاج میں یہ چیز نہیں دیکھی، یہ ممکن نہیں کہ بی اماں نے ان کے ذہنوں میں ڈالی نہ ہو مگر وہ نئے ماحول کو نئے انداز کو اڈاپٹ کر گئے ہیں، یہاں بے جگہ محسوس کرتے ہیں۔''

''تمہیں ہمیشہ یہاں تو نہیں رہنا حمزہ۔'' نگین کو خیال آیا۔ ''اب سے کچھ دیر بعد جب پریکٹیکل لائف میں قدم رکھو گے تو ممکن ہے اس وقت یہ جگہ تمہیں چھوڑنی پڑے، تم بھی نئے ماحول اور نئے انداز کو اڈاپٹ کر جاؤ گے اور یہاں بے جگہ محسوس کرو گے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہو۔'' حمزہ نے سر ہلایا۔ ''میں یہاں بی اماں کے ساتھ تنہا رہا ہوں، اس گھر کا ماحول میرے مزاج میں بھی رچ بس گیا ہے، میں یہاں سے کہیں اور جا کر تو بے جگہ محسوس کر سکتا ہوں یہاں نہیں، تمہیں پتا ہے نگین! بی اماں نے زندگی کے وہ سنہرے اصول میرے مزاج کا حصہ بنا دیے ہیں جو ہم رسالوں، کتابوں کے اقوالِ زریں والے صفحات پر پڑھتے اور بھول جاتے ہیں۔ مجھے خود بھی پتا نہیں چلا کہ ایسا کیسے ہوا مگر یہ سب انہوں نے بھی لاشعوری طور پر کیا۔ روایات اور اخلاق کے اصولوں سے پیار آج کی دنیا کے اصول

نہیں رہے مگر میں نے محسوس کیا کہ جہاں یہ نہ ہوں وہاں مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ میں اپنی اماں کے پاس اسی وجہ سے تو رہ نہیں سکا۔ وہاں مجھے یہ دونوں چیزیں نظر نہیں آتیں۔"

"تم قدامت پسند بن گئے ہو۔" نگین نے اسے تنگ کیا۔

"یہ قدامت پسندی نہیں ہے لیکن انسان کی زندگی کے کچھ اصول ایسے بھی ہونے چاہئیں جن کی وجہ سے وہ اس ماحول کا حصہ نظر آئے جس میں وہ رہتا ہے۔ ورنہ تو بندہ اوپرا، اوپرا سا لگتا ہے۔" یہ ایک منفرد سی بات تھی مگر نگین نے بہت بعد میں یہ جانا کہ اسی منفرد بات کی وجہ سے حمزہ باقی لوگوں سے مختلف نظر آتا تھا۔ اس کے اپنے خاندان کے لوگ کھاتے پیتے اور جدید طرزِ زندگی کے شیدائی تھے اور بی اماں کے گھر کے ماحول کا مذاق اُڑاتے تھے مگر حمزہ کسی قسم کے کامپلیکس کا شکار نہیں تھا۔ وہ ان سب میں اسی اعتماد سے اٹھتا بیٹھتا تھا جو اس کی شخصیت کا خاصّہ تھا وہاں اس کی اور ان کی شخصیات میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا تھا۔

"مہرین کے گھر میں حمزہ اب رہ ہی نہیں سکتا۔" نگین کی امی کبھی کبھار خیال ظاہر کرتیں۔ "بڑی مشکل بات ہے۔"

جب بی اماں کا انتقال ہوا اس وقت حمزہ لاہور میں پڑھ رہا تھا۔ وہ ویک اینڈ پر باقاعدگی سے گھر آتا تھا، نگین کی شادی ہو چکی تھی، بی اماں کی موت ان سب کے لیے بہت بڑا صدمہ تھی مگر حمزہ کے لیے ایک بڑا جھٹکا ثابت ہوئی تھی۔ وہ بی اماں کے سائے سے محروم ہو گیا تھا اور دوسری طرف اس کی اماں اب اس سلسلے میں کوئی دلیل سننے کو تیار نہ تھیں کہ وہ ان کے پاس جا کر نہیں رہے گا۔ نگین بخوبی سمجھ سکتی تھی کہ حمزہ کی زندگی میں وہ وقت سب سے کڑا تھا مگر اس وقت تک وہ میچور اور کمپوزڈ ہو چکا تھا کہ اس نے کسی پس و پیش کے بغیر اپنی اماں کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد اگرچہ وہ اس سے رابطے میں رہا مگر ملاقات کا موقع کم ہی آتا۔ اب کچھ عرصے سے جب حمزہ کو اس فرم میں جاب مل گئی اور اس کا پہلا ٹرانسفر لاہور ہو گیا تو نگین سے ملاقات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

نگین اب اس کو دیکھتی تھی تو اسے محسوس ہوتا تھا کہ حمزہ کی شخصیت اور مزاج میں کافی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ یہ ایک فطری سی بات تھی مگر اس کا وہ مخصوص ٹھہراؤ اور تحمل اب بھی اس کے مزاج سے جھلکتا تھا۔ جس نے اسے باقیوں سے منفرد بنا رکھا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنے باقی گھر والوں سے اتنا مختلف لگتا تھا کہ اکثر لوگ حیرت سے مہرین سے پوچھتے تھے کہ کیا یہ واقعی ان کا بیٹا ہے۔

☆☆☆

"تم علینہ ہو؟" علینہ کو اپنے سیل فون پر ایک اجنبی آواز سنائی دی، یہ کون تھا جو اتنی بے تکلفی سے اس سے بات کر رہا تھا۔

"آپ کون ہیں؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"میں وہی ہوں جس کو کچھ دن پہلے لائیو شو میں آپ کوس رہی تھیں۔" دوسری جانب سے آواز آئی۔

"ار... ے......" علینہ کے دل نے ایک دھڑکن مس کر دی۔ "فہد!" وہ اس روز لائیو شو میں اپنی آواز سنائی نہ دیے جانے پر بہت مایوس تھی۔

"آئی ایم سوری! اس روز میں نے دانستہ تمہاری کال رُکوا دی، جو تم کہہ رہی تھیں وہ آن ائر چلا جاتا تو مسئلہ ہو جاتا۔"

"ہاں شاید۔" علینہ کو اس کی بات فوراً سمجھ میں آ گئی۔

"کیسی ہو؟" دوسری جانب سے پوچھا گیا۔ "میں نے بہت بے صبری سے تمہارا نمبر لیا آپریٹر سے یار آئی سو مچ مس یو!" وہ بے تکلفی سے کہہ رہا تھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہیں یہاں سے گئے عرصہ ہو گیا تم اس دوران ملک سے باہر رہے پھر تم مجھے کب کہاں اور کیسے مس کرتے ہو، میرا خیال ہے کہ میرا تو نام بھی تمہیں اس روز یاد آیا ہوگا جس روز میں نے کال کی تھی۔"

"میں بھول گیا ہوتا تو اس روز بھی یاد نہ آتا۔" دوسری جانب سے سنجیدگی سے کہا گیا۔ "تم میری واحد ایسی پرانی یاد ہو جسے میں کبھی بُھلا نہیں سکا۔ تم کیسی ہو لینہ، کیا کر رہی ہو، آنٹی کیسی ہیں، ایبٹ آباد کیسا ہے، وہ سڑکیں، وہ راستے شملہ، سربن، برن ہال، پی ایم اے روڈ، عباسی مسجد اور ہرنو کیسے ہیں، اس شہر کی فضائیں اور ہوائیں کیسی ہیں؟ میں اس سب کو بہت مس کرتا ہوں۔ میں بہت دنیا گھوما ہوں مگر اس شہر کی فضا کی خوشبو اور اس شہر کے رنگوں جیسے رنگ میں نے کہیں اور نہیں دیکھے، نہ محسوس کیے، لینہ تم سوچ نہیں سکتیں کہ اس روز تمہاری کال نے مجھے کتنا خوش کیا مجھے لگا میں اس لائیو شو میں آیا ہی اس لیے تھا کہ اس کے ذریعے تمہارے ساتھ میرا رابطہ ممکن ہونا تھا۔"

"ارے یہ تو ویسے کا ویسا ہی ہے۔ اتنا ہی بے تکلف، اتنا ہی سادہ۔" علینہ نے لمحوں میں اندازہ لگایا۔

"اور کتنے مزے سے تم مجھے گدھا کہہ رہی تھیں اس روز۔ ارے، کیا یہ کام گدھوں کے کرنے کا ہے، تم کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے جاتی ہو تو کیا گدھوں کا پکایا کھانا کھاتی ہو۔" پھر اچانک جیسے اسے لڑنا یاد آ گیا۔

"اچھا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم خانساماں ہونے پر فخر کیا کرو گے، مالی گیری، بیرا گیری، ڈرائیوری اور خاکروبی کے اعلیٰ کورسز کرنے کب تشریف لے جا رہے ہو بیرونِ ملک؟" علینہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "آئیڈیا برا نہیں۔ اگر ایسے کورسز منعقد ہوئے تو کرنے پر غور کیا جاسکتا ہے۔" پھر وہ دونوں بے اختیار ہنس دیے۔ اب وہ ایک دوسرے سے اتنے سالوں میں گزر جانے والے حالات کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔

"ارے، یوں لگتا ہے کہ برسوں کے بعد کسی اپنے سے ملاقات ہوئی ہو۔" اس رات علینہ نے بستر پر لیٹے لیٹے سوچا۔ "اور بات بھی یوں کہ جیسے درمیان کا وقت آیا ہی نہ ہو، سچ ہے فہد اس لائیو شو میں آیا ہی اس لیے تھا کہ اس کی میری بات ہونی تھی۔" اس روز وہ بہت دنوں بعد دل سے خوش تھی بہت خوش۔

☆☆☆

"تیری ضد بھی تو انوکھی ہے بینش۔" صالحہ نے کچن میں بیٹھے کھانا کھاتے ہوئے بینش کو مخاطب کیا۔ "رشید اور مجید کو میں کیا سمجھاؤں اور تو کیا سمجھائے کہ تو نے اس کالج میں داخلہ لینا ہے جس میں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں اور تو نے وہاں جو پڑھائی کرنی ہے اس کو کرنے کے بعد تیرے ہاتھ کمہاروں والا ہنر آجائے گا، مٹی کے برتن بنانے لگ جائے گی۔ وہ تجھ سے کیا یہ سوال نہ کریں گے کہ کمہاروں کی طرح برتن ہی بنانے سیکھنے ہیں تو پڑھائی پر اتنا خرچہ کرنے کے بجائے اپنے تانگے چلی جا پسرور، وہاں بہتیرے ہوتے ہیں کمہار اور کمہاروں کے برتن، بہتیرا پیسہ کماتے ہیں وہ اِدھر اُدھر برتن بیچ کر بلکہ پورے پاکستان میں۔" صالحہ نے اپنے تئیں بہت اچھی دلیل پیش کی تھی۔ جس کو سننے کے بعد بینش کو اپنے دماغ سے پڑھنے کا کیڑا بالکل ہی نکال دینا چاہیے تھا۔ بینش گھٹنوں پر منہ دھرے بڑی دلچسپی سے اماں کو سوکھی روٹی پر کریلے پیاز رکھے رغبت سے کھاتے دیکھ رہی تھی۔

"اس کام میں اور اس پڑھائی میں بڑا فرق ہے اماں۔" اس نے اپنی دلچسپی اور محویت کو جھٹک کر کہا۔ "وہ کمہاروں کا پیشہ اور مہارت تعلیم کا ایک شعبہ بن گیا ہے۔ اس کی با قاعدہ تعلیم انسان کو برتن سازی کے فن کا ماہر بنا دیتی ہے اور آپ کو اندازہ نہیں کہ آج کل اس کی کتنی اہمیت ہے اور اس کے ذریعے کتنی شہرت اور کتنا پیسہ کمایا جاسکتا ہے۔"

"لے شہرت کو ہم نے آگ لگانی ہے۔" صالحہ نے سادگی سے کہا اور لسّی کے گلاس کو ایک سانس میں ختم کر کے ہونٹوں کو دوپٹے سے پونچھا۔ "ہاں پیسے کی بات کر، پیسہ تو لڑکیاں خوب کما رہی ہیں، ثمینہ کو دیکھا جس ہوٹل میں کھانا دیتی ہے لوگوں کو، وہاں سے پیسہ بھی ملتا اور بچا بچایا ڈھیر کھانا بھی، وہ ہوٹل والے اگلے دن گرم کر کے تھوڑی دیتے ہیں پچھلے دن کا کھانا، وہ رات کو سب بانٹ دیتے ہیں اپنے کام کرنے والوں کے درمیان پر ثمینہ نے تو کچھ خاص پڑھائی نہیں کی، پھر بھی کما رہی ہے خوب، تو جو کہہ رہی ہے اس پر تو پیسہ ہی بہت لگتا ہے، پہلے اتنا پیسہ لگاؤ پھر کماؤ، اس وقت تک ہم تجھے یہاں تھوڑی ہی بیٹھا چھوڑیں گے، اس وقت تک تو اپنے اگلے گھر چل پڑی ہوگی، اگلوں کو فائدہ پہنچانے، پیسہ ہم لگائیں فائدہ اگلے اٹھائیں یہ بھی کوئی بات ہوئی۔" صالحہ کے لہجے میں قطعیت تھی وہ ہرگز بینش کا ساتھ دینے والی نہیں تھیں۔

"میں بھائیوں سے خود ہی بات کرلوں گی اماں، مجھے یقین ہے وہ میری بات ٹالیں گے نہیں۔" اس نے صالحہ کے کھانا ختم کرنے کے بعد برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا وہ اتنی دیر اماں کے بہلاوے میں رہی، خود ہی بھائیوں سے بات کر لیتی آر یا پار فوراً ہی پتا چل جاتا۔

اس کے رشتے داروں کا خیال تھا کہ اپنے حالات اور ماحول سے اس کا مزاج میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں رہتی بستی تھی مگر خود وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسا نہیں تھا۔ وہ جن حالات اور ماحول میں پلی بڑھی

تھی اس سے اس کی جذباتی وابستگی تھی اور اسے ان سے کوئی اختلاف نہیں تھا، ہاں اسے پڑھنے اور اچھا پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے گوالمنڈی کالج سے ایف اے کیا تھا اور اب اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ فائن آرٹس میں بی اے کرے۔ اس کا دل پنجاب یونیورسٹی سے زیادہ نیشنل کالج آف آرٹس میں داخلہ لینے کو چاہتا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ اس کے بھائی اس پر نہیں مانیں گے۔ اگر وہ وہاں کے ماحول کے بارے میں کچھ نہ بھی جانتے ہوئے تو بھی وہاں کے اخراجات کے بارے میں جان کر ہی منع کر دیں گے۔ جبکہ خود اس کا یہ خواب تھا کہ وہ وہاں پڑھے۔ اس کے پاس پنجاب یونیورسٹی ہی ایک ایسی چوائس تھی جس کے لیے بھائیوں سے اصرار کیا جاسکتا تھا۔ ایسے موقع پر جب اپنے دل کی کوئی بات کہنا ہوتی اسے اپنے ابا بہت یاد آتے۔ جو اس کے ساتھ شفیق بھی تھے اور اس کی بات ماننے کو ہر دم تیار بھی رہتے تھے لیکن جن کے سائے سے وہ بہت جلد محروم بھی ہوگئی تھی۔ اسے خیال آتا کہ وہ زندہ ہوتے تو نہ صرف پڑھنے کا بلکہ این سی اے میں پڑھنے کا اس کا خواب بھی ضرور پورا ہوتا۔ اس سے دونوں بڑے بھائی جن کی وہ اکلوتی بہن تھی وہ بھی اس کے ساتھ بہت پیار کرتے تھے مگر بہت سی باتیں ایسی تھیں جن پر وہ اس کا نقطۂ نظر سمجھ نہ پاتے تھے، ابا کی وفات کے بعد ان دونوں کو ہی اپنی پڑھائی چھوڑ کر ابا کی کپڑے کی بڑی دکان سنبھالنا پڑی تھی۔ ابا کی دکان دادا کے زمانے سے بہت چلتی تھی اور واقف لوگ امرتسر کے ان کشمیری شیخ برادران پر اعتماد بھی ان کے باپ دادا کی دیانتداری کی وجہ سے ہی کرتے تھے۔ بھائیوں کی طبیعت میں ایمانداری اور حلم ابا کی وجہ سے آیا تھا، دونوں محنتی اور حوصلے والے تھے، کاروبار پہلے سے بھی بہتر ہوگیا تھا اور اب تو چھوٹا بھائی اسی دکان کی ایک برانچ انارکلی میں بھی کھولنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ بینش کو ابا کے بعد انہوں نے کسی طرح کی کمی نہیں ہونے دی تھی اور بہت لاڈ پیار سے رکھا تھا مگر اس کی جن باتوں کو وہ سمجھ نہیں پاتے تھے ان کے سلسلے میں وہ بے بس تھے۔

"میرا تو خیال ہے بینش بیٹا تو سیدھا سیدھا بی اے کرلے اپنے اس گوالمنڈی والے کالج سے ہی۔" اس رات جب کھانے کے دوران بینش نے براہِ راست بھائیوں سے بات کی تو بڑے بھائی نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو اور کیا یہ ہی تو میں اسے سمجھاتی ہوں، ہم نے تجھے اگلے گھر بھیج دینا ہم نے کون سا تجھ سے نوکریاں کروانی ہیں۔" اماں نے بیٹے کا موقف سن کر بینش کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جیسے کہہ رہی ہوں اور لے مزہ خود بات کرنے کا۔

"پر بھائیان۔" بینش نے اپنے مخصوص انداز میں کہنا چاہا۔

"پر والی کوئی بات رہ ہی نہیں گئی۔" اماں جھٹ سے بولیں۔ "بھائی نے کہہ تو دیا ہے کہ کیا کرنا ہے، چل تیرا شوق ہے تو دو جماعتیں اور پڑھ لے ورنہ ہمارے گھر تو لوگ ابھی سے رشتہ پوچھنے آتے ہیں اللہ کے فضل سے کوئی کمی نہیں ہے۔"

"او اماں آپ تو چپ کرو۔" چھوٹے بھائی نے الجھ کر کہا۔ "تم بتاؤ بینش صاف، صاف کیا دل چاہتا ہے تمہارا؟" بینش کا دل اچھل کر حلق میں آگیا، یہ ہی وقت تھا کہہ دینے کا یہ وقت نکل جانے کے بعد واپس آنے والا نہیں تھا۔

"میرا دل چاہتا ہے میں فائن آرٹس پڑھوں، ایف اے میں میری ٹیچرز میرے کام کی بہت تعریف کرتی تھیں، وہ یہی کہتی تھیں کہ اگر میں پروفیشنل ایجوکیشن حاصل کرلوں تو بہت اچھا ہوجائے گا۔" اس نے دانستہ

انگریزی کے الفاظ بولے اسے معلوم تھا کہ ان کا اثر کیا ہونے والا تھا۔

”یہ تو بڑے فخر کی بات ہے۔“ چھوٹے بھائی نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ ”سب بچوں کو تو ٹیچرز مشورے نہیں ناں دیتیں۔“

”پھر؟“ بڑے بھائی نے چھوٹے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہم تو پڑھنے کا شوق پورا نہ کر سکے۔ حالانکہ میں بھی اپنے ٹیچرز کا بڑا پسندیدہ طالب علم تھا مگر قسمت!“ چھوٹے بھائی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”پر اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، بینش اگر پڑھ سکتی ہے اسے شوق بھی ہے تو پڑھنا چاہیے، ساری دنیا پڑھ رہی ہے اب تو، جتنا پڑھ لے اتنا ہی اچھا ہے۔ زندگی کا کوئی تو طریقہ تو آئے گا۔“

”ہا...... ہائے۔“ اماں اس کا پلٹ پر حیران ہوئیں ”پر وہ تو کہتی ہے پڑھ کر میں نے برتن بنانے ہیں مٹی کے کمہاروں کی طرح۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے، صرف پڑھائی نہیں ہنر بھی سیکھ لے گی۔“ چھوٹا بھائی کچھ زیادہ ہی دیالو ہو رہا تھا۔ ”کہاں سے لینے ہیں داخلہ فارم بینش، مجھے بتادے میں منگوادوں گا۔“ اس نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا، بڑا بھائی کچھ نہیں بولا، یوں یہ طے ہوگیا کہ بینش نے آئندہ آنے والے وقت میں کیا کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ کمرا نفاست سے سجایا گیا تھا، اس میں ہر طرح کی سہولت میسر تھی، کلر اسکیم اور فرنیچر بے حد دلکش تھا مگر اس کا دھیان ان میں سے کسی چیز پر بھی نہیں تھا۔ وہ جس کو صرف دیکھنے کی خاطر یہاں آیا تھا وہ مجسم اس کے سامنے موجود تھی۔ اس کا دھیان اس کے خوب صورت لباس اور بناؤ سنگار پر بھی نہیں تھا۔ وہ تو صرف اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں صرف اس کے چہرے پر اٹکی تھیں۔ اس کا چہرہ جو اس کے دل کا آئینہ تھا اور پکار پکار کر بتاتا تھا کہ اس کا دل کتنا خوب صورت، معصوم اور سادہ تھا۔ اس کے چہرے کی دلکشی اس کے لیے ایک اضافی چیز تھی، اصل میں اس کا دل تھا جس نے اسے اپنے سامنے جھکا دیا تھا۔ ”ارے کیا یہ دل یہاں آنے والے ہر شخص کو نظر آتا ہے؟“ وہ پوچھنا چاہتا تھا مگر یہ بات اسے کبھی نہیں پوچھنا تھی۔ اس سوال کے ساتھ ہی وہ تلخ حقیقت بھی سامنے آجاتی تھی جس سے نظریں چار کرنا بھی مشکل تھا اور نظر بچانا بھی مشکل۔ یہاں اس حسن کو خیرہ کردینے والی خوب صورتی کو دیکھنے کے لیے آنے والا وہ اکیلا نہیں تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں کوئی بھی چند سکوں کے عوض من پسند چہرہ دیکھنے اور من پسند جسم سے ناتا جوڑنے کے لیے آسکتا تھا۔

”اُف!“ اس کے حلق میں زہر سا بھر گیا جسے اس نے ٹھنڈے مشروب کے ایک گھونٹ کے ساتھ حلق سے اتارا اور اس حقیقت سے نظر بچانے کے لیے ایک بار پھر اس وجود پر بھرپور نظر ڈالنے لگا۔ اس کا چہرہ، اس کا جسم وہ اوپر سے دیکھتے، دیکھتے نیچے آنے لگا۔ اس کے ہاتھ بے حد خوب صورت تھے پھر اس کی نظر اس کے بازو میں پہنے خوب صورت جڑاؤ کنگن پر اٹک گئی۔

”تمہیں معلوم ہے میں یہاں کیوں آیا ہوں، تم جانتی ہو کہ میں نے اس ایک رات کی بھاری قیمت کیوں ادا کی ہے؟“ اس نے بھاری لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔

* *

تپتی دوپہر دھیرے دھیرے شام میں ڈھل رہی تھی۔ دھوپ دیواروں سے اوپر چھتوں کی طرف جانے لگی تھی مگر تپش کا اثر کم نہیں ہو رہا تھا۔ فضا میں ہوا کا احساس ذرا برابر بھی نہیں تھا، چرند پرند سب کسی سائے میں چھپے بیٹھے تھے اور ماحول پر عجیب افسردہ سی خاموشی چھائی تھی۔ بینش نے کتنی دیر تک چھت کے پنکھے کے ہلتے پروں کو گھورتے رہنے کے بعد اکتا کر وہاں سے نظریں ہٹائیں اور اپنے بستر کے ساتھ والی کھڑکی سے چق ہٹا کر باہر گلی میں جھانکا۔ گلی بھی سنسان تھی، گلی میں ہر دم کھیلتے رہنے والے بچے بھی شاید اس گرمی کی حدت کو برداشت نہ کرتے ہوئے گھروں کو بھاگ گئے تھے۔ دور گلی کے آخری سرے پر فالسوں کی چھابڑی کسی گھر کی سیڑھیوں پر رکھے ایک شخص اکتایا ہوا کھڑا نظر آیا جو چہرے پر آئے پسینے کو بار بار شانے پر رکھے پیلے کپڑے سے پونچھ رہا تھا۔

”کتنی محنت طلب کمائی ہوگی اس شخص کی۔“ اسے خیال آیا۔ ”صبح کسی باغ سے فالسے توڑتا ہوگا اور پھر دن بھر گلی، گلی پھر کر انہیں بیچتا ہوگا۔ باغ والے کو پیسے دینے کے بعد اس کے پاس کیا بچتا ہوگا؟“ اسے خیال آیا۔

”ارے، یہ شخص تو آئیڈیل ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”جس دور میں کمائی کرنے کے لیے اتنے شارٹ کٹس دستیاب ہوں اس دور میں اتنی محنت اور مشقت کی کمائی کرنے والا آئیڈیل ہی تو قرار دیا جانا چاہیے۔“ یہ بات اس نے دانیال سے سنی تھی اس بات کے یاد آتے ہی بینش کا دھیان باقی سب باتوں سے ہٹ کر دانیال کی طرف چلا گیا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے فائن آرٹس ڈپارٹمنٹ میں بی ایف اے سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا اور ایک انتہائی قابل طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی شخصیت اور فن اسے واقعی دوسروں سے ممتاز نظر آنے میں مدد دیتے تھے۔ بینش نے اسے یونیورسٹی میں اپنے پہلے ہفتے کے دوران ہی نوٹ کرلیا تھا، اس کی وہ پہلی مکمل بات جو اس نے سنی تھی اس کا خیال تھا کہ اسے عمر بھر نہیں بھولے گی۔

”تم بتاؤ تمہاری ترجیح کیا ہوگی؟“ وہ اپنے کسی دوست سے پوچھ رہا تھا۔ ”تمہارے قریب ہی ایک سپر اسٹور ہے جہاں ہر چیز مل جاتی ہے آئس کریم سمیت اور تمہیں سامنے سے آئس کریم کی ریڑھی کھینچتا پسینے میں شرابور گرمی کا ستایا ہوا شخص آتا نظر آئے، کھانی تو تمہیں آئس کریم ہی ہے بتاؤ کس سے لوگے سپر اسٹور والے سے یا اس آدمی سے؟“

”آئس کریم کی کوالٹی پر منحصر ہے۔“ اس کے دوست نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”اگر تم اس ریڑھی والے کی مدد کے خیال سے کہہ رہے ہو تو اسے چند پیسے ویسے دے دوں گا۔“

”اس کی عزتِ نفس کی پروا نہیں کروگے؟“ دانیال کی بات نے بینش کو باقاعدہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کردیا تھا۔

”ان لوگوں کی بھی کوئی عزتِ نفس ہوتی ہے؟“ اس کے دوست نے ہنس کر جواب دیا تھا۔ ”اس روز اس شخص کو دیکھا تھا جو اس روڈ سائڈ ہوٹل کے قریب موجود تھا جہاں سے ہم نے کھانا کھایا تھا، ہمارے کھانا کھانے کے بعد وہ سب پلیٹوں میں سے بچا ہوا جمع کرکے وہیں ہمارے سامنے کھانے لگ گیا تھا ایک سائڈ پر بیٹھ کر، ان لوگوں کی میرے بھائی کوئی عزتِ نفس نہیں ہوتی......“ وہ ہنس رہا تھا۔

”انہی لوگوں کی تو عزتِ نفس ہوتی ہے منصور۔“ بینش نے دیکھا دانیال کے چہرے پر کرب تھا۔ ”یار اس عزتِ نفس کی پروا ہم لوگوں نے نہ کرکر کے اس کو مار ہی دیا ہے مگر یقین جانو انہی لوگوں کے پاس تو عزتِ نفس ہوتی ہے۔“

"ایک بات تو بتاؤ۔" منصور نے اس سے پوچھا۔ "تمہیں اتنا احساس ہے ایسے لوگوں کا تو اس روز تم اس شخص کو کھانا کیوں نہیں کھلا دیا؟"

"اسی خوف سے کہ اس کی عزتِ نفس میرے یوں کھانا کھلانے پر مجروح نہ ہو جائے، وہ جس طرح کھا رہا تھا..... نظروں میں آنے پر شرمندہ نہ ہو جائے، مجھے اس بات سے ہمیشہ بہت ڈر لگتا ہے یار۔" وہ رہا تھا۔ "تمہیں فٹ پاتھ پر بیٹھا وزن کی مشین رکھے لوگوں کا وزن بتانے والا وہ شخص یاد ہے جسے ہم نے پیسے دینے کی کوشش کی تھی بغیر وزن کیے، کتنا لڑا تھا وہ شخص ہم سے، کیسے حقارت سے اس نے ہمارے ہماری طرف پھینک دیے تھے۔ میں اس روز سے ہی ان لوگوں کی عزتِ نفس مجروح ہو جانے کے خیال سے ہُوا ہوں۔"

"سب ڈرامے ہیں یار، ان لوگوں کی کوئی عزتِ نفس نہیں ہوتی۔ پیسہ دکھا کر ان سے کوئی کام بھی کوئی فرق نہیں پڑتا ان کو۔" اس کے دوست نے کہا تو وہ لمبی بحث میں پڑ گئے۔

دانیال کا تعلق کسی امیر اور اونچے گھرانے سے تھا۔ یہ بات بینش کو ڈپارٹمنٹ میں اس کی پہلی دوست آمنہ نے بتائی تھی جو دانیال کو ذاتی طور پر بھی جانتی تھی۔ اس روز اس کی اپنے دوست کے ساتھ اس بحث کو سُن کے بعد بینش کو لگا جیسے اسے کہیں بہت اندھیرے میں انسانیت کی روشنی نظر آ گئی ہو۔ ڈپارٹمنٹ میں پہلے کے دوران وہ خاصی گھبرائی ہوئی سی رہی تھی۔ یہاں کا ماحول، یہاں کے رنگ ڈھنگ پورا کلچر ہی مختلف تھا۔ گوالمنڈی کالج سے یہاں تک سفر طے کر لینا الگ بات، یہاں آ کر خود کو ایڈجسٹ کرنا دوسری بات تھی۔ پہلے ہفتے میں بینش کو اپنی جیسی کوئی نظر نہیں آئی، اگلے ہفتے میں اس کی دوستی آمنہ سے ہوئی جو اگرچہ طبقاتی اعتبار سے اس سے بہت مختلف تھی مگر محبت کرنے والی پُرخلوص لڑکی تھی۔

"تمہیں پتا ہے بینش تم کتنی پیاری لڑکی ہو۔" اس نے دوستی کے پہلے دن ہی اس سے کہہ دیا تھا۔

"میں پیاری ہوں؟" بینش کو اپنے خالص اندرونِ لاہوریے پر قابو پانے میں خاصی دقت ہوتی تھی جس کے زیرِ اثر اچھی خاصی بولی جانے والی اردو بھی پنجابی محسوس ہوتی تھی۔

"ہاں تو اور کیا۔" آمنہ نے بے پروائی سے کہا تھا۔ "ہم لوگ جس خوب صورتی کو حاصل کرنے کے لاکھ جتن کرتے ہیں، وہ تمہارے پاس ویسے ہی ہے قدرتی اور خالص اور اوپر سے تم ابھی تک ویسے ہی خالص ہو، تمہاری روح خالص ہے ابھی تم پر ماحول کی ناخالصیت کا اثر نہیں ہوا اس لیے تم اتنی پیاری دِکھتی ہو لیکن مجھے ڈر ہے یہ ڈپارٹمنٹ تم پر اثر کر کے چھوڑے گا۔"

"ہائے اللہ نہ کرے۔" بینش کو ڈپارٹمنٹ میں موجود لڑکے لڑکیوں کی بے ساختگی اور کھلا ڈلا میل جول یاد آ گیا، کیا وہ کبھی ایسی ہو سکتی تھی، کیا وہ اتنی بے ساختہ اور بے قابو ہو سکتی تھی کہ ساتھ پڑھنے والے لڑکے سے یوں گفتگو کرے اور بے تکلف ہو جائے جیسے کسی لڑکی کے ساتھ ہوتی ہے۔

"یہ تم ابھی کہہ رہی ہو ناں بینش۔" آمنہ نے اپنے شولڈر کٹ سلکی بالوں کو ہاتھ سے برابر کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے سیدھی سادی معصوم لڑکیوں کو ماحول کا اثر پکڑتے دیکھا ہے مگر تم فکر مت کرو، تمہاری قسمت اچھی ہے کہ میں یہاں ہوں، میں تمہاری روح کی خالصیت کی حفاظت کروں گی۔ مجھے خالص روحیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ بینش اس ڈپارٹمنٹ میں میرے جاننے والے بہت ہیں۔ کچھ پرانے دوست بھی ہیں، کچھ فرینڈز ہیں مگر میں دوستی صرف تم سے کروں گی کیونکہ تم جیسے لوگوں کے قریب رہنا میں اپنے لیے اعزاز

ہوں۔"

بینش کے لیے یہ ایک غیر متوقع سی بات تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ ایک سیدھی سادی لڑکی تھی اور اس ماحول میں آ کر ایک مرتبہ تو بری طرح گھبرا گئی تھی مگر آمنہ یوں اس سے دوستی کے لیے ہاتھ بڑھائے گی اس کا خیال اسے نہیں آیا تھا مگر اسے ایک سہارا چاہیے تھا ایک دلاسا، اسے یہاں سروائیو کرنے کے لیے ایسے ہی ساتھ کی ضرورت تھی سو اس نے بلا تامل دل سے آمنہ کی دوستی کو قبول کر لیا تھا اور وہ آمنہ ہی تھی جو اسے نئی نئی چیزوں سے روشناس کروا رہی تھی۔ بینش نے ایف اے میں فائن آرٹس نہیں پڑھا تھا، وہ سائنس کی اسٹوڈنٹ تھی مگر کالج کے فنکشنز پر پوسٹرز اور بیک گراؤنڈز بنانے میں اس کا بڑا شہرہ تھا۔ جب ہی میڈیکل کے لیے اچھے نمبر نہ آنے پر اس کی ایک ٹیچر نے اسے فائن آرٹس پڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔ فائن آرٹس سے اس کے ذہن میں جس چیز کا تصور آتا تھا اس میں مٹی کے برتن بنانے کا فن سب سے نمایاں تھا۔ وہ ٹی وی پر اس سے متعلق کئی پروگرام دیکھ چکی تھی اور اس کے لیے فائن آرٹس پڑھنے کے خیال میں سب سے زیادہ خوشی کا مقام ہی یہ تھا کہ وہ مٹی کے برتن بنانا سیکھ لے گی مگر شروع، شروع میں اسے یہ کورس لائن مشکل اور پڑھائی کا شیڈول سخت لگا تھا۔ اس کی انگریزی بہت اچھی نہیں تھی اس کے لیے یہ سب سے بڑی جھینپ تھی، اس کے ڈپارٹمنٹ میں اکثر لوگ بڑی روانی سے انگریزی بولتے تھے۔ وہ ان کی بات سمجھ جاتی مگر.... وہ انہیں انگریزی میں جواب نہیں دے پاتی تھی۔

"یہ کوئی شرمندگی والی بات نہیں۔" اس سلسلے میں بھی آمنہ نے اس کو تسلی دی۔ "تم پورے اعتماد کے ساتھ اردو میں جواب دیا کرو، بے شک تم اپنی انگریزی بہتر کرنے کی کوشش کر سکتی ہو مگر اردو پر شرمندہ ہونے کا کبھی نہ سوچنا یہ سب سے بڑی جہالت ہوگی۔" اور بینش نے دیکھا تھا کہ اس کے اعتماد کے ساتھ اردو بولنے پر کوئی بھی اس کی طرف استہزائیہ نظروں سے نہیں دیکھتا تھا ہاں اگر یہی بات وہ جھینپ کر کرتی تو یقیناً بہت سی نظروں میں استہزا ہوتا۔ لیکچرز کو سمجھنے اور عملی کام کو کرنے میں بھی آمنہ اس کا پورا پورا ساتھ دیتی تھی۔ بینش کے لیے آمنہ وہ فرشتہ ثابت ہوئی تھی جو خاص طور سے کسی کام پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ سوچتی تھی کہ شاید وہ اس نئی دنیا میں کبھی قدم نہ جما پاتی اگر آمنہ وہاں موجود نہ ہوتی۔ وہ اس ڈپارٹمنٹ میں موجود رنگ برنگ لوگوں کو دیکھ کر بہت گھبرائی تھی مگر آمنہ اور دانیال کی شخصیتوں میں اسے وہ رنگ بھی نظر آیا تھا جسے اس نے بلا تامل انسانیت کا رنگ دے دیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے لیے طبقاتی فرق، رنگ، زبان، ماحول کوئی بھی چیز معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ لوگوں کو انسان سمجھتے تھے اور انسانوں کی طرح ہی تعلق قائم رکھتے تھے۔ آمنہ کے بعد جس شخص کو دیکھتے رہنے اور سنتے رہنے کی خواہش بینش کے دل میں ابھرتی تھی وہ دانیال رضا تھا اگرچہ خود دانیال رضا نے شاید بہت دیر تک اس عام اور سادہ سی لڑکی کے ڈپارٹمنٹ میں موجود ہونے کا نوٹس بھی نہیں لیا تھا۔

☆☆☆

"تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کیوں آیا؟" مہرزاد نے اپنا سوال دُہرایا تھا۔ اس سوال کے دُہرائے جانے پر زرنگار جیسے گہرے خیال سے نکلی تھی۔ اس نے اپنے بھاری پپوٹے اٹھا کر اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"یہ آنکھیں یقیناً دنیا کی خوب صورت ترین آنکھیں ہیں۔" مہرزاد کو خیال آیا۔ "کیا یہ لڑکی میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے؟" اس نے لمحے بھر کو سوچا۔ "اوہ کیا یہ بات میں بہت جلد نہیں سوچنے لگا۔" اس نے خود سے سوال کیا اور پھر سوچنے کا سلسلہ موقوف کر کے دوبارہ سے زرنگار کی جانب متوجہ ہوا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" اس نے تیسری بار یہ سوال کیا تھا۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔" زرنگار نے اپنا بھاری دوپٹا درست کرتے ہوئے کہا۔ "مگر اتنا مجھے ضرور معلوم ہے کہ جس خاطر اکثر لوگ یہاں آتے ہیں، یہ راستے اور یہ جگہ جن خیالات کو ذہن میں جنم دے کر لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے آپ ان خیالات سے بالاتر ہیں۔ آپ کوئی معمولی اور عام شخص نہیں ہیں۔ نہ ہی آپ کی سوچ اتنی عامیانہ ہو سکتی ہے۔ معمولی اور عام شخص سے میری مراد دولت، جائداد اور حیثیت ہرگز نہیں کیونکہ یہاں آنے کا تصور صرف وہی کر سکتے ہیں جو صاحبِ دولت، صاحبِ جائداد اور صاحبِ حیثیت ہوتے ہیں۔ آٹے دال کے چکر میں الجھے شخص کا یہاں کیا کام مگر آپ معمولی اور عام شخص اس لیے نہیں ہیں کہ آپ کا ذہن اور آپ کی سوچ بہت بلند، بہت غیر معمولی اور بہت خاص ہے۔ اس کا اندازہ مجھے ان چند ملاقاتوں میں جو اب تک ہوئیں، آپ کی فون کالز اور آپ کے پیغامات سے ہو چکا ہے۔"

"اسی لیے تم نے ایک رات میرے نام کر دینے میں تامل نہیں کیا۔" مہرزاد کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

"یقیناً......!" زرنگار کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"اور اگر تمہارا یہ یقین غلط ثابت ہو جائے اور میں بھی تمہارے جسم اور تمہارے حسن کا خریدار بن کر رات گزاروں تو......؟" مہرزاد اس کے چہرے کے تاثرات کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" نہ اس کے چہرے کے تاثرات بدلے نہ لہجے کا اعتماد ڈگمگایا تھا۔

"کیوں تمہیں اس بات کا یقین ہے اس قدر؟"

"میری عمر زیادہ نہ سہی مگر چہروں، لہجوں اور آنکھوں میں جھانکنے والے خیالات کو سمجھنے میں اتنا وقت گزارا ہے میں نے کہ اس سلسلے میں میرا اندازہ غلط ثابت ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ لمحے جو میں نے یہ تجربہ حاصل کرتے گزارے ان کا شمار کیا جائے تو میری کُل عمر سے ان کی گنتی شاید بڑھ جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے جو لڑکی یہاں اس مارکیٹ میں پہنچ گئی وہ خود اپنی مرضی سے ان راستوں پر چل کر آئی ہوگی۔ اس کے راستے میں کانٹے اور کنکر نہ ہوں گے اس کے زخم زخم پاؤں، سوچ، فہم، ادراک، شعور اور تجربے کی دھول سے پاک ہوں گے۔" اس نے کہتے کہتے مہرزاد کی طرف دیکھا۔ وہ محویت سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"نہیں خانزادہ صاحب، حقیقتیں خیالات کے برعکس ہوتی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔ "تجربات اور مشاہدات کا ایک لمبا سلسلہ ہے میرے ساتھ اور یہاں موجود ہر لڑکی کے ساتھ۔ ہمیں لہجے اور تاثرات، سوچ اور خیالات پڑھ لینے میں لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اسی لیے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ یہاں آپ کی آمد کا مقصد عام اور معمولی نہیں ہے۔ آپ کے ارادے وہ ہرگز نہیں جن کو لے کر دوسرے تمام مرد یہاں آتے ہیں۔"

"تم بہت پازیٹو ہو میرے متعلق...... حیرت ہے۔" مہرزاد نے دلچسپی سے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔

"ہونا بھی چاہیے، آپ ہیں ہی ایسے، آپ کی شخصیت کا عنوان ہی مختلف ہے۔" زرنگار کے لہجے کے اعتماد اور یقین نے مہرزاد کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

"تم دیکھنے میں بہت معصوم لگتی ہو، تمہارا ہر انداز تمہاری کم عمری اور معصومیت کا عکاس ہے، میرا تو تجربہ اور مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ کوئی بہت تجربہ کار انسان بھی دھوکا کھا جائے اور کبھی یقین نہ کرے کہ تم جو بہت تجربے اور مشاہدے کا دعویٰ کر رہی ہو وہ درست ہے۔" اس نے کہا۔

"نہ کرے......!" وہ بے پروائی سے بولی تھی۔ "پروا کسے ہے مگر جو حقیقت ہے وہ حقیقت ہے۔ مجھے غلط

بیانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ سے تو ہرگز نہیں، آپ سے میں جھوٹ بول نہیں سکتی اور جب تک آپ سے ملاقات کا سلسلہ رہے گا میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔"

"کیوں، مجھ میں کیا خاص بات ہے؟" مہرزاد چونکا۔

"آپ......" وہ کہتے کہتے رکی اور ہنس دی۔ "آپ کو میں نے بتایا تو ہے آپ مختلف ہیں، آپ عام نہیں ہیں بہت خاص ہیں۔ آپ منفرد ہیں۔"

"اچھا......" مہرزاد نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تو ابھی ابھی جو تم نے دعویٰ کیا ہے اس پر پورا اترنا چاہیے تمہیں۔"

"کون سا دعویٰ؟" وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"یہی کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گی۔" مہرزاد نے یاد دلایا۔

"بالکل نہیں بولوں گی، یہ تو طے ہے۔" وہ اسی کامل اعتماد کے ساتھ بولی۔

"پھر یہ بتاؤ کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" مہرزاد نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔

"بتایا تو ہے کہ مجھے اس کا ٹھیک اندازہ نہیں ہے۔" زرنگار نے کہا۔

"زرنگار......" مہرزاد نے کہا اور توقف کیا۔ "یہ نام تمہاری شخصیت کے ساتھ موزوں نہیں لگتا، تمہارا یہ نام ہونا بھی نہیں چاہیے، مجھے یقین ہے کہ یہ نام اس ماحول اور اس ماحول کے بنانے والوں کا دیا ہوا ہے۔ کیا ہم تمہاری کھوج میں جا سکتے ہیں زرنگار۔ کیا ہم تمہاری تاریخ میں سے تمہارے اصل کو لوکیٹ کر سکتے ہیں؟"

"تو آپ اس لیے آئے ہیں۔" زرنگار نے فوراً اندازہ لگایا۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کسی بھی بات سے فرق نہیں پڑتا، تمہارا پس منظر کیا ہے یا اب تم کس پیش منظر میں موجود ہو۔ مجھے کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تمہیں پرکھنے اور سمجھنے کے لیے میرے پیمانے مختلف ہیں مگر میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم یہاں کیسے؟" مہرزاد نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"جاننے کی خواہش۔" زرنگار ہولے سے ہنسی۔ اس کے لہجے میں طنز تھا، استہزا تھا یا شاید پھر کچھ بھی نہیں تھا۔ "خواہش بھی ہے اور فرق بھی نہیں پڑتا۔"

"ہاں خواہش بھی ہے اور فرق بھی نہیں پڑتا۔" مہرزاد نے اس کے لہجے اور ہنسی سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ "تمہارا یہاں ہونا ایک بھیانک حقیقت ہے مگر مجھے اس بھیانک حقیقت کا سامنا کرنے سے بھی خوف نہیں آتا۔ جاننے کی خواہش اس لیے ہے کہ وہ چہرے دیکھنا چاہتا ہوں جنہوں نے ایک خوش رنگ پھول کو کیکر کے جنگل میں لا سجایا ہے۔ یاد رکھنا کیکر کا جنگل ہو یا خوش رنگ، خوش نما باغ، پھول، پھول ہی رہتا ہے نہ اس کا نام کوئی بدل سکتا ہے نہ اس کی خوب صورتی چھین سکتا ہے، یہ ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔"

"یہ خوش کُن باتیں دل کو بھایا کرتی ہوں گی کبھی مگر اب دل ہر حقیقت سے آگاہ ہے، نہ کیچڑ میں کھلنے والے پھول والی بات بھاتی ہے نہ کیکر کے جنگل میں سجے پھول کی بات اچھی لگتی ہے، کون ہے جو کیچڑ اور کیکر کے جنگل میں سجے پھول تک رسائی چاہتا ہے۔ کون ہے جو کیچڑ میں لت پت ہونا یا کیکر میں الجھ کر خود کو زخمی کرنا چاہے گا۔ کتابی باتیں کتابوں میں چھپے حرفوں کو پڑھتے ہوئے ہی اچھی لگتی ہیں، عملی زندگی بہت مختلف ہے، کیچڑ میں اُگے اور کیکر میں الجھے پھول کو دیکھ کر تعریف تو ہر کوئی کر سکتا ہے اس کی خوب صورتی سے آنکھوں کی پیاس بھی بجھائی جا سکتی ہے مگر ان تک رسائی کوئی بھی نہیں چاہتا، کون چاہے گا ایسا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے

مہر زاد کی طرف دیکھا۔

''میں......'' وہ بے اختیار بولا اور پھر ہنس دیا۔ ''سچ بتاؤں، مجھے یہ دعویٰ کرتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے، زندگی دعوؤں کے ساتھ نہیں عمل کے ساتھ سجتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ میرے جیسے شخص کی اس جگہ پر آمد کا مقصد صرف اس پھول کی خوش نمائی سے آنکھوں کی پیاس بجھانا نہیں ہے۔ مجھے اس پھول تک رسائی مقصود ہے جب ہی تو بار بار یہ سوال کر رہا ہوں کہ کیا تم جانتی ہو میں یہاں کیوں آیا ہوں؟''

''کہانیاں کہنے اور کہانیاں سننے۔'' زرنگار نے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں پڑی قیمتی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے کہا۔

''حقیقت سننے......'' مہر زاد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''حقیقت سنانے کا وقت بعد میں آئے گا اور میں وعدہ کرتا ہوں، وہ میں تمہیں ضرور سناؤں گا۔''

''یہ حقیقت الف لیلہٰ کی کہانیوں کی طرح طویل بھی ہوسکتی ہے لیکن میں شہرزاد نہیں ہوں۔'' زرنگار کے جملے نے مہر زاد کو چونکا دیا۔

''میں بھی بادشاہِ وقت نہیں ہوں۔'' وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اگر تم مجھے سناؤ تو یقین جانو میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھوں گا۔''

''آپ نے ایک رات کی قیمت ادا کر رکھی ہے، یہ رات بہت قیمتی ہے مگر کم ہے۔'' زرنگار نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں ایسی ایک ہزار راتوں کی قیمت ادا کرنے پر تیار ہوں اگر تم مجھے حقیقت سنانے پر تیار ہو جاؤ، ایک ہزار راتوں کی قیمت ادا کر دینے سے اگر تمہاری زندگی میں رات کی غلامی سے آزادی کی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو مجھے اور کیا چاہیے۔'' زرنگار نے محسوس کیا مہر زاد خان کا لہجہ بوجھل ہو رہا تھا، زندگی کی ایک خوب صورت حقیقت اس کے اختیار میں تھی مگر وہ اجتناب برت رہا تھا۔ وہ ایسی باتیں کر رہا تھا جو یہاں آنے والا کوئی بھی دوسرا شخص نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا اندازہ بلکہ یقین سو فیصد درست تھا۔ مہر زاد خان دوسروں سے مختلف اور منفرد تھا...... زرنگار کو اپنے اندازے کی صداقت پر یقینِ کامل ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

زوئی حسین کی زندگی کے انداز میں انتہا سے زیادہ یکسانیت تھی، وہ ایک سی روٹین پر لگی بندھی زندگی گزارنے کی عادی تھی۔ اس کا دن صبح سات بجے شروع ہوتا تھا، وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی تھی جس کی صفائی ستھرائی وہ خود کرتی تھی۔ صبح وہ اپنے لیے ناشتا، اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کچھ اسنیکس جو وہ دوپہر میں کھانے کے وقفے کے دوران کھاتی تھی اور رات کا کھانا سب اکٹھا ہی بناتی تھی۔ اس کے چھوٹے سے کچن میں دو برنر کا ایک چولھا تھا جس پر وہ ناشتا اور رات کا کھانا تیار کرتی، اسنیکس کے لیے وہ بجلی کے جدید آلات استعمال کرتی تھی، چھوٹے سے فلیٹ کی صفائی میں اسے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ سب کاموں سے فارغ ہوکر ٹھیک آٹھ بجے نیچے اتر کر اسٹاپ پر پہنچ جاتی جہاں اس کے دوا ساز ادارے کی بس اسے لینے کے لیے ٹھیک آٹھ بج کر پانچ منٹ پر پہنچ جاتی تھی۔ وہ سارا دن ادارے کی لیبارٹری میں گزارتی تھی۔ اس کا تعلق ریسرچ کے شعبے سے تھا۔ لیبارٹری کے اندر کا مخصوص ماحول اور بُو اس کے دماغ میں رچ بس گئی تھی۔ لیبارٹری کے اس شعبے سے منسلک رہنا اس ملک میں اس کی رہائش کے دن بڑھانے کا سب سے اہم ذریعہ تھا۔ اس لیے وہ بھی

اس ماحول اور اس بُو سے تنگ نہیں پڑی تھی۔ اس کے کام کے اوقاتِ کار طویل تھے وہ شام پانچ بجے فارغ ہوتی تھی اور ادارے کی بس پر بیٹھتے بیٹھتے تقریباً چھ بج جاتے تھے۔ شہر بھر میں اس وقت برقی قمقمے جگمگا رہے ہوتے جب زوئی حسین واپس گھر پہنچتی تھی، اس وقت تک اس کا دماغ اور جسم تھک چکے ہوتے تھے مگر اس کا تعلق شدید محنت کی عادی قوم سے تھا اس لیے یہ تھکن اسے بہت زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد بھی وہ زیادہ تر تنہا رہتی تھی۔ اس کا میل ملاپ کم ہی لوگوں سے تھا جس علاقے میں وہ رہتی تھی وہ لوئر مڈل کلاس لوگوں کا علاقہ تھا اس کے اوپر نیچے دائیں بائیں فلیٹس میں ایسی گھریلو خواتین رہتی تھیں جو زوئی کے بارے میں شدید تحفظات رکھتی تھیں اور اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بناتی تھیں۔

''یہ لوگ سانپ، مینڈک اور چھپکلی تک کھالیتے ہیں، یہ لڑکی بھی یقیناً ایسی ہی چیزیں کھاتی ہے جب ہی اس کے کچن سے عجیب و غریب قسم کی بو آتی ہے۔'' زوئی کو معلوم تھا کہ یہ بات تو اس کے بارے میں شد و مد سے کی جاتی تھی۔

''کاکروچ اور چوہے بھی پکاتی ہے۔ میرے بچوں نے خود دیکھا ہے کچن کی کھڑکی میں سے جھانک کر۔'' مسز امتیاز تو یہ بات بہت وثوق سے کہتی تھیں۔

''جانے کوئی دین مذہب بھی ہے اس کا کہ نہیں، سنا ہے ان چینیوں کا کوئی دین مذہب نہیں ہوتا، یہ کسی خدا کو نہیں مانتے، توبہ استغفار۔ اس بلڈنگ میں ضرور ایک فلیٹ اس چینی لڑکی کو دینا تھا ان لوگوں سے سارا ماحول خراب ہوسکتا ہے۔'' بوڑھی مسز ستّار کہا کرتی تھیں۔

ایک اکیلی زوئی حسین پورا ماحول کیسے خراب کرسکتی تھی، یہ کبھی کوئی نہیں بتاتا تھا۔ وہ بھی ان حالات میں جب وہ صبح کی گئی شام گئے گھر لوٹتی تھی اور اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ زوئی کو ان باتوں سے تکلیف ہوتی تھی، اسے اپنے بارے میں چہ مگوئیاں کیے جانے پر افسوس بھی ہوتا تھا مگر وہ اس معاشرے کی عمومی سوچ اور گفتگو سے بہت اچھی طرح واقف ہوچکی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ چہ مگوئیاں کرنا فارغ البال عورت کی فطرت تھی، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتی ہوں، اس لیے وہ ان خواتین کی باتیں بہت زیادہ محسوس نہیں کرتی تھی البتہ جس بات پر اسے سب سے زیادہ دکھ ہوتا تھا وہ یہ بات کیے جانا تھا کہ وہ لادین تھی، اگرچہ وہ خود بھی بہت اچھی طرح نہیں جانتی تھی کہ وہ مذہبی لحاظ سے کس جگہ کھڑی تھی مگر اسے اپنی ماں اور باپ دونوں کے مذاہب سے پیار تھا۔ اس کی ماں خالص چینی عورت تھی اور بدھ مذہب کو ماننے والی تھی اگرچہ اس کے نانا نانی تاؤازم کے پیروکار تھے اور اس کا باپ مسلمان تھا اگرچہ اس کے باپ نے تمام عمر چین میں گزاری مگر وہ بھی خود زوئی کی طرح مخلوط النسل تھے۔ زوئی کے دادا چینی النسل تھے اور دادی پاکستانی مسلم۔ زوئی کے دادا بھی مسلمان تھے، زوئی اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے دادا اور دادی کی شادی کا محرک کیا تھا مگر اسے ان دونوں سے شدید پیار تھا اور اپنی دادی سے محبت کی وجہ سے ہی اس نے فارمیسی پڑھنے کے لیے پاکستان کا انتخاب کیا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ ڈگری کے حصول تک کا دورانیہ پاکستان میں گزارتے، گزارتے اسے کس طرح اس ملک اور یہاں کے لوگوں سے اتنا پیار ہوگیا تھا کہ ڈگری کے حصول کے بعد اس کا واپس جانے کو ایک فیصد بھی دل نہیں مانتا تھا۔ یہ بہت مشکل وقت تھا۔ اس کے اسٹوڈنٹ ویزے کی مدت ختم ہو رہی تھی اور اسے واپس جانا تھا جبکہ وہ کسی صورت بھی خود کو واپسی پر آمادہ نہیں پاتی تھی۔ اس کی اسی خواہش کو دیکھتے ہوئے اس کے ایک استاد نے اسے ریسرچ سے منسلک ہو جانے کا مشورہ دیا۔ ریسرچ سے وابستگی کے حصول کے لیے اسے کئی ایک دوا ساز کمپنیوں کے پیچھے خوار ہونا پڑا تھا اور اس کے مطلوبہ کاغذات ملنے تک اس کے ویزے کی مدت

بڑھائے جانے کے باوجود ختم ہو چکی تھی مگر اسے خوشی تھی کہ ریسرچ سے منسلک ہو جانے کی وجہ سے اس کے ویزے پر ریسرچ کے اختتام تک قیام کا اجازت نامہ ثبت ہو چکا تھا۔ زوئی کو یہاں رہنے سے بہت سکون تھا۔ وہ ان فضاؤں اور ہواؤں سے مانوس ہو چکی تھی۔ وہ اس زمین کی محبت میں اتنی بری طرح گرفتار تھی اسے یہاں کے لوگوں کے رویے اور اور مزاج سے بھی اُنس ہونے لگا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے اسے اس وطن کی یاد بہت کم ستاتی تھی جہاں اس نے زندگی کے اٹھارہ سال گزارے تھے۔ وہ یہیں بس جانے کے خواب دیکھ رہی تھی اور اس کی اس خواہش پر اس کے دوست اور ساتھ کام کرنے والے حیران ہوتے تھے۔

''یہاں کے لوگ اِدھر سے باہر فرسٹ ورلڈ کے کسی ملک میں جانے کو بے چین رہتے ہیں زوئی.... عجیب لڑکی ہو جس کو اپنا اتنا اچھا، صاف ستھرا، پُرسکون ملک یاد نہیں آتا اور تم یہاں رہ جانا چاہتی ہو۔'' ان میں سے اکثر کہتے تھے۔

زوئی کو خود بھی سمجھ نہیں آتا تھا کہ ایسا کیوں تھا، کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ بچپن سے لے کر اس وقت تک کی زندگی جب وہ یہاں آئی تھی کی جامد خاموشی اور مشین جیسی رفتار نے اس کا دل اچاٹ کر ڈالا تھا۔ کبھی اسے خیال آتا کہ اس کی ماں کی شخصیت میں جو گہما گہمی، ملنساری، محبت اور رچاؤ تھا اس کے اَسرار کو کھوجنے کے لیے وہ یہاں آئی اور پھر یہاں ہی رہ گئی یا پھر شاید اس ملک کی ثقافت کی رنگا رنگ اور نت نئی جہتوں نے اس کے پاؤں باندھ لیے تھے۔ جو بھی تھا ٹھیک سے سمجھ میں نہ آنے کے باوجود ایک حقیقت یہ تھی کہ زوئی حسین جس کی شکل، صورت، تاریخ اور ثقافت بالکل مختلف تھی پاکستانی ماحول کے عشق میں گرفتار ہو چکی تھی۔

☆☆☆

''اگر تم سمجھتی ہو کہ مجھے بی اماں کی کہی ہر بات کا لحاظ ہے اور میں اسے پورا کرنے کی کوشش اب بھی کر رہا ہوں جبکہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں تو سمجھ لو کہ اس لڑکی میر اُل کا تعلق بھی اسی بات سے ہے۔'' حمزہ نے کھانا کھاتے ہوئے نگین کی اس بات کا جواب بہت اچانک دیا تھا جو وہ اس سے پچھلے کئی دن سے پوچھ رہی تھی۔

''اس لڑکی میر ال کا تعلق بی اماں سے ہے؟'' نگین کو پانی پیتے پیتے اُچھو لگ گیا۔

''ہاں بالکل بی اماں سے۔'' حمزہ نے آخری نوالہ کھانے کے بعد پلیٹ پرے کھسکاتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ کیسے؟'' نگین مارے تجسس کے کھانا کھانا بھول گئی۔

''تمہیں یقیناً نہیں مگر ماموں اور ممانی کو ضرور یاد ہوگا کہ بی اماں کی ایک دوست ایبٹ آباد میں رہتی تھیں وہ ان کی دور پار کی عزیز بھی تھیں مگر دوستی کا رشتہ عزیز داری سے زیادہ قریبی تھا، دونوں ایک دوسرے کو خطوط بھی لکھا کرتی تھیں۔ دو مرتبہ وہ خاتون ہمارے ہاں سیالکوٹ آئی بھی تھیں اور کئی مرتبہ بی اماں گرمی کی چھٹیوں میں ان کے پاس جاتی تھیں۔ چند ایک بار مجھے بھی اتفاق ہوا ان کے ساتھ جانے کا۔''

''پھر......؟'' نگین ایک سانس میں ہی ساری کہانی جان لینا چاہتی تھی۔

''پھر یہ کہ مجھے ان دونوں کا آپس کا پیار بہت اچھی طرح یاد تھا، ان خاتون کے گھر کا ماحول اور لوکیشن بھی میرے ذہن میں تھی۔ وہ بہت خوب صورت خاتون تھیں ان کے حُسن کو عمر کی گریس نے چار چاند لگا رکھے تھے۔ وہ ہمیشہ یاد رہ جانے والی شخصیتوں میں سے ایک تھیں جو رواداری اور مروت بی اماں کی شخصیت کا خاصا تھی وہ ان کی شخصیت کا بھی حصہ تھی۔ میں ان سے خاصا متاثر تھا۔ بی اماں کے برعکس ان کے ساتھ خاصی بڑی ٹریجڈیز ہو چکی تھیں، ان کے شوہر کا انتقال ہو ہی چکا تھا مگر ایک فضائی حادثے میں ان کا بیٹا اور بہو بھی ان کا

ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ اپنی اکلوتی پوتی کے ساتھ ایبٹ آباد میں رہتی تھیں۔ اس پوتی کی پرورش انہوں نے ہی کی تھی اور میں کبھی بھول نہیں سکتا کہ وہ اتنی کم عمری میں بھی کیسی مہذب اور سمجھدار لڑکی تھی۔''

''حسین بھی ہوگی اپنی دادی کی طرح؟'' نگین نے اضافہ کیا۔

''یہ کیسے کہا تم نے؟'' حمزہ اس سنجیدہ ترین گفتگو میں پہلی بار مسکرایا۔ ''ہو سکتا ہے کہ اس کے والد اور والدہ اتنے حسین نہ ہوں اور وہ ان میں سے کسی ایک پر چلی گئی ہو۔''

''بس میرا اندازہ ہے کہ وہ حسین ہوگی اپنی دادی کی طرح۔'' نگین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہ اندازہ کیوں ہے پھر کبھی بتاؤں گی۔''

''اچھا......'' حمزہ زیرِ لب مسکرایا۔

''چلو تم آگے سناؤ۔'' نگین نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

''بی اماں کی وفات کے بعد مجھے ان کی دوست کے بارے میں تقریباً بھول ہی گیا بلکہ اس سے بھی پہلے ان کی زندگی میں بھی وہ آخری دفعہ جب سیالکوٹ آئیں، میرا خیال ہے کہ میں فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا، تمہیں بھی شاید یاد ہوں وہ خاتون جو پائن کونز لائی تھیں اور سفید مکئی کا آٹا اور کھٹا ترین انار دانہ اور ریڈ بلڈ مالٹے خان پور کے۔'' حمزہ نے یاد دلایا۔

''اصل میں، میں کوشش تو بہت کر رہی ہوں کہ مجھے ایسی کوئی شخصیت یاد آ جائے لیکن ابھی تک مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا کہ وہ کون تھیں۔'' نگین نے سادگی سے جواب دیا۔

''ہاں......'' حمزہ نے سر ہلا کر کہا۔ ''اچھا، شاید تمہیں اس لیے یاد نہ آ رہی ہوں کہ اس آخری آمد پر وہ صرف ایک رات ہی ٹھہری تھیں اور پھر بی اماں کی بیماری کے دوران اور ان کی وفات پر بھی ان کا کوئی اتا پتا نہیں آیا بلکہ شاید کسی نے ان کو اطلاع ہی نہیں دی۔''

''کون دیتا؟'' نگین نے کہا۔ ''ابو کو ہی دینی چاہیے تھی یا پھر تمہیں لیکن کبھی کبھار ملنے والے ایسے مواقع پر اکثر ذہن سے نکل جاتے ہیں۔''

''اور پھر میں تو بی اماں کے بعد بہت سی باتوں سے غافل ہو گیا۔'' حمزہ کے لہجے میں دکھ سا اتر آیا۔ ''یاد رہا تو صرف اتنا کہ بی اماں نہیں رہیں۔''

''پھر ان دوست کا خیال کیسے آیا تمہیں؟'' نگین کو تجسس کا دورہ دوبارہ سے پڑ گیا۔

''ایبٹ آباد جانے کے اتفاق سے۔'' حمزہ نے تھکن سے بھاری ہوتا سر ڈائننگ چیئر کی پشت سے ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''ایبٹ آباد پہنچتے ہی میرے دماغ میں بی اماں کے ساتھ وہاں تک کا سفر اور ان کی دوست کے ہاں قیام روشن ہو گیا۔ مجھے اس شہر کی فضا میں بسی مخصوص خوشبو سے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ تمہیں پتا ہے نگین کہ ہر شہر کی اپنی ایک الگ خوشبو ہوتی ہے، اپنی ایک الگ فضا۔'' وہ بات کرتے کرتے کسی اور موضوع کی طرف چلا گیا۔

''ہوں......'' نگین نے بے دھیانی سے سنتے ہوئے یونہی سر ہلا دیا۔

''اور وہ خوشبو اور فضا ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہو جاتی ہے، خواہ کتنے سالوں بعد ہی کیوں نہ اس شہر میں واپس جاؤ وہ فضا اور خوشبو ذہن کے کسی خانے سے نکل کر فٹ سے حواس میں بس جاتی ہے اور پھر بہت کچھ یاد آنے لگتا ہے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔'' نگین کو اب خیال آیا کہ اس کا اپنا تجربہ بھی ایسا ہی کہتا تھا۔

''خیر......'' حمزہ کو اپنی ادھوری چھوڑی بات یاد آ گئی۔ ''خیر... میں تمہیں سنا رہا تھا کہ جب میں ایبٹ آباد

پہنچا تو مجھے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ رابعہ آنٹی کا گھر، اس کا نقشہ، وہ علاقہ، ان کی باتیں، سب سے بڑھ کر بی اماں۔“ حمزہ نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

”پھر تم ان سے ملنے چلے گئے۔“ نگین نے متوقع بات کہی۔

”ہاں، میں جانا چاہتا تھا مگر ان کا ایڈریس بھول گیا تھا، دراصل وہ شہر اتنا بدل گیا ہے کہ سارے راستے اور علاقے گڈمڈ ہوگئے اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کدھر جاؤں جو وہ مل جائیں مگر نہیں صاحب وہ تو علاقہ جیسے کہیں گم ہوگیا تھا۔ جب میں ڈھونڈ، ڈھونڈ کر مایوس ہوگیا تو یونہی گھومتے گھماتے ایک دیکھے، دیکھے علاقے میں ایک گھر سے پتا کرنے پر ان کا سراغ مل ہی گیا۔“

”وہ تو بہت خوش ہوئی ہوں گی تمہیں دیکھ کر۔“ نگین اس سراغ مل جانے والی بات سن کر خوش ہوگئی۔

”نہیں، وہ وہاں نہیں تھیں۔“ حمزہ نے نیچی آواز میں کہا۔

”ارے...... “ نگین نے غور سے اسے دیکھا۔ ”وہ کہیں اور شفٹ ہوگئیں کیا؟“

”ہاں......“ حمزہ نے مختصر جواب دیا۔

”کہاں......؟“

”اس دنیا سے عالم بالا میں۔“ حمزہ نے ایک اور مختصر جواب دیا۔

”ارے...... “ نگین کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ......“

”ہاں......“ حمزہ نے سر ہلایا۔

”اوہ...... بہت افسوس ہوا۔“ نگین نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا اور کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

”یہ ایک متوقع سی بات ہونی چاہیے تھی۔ بی اماں جا سکتی ہیں تو وہ بھی تو تقریباً ان کی ہم عمر ہی ہوں گی۔“ نگین نے خاموشی کو توڑنے کے لیے کہا۔

”مجھے علم ہوا کہ وہ وفات سے کچھ عرصہ قبل ایبٹ آباد سے بالاکوٹ شفٹ کر گئی تھیں۔ میں نے ان کے بارے میں بتانے والی لڑکی سے ان کی پوتی کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔“

”اچھا......“ نگین نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔ ”تو تم اس لیے بالاکوٹ گئے تھے۔ ان لوگوں کے بارے میں معلوم کرنے بلکہ پوتی کے بارے میں معلوم کرنے۔“

”معلوم کرنے نہیں بلکہ اس سے تعزیت کرنے اور یہ بتانے کہ میں بی اماں کا پوتا ہوں اور اگر بی اماں زندہ ہوتیں تو وہ بھی ضرور اس کے پاس افسوس کرنے کے لیے اور اسے یہ بتانے کے لیے کہ عزیز، رشتے دار نام پر وہ اس کے لیے موجود ہیں، پہنچتیں۔“ حمزہ نے تصحیح کی۔

”اوہ ہاں...... “ نگین نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم نے اچھا کیا...... بہت اچھا کیا۔ بی اماں ہوتیں تو ضرور ایسا ہی کرتیں۔“

”میں وہاں ایسا ہی کرنے کے لیے گیا تھا مگر میں وہاں پہنچا تو وہ مجھے وہاں نہیں ملی۔“ حمزہ نے بتایا۔

”ارے...... وہ کہاں گئی؟“ نگین نے چونکتے ہوئے کہا۔

”اس کے اردگرد رہنے والے لوگوں نے بتایا کہ رابعہ بانو کا انتقال اس تباہ کن زلزلے کے نتیجے میں ہوا جس نے اس پورے علاقے کو موت کی وادی بنا دیا تھا۔ ان کی پوتی میرال زلزلہ زدگان کے لیے لگائے گئے عارضی امدادی کیمپوں میں سے ایک میں زخمی حالت میں موجود تھی لیکن ایک رات وہ اچانک وہاں سے غائب

ہوگئی۔ اس کا کچھ اتا پتا نہیں معلوم تھا وہاں کے لوگوں کو۔“ حمزہ کی آواز بات کرتے کرتے بھاری ہوگئی۔

”اوہ میرے خدا......“ نگین کو جیسے سخت شاک لگا۔

”پتا نہیں کیوں نگین مگر یہ صورتِ حال جان کر میں ایک عجیب سے دکھ، عجیب سی پریشانی میں مبتلا ہوگیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب میرے کسی بہت ہی اپنے کے ساتھ ہوا ہو۔ مجھے یاد آیا کہ رابعہ بانو، بی اماں سے کہا کرتی تھیں کہ ان کا اور ان کی پوتی کا خدا کے بعد ایک دوسرے کے علاوہ کوئی نہیں یا پھر بی اماں تھیں جو ان سے ملا کرتی تھیں عزیز، رشتے دار اپنی اپنی زندگیوں میں مست اور دوست احباب بہت ہی کم...... پھر تم سوچو کہ اس تباہ کن قیامت جیسی صورتِ حال میں کون تھا جو اس لڑکی کے سر پر موجود تھا۔ تم ذرا اندازہ لگانے کی کوشش کرو کہ اس لڑکی پر کیسی قیامت ٹوٹی ہوگی۔ اس قیامت خیز منظر کو دیکھنا۔ اس کا شکار ہونا، دنیا میں اپنا واحد رشتہ کھو دینا اور پھر اجنبی مددگاروں کے درمیان زخمی حالت میں موجود ہونا ہی ایک ایسا عذاب ہوگا جس کا تصور کرنا مشکل ہے پھر نہ جانے اس کے ساتھ کیا ناگہانی ہوئی کہ وہ وہاں سے غائب ہوگئی۔“ حمزہ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔ اس کے چہرے پر کرب تھا۔

”تم سوچ نہیں سکتیں کہ بالاکوٹ میں قیام کے دوران مجھے اس زلزلے کے دوران اور بعد کی کیسی کیسی کہانیاں سننے کو ملیں۔ سننے اور دیکھنے میں بہت فرق ہے۔ کیا کیا ہوا اور کس، کس کے ساتھ ہوا بتانا مشکل ہے۔ میں نے سب سنا مگر اس سننے کے دوران جس بات پر میرا دل اور میرا دماغ اٹک کر رہ گیا وہ میرال کا وہاں سے غائب ہو جانا تھا۔ میں نے وہاں ہر اس شخص سے ملاقات کی جو میرال اور رابعہ بانو کو تھوڑا بہت جانتا تھا۔ ان میں ایک خاتون ایسی بھی تھیں جنہوں نے بتایا کہ گزشتہ سال انہوں نے میرال کی شکل کی ایک لڑکی کو مسلم ٹاؤن کے ایک گھر میں دیکھا تھا، ان کے بقول وہ گھر اُن کی بہن کی کسی دوست کی ماں کا تھا، وہ وہاں کسی کی عیادت کرنے گئی تھیں۔ میرال پہچان لیے جانے پر اس منظر سے غائب ہوگئی، ان خاتون کے دریافت کرنے پر گھر والوں نے بتایا کہ وہ ان کی بیٹی کی دوست تھی۔ یہ وہی گھر ہے جس کا پتا میں نے اشعر بھائی کو دیا تھا۔ مجھے اس خبر نے اس شاک میں مبتلا کر دیا۔ جس سے نکلنا مشکل تھا مگر میں اتنی جلدی اس کے بارے میں معلوم کر لینا چاہتا تھا کہ خود یہاں آنے کا انتظار بھی نہیں کر سکا اور اشعر بھائی کو فون پر ہی کہہ دیا۔ میں پوری سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں نگین کہ مجھے اس لڑکی کو ہر حال میں تلاش کرنا ہے۔ شاید اس تباہ کن واقعے کے نتائج نے ایسی کئی کہانیوں کو جنم دیا ہو۔ میں یا تم ہر جگہ ہر ایک کی کھوج میں نہیں جا سکتے مگر یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے بی اماں کے حوالے سے یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ اس لڑکی کی کھوج لگائیں۔ خدا نہ کرے کہ وہ واہمے جو یہ ساری بات سن کر کسی بھی ذی عقل کے ذہن میں آ سکتے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی اس کے سلسلے میں درست ثابت ہو...... مگر اس کا پتا لگانا بہت ضروری ہے۔ وہ ایک انتہائی شریف اور باعزت فیملی کی بیٹی ہے اور وہ خود بھی یقیناً بہت مہذب اور ڈیسنٹ لڑکی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا ایبٹ آباد جانا اور اس کے متعلق دریافت کرنا اور اس واقعے کی خبر تک پہنچنا اسی لیے ہوا کہ اس لڑکی جس کی تلاش اور حالات سے کسی ایک شخص کو بھی دلچسپی نہیں تھی کے لیے کوئی تو ہو جو پریشان ہو، شاید ہماری تلاش اس کے کسی کام آ جائے۔“

”حمزہ ایک بات پوچھوں؟“ نگین نے اس کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے نگین۔“ وہ جیسے بن سنے ہی سمجھ گیا۔ ”میرا اس لڑکی سے کوئی ایسا قلبی تعلق نہیں ہے۔ میں تو ان لوگوں کو بالکل ہی بھلا چکا تھا اور بھولا ہی رہتا اگر ایبٹ آباد نہ جاتا۔ مجھے تو شاید ڈھنگ سے

اس لڑکی کی شکل بھی یاد نہیں مگر اس کا یوں بے آسرا ہونا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ ایسا تو ہم کسی بھی آشنا کے لیے محسوس کر سکتے ہیں ناں اور اگر تم اس علاقے میں جا کر ابھی اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان لوگوں کے حالات دیکھو تو یقیناً سوچو گی کہ ان میں سے جتنے لوگوں کی مدد کر سکتی ہو ضرور کرو...... پھر یہ تو ایک ایسی لڑکی جو بی اماں کے تعلق کے حوالے سے ہمیں عزیز ہونی چاہیے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو حمزہ۔" نگین نے آہستہ آواز میں کہا اور برتن سمیٹنے لگی۔ اس کے دل پر اچانک ہی ایک عجیب سی اداسی چھا گئی تھی۔ میرال نامی اس لڑکی پر سے گزرنے والے حالات کا اثر بھی تھا اور زلزلے کا شکار ہونے والے باقی لوگوں کا دکھ بھی نئے سرے سے جاگ گیا تھا۔ اسے حمزہ کی انسانیت پسندی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ حمزہ ہو بہو بی اماں کی تربیت کا پرتو تھا۔ وہ بھی جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھتی تھیں، غمزدہ ہو جاتی تھیں اور فوراً مدد کو تیار بھی۔ کئی ایسی خواتین بھی اس نے ان کے پاس مالی طلب کو آتے دیکھی تھیں جن کے چہرے سے خود بی اماں بھی شناسا نہیں ہوتی تھیں۔ اِدھر اُدھر سے ان کی سخاوت اور نیک دِلی کی خبر سن کر ہی اُدھر آجاتی تھیں اور بی اماں چپکے سے ان کی توفیق بھر امداد کرنے کے بعد کسی کے استفسار کرنے پر بتاتی تھیں۔

"وسیلہ انسان خود نہیں بنتا، اسے خدا وسیلہ بناتا ہے اب اگر خدا بنا دے تو کیا ناشکری کر دوں اس کی مہربانی کی، شکر ہے اس نے کسی کی ضرورت پوری کروانے کے لیے میرا انتخاب کیا، یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ کام کسی اور کو سونپ دیتا اور میں سوتی رہ جاتی۔"

"اوکے...... پھر میں چلتا ہوں، اشعر بھائی تو نہ جانے کب پہنچیں۔" کچھ دیر بعد نگین کے کان میں حمزہ کی آواز آئی وہ اس کی ساس کو سلام کرنے کے بعد اسے خدا حافظ کہنے آیا تھا۔

"حمزہ۔" نگین نے اسے خدا حافظ کہنے سے پہلے کہا تھا۔ "ہم میرال کو ضرور ڈھونڈیں گے۔ اگر دنیا میں ہوئی تو ضرور ملے گی۔"

"ہم۔" حمزہ نے دُہرایا اور مسکرایا۔ "اچھا، ہاں ضرور۔" وہ مسکرا رہا تھا جیسے اسے دوسراہٹ مل گئی ہو۔ "اچھا خدا حافظ۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" نگین جیسے مطمئن ہو گئی۔

☆☆☆

اسے اس گھر کے کسی بھی کام میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی اور بواجی اسے ہر کام میں طاق کر دینا چاہتی تھیں۔ کھانا پکانا، کپڑے سینا، کپڑے دھونا، صفائی ستھرائی، کپڑوں کو استری کرنا، بستر بنانا، یہاں تک کہ چارپائیاں بُننا بھی وہ اس کو سکھا چکی تھیں اور وہ اپنے مزاج اور طبیعت کے عین خلاف یہ سب کچھ سیکھ بھی چکی تھی مگر اس کی زندگی ایک مسلسل جھنجلاہٹ بن چکی تھی۔ جب بھی وہ تنہا ہوتی اسے اپنی محرومیوں پر کڑھنے اور جلنے کا نادر موقع مل جاتا۔ وہ رہ رہ کر اپنے مرے ہوئے ماں باپ کو یاد کرتی جو اگر زندہ ہوتے تو نہ جانے وہ کس ریاست کی شہزادی ہوتی۔

"ہم اکثر زندگی کی حقیقتوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے اپنی محرومیوں کی گنتی میں پناہ لینے لگتے ہیں جیسے وہ محرومیاں نہ ہوتیں تو ہماری ٹوپیوں میں کئی طرح کے پر لگے ہوتے۔ ایسا کرتے ہوئے ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر یہ محرومیاں نہ ہوتیں تو ہم کسی اور بہت بڑی مصیبت میں پھنسے ہوتے، دراصل ہمیں کسی بھی حالت میں خوش رہنا آتا ہی نہیں ہے۔" اس کی پسندیدہ ترین استاد مسز اعجاز نے اسے ایک بار سمجھایا بھی تھا

مگر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینے کے باوجود اسے تنہا رہ کر اپنی محرومیوں پر کڑھنا بہت اچھا لگتا تھا۔

"کیا ہے خود تو آرام سے دنیا سے منہ موڑ کر آرام سے خاک کی چادر اوڑھ کر سو گئیں اور میرے لیے عمر بھر کی مصیبتیں جھیلنا چھوڑ گئیں۔" وہ اس کھلے میدان میں موجود بے شمار قبروں میں سے ایک قبر کا تصور کرتے ہوئے سوچتی، وہ قبر اس کی ماں کی قبر تھی۔ "کیا تھا جو مجھے بھی ساتھ لے جاتیں۔" پھر اسے ایک اور نادر خیال آتا۔ "اور آپ!" وہ اپنے باپ کی قبر کو یاد کرتی۔ "اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مر جانا کہاں کی بہادری ہے، مزہ تو جب آتا جو زندگی کا سامنا کرتے۔" بواجی نے اسے بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ کی آپس میں بھی نہیں بنی تھی، وہ ہر معاملے میں ایک دوسرے کی ضد تھے اور زندگی میں کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جسے کبھی انہوں نے افہام و تفہیم سے حل کیا ہو، ان کی ہر بات بحث بن جاتی تھی اور بحث جھگڑے پر منتج ہوتی تھی۔

"کیا ہی اچھا ہوتا جو ایسے میاں بیوی جن کی آپس میں نہ بنتی ہو بچے پیدا کرنے کی غلطی نہ کیا کریں۔" ایسی باتیں سن کر وہ اکثر یہ بھی سوچتی تھی۔ مگر پھر اسے ابراہم لنکن یاد آ جاتا تھا جو کہتا تھا کہ "سنا ہے بلیاں اور بلے آپس میں بہت لڑتے ہیں مگر دنیا میں بلی کے بچوں کی تعداد حیران کُن حد تک زیادہ ہے۔" "انسان بھی بالکل بلی کا سا مزاج رکھتے ہیں۔" وہ سوچتی۔ "آپس میں جتنا مرضی لڑتے رہیں بچے بے شمار پیدا کرتے ہیں۔" اسے اس حقیقت کو یاد کر کے اور بھی غصہ آتا۔

"مگر تمہارے ماں باپ نے تو کوئی بڑی حماقت نہیں کی، ان کی شادی کے چار سال بعد تم پیدا ہوئیں اور تمہاری پیدائش کے ٹھیک تین سال بعد تمہاری اماں زندگی سے سمجھوتا نہ کر سکنے کی وجہ سے برین ہیمبرج کا شکار ہو گئیں۔" بواجی اسے سکون سے سمجھاتیں۔

"اور اگرچہ زندگی میں ان کی آپس میں کبھی نہیں بنی مگر ان کے مرنے کے صرف دو سال بعد ہی ابا جان بھی حادثے میں جان گنوا بیٹھے، اب کیا پتا وہاں آگے بھی سکون سے بیٹھے ہیں کہ وہاں بھی بحث اور جھگڑے میں پڑے ہیں۔"

"وہ تو مزے میں ہوں گے، مصیبت تو میرے لیے ہے۔" وہ کڑھنے کے دورانیے میں سوچتی۔ "بواجی کی خوشامد کرتے کرتے زبان تھکنے لگتی ہے اور کرنی اس لیے پڑتی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، اپنی بقا کے لیے ان کے سہارے کی سخت ضرورت ہے اور سہارا خوشامد کے جواب میں ہی مل سکتا ہے۔" حالانکہ ایسا ہرگز نہ تھا۔ بواجی کی ساری محبت اور ساری توجہ اس کے لیے تھی۔ مگر وہ ان کامپلیکسز کا کچھ کر نہیں سکتی تھی جو بچپن سے ہی اس کی زندگی کا حصہ بن کر رہ گئے تھے۔ اسے اپنے ساتھ کے بچوں کے والدین کو دیکھ کر اور بھی رونا آتا۔

"اللہ میاں کو دیکھو۔ پچیس بچوں کی اس کلاس میں سے صرف میرے والدین کو ہی لے جانا تھا اور وہ بھی دونوں کو۔" وہ سوچتی۔ "اگر وہ ہوتے تو پیرنٹس ٹیچرز میٹنگ میں موجود ہوتے جیسے ان سب کے والدین موجود ہیں۔" وہ اسکول میں آنے والے والدین کو دیکھ کر سوچتی۔ "کیسا ایک، ایک نمبر پر لڑتے ہیں یہ ٹیچرز سے ایک بواجی ہیں جو آرام سے کہہ دیتی ہیں جتنی تم نے محنت کی اتنا پھل کھایا، استاد کبھی کسی کا حق نہیں مارتے۔" جو بھی کر لیں ماں باپ کا سا دل تو کبھی نہیں لا سکتیں... اپنے اندر۔" وہ خود کو مطمئن کرتی اور مزید چڑ جاتی سچ تو یہ تھا کسی ناپسندیدہ کام سے گھبرا کر وہ ماں باپ سے محرومی کے ماتم میں پناہ لینے کی عادی ہو چکی تھی۔

"اور یہ دیکھو یہ بھی کوئی کام ہے جو یہ مجھ سے کروا رہی ہیں۔" دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھی سرخ مرچوں کی ڈنڈیاں توڑتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ "اچھی بھلی بازار میں پسی ہوئی مرچوں کے پیکٹ مل جاتے ہیں مگر ان کا ہر کام نرالا اور مشقت طلب ہی ہوتا ہے۔"

تم بِن ہے گھر ویران میرا

گھر بھر میں تھی برکتیں تم سے ماں، وہ گھر جو ایک شفیق ماں سے محروم ہو گیا

ہوش سنبھالا تو ایک ایسی شفیق ہستی کو اپنے گرد پایا جس کے رویّے نے پیار اور محبت سے آشنا کیا، ا ہستی جو ہمیں ہر پل مضبوطی کا احساس دلاتی تھی ان کے ہونے سے کوئی بھی پریشانی یا غم پاس نہیں پھٹکتا تھا۔ ا ہماری چھوٹی چھوٹی سی خواہشوں اور ہماری ضرورتوں کے حصول میں دن رات ایک کر دیتیں۔ وہ تھیں میری جان ہستی، میری ماں، جس کی چھاؤں ہمیں غموں کی دھوپ سے بچائے رکھتی تھی، اب وہ ہم میں نہیں۔ وہ ہم سب بہن بھائیوں کی چاہت تھیں۔ اتنی ہی خوش اخلاق، باہمت خاتون صرف اپنے کام سے مطلب رکھتی تھیں۔ ان کا پیار ہی ہم بہن بھائیوں کے لیے مثالی تھا شاید بیان نہ کر سکوں خود تو وہ اس دنیا میں ہی ساری تکلیفیں جھیل گئیں، وہ تکلیفیں دو ڈھائی مہینے کیسے جھیل گئیں وہ ان کا گرنا بیڈ سور ہونا ہی ان کا ناسور بن گیا وہ ان کی نظریں جو کبھی نہیں بھول پاؤں گی وہ کچھ کہنا بھی چاہتی تھیں تو ان کی آواز نے ان کا ساتھ نہیں دیا ہم پوچھتے بھی کہ کیا تکلیف ہے تو صرف رو دیتی تھیں۔ حسرت بھری نظریں دل دہلا دیتیں۔ جب ہم سے کوئی بچھڑ جاتا ہے تو وہ رات چاہے سردی کی ہو چاہے گرمی کی لُو جسم کے آر پار ہو جاتی ہے۔ رب نے یہ کائنات اور اس کا تمام حسن ان ہی رشتوں سے بچا رکھا ہے جب یہ رشتے نہ ہوں تو موسموں کی بے رونقی اور روکھے پن کا احساس زیادہ دلاتی ہے۔ یہ موسم پہلے بھی آتے تھے مگر ہمارے والدین کے سنگ یہ بہت خوب صورت ہو جاتے تھے۔ آج یہ بدمزہ سی وجہ سے ہیں کہ ان کی یادوں کی ہُوک سے لمحے غمگین ہوئے جاتے ہیں اور آنکھیں پُرنم رہتی ہیں۔ وہ منظر کبھی نہ بھولنے والا دُھندلا سا گیا ہے، وقت کی چاپ سنائی نہیں دیتی اتنی خاموشی چھائی ہے۔ سات مہینے بیت گئے ماں سے بچھڑے لگتا ہے کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور وہ ہنستی مسکراتی سب کو آواز دیتی داخل ہوں گی۔ وہ آخری وقت کافی تکلیف میں ان کا گزرا تھا مگر ہمارے چہرے دیکھتے ہی ان میں حوصلہ پیدا ہو جاتا۔ ہر شخص ہر انسان نے موت کا مزہ چکھنا ہے مگر جب کوئی جان سے زیادہ عزیز ہستی جدا ہوتی ہے تو درد کا احساس ہمیشہ ہی غم کو ہرا کر دیتا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ سے یہی التجا ہے کہ میری ماں کی مغفرت فرما اور ان کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دے اور ہم سب سے جو کمی اور کوتاہی ان کی زندگی میں رہ گئی وہ دور کرنے کی توفیق عطا فرما، آمین!

مرسلہ: صوفیہ قمر، کراچی

''ثابت مرچیں لا کر اچھی طرح دھو کر سکھائی جائیں گی، روزانہ انہیں دھوپ میں بکھیرنا اٹھانا بھی ایک الگ ڈیوٹی بن جاتی ہے اور پھر ان کی ڈنڈیاں توڑ کر انہیں پسوایا جائے، کمال ہے ایک ایسے دور میں جب سہولتیں اور آسانیاں اس قدر میسر ہیں یہ صدیوں پیچھے کی روایت چلا رہی ہیں۔'' وہ اس طرح کے کاموں میں مشغول ہو کر غائب دماغی کی کیفیت کا شکار ہو جاتی تھی۔

''ابھی ہلدی منگوا کر اسے بھی ابال کر سکھانا ہے اور پسوانا ہے، سالن کا رنگ خراب ہو جاتا ہے اگر مسالا غلط ہو تو۔'' اس کو ایسی سوچ سے چونکا کر ہوش میں لانے والی بھی بوا جی ہی ہوتی تھیں۔

''نمک بھی منگوا لیں، وہ بھی دھو کر سکھائیں گے۔'' اس نے جل کر کہا۔

''ہاں بات تو ٹھیک ہے مگر یہ آیوڈین والے نمک والی بات دل کو نہ لگتی ہوتی تو ضرور کر لیتی ایسا.....'' بے نیازی سے بولیں۔

''دو بندوں کے کھانے میں مسالا پڑتا ہی کتنا ہے مگر اہتمام کس قدر ہے۔'' وہ کُڑھ کر سوچتی۔

اور اسی پر بس نہیں وہ اسے سلائی کڑھائی کی ماہر بھی بنانا چاہتی تھیں۔ خود انہوں نے ایک نجی ادارے کے تعاون سے سلائی مرکز بنا رکھا تھا، جس سے شہر کی کئی خواتین اور بچیاں استفادہ حاصل کر رہی تھیں۔

''میں پڑھائی کروں یا سلائی سیکھوں، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا۔'' ان کی اس فرمائش پر کہ وہ بھی سلائی مرکز سے سلائی سیکھے وہ جھنجلا جھنجلا کر کہتی تھی۔

''پڑھائی کے وقت پر پڑھائی کرو اور سلائی کے وقت پر سلائی۔ جب چھٹیاں ہوں ان دنوں میں سلائی کڑھائی سیکھا کرو، ہنر سب اچھے ہوتے ہیں، ہاتھ میں ہوں تو کام آتے ہیں۔

''مجھے آپ کی اس تھیوری سے ذرا بھی اتفاق نہیں ہے۔'' وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ کبھی نہیں پائی۔ شدید اختلافات کے باوجود نہ جانے کیوں وہ بوا جی کے سامنے بول نہیں پاتی تھی، اپنا ردِعمل دکھا نہیں پاتی تھی۔ ان کی شخصیت کا یہ رعب تھا یا ان کی وہ محبت تھی جو کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ کے مترادف تھی کہ سامنے اس کی زبان گنگ ہو جاتی تھی۔

''اگر تم یہ کام نہ سیکھو گی تو لوگ کہیں گے چراغ تلے اندھیرا والی بات ہے۔ زندگی کا اعتبار کوئی نہیں، آج محل میں بسنے والے کل کُٹیا میں رہنے پر مجبور ہو جائیں، بڑے بڑے بادشاہوں پر کڑا وقت آتا رہا ہے، اگر اس بُرے وقت کا تصور ذہن میں ہو تو انسان آپ سے آپ ہی ہر کام سیکھ لیتا ہے، نہ جانے کب کس ہنر کی ضرورت پڑ جائے۔'' وہ رسان سے سمجھاتیں۔

''کبھی اچھی بات نہ سوچے گا میرے بارے میں۔'' وہ کُڑھ کر سوچتی۔ ''محل میں تو آج بھی نہیں رہ رہی، آنے والے کل کے لیے محل نہ سہی ایک شاندار گھر تو سوچا جا سکتا ہے ناں مگر بوا جی۔'' اسے خیال آتا۔ ''ہمیشہ بدترین سوچیں گی میرے لیے، کبھی جو خیر کا کلمہ نکلا ہو میرے لیے انہوں نے اور بے ہنری اور بے سلیقگی کا ہر تیر انہیں مجھ ہی میں نظر آتا ہے خیر سے'' حالانکہ کیسی اچھی وہ مس سلیم شیرانی ہیں جو سمجھتی ہیں کہ انگریزی ادب کے بارے میں وسیع معلومات رکھنے والی مجھ ایسی اسٹوڈنٹ انہیں اپنے پورے کیریئر میں نظر نہیں آئی اور مس علیم کے خیال میں مجھ ایسی ڈیبیٹر اسکول نے کبھی پیدا نہیں کی۔ میں بوا جی کو کیسے سمجھاؤں کہ میرا میدان اور میرا مقام وہ نہیں جو وہ سمجھتی ہیں، میرا مقام اور میرا میدان کچھ اور ہے۔'' وہ اپنے خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی۔ جہاں ادب کے بڑے بڑے کردار اس کے منتظر ہوتے تھے، وہ ان سے گفتگو کرتی، بحث و مباحثہ میں حصہ لیتی

اور خود اپنے آپ کو بھی دنیا کی مشہور ترین ہستیوں میں سے ایک خیال کرتی۔ اس کے بچپن سے ہی اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا، یہ اس کے ساتھ ایک اچھا اتفاق ہوا تھا کہ بواجی نے اسے شہر کے سب سے اچھے اسکول میں تعلیم دلوائی تھی۔ اسکول کے ماحول اور تربیت نے اس کے اندر موجود پیدائشی اوصاف کو خاطر خواہ جلا بخشی تھی۔ اسے دنیا بھر کی چیزوں کے بارے میں بلا کی معلومات حاصل تھیں۔ اس کا شمار اسکول کی ذہین ترین طالبات میں ہوتا تھا اور نہ صرف اسکول میں بلکہ گھر میں بھی ان کی رہائشی کالونی کے مکین اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ لائق اور محنتی تھی اور ہر گھریلو امر میں طاق تھی، ایسی لڑکی بہت سوں کی آئیڈیل قرار دی جاسکتی تھی۔ مگر صرف اسے معلوم تھا کہ وہ ان تمام اوصاف کی مالک ہونے کے باوجود کتنی منفی سوچ کی مالک تھی۔ خود اس نے اپنے آپ کو negative (منفی) اور sadist (یاسیت پسند) کا خطاب دے رکھا تھا۔ اسے خود بھی معلوم تھا کہ اس کے یہ دونوں اوصاف باقی سب خوبیوں پر بھاری تھے اور انہیں ختم کرنے کا ذریعہ بن سکتے تھے۔ جس وقت وہ خود ترسی اور خود رحمی کا شکار ہو جاتی اس وقت دنیا کی بڑی سے بڑی خوشی بھی اسے اس کیفیت سے نکالنے میں ناکام ہو سکتی تھی۔ یہ بات اسے بہت بعد میں جاکر معلوم ہوئی تھی کہ ان دونوں خامیوں سے بھی بڑی ایک خامی اس کے مزاج کا حصہ تھی بلکہ اس کی شخصیت پر حاوی تھی اور یہ وہ خامی تھی جو آنے والے دنوں میں طور پر اس کی زندگی کا پانسہ پلٹنے والی تھی۔ یہ بھی اسے بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ اس خامی کا نام ناشکری تھا۔

☆☆☆

زندگی کے اس دور میں جب ہر نوجوان سائنس اور ٹیکنالوجی کے پیچھے خوار ہو رہا تھا اور فنانس اور ایڈمنسٹریشن کے میدان مار لینے کے پیچھے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ دانیال کو آرٹ میں دلچسپی تھی۔ اس کی ڈرائنگ بچپن سے ہی بہت اچھی تھی۔ اس کے گھر کے ماحول نے اس کے شوق کو ہوا دی تھی۔ اس کے ڈیڈ کو فن مصوری میں اچھی خاصی دلچسپی تھی۔ اس کے گھر میں نامور مصوروں... کی مشہور پینٹنگز موجود تھیں۔ خود اس کا گھر آرٹ کا ایک نادر نمونہ محسوس ہوتا تھا، جدید فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ، اس کی ممی کا ذوق بھی بہت اچھا تھا اور یہ وہی تھیں جنہوں نے دانیال کے اندر ایک پیدائشی آرٹسٹ کو دریافت کر لیا تھا۔ وہ صرف چھ سال کا تھا جب انہوں نے بچوں کے ایک آرٹ مقابلے میں اس کی رجسٹریشن کروائی تھی۔ اس نے وہ مقابلہ بہت بڑے مارجن سے جیتا تھا۔ اس کے بعد وہ اسے ہر ایسی جگہ لے جانے لگیں جہاں اس کے فن کو جلا بخشے جانے کا امکان ہوتا۔ گرمی کی چھٹیوں میں وہ آرٹ اسکولز کے سمر کیمپ میں شرکت کرتا اور آرٹ مقابلوں میں حصہ لیتا۔ وہ پیدائشی طور پر دائیں کے بجائے بائیں ہاتھ پر مضبوط تھا۔ اور جب وہ بائیں ہاتھ سے اپنے سامنے موجود کینوس پر مقابلے کے عنوان سے متعلق تصویر بناتا ہوا لائنیں کھینچتا تو ایک مکمل مصور معلوم ہوتا۔

''میں تمہیں دنیا کے بڑے بڑے آرٹ اداروں میں داخلہ دلواؤں گی۔'' ممی اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتیں وہ خوش ہو جاتا اور آرٹ پڑھنے سے متعلق اس کا ارادہ مضبوط ہو جاتا۔ مگر سینئر کیمبرج کے دوران اس کے ذہن اور سوچ نے اچانک یوٹرن لے لیا۔ اس کی وجہ اس کے بھائی کا فلائنگ کا شوق تھا۔ اس کا بڑا بھائی چارٹرڈ اکاؤنٹنسی میں دلچسپی رکھتا تھا اور اس کا ارادہ بیرونِ ملک جاکر تعلیم حاصل کرنے کا تھا اسے اپنے اے لیولز رزلٹ کا انتظار تھا اور اسی دوران اس نے ایک فلائنگ کلب جوائن کر لیا تھا۔ ویک اینڈ پر کبھی کبھار دانیال کو بھی ساتھ چلنے کی آفر کرتا، اس نے اب تک جو سیکھا تھا اسے گھر کے کسی فرد کو دکھانے کا شوق تھا مگر گھر میں کسی اور کو فرصت ہی نہیں تھی سو دانیال ایک بار عاصم کا دل رکھنے کو اس کے ساتھ چلا گیا۔ عاصم اپنی تربیت

کے ابتدائی مراحل میں تھا اور اس کا ٹرینر اس پر رسک نہیں لیتا تھا مگر دانیال نے وہاں ان لوگوں کو بھی دیکھا جو تربیت کے آخری مراحل میں تھے یا تربیت حاصل کر چکے تھے۔ وہ زندگی میں کئی بار جہاز کے ذریعے سفر کر چکا تھا، اندرونِ ملک بھی اور بیرونِ ملک بھی مگر اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا بڑے بڑے پروں والے جس مشینی پرندے پر بیٹھ کر وہ سمندر پار تک کا سفر گھنٹوں میں کر لیتا تھا اسے اڑانے میں کیا مزہ آسکتا تھا۔ اس روز اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ اس کام میں کتنا مزہ تھا، کتنا تھرل تھا۔ وہ پورا دن اس نے فلائنگ کلب میں گزارا تھا اور وہاں موجود لوگوں کی شام تک اس کے بارے میں حتمی طور پر...... یہ رائے تھی کہ عاصم سے بہت پہلے وہ فلائنگ سیکھ سکتا تھا اور فلائنگ کلب سے نکلنے سے پہلے وہ اس بات کا قوی ارادہ کر چکا تھا کہ وہ فلائنگ سیکھے گا نہ صرف سیکھے گا بلکہ اس کو اپنا کیریئر بھی بنائے گا۔

''کیریئر پلان میں یہ اچانک تبدیلی تمہاری زندگی کا سارا ٹیمپو خراب کر سکتی ہے۔'' ممی نے اس کا ارادہ سن کر رائے دی تھی، وہ شاید ایک دم اس کی مخالفت نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

''ابھی کیریئر بنانے کا سلسلہ شروع ہی کہاں ہوا ہے؟'' اس نے بے نیازی سے کہا تھا۔ ''آرٹ ایک ایسا ہنر ہے، جو پیدائشی موجود ہوتا ہے انسان میں، اسے کوئی چھین یا چرا نہیں سکتا، اسکیچ بنانا اور پینٹنگز بنانا میرے ہاتھ کا ہنر ہے، اس میدان میں پیشہ ورانہ تعلیم میرے ہنر کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے مگر اس کے بغیر بھی میں آرٹسٹ تو کہلا ہی سکتا ہوں۔ تاریخ ایسے آرٹسٹوں کے ناموں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے پکاسو، مائیکل انجلو، وان گو، ڈاونچی، مانے اور پیزارو کی لائف ہسٹریز، تکنیک، کام اور بڑے بڑے کاموں کے بارے میں نہیں پڑھا مگر وہ پھر بھی آرٹسٹ تھے اور ان کے کام کی خوب صورتی کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا، یہ وہ میدان ہے جس میں تھیوری اتنی اہم نہیں جتنا کہ عملی کام اہم ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ اس فیلڈ میں بڑے بڑے تعلیمی اداروں سے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر کام کیا جائے، ان ڈگریوں کے بغیر بھی میرا کام اور میرا ہنر میرا ہی رہے گا۔'' اس نے جواب میں لمبی تقریر جھاڑ دی تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ میدان بھی ایک ٹھیک ٹھاک کمائی والا پیشہ بن چکا ہے، تم نے دیکھا نہیں اس میں کتنی نئی، نئی جہتیں نظر آرہی ہیں۔ پہلے لوگ صرف پینٹرز یا مجسمہ ساز ہوتے تھے اب ہنر کاری بھی فیلڈ آف آرٹ ہے، سنار، کمہار، جولاہے سب کے کام فیلڈ آف پروفیشنل آرٹ بن چکے ہیں۔ تم اپنے اس پیدائشی فن میں زیادہ نام اور زیادہ پیسہ کما سکتے ہو بہ نسبت اس میدان کے جو تمہارے لیے بالکل نیا ہے اور ایک جذباتی جنون کی شکل میں تمہارے دماغ میں سما گیا ہے۔'' ممی نے اسے سنجیدگی سے سمجھایا تھا۔ شاید ان کی نظروں کے سامنے دنیا بھر کی ان مشہور آرٹ گیلریز کے منظر گھوم رہے تھے جن کی دیواروں پر وہ تصور ہی تصور میں اس کا کام سجا ہوا دیکھتی تھیں۔

''یہ جذباتی جنون نہیں ہے۔'' دانیال نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ ''جو کیفیت میرے دل و دماغ پر گزری ہے فلائنگ کلب میں جاکر، وہ جذباتی جنون نہیں ہے۔ بلندیوں پر اڑنے کی خواہش جنون نہیں تجسس ہے۔ اوپر فضا میں وہ کون سا جہان ہے جسے مسخر کرنے کی ذمے داری ہے انسان پر، ہوا کا دوش کیسا ہوتا ہے۔ ہوا کے دوش پر توازن برقرار رکھنے کا عمل کیسا لگتا ہے، آپ یوں سمجھیں کہ میری زندگی کو ایک نیا رخ عطا ہو گیا ہے۔ زندگی صرف ایک ہی کام کرنے کے لیے عطا نہیں کی گئی۔ اس کائنات میں کرنے کے لیے بہت سے کام ہیں، انسان کی کامیابی اس بات میں ہے کہ وہ ایک زندگی میں کتنے کام کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے۔''

"یہ تمہاری عمر کی سوچ ہے اور یہ سوچ ایسی ہی ہونی چاہیے اس لیے میں مخالفت نہیں کروں گی، کچھ عرصے بعد ہی تمہیں پتا چل جائے گا کہ زندگی ایک کام کو ڈھنگ سے کرنے کے لیے بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے، کجا یہ سارے کام۔" ممی نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ "ٹھیک ہے تم اپنا شوق پورا کرلو، عاصم کررہا ہے، تم بھی ضرور کرو، فارغ وقت کو استعمال کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے یہ۔" ممی نے اس کی بات کو سنجیدہ نہیں لیا تھا اور یہ ان کی غلطی تھی۔

☆☆☆

"ارے علینہ تم ابھی تک سوچ بچار ہی میں پڑی رہتی ہو، ارے بھئی سوچ بچار کی عمر تو گزر گئی اب تو تمہیں پریکٹیکل لائف میں داخل ہو جانا چاہیے۔ کچھ کرو ڈارلنگ زندگی کو ضائع کیوں کررہی ہو؟" علینہ کے کانوں میں وہ آواز گونج رہی تھی جو آج کل اکثر اس سے مخاطب ہوتی تھی۔

"کیا کروں، میں تمہاری طرح ڈیرنگ (بہادر) نہیں ہوں جو نت نئے تجربے کرتی پھروں۔ میں کیا تمہاری طرح شیف کو موس قسم کا کام کرلوں، اُف فہد تم کتنے بہادر ہو، تمہارے دل میں جو آتا ہے کرلیتے ہو، تمہیں کسی کی کہی بات کا خوف ہوتا ہے نہ ہی کسی کے مذاق کا۔" اسے اپنے کہی بات یاد آئی۔

"ارے تم کون سی صدی میں جی رہی ہو بی بی۔ یہ پروفیشنل ازم کا دور ہے۔ یہ کام پیشہ بن چکا ہے، ہر چیز پیسہ یعنی money بن چکا ہے۔ تم نے وہ مشہور مقولہ نہیں سنا جو جدید دور کی پیداوار ہے، لوگ کہتے ہیں کہ جب تمہیں ذرا سی فرصت ملے تمہیں چاہیے کہ تم خود کو پیسہ کمانے والی مشین میں تبدیل کرلو۔" اس نے کہا تھا۔

"ارے یہ ہم سے نہیں ہوتا۔" علینہ نے بے ساختہ جواب دیا تھا۔ "پیسہ عملی زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہوتا ہوگا مگر کیونکہ میں ابھی عملی زندگی میں داخل نہیں ہوئی، اس لیے میرے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"تمہارے لیے وقت کی بھی کوئی اہمیت نہیں کیا؟" دوسری جانب سے پوچھا گیا تھا۔

"وقت بہت اہم چیز ہے۔" علینہ نے اعتراف کیا۔ "مگر کیا کریں کہ میرے پاس ہے بہت وافر مقدار میں، اس لیے مجھے اس کی بھی کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی۔" اسے احساس ہورہا تھا کہ وہ یہ ساری باتیں صرف اپنے مخاطب کو زچ کرنے کے لیے کررہی تھی۔

"ارے تمہیں وقت کی اہمیت کا احساس نہیں؟" دوسری جانب سے حیرت کا شدید اظہار کیا گیا تھا۔ "مت بتاؤ مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"میرے پاس وقت گزارنے کے لیے کوئی معقول کام نہیں ہے، اس شہر میں مواقع بھی محدود ہیں اور مجھے کوئی بھی کام کرنے کی اجازت نہیں دیتیں، پھر میں کیا کروں، میں کچھ کرتی نہیں اس لیے میرے پاس وقت بہت ہے اور اسی لیے مجھے وقت کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ گزرتے لمحوں کی گنتی سے اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔" علینہ نے برملا اعتراف کیا۔

"ڈونٹ ٹیل می علینہ کہ تم ابھی تک ماماز بے بی mama's baby ہی ہو، تم نے اپنا قد کاٹھ نہیں نکالا، تم ابھی تک اسی بڑے درخت کے نیچے موجود چھوٹا سا پیڑ ہو جسے اونچا ہونے اور ٹہنیاں پھیلانے کی جگہ نہیں ملتی۔" ایک مرتبہ پھر حیرت کا شدید اظہار کیا گیا۔

"یہ حقیقت ہے فہد۔" علینہ اعتراف کے موڈ میں تھی۔ "میری ماما کو بون سائی پلانٹس bonsai plants میں بہت دلچسپی ہے، وہ پودوں کو کاٹ چھانٹ کر چھوٹے پودے بنائے رکھنا پسند کرتی ہیں۔ میں بھی ان کا ایک بون سائی پلانٹ ہوں۔"

"اوہ آئی ایم سوسوری۔" علینہ کو ان الفاظ کے سننے سے زیادہ تکلیف بھی کسی بات کے سننے پر نہیں ہوئی تھی۔

"تم اب بھی اسی طرح کی تنہائی کا شکار ہو یار۔ کچھ ایسے دوست بنا لیے ہوتے جو تمہاری تنہائی بانٹ سکتے۔" فہد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس معصوم اور حالات کی شکار لڑکی کو کس طرح دلاسا دے سکتا تھا۔

"کیا کسی دوست کے پاس اتنا فالتو وقت ہوتا ہے کہ وہ کسی کی تنہائی بانٹنے کے خیال سے اس کے ساتھ لگا بیٹھا رہے؟" علینہ کے لہجے میں طنز تھا یا خودترسی فہد کی سمجھ میں نہیں آیا مگر اس کا دل دکھی ہوگیا۔

"ہاں ہوتا ہے، بالکل ہوتا ہے۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ "مثلاً میرے پاس تمہارے لیے بہت وقت ہے، تمہاری باتیں سننے کے لیے، تمہاری خوشیاں اور تمہارے دکھ شیئر کرنے کے لیے اور اپنی باتیں تمہیں سنانے کے لیے، میرے پاس بہت وقت ہے یقین کرو۔"

"تم مجھ پر ترس کھا رہے ہو۔" علینہ کو عجیب سا احساس ہوا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ فوراً بولا۔ "ترس کھانے کے لیے یہاں بھی بہت لوگ موجود ہیں، تم سے تعلق دوسرا ہے، تمہارے ساتھ تو خود مجھے بھی ایک تعلقِ قلبی محسوس ہوتا ہے۔ کیا ہم چند سال پرانی دوستی کی مکمل تجدید نہیں کرسکتے؟"

"ہوں۔" علینہ نے کچھ دیر تک سوچا۔ "ماما کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئے گی۔"

"انہیں بتا کون رہا ہے۔" فہد نے کہا۔ "ضروری تو نہیں کہ ہر بات ہر کسی کے ساتھ شیئر کی جائے۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم اسے پسند کروگی یا نہیں اور قبول کروگی یا نہیں مگر میری پیشکش برقرار رہے گی، تم جب چاہو جس وقت چاہو مجھے کال کرسکتی ہو۔ تمہارے لیے میں ہر وقت حاضر ہوں۔" اس کے لہجے میں خلوص تھا اور اپنے اس رویے پر وہ خود بھی حیران ہورہا تھا۔

"لائیو کوکنگ شو کے دوران بھی۔" علینہ کی آواز میں اچانک ہی مسرت چھلکنے لگی۔

"وہاں بھی۔" فہد نے مسکرا کر کہا۔ "میں کال بلاک کرا کے سن سکتا ہوں، وہاں سے فارغ ہوکر تمہیں کال بیک کرسکتا ہوں، تم فکر مت کرو تم جہاں بھی جب بھی مجھ سے بات کرنا چاہوگی، میں دستیاب ہوں گا۔"

علینہ کو محسوس ہوا جیسے اس کی عمر بھر کی تنہائی لمحے بھر میں ختم ہوگئی ہو۔ اسے دوسراہٹ کا احساس ہونے لگا۔

"میوزک سنتی ہو آج کل؟" فہد نے اچانک پوچھا۔

"ہاں، کبھی کبھار۔" علینہ نے مختصر جواب دیا۔

"موویز دیکھتی ہو؟"

"بہت کم۔"

"اسپورٹس دیکھتی ہو، فارمولا ون اور باسکٹ بال، تمہیں علم ہے کیا ہورہا ہے اسپورٹس کی دنیا میں؟"

"شاید نہیں۔"

"نیوز چینلز تو دیکھتی ہوگی، حالاتِ حاضرہ پر معلومات کا کیا حال ہے؟"

"نہ ہونے کے برابر۔"

"پھر کرتی کیا رہتی ہو؟"

"کچھ نہیں کرتی اور کچھ نہ کرنا بھی آہستہ آہستہ کرتی ہوں۔"

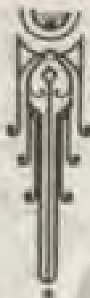
"اوہو۔" فہد بے اختیار ہنس دیا۔ "چلو میں تمہیں چند سی ڈیز بھجواتا ہوں، میوزک اینڈ موویز بھجوادوں؟" اس نے پوچھا۔

"تم مجھے بتادو، میں خرید لوں گی۔"
"ٹھیک ہے، ایسے ہی سہی۔" وہ فوراً مان گیا۔ "اور میرا کوکنگ شو دیکھنا مت بھولنا اور کوکنگ بھی ایک آرٹ ہے۔"
"جیسے آنے والے کل میں خاکروبی اور کپڑے دھونا بھی ایک آرٹ بننے والا ہے۔" علینہ نے مذاقاً کہا۔
"کوئی حرج نہیں اور کوئی پتا نہیں کہ ایسا ہی ہو۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"تم سب سرٹیفکیٹس لے لینا ان آرٹس میں، تم یونیک بننے کے شوقین تھے اور تم یونیک بننے کی سیڑھیاں چڑھنے کے شوق میں کچھ بھی کر سکتے ہو۔"
"جو بھی سمجھ لو، میں تو ایسا ہی ہوں۔" وہ برا منائے بغیر بولا۔
اور علینہ کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ کسی کے برا منانے کے خوف کے بغیر کسی سے مذاق کرنا کیسا لگتا ہے۔

☆☆☆

"ڈیزائننگ کا تعلق صرف ڈیزائننگ سے ہوتا ہے، اس میں کسی دوسرے فیلڈ آف آرٹ کی گنجائش نہیں ہے یہ خود ہی ایک وسیع مضمون ہے۔" آمنہ نے بینش کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
"چلو اماں کی ایک پریشانی تو ختم ہوئی کہ میں مٹی کے برتن بنانا سیکھ کر کمہاروں جیسے کام کرنا شروع کر دوں گی۔" بینش نے آمنہ کی بات یاد کرتے ہوئے کہا۔ وہ گھر سے آرٹ کی تعلیم حاصل کرنے نکلی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اسے تصویریں بنانا، پورٹریٹ بنانا، مٹی کے برتن بنانا اور مجسمہ سازی جیسے ہنر سیکھنے کے علاوہ کتابیں پڑھنا پڑیں گی۔ مگر جب اسے ڈپارٹمنٹ میں پڑھائے جانے والے مضامین اور ذیلی ڈپارٹمنٹس کے بارے میں بتایا گیا تو اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ کیا پڑھے۔
"بی ایف اے پینٹنگ سے بہتر ہے تم ڈیزائننگ میں داخلہ لو۔" اس کے کالج کی ایک استاد نے اپنے تئیں اسے صائب مشورہ دیا اور اس نے ڈیزائننگ میں داخلہ لے لیا۔ اب اسے یہ میدان مشکل لگ رہا تھا۔ اگر آمنہ کا ساتھ اسے نہ ملتا تو شاید وہ حوصلہ ہار چکی ہوتی۔ آمنہ کی دوستی نے اسے شروع کی بہت سی مشکلات سے بچا لیا تھا... اور جوں جوں وہ کورس کو سمجھنے لگی تھی اس کا پریشان حال دل مطمئن ہونے لگا تھا، ذرا سا سنبھلنے کے بعد جس اتفاق نے اسے مزید خوشی عطا کی تھی وہ دانیال ابراہیم کا بھی ڈیزائننگ کا طالب علم ہونا تھا۔ اسے پہلی مرتبہ اپنی ٹیچر کا مشورہ اچھا لگا تھا۔
اس نے گھر میں بیٹھے، پڑھتے ہوئے، کلاس میں لیکچر لیتے ہوئے، راستے میں آتے جاتے کئی بار اپنے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ دانیال میں اس کی دلچسپی کی وجہ کیا تھی۔ کیا وہ بہت خوش شکل اور اسمارٹ تھا؟ اس لیے اس سوال کا جواب "کہہ سکتے ہیں" ہوتا تھا۔ کیا وہ بہت امیر تھا اس لیے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہوتا تھا، کیا اس کی شخصیت منفرد تھی؟ اس بات کا جواب یقیناً "ہاں" ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ اس کھوج میں پڑ جاتی کہ دانیال ابراہیم میں کیا انفرادیت تھی جو باقیوں میں نہیں تھی۔ اس سوال کے کئی جواب اس کے ذہن میں آتے تھے مگر کوئی جواب بھی بہت زیادہ تسلی بخش نہیں تھا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اس سوال کے جواب کو وہ کچھ عرصہ ملتوی رکھے گی۔ کیونکہ اس سوال کے جواب کے لیے اسے کئی کلیوز چاہیے تھے جو اسے مل نہیں پا رہے تھے۔ اس نے خود سے یہ سوال کرنا چھوڑ کر دانیال کی شخصیت کا خاموش جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔

(جاری ہے)



وہ کھڑکی

نیلم احمد بشیر



"یہ دیکھیں اماں، یہ رہا آپ کا کمرا۔" قدیر نے سوٹ کیس رکھتے ہوئے اماں کو پیار سے مخاطب کیا اور کمرے میں ایک گول چکر سا لگا کر گھوم گیا۔
"مگر پاپا، یہ تو میرا کمرا ہے۔" قدیر کے چھ سالہ بیٹے انعم نے فوراً باپ کی بات درست کی۔ "دادی کا تو نہیں۔"
"ہاں، ہاں بیٹا، تمہارا ہی کمرا ہے مگر اب تمہیں دادی کے ساتھ شیئر کرنا پڑے گا۔ سمجھایا تھا ناں آپ

کو۔'' انعم کی ماں شہناز نے آگے بڑھ کر اپنے بیٹے کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا اور اپنی ساس کا بستر ٹھیک کرنے لگی۔ ''یہ بچے بھی وقت بے وقت کیسی بات کردیتے ہیں۔'' اس نے منہ ہی منہ میں کہا۔

''ارے، تم لوگوں نے دادی کو سلام تو کیا نہیں، چلو چلو۔'' قدیر نے اپنی بیٹی علیزے کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

''سلام گرینڈ ما۔'' علیزے آہستہ سے بولی۔ انعم نے بھی ایسا ہی کیا اور پھر ماں کے پیچھے جا چھپا۔

دادی نے انگریزی لب و لہجے میں کیے گئے اپنے پوتا، پوتی کے سلام کو بڑے پیار سے قبول کیا اور دونوں کو پیار سے پکڑ کر اپنے سینے سے لگالیا۔

''نو نو بیٹا، یہ کوئی سلام نہیں ہے۔ پورا السلام علیکم کہیے..... آپ کو پتا ہے ناں کہ ہم لوگ مسلمان ہیں اور ہم پورا اسلام کرتے ہیں۔'' قدیر نے ہلکی پھلکی سی سرزنش کی تو بچوں نے قدرے بلند آواز میں السلام علیکم کہا اور پھر کمرے سے باہر بھاگ گئے۔

''اماں جی، آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اب آپ امریکا میں ہیں۔ دنیا کے بہترین ملک میں۔ یہاں کسی بات کی کوئی تنگی نہیں ہے۔ پاکستان کی طرح نہیں کہ بندے کو ہر وقت مصیبتیں ہی پڑی رہیں۔ سچی بات ہے آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کا اتنی آسانی سے ویزا لگ گیا اور آپ یہاں ہمارے پاس آگئیں۔ ویسے بھی اب آپ وہاں کیسے رہ سکتی تھیں۔'' قدیر پُرجوش لہجے میں بولا۔

''ہم تو بڑے خوش ہیں۔ ہماری اماں جی کے آنے سے ہمارے گھر میں بھی برکتیں پھیلیں گی۔'' شہناز نے بھی ساس کو مخاطب کرکے لگاوٹ سے کہا۔ قدیر نے تائید میں سر ہلادیا۔

''اچھا چلیں اماں، آپ آرام کرلیں تھک گئی ہوں گی۔ لمبی فلائٹ تھی۔ شام کو چائے پر باتیں ہوں گی۔'' قدیر نے ماں کو آرام سے بیڈ پر لٹادیا اور خود بیوی کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔

''کتنی خوش اور پُرسکون لگ رہی تھیں اماں، ہے ناں!'' شہناز نے کچن ٹیبل پر بیٹھے اپنے شوہر کے سامنے کافی کا مگ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی، خوش کیوں نہ ہوں...... آخر اکلوتے بیٹے کے گھر آئی ہیں۔ یہاں ہماری سیٹلڈ زندگی دیکھ کر دعائیں ہی تو دے رہی ہوں گی۔'' قدیر نے فخریہ انداز میں اپنے گھر کے اندرونی حصے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اس کے جدید ترین انداز میں تعمیر شدہ کچن میں نصب سرمئی اسٹین لیس اسٹیل کی اپلائنسز کتنی پُروقار دکھائی دے رہی تھیں۔ بڑے سے وسیع کاؤنٹر پر دھرے خوب صورت رنگ دار فروٹ کی بڑی سی طشتری سے روشنیاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ کتنا پرفیکٹ اور صاف ستھرا تھا اس کا گھر...... خوب صورت کچن، پُرآسائش باتھ روم، اچھی بیوی، پیارے پیارے صحت مند بچے۔ انسان کو اور کیا چاہیے ہوتا ہے۔ ایک ماں کی کمی تھی سو وہ بھی پوری ہوگئی۔

اماں تو گاؤں کبھی نہ چھوڑتیں مگر برا ہو اس سیلاب کا کہ جس میں اُن کا گھر تو کیا پورے کا پورا گاؤں ہی بہہ گیا۔ وہ اکیلی ہی رہتی تھیں۔ ابا سالوں پہلے گزر گئے تھے مگر گاؤں میں رہنے والے ان کے رشتے داروں، ملنے جلنے والوں، دوست، احباب کی وجہ سے انہیں کبھی تنہائی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ قدیر اور شہناز نے کئی بار اماں کو امریکا آنے کی دعوت دی مگر وہ ہر بار ٹال جاتیں۔

''میں یہیں خوش ہوں۔ میری مٹی یہیں کی ہے۔ وہ مجھے کہیں جانے نہ دے گی۔'' اماں ہر بار یہی کہتیں۔

قدیر اور شہناز مایوس ہوکر خاموش ہو جاتے کیونکہ اب انہیں اماں کی یاد سے زیادہ اس حقیقت نے ستانا شروع کردیا تھا کہ ان کی گھریلو زندگی میں

کسی مددگار کسی ہیلپر کی ضرورت بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔

امریکا کی مصروف اور مشینی زندگی میں دونوں میاں بیوی مل کر کماتے تھے تو گزارہ ہوتا تھا مگر آمدنی تھی کہ بڑھتے ہوئے اخراجات کی بنا پر کم ہی پڑتی چلی جارہی تھی۔ دونوں صبح سویرے ہی جاب پر نکل جاتے اور دن ڈھلے لوٹتے۔ بچوں کو اسکول کے بعد ایک ڈے کیئر سینٹر میں جانا پڑتا کیونکہ اکیلے گھر پر بھی نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ شام کو گھر آکر کھانا پکانا، برتن دھونا، ویک اینڈ پر لانڈری کرنا، صفائی کرنا کچھ کم کام نہیں تھے۔ کبھی کبھار اگر بچوں کو گھر پر رکھنا ہوتا تو بے بی سٹر کو بھی اچھے خاصے پیسے دینے پڑ جاتے تھے۔ بڑی مشکل ہوتی جارہی تھی۔

''آخر اماں اب یہاں آ کیوں نہیں جاتیں؟ کیا مسئلہ ہے ان کا......؟ وہاں اب ان کا رکھا ہی کیا ہے۔ ابا جی رہے نہیں تو کیا خالی مکان کی دیواروں کو چاٹنا ہے؟'' ایک روز شہناز غصے سے جھنجلانے لگی۔ ''کم از کم یہاں آکر ہمارا ہاتھ تو بٹا سکتی ہیں۔ ہم اکیلے ہی کھپتے رہتے ہیں اور پھر انہیں ماہانہ خرچ بھی تو بھیجنا پڑتا ہے۔ ہمارے بھی اب بچے ہیں، اخراجات ہیں انہیں خود ہی خیال کرنا چاہیے۔ آپ سے جدائی کا رونا بھی روتی رہتی ہیں۔ یہاں آگئیں تو آپ یعنی۔ ان کا اکلوتا بیٹا ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔'' قدیر نے سن کر خاموشی سے سر جھکالیا۔ واقعی اس کی ماں کی ضد بہت بے جا اور غیر معقول تھی۔ اب انہیں امریکا آہی جانا چاہیے تھا۔ اماں نے یہ بات کبھی مان کے نہ دی مگر وہ تو برا ہو سیلاب کا کہ اماں کی زندگی کی بچی کھچی خوشیاں بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ نہ گھر رہا اور نہ ہی زمینوں کی کاشت سے آنے والی آمدنی۔ وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ غیر لوگوں کے بیچ میں کیمپوں، سڑکوں پر رہنے سے تو بہتر تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ہی پاس چلی جائیں۔ بیٹا اور بہو اتنی چاہت سے بلاتے بھی رہتے تھے پھر ویزا ملتے ہی وہ امریکا جانے والے جہاز میں بیٹھ گئیں اور گھنٹوں کی مسافت کے بعد اب امریکا کے ایک چھوٹے سے مگر جدید قصبے ڈین ول جا پہنچیں۔

☆☆☆

بہو بیٹا اور ان کے بچے کمرے سے جاچکے تھے۔ اماں نے خود پہلی بار اس کمرے کا بھرپور جائزہ لیا جہاں اب انہوں نے شاید ہمیشہ کے لیے رہنا تھا۔ درمیانے سائز کے کمرے میں دو سنگل بیڈ دیواروں کے ساتھ ساتھ قرینے سے لگے ہوئے تھے۔ پوتے کی عمر کے حسبِ ذوق کئی قسم کے پوسٹرز اور تصاویر سے دیواریں مزین تھیں۔ یکلخت اماں کو ایک عجیب سی گھبراہٹ کا احساس ہوا۔

''میں کہاں آگئی ہوں۔'' انہوں نے اپنے آپ سے سوال کیا اور بھاگ کر کمرے کی واحد کھڑکی کا پردہ جلدی سے ہٹانے لگیں۔

''ارے یہ کیا......؟'' یہ گھر کا پچھواڑا تھا۔ دور دور تک پھیلی ایک خوب صورت سرسبز وادی تھی جس کے آخر میں جنگل شروع ہوجاتا تھا۔ گھر کے ایک طرف آڑوؤں کے درخت تھے جن سے پھل گر گر کر زمین پر ڈھیر ہوتے نظر آرہے تھے۔

''کوئی انہیں کھاتا کیوں نہیں؟'' اماں نے حیرت سے سوچا۔ بڑے سے بیک یارڈ میں لگے پھولوں پر ننھی ننھی شکر خور چڑیاں ہوا میں معلق ہوکر پھولوں سے رس کشید کرتی نظر آرہی تھیں۔

''سبحان اللہ۔'' اماں کے منہ سے خود بہ خود تسبیح جاری ہوگئی۔ ''اللہ نے میرے بیٹے کو کتنے بھاگ لگائے ہیں۔ عالیشان محل نما گھر، دو گاڑیاں، قیمتی ساز و سامان، اچھی بیوی، پیارے پیارے بچے، واقعی انسان کو اور کیا چاہیے۔'' وہ فوراً سجدے میں گر گئیں۔ وضو کرکے دو نفل شکرانے کے ادا کیے اور پھر سے کھڑکی کے نظارے میں کھو گئیں۔ باہر ہوا چل

رہی تھی۔ درخت مستی سے جھوم رہے تھے۔ ہوا میں گرد نام کو بھی نہ تھی۔ دور ایک پہاڑی پر سے جھرنا بہتا نظر آرہا تھا جس پر اڑتے چند آبی پرندے اپنی رنگ برنگی چونچیں کھولے بار بار نیچے اوپر ہوتے نظر آرہے تھے۔

''سبحان اللہ۔'' اماں پھر کہہ اٹھیں۔ کھڑکی سے باہر کا منظر انہیں بہت پسند آیا تھا۔

چند گھنٹے لیٹ کر تھکن اتار لینے کے بعد اماں بیڈروم سے نیچے اتر کر کچن میں چلی آئیں جہاں ساری فیملی موجود تھی۔ چائے پر خوب گپ شپ ہوئی۔ قدیر نے بھولے بسرے رشتے داروں کے قصے سنے، سیلاب کی تباہ کاریوں پر افسوس کا اظہار کیا اور شہناز نے اماں کو کچن کا بھرپور دورہ کروا کر اس کا مکمل جغرافیہ سمجھایا۔ پینٹری میں رکھی گروسری کے خشک آئٹمز دکھائے اور یہ بھی بتایا کہ کون سی مشین کو کیسے چلانا ہے اور کیسے بند کرنا ہے۔ مائیکرو ویو اوون، ڈیجیٹل چولھے، ڈش واشر...... کس کس قسم کی مشینیں تھیں اور تو اور کوڑا ڈالنے والا ڈبا بھی بٹن دبانے سے کھلتا اور بند ہوتا تھا۔

''بھلا یہ سب مجھے کیسے آئے گا؟'' اماں کچھ گھبرا سی گئیں۔

''ارے اماں جی، آپ فکر نہ کریں۔ چند ہی دن میں آپ کو سب کچھ آجائے گا۔ اتنا مشکل کچھ نہیں ہے اماں...... یہ امریکا ہے امریکا۔ یہاں تو آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔'' قدیر نے ماں کی الجھن سمجھ کر مسکرا کر اُن کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی۔ اماں نے یونہی سر ہلا دیا۔ وہ اپنے بچوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں نہ ہی یہ احساس دلانا چاہتی تھیں کہ وہ شاید کم عقل یا جاہل ہیں لہٰذا چپکی ہو رہیں۔

ایک تو جگہ کی تبدیلی پھر امریکا اور پاکستان کے وقت کا فرق۔ اماں رات کو لیٹیں تو پھر نیند ہی نہ آئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتی رہیں حالانکہ بہت آرام دہ تھا۔ پوتا ساتھ والے بیڈ پر سکون سو رہا تھا۔ انہیں اس پر بہت سا پیار آیا مگر ضبط اسے جگانا نہیں چاہتی تھیں۔ چاروں طرف خا[illegible] تھی۔ گھر میں بیٹے، بہو کے قریب ہی ہونے کا کُن احساس تھا مگر نیند نے تو گویا نہ آنے [illegible] کھا رکھی تھی۔

صبح کے پانچ بجے ہوں گے کہ اماں بستر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وضو کر کے نماز پڑھی۔ ان پوتے نے بتی جلانے پر کسمسا کر اوں اوں گھبرا کے جھٹ سے بتی بند کر دی اور دھیرے کھڑکی کا پردہ اٹھا کر باہر جھانکا۔ ایسا لگا جیسے سے پردہ ہٹا کر وہ کوئی خوب صورت کھیل دیکھ ہوں۔ ملگجے اندھیرے سے ایک نئی نویلی نکھری ہوئی صبح جنم لیتی دکھائی دے رہی تھی۔ چڑ چہک رہی تھیں، نظارے بہک رہے تھے، دھیرے دھیرے کورنش بجاتا پیچھے کھسک تھا۔ اماں کو سورۂ رحمان کا خیال آگیا شاید ایسی خوب صورت وادیوں کے لیے اتاری گئی تھی پیاری سورت مگر پھر یکدم اماں پر اداسی پو شدت سے حملہ آور ہوگئی۔

''یہ نظارہ خوب صورت سہی مگر میرے گاؤں سبزہ زاروں کا بھلا کہاں مقابلہ کر سکتا ہے۔ پکھو پر لگے پیپل کی گہری چھاؤں تلے بیٹھ کر مجو میر کیسے کیسے ٹپے اور دلدوز ہیریں سنایا کرتا ہے۔ کچیلے، پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس بچے جو جوہڑ میں بھینسوں کے ہمراہ نہاتے کنول کے پھولوں طرح کھلے نظر آتے ہیں اور یہ امریکا کا خوب صورت ویرانیوں کا مارا ہوا سبزہ زار جہاں نہ بندہ نہ بندے کی ذات۔ کتنا ویران، اجاڑ اور اداس خاموشی کا شور ہے اور جنگل میں ناچتا کوئی نہ ہے۔'' اماں کو سوچوں نے گھیر لیا۔

''کیوں نہ ذرا باہر نکل کر تازہ ہوا کھالوں۔ ہلکی سی چہل قدمی کروں تو طبیعت ذرا سی بشاش ہو جائے گی۔'' اماں کے جی میں آئی تو انہوں نے پیروں میں چپل ڈالی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے والے حصے میں پہنچ گئیں۔ ابھی گھر والے سو رہے تھے کسی کو جگانا مناسب نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے کوشش کر کے گھر کے مین دروازے کا لاک گھمایا اور باہر جانے کے لیے اسے کھول لیا۔

''یہ کیا؟'' دروازے کے کھُلتے ہی یوں لگا جیسے کائنات میں صور پھونکا جا رہا ہو۔ چاروں طرف ایک شور بپا ہو گیا۔ کانوں میں سوراخ کر دینے والی تیز آواز ایسی تھی جیسے کوئی ایمبولینس قریب المرگ مریض کو لیے چنگھاڑتی ہوئی سڑکوں کے بیچ راستہ بناتی بھاگی چلی جا رہی ہو یا آگ بجھانے والا انجن گھر میں گھس آیا ہو۔ مُردے قبروں سے نکل کر... سرپٹ دوڑے جا رہے ہوں اور قیامت کا اعلان جاری کیا جا چکا ہو۔ اماں کے دیکھتے ہی دیکھتے گھر کے سامنے پولیس کی گاڑیاں ہارن بجاتی جمع ہونا شروع ہو گئیں۔ شور شرابے سے بہو، بیٹا بھی جاگ گئے، وہ بھی رات کے ہی کپڑوں میں الٹے سیدھے قدموں بھاگتے ہوئے گھر سے باہر آکر کھڑے ہو گئے۔

''اوہو، اماں جی یہ کیا، کیا آپ نے؟'' شہناز غصے کو دباتے ہوئے بولی۔

''کیوں... کیا کیا ہے میں نے؟'' اماں کچھ سمجھ نہ سکیں۔

''آپ گھر سے باہر نکل آئی ہیں۔ آپ کو نکلنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'' وہ بولی۔ اماں سوچ میں پڑ گئیں۔

''یہاں کیا گھر سے باہر قدم نکالنا اتنا بڑا جرم ہے۔ مجھے کیا خبر تھی۔'' وہ حیران ہو کر بیٹے کی طرف دیکھنے لگیں جو پولیس والوں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ چند ہی لمحوں میں پولیس والے بیٹے سے ہاتھ ملا۔

کر رخصت ہو گئے اور چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ قدیر اماں کی طرف بڑھا، لمحے بھر کو رکا اور پھر کہنے لگا۔

"اماں جی، دراصل رات کو ہم نے الارم سسٹم لگایا ہوتا ہے۔ صبح گھر سے باہر جاتے ہوئے اسے ڈی کوڈ کرنا ہوتا ہے۔ اگر نہ کریں تو یہ الارم پولیس اسٹیشن میں بج اٹھتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے گھر کوئی چور آ گیا ہے۔ اسی لیے وہ فوراً دوڑے آتے ہیں۔"

"دو بار غلطی سے بجنے کے بعد پولیس والے فائن لگا دیتے ہیں کہ آپ نے خواہ مخواہ پھیرا لگوایا۔" شہناز نے اماں کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"میں نے پولیس والوں سے معذرت کر لی ہے اور بتایا ہے کہ آپ ابھی یہاں نئی نئی آئی ہیں اور آپ کو اس سسٹم کا علم نہیں ہے۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔" قدیر نے اندر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اماں کو تقریباً دھکیل کر کہا۔ اماں سر جھکائے خاموشی سے اندر کو چل دیں۔

انہیں شدید احساسِ جرم ہونے لگا۔ انہوں نے آتے ہی کتنی بڑی غلطی کر دی تھی۔ بیٹے کے گھر کو ڈسٹرب کر دیا تھا۔ پوتا، پوتی بھی انگلش میں دادی کے بارے میں کچھ کہتے جا رہے تھے۔ اماں کو سمجھ نہ آنے کے باوجود سمجھ آ رہی تھی کہ اُن کے بارے میں کیا بات ہو رہی ہے۔ بھلا گھر سے باہر قدم رکھنے کے اتنے برے نتائج ہو سکتے ہیں انہیں کیا پتا تھا۔

"اماں آپ گھبرائیں نہیں۔ ہم آپ کو سکھا دیں گے کہ الارم کیسے ڈی کوڈ کر کے بند کرنا ہے پھر آپ آرام سے صبح کی سیر کو چلی جایا کریں گی۔" قدیر نے کچھ دیر بعد نرمی سے کہا۔

"نہیں نہیں، مجھے نہیں سیکھنا کچھ بھی۔ میں گھر سے باہر قدم رکھوں گی ہی نہیں۔ تم فکر نہ کرو۔" اماں گھبرا کر بولیں۔ شہناز نے پتھرائے ہوئے چہرے سے ساس کو دیکھا۔

"اماں جی، یہاں تو یہ سب کرنا ہی پڑ... آپ سیکھ لیں گی تو اچھا ہوگا۔"

"نہیں نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں... گھر میں ہی رہوں گی۔" اماں بھی اپنی بات... رہیں۔ شہناز خاموش رہی۔ مصلحت اسی میں...

جلدی کام پر جانا تھا۔ شہناز، اماں کو... دینے لگی۔ اس نے بتایا کہ کیسے منجمد گوشت... سے نکال کر نارمل ٹمپریچر پر لانا ہے۔ روٹی... لیے آٹا کہاں رکھا ہوتا ہے، چھری کس دراز... گی۔ کچن کاؤنٹر کو کس طرح صاف کرنا ہے... فور اور تائنٹ اسپرے سے کاغذ کے ٹاول... ہے، گیلا اسفنج نہیں مارنا کیونکہ اس طرح جراثیم... طور پر خاتمہ نہیں ہوتا۔ چولھوں کے ناب کو اچھی... چیک کر کے گھمانا ہے جلنے کے بعد بجھنے تک ایک بتی جلتی رہے گی۔ ایسے میں چولھے پر کوئی چیز... رکھنا۔ ایگزاسٹ فین ضرور چلانا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اماں نے حسبِ ہدایات پھونک پھونک کر کچن میں کھانا بنانے کی کوشش کی۔ کئی مشینوں، بٹنوں کی انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی مگر وہ اندازے سے کام کرتی گئیں اور کھانا پکا ہی لیا۔ شام کو... آئے تو انہوں نے ناک سکوڑ کر فضا میں... شروع کر دیا۔

"اماں لگتا ہے آپ ایگزاسٹ فین چلانا... گئی تھیں، ہے ناں؟" شہناز نے مسکرا کر پوچھا۔

اماں کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ شہناز لپک کر... اور فوراً خوشبودار رنگین موم بتیاں سلگانا شر... کر دیں۔ چاروں طرف مدھری مہک پھیلنے... قدیر نے بھی سارے گھر کی کھڑکیاں کھولنا شر... کر دیں۔ برفانی ہوا کے جھونکوں سے اماں... چھوٹنے لگی۔ اماں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا... ہے۔ ان سے کیا خطا ہو گئی ہے۔

''اماں... آئندہ سے ذرا احتیاط کیجیے گا۔ کھانا پکاتے وقت کھڑکیاں کھول لیں اور ایگزاسٹ فین ضرور چلا لیں۔ دراصل ایسا نہ کریں تو سارے گھر میں لہسن، پیاز اور ادرک کی بُو پھیل جاتی ہے پھر بہت برا لگتا ہے۔'' قدیر ائر فریشنر چھڑکتا ہوا قریب آ کر چاٹ انداز میں بولا۔ اماں چونک گئیں۔

''ہیں...... مسالے کی خوشبو اتنی بری چیز ہوتی ہے۔ مجھے کبھی پہلے کیوں نہ پتا چلا۔ شاید یہاں ایسا ہی سوچتے ہیں۔'' وہ سوچوں میں ڈوب گئیں۔ کیسی کیسی باتوں کا انہیں پتا چل رہا تھا جن کا انہیں کچھ پتا ہی نہ تھا۔ عجیب دنیا میں چلی آئی تھیں وہ۔

''اور ہاں اماں جی، صبح جلدی میں کچھ باتیں تو میں بتانا بھول گئی تھی۔ یہ جو کچن سنک میں لگا ہوا ایک ڈھکا ہوا سوراخ ہے ناں۔ اس میں غلطی سے بھی کبھی ہاتھ نہ ڈالیے گا۔ یہ کوڑے کو پیس دینے والا گاربیج ڈس پوزل ہے۔ اسے اس بٹن سے آن اور آف کرتا ہے اور اگر کبھی کوئی چمچ اس میں گر گیا تو اس کی موٹر ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ گرم ہنڈیا کو کچن کاؤنٹر پر بغیر کسی میٹ کے نہیں رکھنا کیونکہ کاؤنٹر جل بھی سکتا ہے۔ فرش پر موپ پھیرتے وقت کبھی بلیچ والا پانی نہیں استعمال کرنا کیونکہ وڈ ورک کا رنگ و روپ خراب بھی ہو سکتا ہے۔''

اماں دن بھر کچن کی دنیا میں جی لگاتیں اور پھر فراغت ملنے پر کھڑکی کے منظر سے ملاقات کرنے چلی جاتیں۔ جنت کے نظارے انہیں بہت بھلے محسوس ہوتے اور وہ ان کے سحر میں کھوئی رہتیں۔ انہوں نے ایک دو بار دیکھا کہ جنگل کے کچھ آوارہ ہرن اور ہرنیاں بھی سبزہ زار سے اپنا حق لینے کو چلے آتے ہیں تو اماں انہیں دیکھ کر سرشار ہوتی رہتیں۔ کتنی خوب صورتی تھی اس منظر میں مگر ساتھ ہی ویرانی کا احساس ہوتا۔

چند ہفتوں میں اماں کافی کچھ سیکھ گئیں۔ بیٹا، بہو جب شام کو تھکے ہارے گھر آتے تو گرم گرم کھانا اور پھلکے ان کا انتظار کر رہے ہوتے۔ مٹھی بھر محبت کی اجرت کے عوض انہیں سب کچھ اتنے اچھے طریقے سے ملنے لگا تھا۔ شہناز اور قدیر کو اتنی آسانیاں پا کر زندگی میں کچھ اور مزہ آنے لگا تھا۔ اپنے بچوں کی خوشی دیکھ کر اماں کو بھی کارآمد ہونے کا احساس ہونے لگتا اور وہ بھاگ بھاگ کر کھانا پرونسے لگتیں۔

''دادی رات کو خراٹے بہت لیتی ہیں، میں ڈر جاتا ہوں۔'' ایک بار اُن کے ننھے پوتے نے کھانے کی میز پر انکشاف کر کے اماں کو تو پانی پانی کر دیا۔ اسی لمحے اماں نے سوچ لیا کہ وہ بچے کے کمرے میں نہیں لاؤنج کے صوفے پر سویا کریں گی۔ قدیر اور شہناز بھی اماں کے اس فیصلے پر کچھ نہ بولے تو اماں نے سمجھ لیا کہ یہی صحیح فیصلہ تھا اور انہیں اسی پر کاربند رہنا چاہیے۔

''اماں اگر آپ دن میں کبھی بور ہو جائیں یا تنہائی محسوس کریں تو یہ ریڈیو لگا لیا کریں۔ دیکھیں ایف ایم چار سو پر صبح گیارہ بجے ایک اسلامی پروگرام ہوتا ہے۔ آپ سنیں گی تو آپ کا دل بہلا رہے گا۔'' ایک روز شہناز نے ان پر مہربانی کی اور انہیں ریڈیو پروگرام کے بارے میں بتا دیا۔

''سن رائز ریڈیو یہاں کی کمیونٹی میں بہت پاپولر ہے۔ ہم لوگوں کے پاس تو سننے کا ٹائم ہی نہیں ہوتا۔ چلیں آپ ہی سن لیا کریں۔'' اماں نے اسٹیشن کا نمبر نوٹ کر لیا اور اگلے روز گھر خالی پاتے ہی ریڈیو کا ڈائل گھما دیا۔ ابھی گیارہ نہیں دس ہی بجے تھے مگر اماں کو خیال نہیں رہا اور بے چینی سے سوئی کو اِدھر اُدھر گھمانے لگیں۔

''گڈ مارننگ سننے والو۔ یہ ہے سن رائز ریڈیو کا انڈین پروگرام اور میں ہوں آپ کا ہوسٹ، سنیل شرما۔ آپ اپنی پسند کے گانے سنیں گے اور ہمیں فون بھی کریں۔ یہ ہے ہمارا نمبر۔'' اماں دھیان سے

سننے لگیں۔ سنیل شرما نے کسی کی فرمائش پر ایک بہت ہی پرانا گانا لگا دیا تھا۔

اماں کی رگ رگ میں عجیب سی خوشی اور اداسی سنسناہٹیں پیدا کرنے لگی۔ یکدم اماں کے کلیجے میں اک ٹیس سی اٹھی۔ انہیں یاد آیا۔ ان کے ابا جی تقسیم سے پہلے کسی انگریز سے ایک ریڈیو خرید لائے تھے جو بہت سال ان کے گھر میں رہا تھا۔ اماں اپنے بچپن اور جوانی میں گانوں کی بہت شوقین ہوا کرتی تھیں۔ یہ گانا بھی انہی دنوں کی یادگار تھا۔ پانچ جماعتیں پڑھی اماں کے لیے وہ زمانہ کتنا جادوئی زمانہ تھا۔ آگاہی کے نئے نئے در کھلتے جا رہے تھے۔ وہ اس عہدِ گزشتہ کو کبھی بھلا نہیں سکی تھیں۔ کیا واقعی میں نے کبھی ایسا کوئی زمانہ گزارہ بھی ہے؟ اس نئے زمان ومکان کے تانے بانے میں الجھی ہوئی اماں کو وہ سب ایک دھندلے خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کبھی اس دور کے علاوہ بھی کسی دور سے گزری ہیں۔

انڈین پروگرام کے بعد اسلامی پروگرام شروع ہوا تو اماں نے اپنے دین کی پیاری پیاری باتیں سنیں۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب نے عورتوں کے لیے پردے کے احکامات، وضو، نماز کے فضائل، جھوٹ بولنے پر عذابِ الٰہی کے بارے میں خوب تفصیل سے گفتگو کی جس سے اماں کو اپنے اعمال بہت سیاہ لگنے لگے اور انہوں نے سچے دل سے خدا سے معافی مانگنے کو مصلیٰ نکال کر بچھالیا۔ اتنا روح پرور پروگرام سن کر اماں کی روح سرشار ہوگئی۔

اب اماں نے اپنا معمول بنالیا تھا۔ صبح کچن میں کام کرتے وقت ریڈیو سنتیں۔ کھانا پکاتیں، برتن دھوتیں، صفائی کرتیں تو جان ماری کا اتنا احساس نہ ہوتا۔ پہلے انڈین اور پھر اسلامی پروگرام باقاعدگی سے سنتیں تو لگتا بالآخر اب ان کی عاقبت سنور ہی جائے گی۔ دوپہر کو وہ نمازِ ظہر سے فارغ ہو کر ہاتھ میں تسبیح تھامے کھڑکی کے سامنے کرسی ڈال لیتیں، سبزہ زار کا منظر دیکھ کر دل بہلایا کرتیں۔ اب ان کی دنیا اور یہی ان کے معاملات تھے۔

ایک روز انڈین ریڈیو والا سنیل شرما فرمائش کے لیے لائیو کالز لے رہا تھا۔ اماں کے جی میں جانے کیا آئی ڈرتے ڈرتے نمبر نوٹ کیا۔ نظر آنکھوں پر جمائی اور کال کر دی۔ اتفاق کی بات کہ کال مل بھی گئی اور سنیل شرما نے ان سے بات چیت کرنا شروع کر دی۔

”جی میڈم، کال ملانے کا شکریہ۔ بتائیے کون سا گانا سنیں گی۔ اچھا سب سے پہلے آپ اپنا نام، لوکیشن تو بتائیے؟“ سنیل شرما شوخی سے بولا۔

”نام......“ اماں کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ان کا کیا تھا؟ وہ تو جیسے بھول ہی گئی تھیں۔ انہیں امریکا آئے ہوئے مہینوں ہو گئے تھے مگر کسی نے انہیں ان کے اصلی نام سے نہ پکارا تھا۔ بچے گرینڈ ما کہتے، بہو اماں جی۔ کیا وہ ان رشتوں کے علاوہ بھی کچھ زندہ تھیں؟ وہ ایک پل کے لیے سوچ میں پڑ گئیں۔

”ماسی زبیدہ...... ماسی زبیدہ۔“ یکدم ان کے کانوں میں ان کے ہمسائے میدو کمہار کی بیٹی کی آواز گونجی۔

”اوہ تو میرا نام زبیدہ ہے۔“ اماں نے بڑی جلدی سے اپنے منہ سے اپنا نام اُگلا جیسے اگر جلدی نہ کی تو وہ نام کہیں گم ہو جائے گا اور وہ اپنا تشخص ڈھونڈتی پھریں گی۔

”تو مس زبیدہ، بتائیں کون سا گانا آپ کی فرمائش پر لگاؤں؟“ سنیل شرما بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میری فرمائش۔“ اماں تھوک نگلتے ہوئے بولیں۔ آج تک ان کی فرمائش یا خواہش تو کبھی کسی نے پوچھی ہی نہیں تھی۔ ”وہ والا گانا لگا دیں بچپن کے دن بھلا نہ دینا۔“ اماں کو یک دم اپنا بچپن یاد آ گیا اور

وہ کسی اور ہی دنیا میں چلی گئیں۔

”گڈ...... گڈ...... ویری گڈ چوائس، مس زبیدہ۔ یہ لیجیے سنیں۔“ سنیل شرما چہکنے لگا۔ گانا شروع ہو گیا اور اماں چوہدری صاحب کے خیالوں میں کھو گئیں۔ چوہدری نیاز ان کے بچپن کے ساتھی ان کے چچا زاد تھے۔ وہ دونوں اکٹھے ہی پلے بڑھے، کھیلے کودے تھے پھر بڑے ہوتے ہی ان کی شادی کر دی گئی۔ نیاز اکثر ہی یہ گانا سنا کر چھیڑا کرتے تھے تو وہ کتنا شرمایا کرتی تھیں۔ اماں بے اختیار مسکرانے لگیں اور مسکراتے مسکراتے چپکے سے سترہ سال کی ہو گئیں۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا یہ سب۔ آج کتنی مدت کے بعد انہوں نے اپنے بیٹے، بہو، پوتے، پوتی کے علاوہ کسی اور سے بات کی تھی۔ ان کی زبان تو باتیں کرنے کو ہی ترس گئی تھی۔ آج ایک عرصے بعد کسی نے ان کا نام لیا تھا۔ انہیں اماں کے علاوہ کسی اور نام سے پکارا تھا۔ ان کے مرحوم دلبر شوہر کی یاد دلائی تھی۔ اماں ہوا میں اڑنے لگی تھیں۔

گانا ختم ہوتے ہی ریڈیو پروگرام ختم ہو گیا تو اماں کھڑکی کا پردہ سرکا کر حسبِ معمول سبزہ زار کے نظارے سے دل بہلانے کو کرسی ڈال کر بیٹھ گئیں اور ماحول کی خوب صورتیوں کو اپنے اندر جذب کرنے لگیں۔ اچانک انہیں لگا جیسے روز کے معمول کے ماحول سے آج کچھ مختلف سا منظر ہے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھیں کیا......؟ کہ ان کی نظر ایک انسانی وجود پر پڑی جو ساتھ والے مدتوں سے ویران پڑے گھر میں سے باہر آ رہا تھا۔

”ارے یہ کیا؟ آج یہاں کوئی انسان نظر آ رہا ہے؟ کیا کوئی رہنے لگا ہے اس گھر میں؟“ اماں نے غور سے اس شخص پر نظریں جما دیں۔ وہ کوئی بوڑھا سفید فام امریکن تھا جو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ڈرائیو وے سے گزر کر سڑک کنارے لگے ڈاک کے ڈبے کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

"اچھا تو یہ کوئی ہمسایہ ہے مگر یہ پہلے کبھی کیوں نہیں دکھائی دیا شاید نیا ہی آیا ہو۔" اماں سوچنے لگیں۔ ایک لمحے کو تو اماں کو لگا جیسے ان کے منظر میں اس نئے شخص نے شامل ہو کر دخل اندازی کی ہے مگر اماں کو دھیرے دھیرے اس کردار میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ روزانہ دن کے پورے ایک بجے وہ بوڑھا ڈولتے قدموں سے گھر کے باہر آتا، کوڑے کا ایک بڑا سا بیگ کوڑے دان میں پھینکتا اور پھر ڈاک چیک کر کے واپس گھر کے اندر داخل ہو جاتا۔ اماں کو اسے دیکھتے ہفتے اور پھر مہینے بیت گئے۔ سردی ہو یا گرمی اس شخص کی روٹین میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اماں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچتی رہتیں۔

"ہائے بے چارہ اکیلا رہتا ہے۔ اس کے گھر والے پتا نہیں کہاں ہیں۔ یہ یہاں کیوں پڑا ہوا ہے۔" اماں نے یہ بھی دیکھا کہ کھانا ڈلیور کرنے والی ایک گاڑی meals on wheels کے نام سے آتی اور اسے دو وقت کھانا پہنچا کر جاتی ہے پھر اماں سوچتیں آخر میں بھی تو گاؤں میں اکیلی ہی رہتی تھی مگر وہاں تو کوئی دوست، کوئی رشتے دار، نوکر چاکر، سودے پھیری والا کوئی نہ کوئی تو ہوتا ہی تھا۔ یہاں تو میل ہا میل کوئی دور تک نظر نہیں آتا۔ اس ویرانے میں یہ اکیلا سارا دن کیا کرتا ہوگا۔ یہ وہ جگہ ہے جس کے بارے میں ہم کہتے تھے جا بچہ راوی نہ کوئی آدمی نہ کوئی جاوی۔ کیسے لوگ ہیں یہاں کے۔ کیسا غیر غیر سا دیس ہے۔" اماں بہت باتیں دل میں رکھتیں مگر کسی سے کہہ نہ پاتیں۔

ان کے بیٹا، بہو شام کو تھکے ہارے آتے تو انہیں بس اماں کے ہاتھ کا پکا ہوا لذیذ اور تازہ کھانا کھانے میں ہی دلچسپی ہوتی۔ ان کے اپنے ہی سو بکھیڑے تھے۔ کبھی بچوں کی اسکول ایکٹی ویٹیز، کبھی کوئی فنکشن یا پارٹی وغیرہ۔ اماں ان سے کیا باتیں کرتیں۔ بس کھڑکی میں بیٹھی باہر کو تکتی رہتیں او [..] کو ہی اپنا دوست سمجھ لیتیں کہ دوست کی ضرورت [..] ایک کو محسوس ہوتی ہے۔

ایک روز نہ جانے کیا ہوا، بوڑھے امریکی [..] نظر سامنے والے گھر کی ایک کھڑکی میں کھڑے ہیولے پر پڑ گئی۔ وہ روایتی دوستانہ امریکی انداز [..] مسکرایا اور ہاتھ ہلا کر زور سے ہائے کہا۔ اماں [..] جیسے کسی بچھو نے ہی کاٹ لیا۔ تڑپ کر کھڑکی [..] پردے سے علیحدہ ہو گئیں۔ ایسا لگا جیسے اس نے [..] کی کوئی چوری پکڑ لی ہو۔

"ہیں...... کیا میں نامحرم کو چھپ چھپ کر [..] رہی تھی۔ توبہ اللہ مجھے معاف کرنا مگر میں ایسی تو [..] ہوں۔" وہ بڑبڑائیں۔ انہیں خواہ مخواہ ہی احساس [..] جرم ہونے لگا۔

موسم آہستہ آہستہ گرم ہو رہا تھا۔ ایک روز [..] نے کھڑکی کو اَن لاک کر کے جالی میں سے باہر [..] کی کوشش کی تو تازہ ہوا کے فرحت بخش جھونکوں [..] ان کا منہ چوم لیا۔ انہیں بہت اچھا لگا۔ دن [..] پورے ایک بجے تھے۔ بوڑھا اپنے معمول [..] مطابق باہر نکلا اور کوڑا پھینک کر ڈاک اکٹھی کر [..] لگا۔ یکایک اس کی نظر پھر کھڑکی میں کھڑے [..] ہیولے پر پڑ گئی۔ اس نے پھر سے مسکرا کر ہائے [..] پھر امریکی دستور کے مطابق بولا۔

"اِٹس اے بیوٹی فل ڈے۔" اماں [..] لجا گئیں جیسے اس نے موسم کی نہیں ان کے حسن [..] تعریف کر دی ہو مگر اب کی بار وہ پیچھے ہٹ کر [..] نہیں بلکہ وہیں کھڑی رہیں اور جواباً اسے بھی [..] ہلا دیا۔ بوڑھا ہاتھ ہلا کر دوبارہ اپنے گھر [..] اندر چلا گیا۔ اماں سوچ میں پڑ گئیں انہیں لگا [..] غیر آباد، ویران جزیرے میں قید ایک تنہا شہزادی [..] جس کے آس پاس کوئی آباد نگر، کوئی زندہ بستی [..] ہے۔ چاروں طرف گہرا سمندر ہے اور اوپر آسمان تنا ہے۔

"کیا شہزادی کبھی اس جزیرے کی قید سے رہا ہو سکے گی؟ مگر اب میں رہا ہو کر جاؤں گی بھی کہاں؟ گھر تو کب کا سیلاب میں بہہ گیا ہے۔ اب تو وہاں نئی آبادکاریاں شروع ہو چکی ہوں گی اور پھر یہ تو میرے اپنے من موہنے بیٹے کا گھر ہے۔ اب تو میرا یہیں رہنا بنتا ہے۔" وہ خود ہی اپنے آپ سے سوال کر کے جواب دے دیتیں اور پھر اپنی معمول کی زندگی میں مصروف ہو جاتیں۔

اب کبھی کبھار اماں اور بوڑھے کے درمیان کھڑکی سے ہی ہیلو ہائے، یس اور نو کے الفاظ کا تبادلہ ہو جاتا تو اماں کو اچھا لگتا کہ انہوں نے کسی ذی روح سے کم از کم بات تو کی ہے۔ ان کا وجود ہے، وہ ختم نہیں ہوئیں۔ اماں کو ایک آس رہنے لگی تھی وہ ایک بجے کا انتظار کرتی رہتیں۔ سارے دن کی تنہائی میں یہی وہ چند لمحے تھے جب وہ کسی سے ہم کلام ہوتی تھیں پھر اماں کا جی چاہا وہ اس بوڑھے شخص سے بہت ساری باتیں کریں۔ اس سے پوچھیں وہ اکیلا کیوں رہتا ہے۔ اس کے بال بچے کہاں ہیں، وہ کیا کرتا ہے مگر نہ اماں کو ہی اتنی انگریزی آتی تھی اور نہ اس بوڑھے کو اماں کی زبان کا پتا تھا لہٰذا بات آگے نہ بڑھی۔ کھڑکی کا منظر تبدیل نہ ہو سکا۔ کئی بار اماں کا جی چاہا وہ نیچے اتر جائیں اور اس سے بالمشافہ گفتگو کریں مگر پھر اماں کو یاد آ جاتا کہ جن جزیروں میں شہزادیاں قید ہوتی ہیں ان کے محلوں کے قفل کھولنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ قدم باہر رکھیں تو خطروں کی گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں لہٰذا اماں بس اوپر ہی کھڑکی میں کھڑی مسکرا کر ہیلو، ہائے کہہ لینے پر ہی اکتفا کر لیتیں۔

ایک روز ایک عجیب بات ہوئی۔ اماں حسب معمول ایک بجے کھڑکی میں بیٹھی ہمسائے سے ہیلو کرنے کے بعد اسے ڈاک نکالتا دیکھ رہی تھیں کہ انہیں لگا جیسے بوڑھا یکدم زمین پر جھکتا ہی چلا گیا۔

"ارے، اسے کیا ہوا ہے؟ لگتا ہے کچھ ہو رہا ہے۔" اماں کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین پر گر کے لوٹنے لگا۔ ڈاک اس کے ہاتھ سے نیچے جا گری۔ اماں بے چین ہو گئیں۔

"بھائی صاحب، بھائی صاحب۔ ہیلو...... ہیلو۔" اماں نے کھڑکی کھول کر پوری طاقت سے آواز دی۔ بوڑھے نے ایک نظر اوپر کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"اللہ اسے تو کچھ ہو رہا ہے۔ کہیں دل کا دورہ......" اماں سوچ کر پریشان ہو گئیں۔ یک دم اماں کے اندر جیسے بجلی سی بھر گئی۔ وہ یوں اپنی کرسی سے اچھلیں جیسے سولہ سال کی نوجوان لڑکی ہوں اور چھلانگیں مارتی سیڑھیاں اترنے لگیں۔ جلدی سے مین دروازہ اَن لاک کیا اور تقریباً بھاگتی ہوئی اس اجنبی ہمسائے کی طرف چلنے لگیں جس کا انہیں نام تک نہیں معلوم تھا۔ ایسے میں الارم کی پُرشور تیز آواز ان کے لیے بالکل بے معنی ہو چکی تھی۔ بوڑھے کے قریب پہنچ کر انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں اور کچھ نہ سوجھا تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ملنا شروع کر دیا۔ گاؤں میں اسی طرح بے ہوشوں کی ہتھیلیاں گھس کر انہیں ہوش میں لایا جاتا تھا۔ اماں کو خود ہوش تب آیا جب انہیں تیز تیز آواز کے ہارن والی پولیس گاڑیاں اپنے گھر کی جانب آتی سنائی اور دکھائی دیں۔ انہیں ایک دم احساس ہوا کہ وہ کیا کر بیٹھی ہیں، چونک کر خواب سے جاگیں اور الٹے قدموں اپنے گھر میں گھس کر سانس برابر کرنے لگیں۔ پولیس والوں نے کئی بار گھنٹیاں بجائیں مگر اماں نے دروازہ ہی نہ کھولا۔ وہ اپنی رپورٹ لکھتے لکھتے گھر کے اردگرد چکر لگا کر دیکھنے لگے کہ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں کہ اچانک ان کی نظر زمین پر گرے ہوئے بوڑھے پر پڑ گئی۔ انہوں نے فوراً فون کر کے ایمبولینس منگوائی اور بوڑھے کو اسٹریچر پر ڈال کر غالباً

اسپتال بھجوادیا۔
اماں یہ سب اندر سے چھپ کر دیکھتی رہیں۔ یہ سوچ کر خوش ہوگئیں کہ کم از کم بوڑھے کو طبی امداد تو مل جائے گی۔

''آج آپ باہر گئی تھیں؟'' شام کو گھر لوٹنے پر قدیر نے اماں سے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' اماں کا رنگ فق ہوگیا اور وہ صاف جھوٹ بول گئیں۔

''اچھا، حیرت ہے پولیس والوں کا فون آیا تھا کہ یہ سیکنڈ ٹائم ہے جب آپ کی طرف سے ہمیں false alarm ملا ہے۔ پکی بات ہے غلطی سے آپ کا ہاتھ کہیں دروازے پر تو نہیں لگ گیا؟'' قدیر نے کھانا پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ارے ، ارے دیکھیے یہ نیوز...... یہ کیا دِکھا رہے ہیں۔'' شہناز نے اپنے شوہر کی توجہ ٹی وی کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہماری اسٹریٹ ہے۔ اوہو...... یہ تو ہمارے ساتھ والے گھر میں ہی رہتا تھا ناں!'' قدیر نے نیوز رپورٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا ڈیڈ؟'' ننھے انعم نے باپ سے سوال کیا۔

''بے چارہ ہمارا نیبر تھا ناں جانسن۔ وہ جو کچھ عرصے پہلے ہی یہاں شفٹ ہوا تھا۔ آج ہارٹ اٹیک سے مرگیا۔ شکر ہے پولیس یہاں آئی ہوئی تھی وہ اسے اٹھا کر لے گئی ورنہ تو بے چارہ پتا نہیں کب تک یونہی زمین پر مُردہ پڑا رہتا۔'' قدیر نے تفصیلات بتائیں۔ اماں کے حلق میں نوالہ پھنسنے لگا۔

''بھائی صاحب۔'' ان کے دل سے ایک چیخ نکلی جسے انہوں نے اپنے اندر ہی دبالیا پھر یک دم انہیں ایک عجیب سی خوشی کا سا احساس ہوا۔ بوڑھا جانسن اس تنہائی کی قید سے بالآخر چھوٹ گیا تھا۔ کتنا اچھا ہوا تھا۔ ان کا جی چاہا وہ سنیل شرما کے کسی ریڈیو پروگرام میں کسی چنچل گانے کی دُھن پر اٹھ کر بے ساختہ ناچنے لگیں۔ گھر کی ساری کھڑکیاں، دروازے مکمل طور پر کھول دیں تاکہ تازہ ہوا اندر آجائے اور انہیں نہال کردے۔

''ان بے چارے بوڑھے امریکنوں کا تو یہی انجام ہوتا ہے۔ اکیلے پڑے، گل سڑ کر مرجاتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ ہم تو اپنے پیارے بزرگوں کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں، ہے ناں اماں؟'' قدیر نے اپنی ماں کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر نیا لقمہ لیا۔ آج مٹن پلاؤ بہت زبردست تھا۔ اماں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

''بے چارہ بابا، نہ جانے کہاں تھے اس کے گھر والے۔'' شہناز بولی۔ ''ارے ہاں قدیر، میں نے آپ کو بتایا نہیں قریشی صاحب کہہ رہے تھے انہوں نے اپنے ابوامی کو پاکستان سے بلالیا ہے۔ کہتے تھے گھر میں بچوں کے لیے آسانی رہتی ہے۔ اب تو بہت سے انڈین پاکستانی لوگ ایسا ہی کررہے ہیں۔''

''اچھا مگر قریشی صاحب تو کہہ رہے تھے میرا گھر بہت چھوٹا ہے۔ ان کے والدین رہیں گے کہاں؟''

''مسز قریشی کہہ رہی تھیں اتنا بڑا گیراج خالی پڑا ہے۔ انہیں وہیں سیٹ کردیں گے۔'' شہناز نے سلاد میں سے کھیرا اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ویسے ایک بات ہے قدیر مجھے سمجھ میں نہیں آرہا.... بابا جانسن کو لے جانے کے لیے پولیس ہماری گلی میں آئی ہی کیوں جبکہ ہمارا الارم بھی نہیں بجا تھا؟'' شہناز نے کچھ سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں کہا اور عجیب عجیب نظروں سے ساس کی طرف دیکھنے لگی۔ □

گواہ

توقیر عائشہ



''بھائی صاحب کا فون آیا تھا۔ اس مہینے کی 25 کو ان کی فلائٹ ہے۔ پوچھ رہے تھے کہ کیا مشورہ کیا؟'' نازیہ نے طاہر کی جانب چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بھئی بات یہ ہے کہ اتنی بڑی آفر قبول کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔'' طاہر نے جواب دیا۔

''ایسا کرتے ہیں شام کو اُن کی طرف چلتے ہیں، اونٹ کسی کروٹ بیٹھ ہی جائے گا۔'' نازیہ نے

برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔ حسبِ وعدہ شام میں وہ جمال بھائی کے پاس بیٹھے تھے۔

مسئلہ یہ تھا کہ نازیہ کے بڑے بھائی جمال کو بہت اچھی جاب کینیڈا میں مل گئی تھی اور وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی بہتر تعلیم اور مستقبل کے لیے وہاں شفٹ ہونا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنی چھوٹی بہن نازیہ کو جسے انہوں نے باپ بن کر پالا تھا اپنے گھر میں رہائش کے لیے آمادہ کرلیں۔

جمال بھائی ابھی برسرِ روزگار ہوئے ہی تھے کہ ان کے والد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ماں اور چھوٹے بھائی اور بہن کی ذمے داری ایسی محبت سے نبھائی کہ ماں دعائیں دیتے نہ تھکتیں۔ یہ دعائیں انہیں معاشی کیا ہر طرح سے خوب مستحکم کرتی چلی گئیں۔ پہلے چھوٹے بھائی کو گھر بار کا کیا بعد میں ماں کے اصرار پر اچھے خاندان کی لڑکی سے شادی بھی ہو گئی مگر بیٹی نازیہ کی خوشی دیکھنے سے پہلے ہی ماں بھی دنیا چھوڑ گئیں۔ اب بھائیوں کو اس ذمے داری کا ہر آن احساس تھا۔ بھائیوں کی مستحکم معاشی حالت کے پیشِ نظر بہت سے رشتے آتے لیکن ان کی لالچ ان کی گفتگو سے ٹپکتی اور دونوں بھائی انہیں چلتا کرتے۔

ایسے میں ان کی نظر خاندان کے ہی ایک جوان پر پڑی جو عمر، تعلیم اور روزگار سب ہی میں نازیہ کا ہم پلہ تھا۔ اس کی والدہ دنیا میں نہ تھیں اور والد صاحب کا خیال تھا کہ بھائیوں میں محبت قائم رکھنی ہے تو اپنی، اپنی رہائش الگ ہونی چاہیے۔ اگرچہ وہ والد صاحب کے ساتھ ہی کاروبار میں شامل تھا۔ آمدنی اتنی معقول تھی کہ درمیانی درجے کی آبادی میں ون یونٹ بنگلا بنا لیا تھا۔ والد صاحب نے اس کے سہرے کے پھول کھلائے جو جلد ہی مرجھا گئے۔ میکے کا شدید اصرار اور کچھ خود فرح کی امریکا سیٹ ہونے کی خواہش اتنی بڑھی کہ وہ چند ماہ ہی ساتھ رہ سکی اور پھر ہمیشہ کے لیے اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔

یہ طاہر تھا جس کے دکھ سے سب ہی واقف تھے۔ جمال بھائی کو تو اس سے بڑی ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ کزنز اور خاندان کے دیگر افراد کسی غرض یا لالچ میں جمال بھائی کے آگے پیچھے پھرتے مگر طاہر برابری اور وقار کے ساتھ ملتا۔ جمال بھائی نے گھر میں طاہر کے بارے میں مشورہ کیا تو سب ہی نے پسند کیا۔ فکر نازیہ کی تھی کہ کہیں وہ انکار نہ کردے۔ لیکن شائستہ (جمال بھائی کی بیوی) نے نازیہ سے اس طور پر بات کی کہ وہ بھی راضی ہو گئی اور یوں نازیہ کے دم سے طاہر کا گھر پھر سے آباد ہو گیا۔

چند سال میں نازیہ کو بھی اللہ نے بیٹے اور بیٹی سے نواز دیا اور یوں طاہر کی زندگی پھر سے خوشگوار ہو گئی مگر اب کچھ عرصے سے نازیہ اس رہائش سے مطمئن نہیں تھی۔ اب یہاں کی مقامی آبادی میں نچلے طبقے کے افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، قریبی میدان میں قائم ہونے والے کسی ویگن کے آخری اسٹاپ اور پھر آٹو ورکشاپس کی ڈھیروں دکانیں مستقبل کا عجب نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ جمال بھائی کی آفر نازیہ کو بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ وہ مکان جو نازیہ کے والدین کا گھر تھا۔ جمال بھائی نے اسے فروخت ہونے سے بچائے رکھا تھا جبکہ اپنے بہن اور بھائی کو شریعت کے مطابق ان کا حصہ دے چکے تھے۔ وراثت کی تقسیم کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا اور کرائے کی انہیں کوئی حاجت بھی نہ تھی لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ نازیہ اس گھر میں رہائش اختیار کرلے۔

☆☆☆

"طاہر میاں! ہمارے اوپر مہربانی کرو اور ہمارے گھر میں رہ لو جو تنخواہ چوکیدار کو دیں گے تمہیں ہی دے دیا کریں گے۔" شائستہ نے مذاق میں کہا اور سب ہی ہنس پڑے۔ اب جمال بھائی نے بات آگے بڑھائی۔

"تمہارا اسد کل انہی گلیوں میں کھیلے گا۔ یہ اسکول، کالج جائے گی اب وہاں کا ماحول پہلے جیسا نہیں رہا، اپنا گھر فروخت کر کے اسی علاقے میں پلاٹ لے کر ڈال لو۔ آہستہ آہستہ تعمیر کرتے رہنا۔ بچوں کی بہتری اسی میں ہے۔"

اس منصوبے میں کوئی جھول نہ تھا۔ پیشکش میں چھپے خلوص نے طاہر کو قائل کر ہی لیا۔ جمال بھائی خیر و عافیت کے ساتھ اپنی فیملی کو لے کر کینیڈا چلے گئے اب ان دونوں کو اپنا سامان شفٹ کرنا تھا۔ وہ بھی مرحلہ وار پورا ہوا۔ جب سامان منتقل کیا جا رہا تھا تو طاہر کو وہ دن بھی یاد آئے جب فرح کے بھائی علیٰحدگی کے بعد اس کے جہیز کا سامان لے جا رہے تھے اور بدلے میں ایک سناٹا اور وحشت چھوڑ کر جا رہے تھے مگر اب میں اور تب میں کتنا فرق تھا۔ سب کام منصوبے کے مطابق انجام پاتے جا رہے تھے۔ امید تھی کہ مکان بھی جلد فروخت ہو جائے گا مگر...... یہ تو جوئے شیر لانے کے مترادف ثابت ہوا۔

طاہر نے قریبی اسٹیٹ ایجنٹ کو ساری معلومات لکھوا دیں۔ دونوں میاں بیوی آئے دن یہاں کا چکر لگاتے کہ خالی گھر میں کوئی گھس کر ہی نہ بیٹھ جائے۔ چوکیدار بھی نہیں رکھتے کہ آج کل اس کا بھی کچھ بھروسا نہیں کوئی غیر قانونی کام ہی نہ شروع کردے۔ اخبارات میں اشتہارات دیے۔ ہر حربہ آزما لیا گیا۔ ایسا نہ تھا کہ گاہک نہ ملتا ہو۔ گاہک بہت آتے، پسند بھی کرتے معاملہ بیعانے کے لین دین تک پہنچ جاتا مگر پھر کوئی ایسا انوکھا مسئلہ آڑے آ جاتا کہ گاہک مچھلی کی طرح ہاتھ سے نکل جاتا۔ آفس سے وقت بے وقت اس کام سے اٹھ کر آنے میں وہاں کا بھی حرج ہو رہا تھا۔ اس ذہنی کوفت سے طاہر اب چڑچڑا ہو چلا تھا۔ اچانک جائدادوں کی قیمتیں گرنا شروع ہو گئیں۔ طاہر نے کم قیمت پر بھی اپنے دل کو آمادہ کر لیا لیکن بات نہ بنی۔

ایسے میں ایک دن اس کا دوست سرور آفس

خوفناک

ایک فقیر نے راستے میں ایک خاتون کو روک کر کہا۔ "خدا کے لیے آپ مجھے صرف سو روپے دے دیں ورنہ مجھے ایسا خوفناک کام کرنا پڑے گا جس کے خیال سے ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے۔"

خاتون نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

"میں سو تو کیا دو سو روپے تمہیں دے رہی ہوں مگر پلیز میرا پرس مت چھیننا۔"

فقیر نے بے پروائی سے کہا۔ "میں حرام کی کمائی نہیں کھاتا۔ میں تو محنت مزدوری جیسے خوفناک کام کی بات کر رہا ہوں۔"

مرسلہ: نور افشاں، شکار پور

میں ملنے چلا آیا۔ دوستوں سے تو آدمی پریشانی بیان کرتا ہی ہے۔ طاہر نے بھی مکان کی فروخت میں غیر معمولی رکاوٹ کا ذکر کیا۔ اس نے پہلے تو مذاق بنایا کہ اس میں جن رہتے ہیں جو بکنے نہیں دیتے لیکن پھر سنجیدگی سے ایک ایسے صاحب کا ذکر کیا جو لوگوں کے مسائل اپنی غیر معمولی دانائی سے حل کرتے ہیں لیکن صرف مشورے کی حد تک۔ ان کے مشورے ایسے صائب ہوتے ہیں کہ اس پر عمل کر کے بہت سے لوگ اپنے مسائل سے نجات پا چکے ہیں اور وہ خود کئی لوگوں کو ان کے پاس لے جا چکا ہے وہ ایک اسکالر ہیں اور اخبارات میں مضامین وغیرہ لکھتے ہیں۔

"تم کہتے ہو تو چلا جاؤں گا۔" طاہر نے بے دلی سے کہا اور وہاں جانے کے لیے رضامندی ظاہر کردی۔

☆☆☆

سرور نے رحمانی صاحب سے وقت لے لیا۔ پوش علاقے کی خوب صورت کوٹھی کے باادب

چوکیدار نے انہیں ایک کمرے میں لا بٹھایا۔ چند ہی منٹ بعد درمیانی عمر کے ایک صاحب داخل ہوئے۔ باریش چہرے پر گول ٹوپی بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ابتدائی تعارف اور مسئلے کی نوعیت جاننے کے بعد انہوں نے طاہر سے کہا۔

''میں آپ سے بہت سے سوالات کروں گا جیسے ڈاکٹر اپنے مریض سے کرتا ہے۔ آپ الجھن تو محسوس نہیں کریں گے؟'' طاہر کا جواب تو اثبات میں ہی تھا پھر انہوں نے عمر، تعلیم، روزگار، خاندانی پس منظر سب ہی کچھ پوچھ ڈالا پھر شادی کے بارے میں پوچھا۔

''یہ میری دوسری وائف ہیں۔'' طاہر نے بتایا۔

رحمانی صاحب نے سابقہ بیوی کے بارے میں پوچھا کہ وہ اب کہاں ہیں۔ طاہر نے وضاحت کر دی۔

''اب یہ تو مجھے علم نہیں، دراصل وہ شادی کے چند ماہ بعد ہی خلع لے کر چلی گئی تھی وہ اپنے والدین کے پاس امریکا سیٹ ہونا چاہتی تھی اور میں اس پوزیشن میں نہیں تھا۔

''کیا آپ موجودہ شادی سے مطمئن ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں، بالکل۔'' طاہر نے جواب دیا۔

اب انہوں نے مکان کے سلسلے کے سوالات شروع کیے۔ طاہر نے تمام معلومات دے دیں کہ کاغذات بھی مکمل ہیں۔ کوئی ہاؤس بلڈنگ کا لون (قرضہ) بھی نہیں ہے اور وہ اس میں 8 سال رہ بھی چکا ہے۔

''کیا آپ نے یہ مکان کسی کو گفٹ کیا ہے؟'' انہوں نے ایک اور سوال کیا۔

''جی ہاں، میں نے اپنی وائف کو دیا ہے۔'' طاہر نے فوراً کہا۔

''کون سی وائف کو پہلی یا دوسری؟'' اس سوال پر طاہر سٹپٹا گیا۔ فوری طور پر کچھ جواب سمجھ میں نہ آیا...... کیونکہ اسے بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔

''وہ جی میری پہلی شادی تھی، جذباتی سا دور تھا خیال بھی نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ میں نے سادہ سے کاغذ پر لکھ کر دے دیا تھا کوئی باقاعدہ دستاویز تو نہیں بنائی تھی۔ اب تو وہ کاغذ بھی کاغذات میں اِدھر اُدھر ہو گیا۔'' اُلجھے اُلجھے لہجے میں بولا۔

''پھر حالات بدل گئے۔ تلخی آ جانے سے آپ کے راستے الگ ہو گئے اور وہ کوئی مطالبہ کیے بغیر چلی گئیں پھر آپ کی شادی ان خاتون سے ہوئی اور آپ نے یہ مکان انہیں بھی گفٹ کر دیا۔ ایسا ہی تھا ناں؟'' رحمانی صاحب نے آگے کا نقشہ کھینچا۔

''جی ہاں۔'' طاہر نے مَرے مَرے سے لہجے میں کہا۔ مسئلے کا یہ رخ اور زاویہ ایک بزنس مین ہونے کے ناتے طاہر پر خوب عیاں ہو رہا تھا۔ رحمانی صاحب نے ایک لمبی ہوں کی اور کچھ دیر بعد گویا ہوئے۔

''میرا خیال ہے، آپ بہت کچھ سمجھ چکے ہیں۔ مکان کا فروخت نہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ چیز آپ کی ملکیت نہیں۔ ہر وعدے کا پہلا گواہ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ چاہے وہ زبانی ہو یا کاغذات پر۔ آپ کی موجودہ بیگم تو اس صورتِ حال سے لاعلم ہیں اور اسے فروخت کرنے پر آمادہ ہیں اگر آپ کی سابقہ بیگم یہ مکان آپ کو واپس کر دیتی ہیں اور اس میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کرتیں تب ہی آپ وعدے کی زنجیر سے آزاد ہو سکیں گے اور یہ فروخت ہو سکے گا۔''

''اب میں کیا کروں؟'' طاہر نے بڑی بے چارگی سے پوچھا۔

''ہے تو یہ بڑے دل گردے کا کام لیکن آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ ہزار کوشش کے باوجود آپ اسے فروخت نہیں کر پا رہے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ آپ کو وعدے کی پاسداری کا نوٹس دے رہا ہے۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو یہ نوٹس مل رہا ہے ورنہ تو یہاں لوگ بڑے بڑے کام دکھا کر پوری زندگی گزار جاتے ہیں اور کوئی نوٹس موصول نہیں ہوتا۔'' رحمانی صاحب نے کہا۔

سرور منہ پھاڑے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ معاملہ واضح ہو جانے کے بعد دونوں مصافحہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر دونوں باتیں کرنے لگے۔

''یار! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مکان اسے دے دوں تو میں خالی ہاتھ رہ جاؤں گا اور اتنی بڑی دنیا میں فرح کو کہاں ڈھونڈوں؟'' طاہر نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

سرور نے تو اپنے دوست کی مدد کی ٹھان ہی لی تھی۔ اس نے کہا۔ ''نیت ثابت رکھ میرے بھائی۔ دنیا گلوبل ویلیج بن چکی ہے۔ فرح کو ڈھونڈ ہی لیں گے۔ ایسا کرو جنہوں نے تمہارا رشتہ لگایا تھا ان سے رابطہ کرو، شاید وہ کچھ بتا سکیں۔ ایسا کرو تم ٹائم لے لو میں خود تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

اس ساری جدوجہد میں فیروز صاحب رابطے کا ذریعہ بنے۔ انہوں نے فرح سے امریکا بات کی۔ فرح کے لیے بھی یہ خبر ایک دھماکے سے کم نہ تھی کہ بیٹھے بٹھائے مکان مل رہا تھا جسے وہ اپنا کبھی سمجھ ہی نہیں سکتی تھی پھر بھی اس نے سوچنے کے لیے ایک دن مانگا۔

آج جب طاہر گھر پہنچا تو لُٹے ہوئے چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔ نازیہ جو کئی دن سے محسوس کر رہی تھی آج رہ نہ سکی۔

''یہ سرور بھائی آپ کو روزانہ کہاں لے جاتے ہیں۔ آخر کیا پریشانی ہے؟'' اب طاہر کی ہمت جواب دے گئی اس نے الف سے ی تک ساری صورتحال سامنے رکھ دی۔

''نازیہ جس چیز پر میرا حق نہیں رہا تھا وہ تمہیں دے بیٹھا۔'' رحمانی صاحب کے جو الفاظ اس کے دل پر لگے تھے وہ زبان پر آ گئے۔ ''زبان سے نکلے الفاظ ہوں یا کاغذ کی تحریریں سب پر پہلا گواہ خدا ہوتا ہے۔ اب میں تم سے نظر نہیں ملا سکتا۔'' طاہر نے کہا اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ نازیہ یہ سن کر بھڑک اٹھے گی مگر وہاں خاموشی تھی۔ نازیہ کے لیے بھی یہ ایک بڑا شاک تھا مگر وہ کچھ دیر کی ذہنی کشمکش کے بعد ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔

''میرے بھائی نے آپ کی شرافت کی بنیاد پر آپ کو میرا ساتھی بنایا تھا اس مکان کی بنیاد پر نہیں۔ اللہ مہربان ہے کہ اس نے ہمیں بے گھری کے عذاب سے بچاتے ہوئے پہلے ہی ایک ٹھکانا فراہم کر دیا۔ آپ وعدہ پورا کریں، اللہ بہتری کرے گا۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

طاہر کے دل سے منوں بوجھ اتر گیا۔ زبان نے تو ساتھ نہ دیا لیکن نازیہ کی ہتھیلی پر گرنے والے دو آنسو سب کچھ کہہ گئے۔

دوسرے دن طاہر اور سرور، فیروز صاحب کے پاس بیٹھے فرح کا حیران کُن فیصلہ سن رہے تھے۔ اس نے پیغام دیا تھا کہ آج کل پاکستان کے جو حالات ہیں ان میں کوئی جائداد بنانا بہت ہی مشکل ہے۔ یہاں میرے شوہر اور بچے ہیں۔ میرا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ طاہر کے بھی بچے ہیں۔ میں یہ مکان طاہر کے بچوں کو گفٹ کرتی ہوں۔ طاہر ان کے سرپرست کی حیثیت سے جس طرح چاہیں اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ فرح کی اعلیٰ ظرفی کے اس مظاہرے نے طاہر کے لیے بند گلی میں راستہ بنا دیا تھا۔ کسی مشکل میں انسان کا گرفتار ہونا دراصل اللہ کی طرف سے ایک سگنل ہوتا ہے کہ اپنے باہمی معاملات درست کر لیے جائیں اس لیے اپنے دل کی بیٹری چارج رکھیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زندگی کی بھاگ دوڑ میں کوئی خاص سگنل آپ سے مس ہو جائے اور خدا کے حضور پہنچنے کے بعد تلافی کی کوئی صورت بھی نہ رہے۔

☺

ناولٹ

آگہی کا ایک پل

سائرہ رضا



بے حد ہڑبونگ، شور شرابے اور آپا دھاپی کے بعد اب خامشی گہرے سناٹے میں تبدیل ہوگئی تھی۔ جو اسے اچانک بری طرح محسوس ہونے لگی، چودہ انچ کے ٹی وی سے نکلتی ہلکی آواز بھی تاثر کو توڑنے میں ناکام رہی تھی، سامنے بیٹھا لیاقت حسین استری شدہ کپڑے، بال جمائے، جوتے چمکائے بس منٹ میں نکلنے والا ہی تھا۔ وہ رات کے سالن کے ساتھ پراٹھا کھاتے ہوئے چائے کے گھونٹ بھی

رہا تھا اور سارا دھیان خبروں کی طرف تھا۔ نیوز اینکر بھی بول رہی تھی اور جائزے چار پٹیاں بھی نیچے چل رہی تھیں۔ اس نے دلچسپی سے اسکرین کو دیکھنا چاہا مگر اُکتا گئی، یہ سناٹا بار بار اس کا دھیان کھینچ لیتا تھا اور ایسی خاموشی اور تنہا صبح شاید بارہ تیرہ برس بعد ان کی زندگی میں آہی گئی تھی...... اس کے ہونٹوں پر پژمُردہ سی غیر محسوس مسکراہٹ پل بھر کو کرن بنی۔

یہ ساتھ ہی تو اماں کا تخت تھا جس پر بیٹھی وہ سارا دن خبریں سنتی، سارے گھر پر نگاہ رکھتیں۔ برآمدے میں دروازہ...... اس کی عین سیدھ میں دو کمرے، عقب میں باورچی خانہ، دائیں جانب کھلا صحن اور سامنے کونے میں بیٹھک...... عذرا کو اُن کی نظریں بگ باس کا کیمرا لگتیں، ہر عمل پر ان کی نگاہ ہوتی، کچھ چھپتا ہی نہیں، نہ ہنسنا، نہ رونا اور بھلا میں آخری بار کب ہنسی تھی؟ اس نے سوچ کے پر پھیلائے پھر ناکام ہو کر سمیٹ لیے اور آخری بار کب روئی تھی...... آہ یہ پلکیں تو اب بھی بھیگی بھیگی لگتی ہیں۔

''پانی دو۔''

''آں ہاں۔'' وہ لپک کر پانی بوتل میں سے گلاس میں انڈیلنے لگی، گڑگڑ کی آواز سے اسے اُلجھن سی ہوئی اس نے تھوڑا آگے ہو کر گلاس ذرا سی آواز پیدا کر کے رکھا نہ جانے کیوں پل بھر میں ایک خواہش پیدا ہوگئی کہ وہ لیاقت حسین کو اپنی طرف متوجہ کرے اور وہ کون سا طریقہ ہوسکتا ہے کہ یہ شخص اسے اب ایک نگاہِ غلط انداز میں ہی دیکھ لے صرف کن انکھیوں ہی سے، وہ ایسے کس ہتھیار سے لیس ہو کہ لیاقت حسین چونک پڑے اور......

''عذرا کیا ہوگیا تجھے؟'' وہ اپنے خیالوں سے چونک پڑی اور خود کو سرزنش کی نہ جانے سوچیں کہاں، کہاں لے گئیں۔ اب جو حال پر نظر ڈالی تو بس ایک ٹھنڈی بے بس سانس ہی لے پائی۔ گہرے نیلے کاٹن کے پلین سوٹ پر کسی اور رنگ کا دوپٹا، جوتی لیاقت حسین کی ہی سافٹی اور چھائیوں سے بھرا چہرہ، اندر دھنسی بے رنگ آنکھیں...... ساری رات کروٹیں بدلنے کے باعث بال برتن دھونے کے تار کی طرح پھیلے تھے۔ دبے، اجڑے نکلے سے اس نے غیر ارادی طور پر انہیں ہاتھ سے سنوارا...... اور یہ لیاقت حسین میری طرف دیکھتا کیوں نہیں وہ پھر اس سوال سے پریشان ہوئی جو شاید سالوں بعد اسے یاد آیا تھا۔

چوں چوں، چڑ چڑ چڑ...... چوں...... امرود کے پیڑ سے چڑیوں کا غول اُڑ گیا خاموشی میں آواز نمایاں ہوئی دونوں کی نظریں ایک ساتھ اٹھیں لیاقت کے چہرے پر نرمی کے تاثرات آگئے اب وہ کھڑا ہوا جیب چیک کر رہا تھا۔

''میں ایسا کیا کروں کہ یہ......'' وہ پیشانی مسلنے لگی۔ وہ اونچی چوکی پر بیٹھی تھی۔

''ارے چولھا بند ہی نہیں کیا۔'' اس کی بڑبڑاہٹ اونچی تھی وہ حتی الامکان تیزی دکھاتے ہوئے کھڑی ہونے لگی۔

''آہ...... اُف...... ہائے۔'' ایک ہاتھ دیوار پر اور دوسرا گھٹنے پر رکھے وہ کھڑی ہوئی اگلے قدم پر باورچی خانے کا دروازہ تھا لیکن عذرا کے پہنچنے سے پہلے ہی اس نے چولھا بند کردیا۔ اب شاید وہ کچھ کہے عذرا نے اچھنبے سے خیال آرائی کی مگر وہ باہر کی جانب بڑھنے لگا تھا۔ وہ اسے پکارنے، متوجہ کرنے کو کوئی جملہ کہنا چاہتی تھی مگر ہمت ہی نہیں ہوئی۔ کھڑی ہوئی تو ایک آہ اور نکلی اب اس طرح اٹھا بیٹھا کہاں جاتا تھا مگر بس یہ اچانک اُمڈنے والی خواہش، یہ اماں کی غیر موجودگی تھی، پانچوں بیٹیوں کا اسکول چلے جانا یا...... وہ سمجھ نہیں سکی وہ دروازے تک آگئی، زمانے ہوئے اس نے یہ دل رُبائی چھوڑ دی تھی۔ کوئی جملہ، کوئی بات یا...... یا......

''سبزی والے سے بات کرلی ہے، وہ آجائے گا اگر کوئی کمی بیشی ہوگی تو کہہ دینا۔''

''ہائے۔'' اس نے جان بوجھ کر اب کی بار آواز پیدا کی کافی دل دوز سی۔ لیاقت حسین چونک گیا تھا، متوجہ ہوگیا تھا۔ عذرا کی آنکھوں میں چمک سی آگئی وہ ایک قدم اور آگے بڑھ آئی۔

''ہائے۔'' وہ ایک پل کو رکا تھا۔ عذرا کا وجود بھی کان بن گیا۔ اگلے پل وہ بالکل بے تاثر چہرے کے ساتھ بائیک پر سوار ہوچکا تھا۔ عذرا دروازہ بند کر کے وہیں زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

''ہائے ہائے...... ہائے۔'' اب اس کے جسم اور دل سے سچ مچ کی آہیں نکل رہی تھیں وہ ہر چیز سے بے نیاز اب جھولی کے گولے پر ہاتھ رکھے سسک رہی تھی۔

☆☆☆

چودہ سال پہلے جب وہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تو لگتا تھا جیسے وہ ہواؤں میں اُڑ رہی ہو۔ صبح عید، رات شب برات، دوپہر سحر انگیز۔ وہ سوتے جاگتے خوابوں میں خود کو پاتی، یہ خیال تو ہمیشہ سے تھا کہ شادی ہوگی تو زندگی بدل جائے گی...... تکلیفوں اور پریشانیوں سے دور۔ اس نے کبھی محلوں کی رانی بننے کے خواب نہیں بُنے تھے بس ایک گھر اچھا سا۔

''میں اپنے شوہر سے بہت محبت کروں گی جب میں اتنی محبت، توجہ اور سلوک دوں گی تو وہ میرے گرد پروانے کی طرح گھوما ہی کریں گے اور اگر ساس سسر ہوئے تو انہیں ماں باپ سے بھی زیادہ عزت دوں گی۔ امی ابا کی تو حکم عدولی کر جاتی ہوں، سارے گھر کے کام کروں گی۔ دیور، نندوں سے بہت پیار، عزت سے پیش آؤں گی پھر جب میں اتنی اچھی ہوں گی تو وہ سب بھی مجھ سے محبت کریں گے۔ محبت کے جواب میں نفرت کب تک ہوسکتی ہے۔ کبھی بے جا ضد نہیں کروں گی۔ سب کا کہا مانوں گی بس مجھے سکون اور عزت سے زندگی گزارنی ہے، بس اللہ رزق کے لیے ہاتھ تنگ مت رکھنا۔'' اس نے اپنی ماں کو ہمیشہ ذرا ذرا سی بات پر بکتے جھکتے دیکھا تھا، غربت تھی سر ڈھکتے تو پیر ننگے کے مصداق ہر چیز بس ناپ تول کر اور اس پر ناشکری کا تڑکا اور تُو تڑاخ کی بھار، وہ بہت حساس تھی اس شور سے ڈر جاتی۔ دسترخوان پر روٹی کم ہوجاتی تو ہاتھ پیچھے کرلیتی کہ اگر اماں سے اور مانگی تو وہ دوبارہ توا جلانے اور مزید روٹی مانگنے پر آگ بگولہ ہوجائے گی۔ وہ خالی پیٹ سو جاتی، پانی پی لیتی۔ اس طرح گھونٹ گھونٹ صبر کرلینے کی عادی ہوگئی بس شور نہ ہو، ہنگامہ نہ ہو بس خاموشی اور سکون۔

اس وقت اسے خود پر بے حد رشک آیا جب لیاقت حسین کا رشتہ اس کے لیے آگیا۔ فقط ایک لیاقت اور ایک اس کی اماں بس دو کمروں کا گھر جس میں آئل پینٹ کیا ہوا تھا کریم کلر...... کھڑے ہو کر روٹی پکانے کا چولھا اور برتن دھونے کی جگہ، اس کی امی نے نہ جانے کون سے زمانوں کا اکٹھا کیا ہوا اچھا برا سامان اس کے ہمراہ کردیا۔ وہ دبلی پتلی، اکیس برس کی صاف رنگت والی خوش شکل لڑکی تھی اور پھر اپنے خوابوں کی تعبیر کو پالینے کا نشہ اسے بے حد خوب صورت مستقبل دکھا رہا تھا۔ لیاقت حسین مسحور سا اسے دیکھتا چلا گیا۔

وہ بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا...... عزیز رشتے دار بس خوشی غمی کے حصے دار تھے۔ غمی...... جب ابا کا انتقال ہوا تو وہ بہت چھوٹا تھا اور خوشی بس اس کی اپنی شادی...... باقی نئے زمانے کے نئے پیسے والے رشتوں کو یتیم اور کلرکی کرنے والے بیوہ ماں کے بیٹے سے دلچسپی بھی کیا ہوسکتی تھی سو اسکول، کالج اور گھر کے بعد اب فقط گھر اور دفتر کے دائرے میں گھومنے والے لیاقت حسین کے لیے یہ نیا رخ بڑا ہی دلفریب تھا۔ گھر میں مسلسل رہنے کے لیے ایک فرد آگیا تھا۔ کھن کھن اور چھن کی آوازیں تھیں۔ عورت کے لیے شادی حقیقتاً دوسرے جنم کے مانند ہوتی ہے، ہر رشتے

بدل جاتی ہے۔ گھر، رشتے، لوگ، محلہ، جذبے، خیال، لباس، زیور، بستر اور تکیہ تک سب...... اور عذرا نے اس تبدیلی کو بہت آرام سے اپنے اندر اتار لیا تھا۔ مرد کے بستر پر محض ایک تکیے کا اضافہ ہوتا ہے اور عورت کے لیے مانو خوابوں کی ارمانوں کی نئی راہ گزر سی بن جاتی ہے۔ وہ ہر روز اس پر سر رکھے کتنے بہت سے خواب اور ارمان بُن ڈالتی ہے......اور عذرا تو یوں بھی بے حد متحمل مزاج، قناعت پسند لڑکی تھی۔ تھوڑی تھوڑی سی خوشیاں بھی اسے انبار لگتیں۔

یہ سب اچھا بھی تو کتنا لگتا تھا۔ اماں ہر روز اسے صبح شام بناؤ سنگار سے رہنے کی تلقین کرتیں۔ پور پور سجانے کو کہتیں اور وہ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کے مصداق احکام بجالاتی اور جب خدا کی طرف سے اس پر خصوصی نظرِ کرم ہوگئی تو سچ مچ وہ ہواؤں میں اُڑنے لگی۔ پیر پہلے ہی کب زمین سے لگ رہے تھے اب تو اپنا وجود اور بھی ہلکا پھلکا تیرتا لگتا۔ وہ اماں کی تمام باتیں بلا چُوں، چراں مانتی جاتی۔ دودھ میں زعفران گھول کر پیتی، کچا ناریل چبائے جاتی، خربوزہ کلو کلو کے حساب سے بنا ڈکار، ڈکار جاتی۔ اماں کی خوشیوں کا تو بیان ہی کیا۔ جوانی کی بیوگی سہنے اور اکلوتے بیٹے کی پرورش کے بعد اب گھر میں ایک اور اضافہ ہونے کو تھا، وہ بیٹھے بیٹھے گانے گاتیں، کہانیاں بُنتیں۔ سر دائیں بائیں ہلا کر اپنی گن گن آواز میں کچھ نہ سمجھ میں آنے والے قصے گنگناتی رہتیں وہ لجا لجا جاتی۔ ماں کے پیٹ میں بچہ کن کن حالوں سے گزرتا ہے اسے اتنی بار سبق دیتیں کہ اب کوئی بھی عمل اسے حیران نہ کرتا۔ ہونے والی ہر بات سے اماں اسے پہلے ہی آگاہ کر چکی تھیں۔ ڈاکٹر کے چکر بھی لگ گئے اور اسپتال میں نام بھی لکھوا دیا گیا۔ اس کی اپنی امی اس پر رشک کرتیں کہ خود انہوں نے سارے بچے چھوٹے سے کمرے میں چارپائی کی آڑ لے کر پیدا کر دیے تھے۔ دوسری جانب لیاقت حسین......!

وہ ماں، بیوی کو خوش اور مگن دیکھ کر بڑا مطمئن لگتا ورنہ ارد گرد کے قصے سن سن کر دل ہی دل میں ضرور تھا۔ ساس بہو کی روایتی چپقلش، ایک طرف زلفوں کا جال دوسری جانب دودھ کی دھاریں، یہاں راوی چین لکھتا تھا تو ٹھیک ہے ٹھیک ہی ہوگا۔ دراصل لیاقت وہ بندہ تھا جس کی ہر ضرورت اماں نے بنا کہے پوری کر دی۔ کپڑے کہنے سے پہلے گئے۔ نئے جوتے کب پہننے ہیں، گھر میں قلعی کر ہوگی۔ اب سردی کے کپڑے، اب شکنجبین کا ہے۔ اب یخنی چلے گی جو اماں نے کہا ہے۔ اماں کو اس کے لیے جس چیز کی ضرورت محسوس ہوئی اس کی خواہش اور کہنے سے پہلے وہ از خود آئیں سو جب اماں کو لگا کہ اب بیٹے کو بیوی ضرورت ہے تو بیوی حاضر۔

"اس کی اماں اسے بہت اچھے سے سمجھ ہیں۔" وہ خوب خوش ہو ہو کر کہتا پھرتا اور اکثر ماؤں کے اکلوتے بچے دنیا کو پھر ماں کی نگاہ ہی سے دیکھتے ہیں، ان کے لیے اپنی ماں سے بڑھ کر کے کہے سوچ سے آگے کچھ ہوتا ہی نہیں ہے اور دُھن میں مگن عذرا نے کبھی اس پہلو کو سوچا بھی نہیں۔ وہ اچھی لگتی تو تعریف کر دیتا۔ اماں کے کہنے چوڑیاں چڑھواتے بازار لے جاتا۔ تعریفی نگاہوں سے بھی دیکھ لیتا اور کبھی یہ بھی ہوتا۔

"اے لیاقت بچے ذرا دیکھ تو دلہن اس رنگ میں کیسی جچ رہی ہے؟" وہ پھر غور کرتا۔

"ہاں واقعی۔"

"اور یہ سبز رنگ بالکل ایسا جوڑا تمہارے ابا بار جب لاہور گئے تو لائے مگر انہیں پہنے دیکھنا نصیب کہاں ہوا بس تم آنے والے تھے پھر وہ چلے گئے۔ دلہن کے کپڑوں میں پہلا رنگ میں نے یہی لیا اور پازیب دیکھتے ہو، آدھ کلو وزن کی ہیں، ارے جس پیر میں جائیں سجا دیں۔" تب لیاقت دیکھتا۔

"ہاں واقعی۔" "عقل رکھتا، دھیان دیا ہوتا تو سارے گھر میں یہ جو قدم قدم چھن چھن ہوتی ہے متوجہ کر لیتی مگر وہی سراسر بے پروا بندہ، عذرا نے بھی خیال ہی نہیں کیا۔ اماں مطلع کرتی جاتیں یہاں تعریف کرنی ہے وہ رٹو طوطے کی طرح۔ "جی جی۔" "یہاں ذرا جھاڑ ہو جائے۔" "ہاں بالکل۔" اماں نے بتا دیا تھا۔

"دلہن دو جی سے ہے جو فرمائش کرے پوری کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" پھر ایک دن بھاگا بھاگا آیا۔

"وہ عذرا کچی مٹی مانگتی ہے؟" وہ بوکھلایا نظروں میں گھن اور حیرت بھرے اماں کا عندیہ لینے آ پہنچا۔

"ارے تو جا لا کر دے، منہ کیا دیکھ رہا ہے۔"

"اماں مٹی...... آخ......"

"ارے مٹی میں بھی بہت سے وٹامن ہوتے ہیں، بتا رہی ہوں نا، زچہ وہی مانگے جو بچہ چاہے۔ ارے جس چیز کی کمی ہوگی اسی کا دل کرے گا۔ اللہ کا نظام ہے۔"

"اچھا، اچھا۔" ڈاکٹر کے ہاں سے ٹیکے بھی لگ گئے۔ اماں نے اسے ساتھ لگا لگا کُرتے بھی سی لیے چھوٹے ٹوپے۔ بنا لاسٹک کے چُنن والے پاجامے، دلائیاں، تلائیاں، چادریں، کُرتوں پر تارکشی بھی کی۔

"بالشت بھر کے کُرتے پھر دو انچ لمبے پھر چار انچ لمبے ارے یہی اندازہ ہے ہمارا، تم بھی دھیان رکھو۔" کروشیا کے جوتے اور سارے کام مکمل ہوئے تو کُرتوں کی جگہ پھول دار فراکوں کی ضرورت پڑ گئی۔ عذرا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"پہلے بچے کی دفعہ دونوں طرح کے کپڑے بناتے ہیں۔ اب اتنی پیاری سی بیٹی اور یہ گجروں والا کُرتہ۔" نرس کُرتے میں اِدھر اُدھر ڈولتی بچی کو لہرا کر بولی۔

''ارے ہمارے ہاں تو پہلا لڑکا ہی ہوا ہے بھلے تم گنتی کروالو۔'' اماں کی آواز میں اچنبھا زیادہ تھا۔

''ارے اماں یہ کوئی رسم ورواج کا حساب نہیں ہے۔ اللہ کا حکم .... بچہ یا بچی بس تیسری جنس نہ ہو۔ اتنے بچے پیدا کروادیے ہیں میں نے اب تو گننے بیٹھوں بھی تو کچھ یاد نہیں مگر خدا سے دعا ہے بس تیسری جنس میرے ہاتھوں نہ ہو تم ناخوش ہو کیا؟'' ڈاکٹر نے ناگواری سے اماں کے حیران چہرے کو دیکھا۔

''نن نن، جی .... بس وہ ....'' اماں سے بات نہ بن سکی۔ عذرا وارڈ میں شفٹ ہوئی تو لیاقت حسین آ گیا بے حد اشتیاق سے بچی کو دیکھا۔ دودھ ملے زعفران اور کچے ناریل نے اثر دکھایا ہی تھا اس کے چہرے میں شباہت تلاش کرنا مشکل تھا تاہم گہری بھویں عذرا کی طرح تھیں۔ اس نے بے اختیار اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے تب ہی اماں کے کُتے چہرے پر نگاہ پڑی۔

''کک .... کیا ہوا اماں؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ بسوری بیٹھی تھیں۔

''خیریت تو ہے ناں؟'' وہ اُن تک چلا گیا۔

''ارے ہاں، خیریت ہی ہے۔''

''پھر اتنی اداس کیوں لگ رہی ہیں اور یہ اپنی پوتی دیکھی آپ نے۔ ارے ہاں اماں آپ نے تو کہا تھا پوتا ہوگا پھر یہ ....؟'' اسے جیسے یاد آیا اور خدا کا شکر ہوش وحواس قائم تھے ورنہ انداز یوں تھا کہ زمین پر گرا کر کہتا یہ کیا ہے پھر؟

''وہی تو۔'' اماں نے تیزی سے ماتھے پر ہتھیلی ماری۔ ''پتا نہیں کہاں سے حالانکہ میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا، یہ تو پہلا پاؤں سیدھا ہی اٹھاتی تھی اور ساری نشانیاں بھی بیٹے والی تھیں۔'' وہ بے حد تاسف سے کہہ رہی تھیں۔ لیاقت کی لیاقت بھی دھری رہ گئی۔ اس نے بچی کو آہستگی سے عذرا کے پہلو میں ڈال دیا۔ اب کے عذرا بھی چونکی۔

''اے، ہاں ناں، اماں نے اور سب نے بھی تو کہا تھا سارے چلن لڑکوں والے ہیں پھر یہ لڑکی ....؟''

☆☆☆

اور اگلی مرتبہ پہلے وہ اماں کے کہنے سننے پر کرتی رہی تھی اب اس کے اپنے دل میں بھی خواہش تھی۔ لیاقت بھی مکمل پُریقین تھا وہ بھی چھوٹے چھوٹے کُرتے لیے اسپتال پہنچ گئی اور واپس بھی نئی بیٹی لیے آ گئی۔ اس دن گھر پر گہرا سناٹا تھا۔ لیاقت، اماں کا چہرہ دیکھ دیکھ ویسے ہی تاثرات اپنا کرلیتا۔ تھوڑا غصہ، افسوس، ناامیدی، بے بسی اور پھر دوبارہ غصہ۔ وہ پُھولے منہ سے بڑبڑاتی ہوئی اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی تھیں اور خود عذرا .... وہ عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔ جن میں سب سے حاوی شرمندگی کی کیفیت تھی۔ اسے بے حد شرم آرہی تھی سب کو مایوسی سے دوچار کرنے پر اسے اپنا آپ قصوروار لگ رہا تھا۔ وہ ان سے نظریں ملانے سے قاصر تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھے وہ کروٹ کے بل لیٹی رہی۔ دادی اماں نے بچی کو بھی سنبھالا اور گھر بھی دیکھا۔ لیاقت دو سال کی اسما کو لیے اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ بارہ پندرہ روز بعد اس نے انجکشن لگوانے کے روز خود ہی بچی کو ارفع کہنا شروع کردیا اور پھر یہ اللہ کا نظام ہے کہ آنے والا بچہ اپنی جگہ بنا کر انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہوجاتا ہے۔ سو زندگی معمول پر آ گئی۔ اماں اب اکثر آہ بھر لیتیں، لیاقت وہی کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھے گول گول گھومتا رہتا .... پھر دن پر دن گزرے دونوں بچیوں نے اپنی موہنی صورتوں، دل رُبا باتوں، چنچل اداؤں اور معصومیت سے تینوں کو گرویدہ کرلیا۔ زندگی مگن ہوگئی مگر بس وہ ایک شاخِ نہالِ دل .... جب ذرا دھیان آتا وہ ہاتھ روک کر ساکت ہوجاتی اردگرد ایک بار پھر آگے .... وہ زبان دانتوں تلے داب لیتی۔

''کیا ہی اچھا ہو لیاقت ہم ان دو بیٹیوں پر گزارہ کرلیں۔ انہی کی اچھی تعلیم و تربیت، گھر شادی وغیرہ ....'' اس نے شوہر سے زیادہ خود کو سمجھانا چاہا۔

''نہیں، ایک بیٹا تو ضرور ہونا چاہیے۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ اس کی زبان ٹھٹھر گئی۔

''ہونا تو چاہیے مگر کیا گارنٹی ہے کہ بیٹا ضرور ہوگا اور بیٹے کے چکر میں بچوں کی لائن نہ لگادیں۔ میرے خیال میں ہمیں کچھ منصوبہ ....'' اس نے ہمت نہ ہاری وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔

''تم تو دو پر ہی گھبرا گئی ہو، میری اولاد ہے میں پالوں گا تمہیں تو گھر سے نکل کر کمانے کو نہیں کہہ رہا اور یہ بچیاں تمہیں کون پڑھاتا ہے؟ اماں نے سن لیا ناں تو .... اور یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے کہ میرے کتنے بچے ہوں گے، ہمارے خاندان کی نسل چلنی ہے، تم سے نہیں ہوتا یہ کام تو صاف بات بتاؤ۔'' وہ بالکل مجھ سے اکھڑ گیا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا دراصل ....'' وہ منمنائی۔

''خدا سے دعا کرو، نماز تم عید، رمضان پڑھتی ہو۔ بس اماں کے وظیفے ہی ہیں۔'' وہ طعنے دینے پر آ گیا کڑوا ہونے لگا خود کا حال یاد نہ کیا، سحری میں نیند کا بوجھ، مغرب میں کھائے کا بوجھ اور بیٹا تو بس صرف ایک اسی کی دعا سے ہونا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' وہ ذرا باقاعدہ ہوگئی۔ اب خدا سے مانگنے لگی۔

''ارے مرد کی مردانگی ہوتی ہے اولاد کی تعداد .... لوگوں کے دس، دس جوان بچوں پر بھی بچے آتے رہتے ہیں۔ یہ سب ٹی وی کے اشتہار ہیں جو تم ....'' وہ کئی دنوں تک بولتا رہا، نہ آواز اونچی کرتا تھا نہ لہجہ روکھا بس بڑے بے تاثر انداز میں جو کہنا ہوتا کہہ دیتا۔ عذرا ہونٹ دبائے سنتی رہتی اور تین سال بعد وہ ڈھائی ماہ کے ابارشن سے دوچار ہوگئی۔ شدید ترین ذہنی دباؤ ....

وہ بے حد خوف زدہ اور ناامید تھی۔

''ارے اسے اُٹھرا ہے مجھے خود خواب میں بشارت ہوئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ یہ اسی تخت پر بیٹھی ہوں پوتا لیے .... ماتھے پر کالا ٹیکا اور سیدھی ٹوپی پہنے آئے ہائے میرے تو بازوؤں میں دم نہیں اسے گود میں بھرنے کو۔'' وہ آتی جاتی سانس پر اسے کوسنے لگیں۔ عذرا کہہ نہ پائی کیسی بشارت۔ وہ تو ایک شائبہ سا تھا محض خیال اور خود اسے خیال آتا۔

''یا اللہ اگر لڑکا تھا تو کم از کم میں دیکھ تو لیتی ....'' اور کبھی سوچتی۔ ''اچھا ہوا پتا ہی نہ چلا۔ جو لڑکی ہوتی تو اماں تو مجھے کھا ہی جاتیں۔'' زندگی اب گول گھومتا پہیا بن گئی تھی۔ صبح سے دوپہر کرو اور دوپہر سے شام۔ ایک عجیب ناامیدی، مایوسی، سرد مہری نے سارے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ چوتھی بار وہ بے حد کمزور تھی اور بیٹی بھی بے حد لاغر پیدا ہوئی یہ کالی پتلی، پتلے پتلے ہاتھ پیر بس بڑی بڑی حیران آنکھیں۔

''ارے یہ تو لڑکیاں جننے کی مشین ساتھ لائی ہے۔ ہائے میرا نصیب۔'' اماں دوہتڑ سینے پر مارتیں۔ عذرا منہ چھپا کر رونے کے بجائے بہ بانگِ دہل روئی۔ تین بیٹیاں اتنی زیادہ نہیں تھیں جتنا کہ اس پر دباؤ تھا۔ ذہنی، جسمانی، جذباتی، نفسیاتی، اخلاقی اور معاشرتی .... وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اور پھر ایک نئے عزم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نمازوں میں اور باقاعدگی آ گئی۔ اس نے مولوی صاحب کے تین چار تعویذ بھی گلے، بازو اور کمر سے باندھ لیے۔ کسی نے بتایا کہ صبح تہجد کے وقت سورۂ بقرہ پڑھو پھر پانی پر پھونک مار کر دعا مانگو بنا بات کیے نماز پڑھو اور سوجاؤ اس نے عمل کیا۔ گیارہ جمعراتوں تک سورۂ یٰسین پڑھی۔ منت بھی مان لی۔ اماں بھی اس بار پہلی بار کی طرح سرگرم تھیں ان کے اپنے وظیفے اور تعویذ تھے۔ وہ خود بھی بے حد امید بلکہ پُریقین تھی۔ لیاقت

نے ، اس نے ، اماں نے یہاں تک کے نو سالہ اسما نے بھی خواب میں بھائی دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر روپ تھا مگر...... ہاں مگر اس بار اس نے خود بھی بچی کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ لیاقت دو دن کمرے میں نہ آیا۔ اماں نے باقاعدہ بَین ڈالے۔ اس نے بچی کا نام بشریٰ رکھ دیا کہ بتانے والے کہہ رہے تھے بشریٰ نام رکھو تو اگلی بار بیٹا ہوتا اور اگلی بار ڈاکٹر نے منع کر دیا تھا مگر اب وہ بے حس بنی ٹکر ٹکر سب کی شکلیں دیکھتی جیسے اس کا نہیں کسی اور کا تذکرہ ہو۔

"ارے مسٹر اس کے جسم میں کچھ نہیں ہے۔ اب نہ آئرن، نہ کیلشیم۔ جیتی جاگتی لاش سمجھو۔ اسے بے حد ضرورت ہے دودھ کی، پھلوں کی، گوشت، مرغی، مچھلی، انڈا اور کیا ضرورت ہے یہ چھٹا بچہ ہے اس کا۔" وہ خالی نگاہوں سے ڈاکٹر کا چہرہ دیکھتی رہی۔ کہہ نہ سکی دل بول رہا تھا۔ اس کی زندگی میں کمی ہے محبت کی، توجہ کی، اعتماد کی، پیار کی، گفتگو کی۔ اس کی زندگی میں اب کمی کے علاوہ ہے ہی کیا۔ گھوم گھام کر پھر سجدہ ریز ہوگئی۔ اس نے اس بار باقاعدہ اللہ سے لڑائی کر لی۔ "تونے... تونے"۔ یہ کہہ کر زبان گھسالی اور گھر میں آئی دائی نے اسے صرف تولیے میں لپٹی بچی پکڑائی اور دبے پاؤں نکل گئی کہ اب اس گھر سے کیا ملے گا۔ سو ہڈیاں کیوں گھسائے۔ وہ اب لیاقت حسین سے کیا بات کرتی جس بات سے ڈرتی تھی وہ ہو چکی تھی۔ ہر سائز کی بچیاں وہ خود انہیں دیکھ گھبرا جاتی۔ گھر اپنا تھا سرکاری نوکری اور گھر کے اندر سے نکالی جانے والی کریانے کی دکان کا کرایہ گزارہ ہو رہا تھا جیسے اس ملک کے اَن گنت سفید پوش...... ایک دوسرے کے کپڑے کام آجاتے اور کتابیں...... بہت تھوڑی خوراک کھاتیں اور وہ بھی خدا لگتی بات کہیں تو کبھی ان کے پیچھے نوالے لے کر بھاگی نہیں! اپنا خود ساختہ غم اتنا بڑا اور اہم لگتا کہ باقی اِدھر اُدھر نگاہ ہی کیا کرتی۔

دو بیٹیوں کے بعد کی جانے والی بلکہ ... جانے والی گفتگو جس میں اس کے حصے فقط ... آئی تھی۔ اب جا کر لیاقت حسین کے دماغ میں ... لگی تھی۔ جب عذرا کے گنے کچھ نہ بچا پہلا فیصلہ لیاقت حسین کا اور دوسرا بھی...... لیکن اب کی بار ... میں ملال کے گہرے رنگ تھے۔ وہ خدا سے ناراض ہوگئی۔ وہ اس کی سنتا ہی نہیں تھا۔ سالوں پہلے ... نے دعا مانگی کہ اللہ کرے اماں مر جائیں تو اس ... بیٹے کے کلمے سے جان چھوٹے گی مگر بعد میں ... اپنا تجزیہ کیا تو ادراک ہوا کہ اماں اور لیاقت کا ... بہانہ تھا۔ اماں کے یا کسی اور کے کہنے سننے کا کیا ... کے اپنے دل میں ایک ایسی طلب جاگ چکی تھی ... خود بیٹا پیدا کرنا چاہتی تھی۔

"بس ایک بار میرے کان یہ جملہ تو سن لیں ... بیٹا ہوا ہے، میں اس جملے کو تصور میں لاؤں تو تصور ... نہیں بندھتا۔ بس ایک بار پھر بھلے تو واپس لے لے ... کانوں کو یہ رس بھرا جملہ سنا تو دے۔" وہ اللہ سے ... پر اتر آئی اور اب مزید وہ اس امتحان سے نہیں گزرے ... گی لیاقت حسین کے فیصلے نے اس کے دل پر اچھا یا ... کوئی اثر نہیں کیا۔ وہ سرِ تسلیم خم کے مصداق بت ... رہی۔ وہ جنگل کا بادشاہ تھا اور ڈاکٹر نے کہا تھا۔

"اب اگر کسی کے زیادہ بچے ہوں تو سمجھو ... میاں بیوی میں قطعاً انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے۔ ... کم بچے ہوں، میاں بیوی اتنے ایک دوسرے ... قریب، دوست اور مزاج آشنا ہیں۔" اور عذرا ... یہ اس کے اور لیاقت کے بارے میں ہی کہا گیا ... وہ کب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ وہ کب ... کرتے تھے۔ وہ تو بس ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ جیسے ... کمرے کا پنکھا، الماری، بستر، چٹائی بے جان ... رنگ چلتی پھرتی کام آتی چیزیں مگر بے جان ... روح، بے جذبہ اور جب وہ اس باب کو ختم کر ... زندگی کے نئے امتحانوں کے بارے میں سوچنے ...

... تو بڑی ہوتی اسما، ارفع، بشریٰ، کنزیٰ اور رضیہ ... رضیہ بھی اماں کا دیا نام تھا حالانکہ اس نے ... کاغذوں میں طوبیٰ لکھوا رکھا تھا مگر وہ کہتیں ارے ... رضیہ کہوا ہے کہ ہم رج گئے بھر گئے ان آس والی ... کچھ مستقبل کے منصوبے تعلیم و تربیت کہ یہ ساڑھے تیرہ سال تو ایک ریس کی طرح گزر گئے تھے تو اب ایک بار پھر یہ ڈراما اب کی بار وہ دونوں حیران، بہت زیادہ پریشان اور ایک دوسرے سے نظریں چرائے ہوئے تھے اور عذرا کو پتا بھی کب چلا...... اماں نے امیدیں باندھنی چھوڑ دی تھیں وہ ایسی کاٹ دار نگاہوں سے اسے گھورتی جاتیں کہ جسم کے آر پار آرا چل جاتا، ایسے طنزیہ جملے بولتیں کہ عذرا تِق دق انہیں دیکھا کرتی۔ بوڑھی ہوگئی تھیں، ناامید اور پریشان، ان کی آہیں اور وسوسے عذرا کے لیے الگ امتحان تھے۔

ایک بار پھر وہ درد بھرا وقت، وہ تکلیف وہ امید و بیم وہ زندگی اور موت کی آپس میں فیصلہ کُن معرکہ آرائی اور اب زندگی یا موت درمیانی راہ کوئی نہیں اور عذرا کو لگتا وہ مر جائے گی اور اگر ایسا ہو تو کیا ہی اچھا ہو، وہ خود اذیتی کا شکار ہوگئی۔ محلے دارنی نے اسے آئرن ٹیبلٹ کے پتے لا دیے۔ اُس کی بہن ہیلتھ وزیٹر تھی، وہ بے دلی سے انہیں کھانے لگی۔ اماں کی بڑبڑاہٹیں.....

"اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں، لے آئے گی ... ایک منحوس، میرے بیٹے کو کھا گئیں یہ ... سارا وقت آٹا ڈھونے پر لگا رہے وہ۔ اس ... عمر کے لوگ لونڈے بنے گھومتے ہیں۔ اس کی بیٹی ... منحوس آگئی۔ آئے ہائے آج لڑکا ہوتا تو ساتھ کام ... اب لڑکیوں کا ڈھیر...... زندگی گزرے گی اب کنڈیاں دروازے چیک کرتے۔" وہ منہ پر دوپٹا رکھ کر رو پڑتیں اور عذرا کو آنے والے وقت کا اندازہ ہونے لگا وہ سر جھکا کر اسکول کا کام کرتی اُن بیٹیوں کو خوفزدہ ہو کر دیکھتی۔ خاموش، دھیمے بولتی، ہلکا ہنستی، مسکراتی اس کی نازک بیٹیاں اور کیا یہ امتحان بن جائیں گی اور درجنوں نئے سوال اسے ہولانے لگتے۔ اس کا ذہن ہمہ وقت الٹے سیدھے خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا لایعنی سوچیں، یکسوئی نام کو نہیں، کیڑے کلبلاتے۔ آئرن کے لیے سیب کہا گیا تو اماں اب نئے تجزیے بتاتیں۔

"ایک بیگن نمک ڈال کر تل کے لیموں نچوڑ کر کھا لے اسی روپے کلو سیب کیا کرے گی۔ ارے آلو کے چھلکے نمک لگا کر کھاؤ آئرن ہی آئرن" اور وہ ڈھیروں چھلکے دھو کر انہیں تلنے بیٹھ جاتی۔ بنا ذائقہ جانے چبانے لگتی۔ دودھ تھا نہ زعفران، خربوزہ نہ ناریل...... جنگل کی مادہ جانور کی طرح بس گھاس چبائے جاتی...... کاش وہ جنگل کی باسی ہی ہوتی تو کوئی مسئلہ ہوتا ہی نہ۔ سال بہ سال بچے دیتی آزاد پھرتی اور شیر اسے ایک روز چیر پھاڑ کھاتا کم از کم یہ جو روز زندگی رگیدتی ہے یہ تکلیف تو نہ سہنی پڑتی۔

وہ اپنے اردگرد دیکھتی تو خود کو بے حد کم تر پاتی۔ لوگوں کی ترحم آمیز نظریں، افسوس جتاتی آہیں وہ لوگوں کے مجمع میں پیچھے رہتی۔ اس کی شخصیت سے اعتماد، خوشی، طمانیت رخصت ہو چکی تھی۔ جو ہے اس کا شکر کرنے کا کبھی اسے گمان بھی نہ ہوا اور جو نہیں مل رہا تھا اس کمی کو اس نے چوبیس گھنٹے کے ہر جاگتے سوتے پل جیا تھا اور اب آج اس کی یہ حالت کہ اسے اب کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ لیاقت کی..... بے اعتنائی، اماں کی کڑواہٹ، بچیوں کی سہمی آس بھری نگاہیں...... وہ سب سے نگاہیں چرائے بس سانس لیتی اور صبح سے شام کرتی۔ بھوک حد سے بڑھی تو کچھ بھی کھا لیا ورنہ گھنٹوں چارپائی پر اوندھی پڑی نیم وا آنکھوں سے غیر مرئی نقطوں کو گھورتی، کسی مشین کی طرح کام کرتی۔ بچیاں بہت کارگزار اور حساس تھیں اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار...... وہ ماں کے نڈھال

چہرے اور بے تاثر آنکھوں سے نظریں چرائے اپنے دائرے میں گھومتی رہتی تھیں۔ باپ کا مشینی انداز، حال چال کبھی کبھار کی مسکراہٹ...... نہ غصہ نہ پیار کا والہانہ پن...... وہ کبھی باپ کے کندھوں کو گھوڑا بنائے نہیں چڑھیں۔ نہ کبھی ماں کی گود میں چھپ کر لاڈ جتائے بس ابا، بس اماں نہ دادی کی گرم خوشبودار آغوش کا ذائقہ چکھا ہاں گرم کڑوی آگ برساتی نگاہیں ہمہ وقت نگراں رہتی تھیں۔ وہ ان رویوں کو کچھ سمجھی ناسمجھی کے عالم میں جیتی جاتی تھیں۔

☆☆☆

اماں کے سگے تایازاد بھائی حیدرآباد میں انتقال کرگئے اور بیوہ بھاوج سگی پھوپی زاد بھی تھی سو اماں روتی پیٹتی جنازے پر پہنچیں۔ لیاقت حسین جنازے کے بعد واپس آگئے اور اماں دسویں کے بعد آنے کا کہہ گئیں، چودہ سالہ شادی شدہ زندگی میں ایسا طویل تنہا وقت پہلی بار آیا تھا مگر اب خواہش کسے تھی۔ وہ خود سے سب سے بے پروا اپنے دائرے میں گھومتی، کھاتی، پیتی، سوتی جاگتی اور بس وقت گزارتی، نہ دوا نہ دعا اللہ سے ناراضی تو بہت پرانی بات ہوگئی تھی۔ اب کی بار کسی اسپتال کا منہ بھی نہ دیکھا۔

''جب مرنے لگوں گی اور ٹائم پڑ جائے گا تو جہاں مرضی جی چاہے لیتے پھریں۔'' اس نے بڑی بےحسی سے سوچا تھا ''زندگی گزار دی ایک فضول سی طلب کے پیچھے!'' اس نے خود کو ڈپٹا۔ ''جیسے مسلسل امتحان کسی اور طرف دھیان دیتی تو کچھ نہ کچھ کر ہی جاتی...... اب سوائے تاسف کے کیا ملا پتا نہیں نتیجہ کیا ہوگا اور یہ آئے دن لوگوں کے بچے گرتے ہیں یہاں نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور بچہ ہاتھ میں۔'' وہ اذیت کی انتہا پر پہنچ کر ناشکری پر اتر آتی۔'' وکیل صاحب کی بہو کے چار بار حمل ضائع ہوگئے اِدھر ایسا بھی کچھ نہیں اور شاید اماں ٹھیک کہتی ہیں مجھے اٹھرا ہی ہوگا۔'' مایوسی کے اندھیرے میں انسان کو یوں بھی ہر چمکتی چیز روشنی کی کرن لگتی ہے۔ صحیح، غلط اور غلط...

''تو بات یہ ہوئی عذرا بی بی کہ سو ہاتھ... سرے پر گانٹھ اب کی بار بھی تم لڑکی ہی جنوگی۔'' ... نے خود کلامی کی اور اپنے پھیلے پیٹ پر ہاتھ رکھ... ''یہ معمول سے کچھ زیادہ بڑا اور بے ڈول لگتا ہے... کبھی بالکل خاموش اور ساکت ہوتا ہے اور کبھی... ہے کوئی لڑ رہا ہے۔'' اس کے محسوسات بے... ہو چکے تھے مگر پھر بھی کبھی کبھار وہ چونک پڑتی اور... بھی ہر بار یہ تجربہ نئے رنگ دکھاتا ہی ہے مگر اس... دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ اسے سب سے زیادہ لاج ام... ارفع سے آتی وہ کیا سوچتی ہوں گی اور...... اور... اور لیاقت حسین کاش وہ پوچھ سکتی کہ وہ کیا سوچتا... ''اور شاید لیاقت حسین تمہیں بھی میرے سوالوں... جواب دینے پڑ ہی جائیں۔''

وہ ایک بار پھر ہائے وائے کرتی بچیوں... پھیلائے کام سمیٹ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے... وہ ڈولتے ہاتھوں گھنٹوں میں مکمل کر رہی لیتی۔'' اب یہ کمر کا درد تو جیسے مستقل ہوگیا ہے۔ ہر... ایسی لہر آتی ہے کہ ابھی کہ تبھی۔'' وہ بڑبڑائی اور کپڑ... کھونٹی پر ڈال دیے۔

''اور پتا نہیں اماں کب آئیں گی۔ ان... موجودگی بھی مشکل ہوتی ہے اور غیر موجودگی... مشکل۔ کم از کم اس خوف ناک سناٹے سے تو بچ... ہے ناں۔'' وہ بہت مدھم آواز میں خود سے ہم کلام...

''سوچ رہی تھی اب ڈاکٹر کو دکھا ہی لوں... کبھار تو ایسا درد آتا ہے کہ میں سمجھتی ہوں کہ بس... پورا ہوگیا۔'' اس نے رات لیاقت حسین کو بتایا۔

''ہوں۔'' اس کی نظریں ہنوز اسکرین پر... تھیں۔ عذرا کی ہمت جواب دے گئی۔

''میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں۔''

''ہاں، ہاں سن رہا ہوں۔ اماں آجائیں تو... جانا۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''اماں کے آنے میں تو ابھی چار پانچ روز ہیں اگر آپ چلتے تو......''

''میں......؟'' لیاقت نے اس کی طرف دیکھ ہی لیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ میں پہلے کبھی گیا ہوں جو اب...... تم اماں کے ساتھ ہی جانا یا پھر پڑوسن کے ساتھ نکل جاؤ۔''

''بچہ پڑوسن کا نہیں ہے اور نہ اماں کا۔'' وہ چیخ گئی۔

''کیا مطلب اس فالتو بات کا؟ جو عورتیں پڑوسنوں اور ساسوں کے ساتھ ہوتی ہیں وہ کسی اور کے بچے کر جاتی ہیں، دماغ ٹھیک ہے؟'' عذرا کا دل بھیگ گیا نہ لہجہ کڑوا مگر بے رخی بھرے یہ جملے۔

''میں آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں لیاقت۔'' وہ سر جھٹک کر مدھم آواز میں بولی۔

''کیوں، اس بار کیا خاص بات ہے؟'' اب انداز میں درشتی تھی۔ عذرا کی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔

''خاص بات......'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''خاص بات تو کوئی نہیں مگر بس...... یونہی خواہ مخواہ۔'' وہ چپ کر گئی بچیوں کے کمرے سے ہلکی پھلکی آوازیں آرہی تھیں ان کے درمیان پھر خبریں حائل ہوگئیں۔

''آپ کو اندازہ ہے لیاقت کہ میں ہر بار کس تکلیف دہ مرحلے سے گزرتی ہوں۔'' وہ اچانک بول پڑی بلاارادہ۔ ''کیسی سانس روک دینے والی اذیت سہتی ہوں اور اُف بھی نہیں کرتی۔ نہ کوئی تسلی دیتا ہے نہ دلاسا آپ نے کبھی سوچا بھی ہے عورت کے لیے یہ کیسا مشکل ترین وقت ہوتا ہے۔''

''ساری دنیا کی عورتیں اسی عمل سے گزرتی ہیں۔ تم انوکھی تو نہیں...... اور یہ کون سا تمہارا پہلا بچہ ہے تم بالکل نوعمر لڑکیوں والا رویہ اپنا رہی ہو اور مجھے جتا کیا رہی ہو خدا کا نظام ہے جو اس کی مرضی...... تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ دنیا میں ہر روز ہر منٹ پر ایک بچہ آرہا ہے۔ تم کوئی واحد ہو...... ہونہہ... درد سہتی ہوں۔'' وہ سچ مچ حیران ہوا پھر دانت چبا چبا کر بولنے لگا۔

''یہ کوئی چارپائی بچھانے کا کام نہیں یا کوئی اور بھاری کام کہ تم سے نہیں ہو رہا تو میں کر دوں گا۔ ارے تمہارا کام ہے تم ہی نے کرنا ہے یہ نئی داستان کون سی کہہ رہی ہو۔'' وہ اچنبھے سے اور غصے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں تو بس یونہی۔'' وہ پھر کھو گئی۔

''ہونہہ۔'' وہ ریموٹ ٹیبل پر پھینک کر پاؤں میں چپل ڈالنے لگا۔ عذرا نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اسے نکلتے دیکھا اور بہ مشکل دراز ہوگئی۔

☆☆☆

اور لیاقت حسین کیا سوچتا تھا اس نے کبھی کسی پر ظاہر ہی نہیں کیا بلکہ شاید وہ خود بھی اپنے بارے میں، دل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اگر اس سے کوئی پوچھتا۔

''کیا تم اپنی پانچ بیٹیوں سے نفرت کرتے ہو؟'' تو وہ بہت زور زور سے نفی میں سر ہلاتا۔

''نہیں، وہ اپنی بیٹیوں سے قطعاً نفرت نہیں کرتا۔''

''کیا تم ان سے محبت کرتے ہو؟''

''آں...... ہاں......'' وہ یقیناً اٹک جاتا وہ اس کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا، اسے کیوں موردِالزام ٹھہرائیں اس نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی اور ضرورت ہی کیا تھی۔ بس وہ آگئیں۔ وہ نامرد نہیں تھا کبھی جب ضمیر کی عدالت میں پیشی ہوتی تو وہ یہ ضرور سوچ لیتا کہ شکر ہے خدا نے اسے صاحبِ اولاد تو کیا ورنہ زندگی کا کیا مقصد ہوتا اور اسے یہ حدیث بھی یاد تھی۔ دو بیٹیوں کی اچھی تربیت اور بیاہ کے بعد وہ جنت کا حقدار ہو چکا تھا مگر بس......!

وہ اپنے ہم عمر محلے داروں کو اپنے بیٹوں کے ساتھ دیکھ کر راستہ بدل لیتا ظاہر کرتا کہ اسے کوئی

فرق نہیں پڑتا۔" آئی ڈونٹ کیئر، مجھے تو پتا ہی نہیں، سب اچھا ہے، میں مطمئن ہوں......" کا عنوان ہمہ وقت چہرے کے مضمون پر لگا دیتا مگر اندر سے وہ کن انکھیوں سے دیکھا کرتا عید اور جمعے کی نمازوں میں ساتھ لگے بہت چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو اور پندرہ سولہ سال کے لڑکوں کو دیکھ کر اسے اپنی کم مائیگی کا شدید احساس ہوتا... اگر ان پانچوں میں سے کوئی ایک بھی بیٹا ہوتی تو میں بھی انگلی پکڑ کر اسے ساتھ لاتا۔" وہ آفس میں فرصت کے لمحات میں میرے بچوں والے ٹاپک میں کبھی حصہ نہیں لیتا تھا۔ اس نے کبھی کسی بچی کے کسی خوب صورت جملے کو کسی پیاری ادا کو ذکرِ محفل نہیں بنایا تھا۔ وہ کیسی ہیں، اسما بہت سمجھدار ہے، وہ ذمے دار ہے، حساس ہے۔ ارفع کی لکھائی بہت خوب صورت ہے۔ یوں جیسے ورق پر موتی بھسلے ہوں۔ بشریٰ نعتیں بہت خوب صورتی اور عقیدت سے پڑھتی ہے۔ کنزیٰ اور رضیہ اس کے بنا کہے اس کے سامنے جوتے رکھتی ہیں، اٹھاتی ہیں۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھا کرتی ہیں۔ رضیہ اکثر اس کے سینے پر آکر اوندھی لیٹ جاتی اور منٹوں میں سو جاتی ہے، وہ اس کے گال چومتی ہے۔ اس کی انگلیاں ہونٹوں میں بھر لیتی ہے۔ اسے ابو سے خوشبو آتی ہے۔ وہ بڑی ہو کر ابو بننا چاہتی ہے۔ موقع ملے تو اس کے بے حد وزنی پشاوری جوتے پیروں میں اُڑس کر دھم دھم چلنے کی کوشش کرتی ہے اور اس نے باقی چاروں بہنوں کی بہ نسبت اسے پہلے ابو پکارا اور...... اور اس نے کبھی ان سب اور ان جیسی بہت سی باتوں پر غور نہیں کیا۔ وہ سب بچے ہیں اور بچے تو ایسے کرتے ہی ہیں، اس میں ایسا کیا اور اس میں کیا مزہ؟ عید، شبِ برات وہ اگر کبھی بچیوں کو لے کر نکلتا۔ اسما، ارفع اور بشریٰ تو اسے تب بھی لگتا لوگ اسے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کی جانب اشارے کر رہے ہیں۔ اسے بے چارہ سمجھ رہے ہیں۔ اس نے انہیں ساتھ لے کر نکلنا چھوڑ دیا اور اب...... اب تو سوال ہی کیا۔ اس نے اماں کی طرح نہ تو چیخ، چیخ کر اپنے جذبات کا اور نہ ہی عذرا کی طرح اندر ہی اندر گھلا بس ایک ساکت نظر ایک بے حسی، ایک گول دائرے میں گھومتا وہ کیا سوچتا ہے وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

اماں کے آنے میں تین روز باقی تھے اور تین دن سے وہ شدید تکلیف میں مبتلا تھی۔ دو روز برداشت کرتی رہی کہ درد آتا اور چلا جاتا۔ کل ضد کر کے وہ کسی نہ کسی طرح لیاقت حسین کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس گئی، وہ گلی محلے میں کلینک کھولے تھی اور موبائل کان سے لگائے گھنٹا پیکج میں مگن تھی۔ اس نے جلدی جلدی اسے نبٹایا اور ساتھ جھنجلا کر جھاڑا بھی۔

"ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ تمہارا کون سا پہلا بچہ ہے بلاوجہ تم درد، درد چلا رہی ہو اور اب تک رجسٹریشن بھی نہیں کروائی۔ ہم ایسے کیس نہیں لیتے کہ سرپیر معلوم نہ ہو، کل آکر سارے ٹیسٹ کروا لو کچھ سمجھ بھی آئے ایک الٹرا ساؤنڈ بھی...... اور کوئی کروایا ہو تو وہ بھی لانا، اب جاؤ۔" عذرا بہ مشکل درد برداشت کرتے کھڑی ہوگئی۔ ڈاکٹر نے دوبارہ فون کان سے لگایا اور مشغول ہوگئی۔ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ لیاقت کی کڑی نگاہیں، وہ بے حد اکتایا اس کے آگے چل رہا تھا۔

"میرا تو کوئی الٹرا ساؤنڈ نہیں ہوا، کیا کروالوں پھر؟" اس نے بات گھمانے کو یونہی کہا۔

"جو مرضی کرواؤ۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے، میرا دماغ مت خراب کرو بلاوجہ جمعے کے دن کی چھٹی کروادی اب کوئی تم ننھی بچی تھوڑی ہو جسے کسی چیز کی خبر نہیں۔"

"میں بہت تکلیف میں ہوں، لیاقت سچ میں کیسے بتاؤں آپ کو...... آہ۔"

"تو کیا وہ ڈاکٹر غلط کہہ رہی ہے، تم تو فارغ بیٹھی ہو اب کیا میں سارا دن جھک ماروں گا، چھٹی ضائع کروادی ابھی اماں کو لینے بھی جانا تھا بلاوجہ کا شور ڈالا۔" وہ مسلسل غُرا رہا تھا۔ عذرا منمناتی پیچھے تھی پھر گھر آکر واقعی درد غائب ہوگیا۔ اس نے ہانڈی بھی چڑھالی اور گھر بھی سمیٹ کر نہالی اور لیاقت سارا دن اسے تیوری چڑھائے گھورتا رہا۔ رات بھر ہلکی ہلکی کراہیں تھیں۔ لیاقت کو کبھی لگا وہ مکر کر رہی ہے پھر وہ گہری نیند سو گئی۔ اذانوں کے وقت وہ پھر اٹھ کر بیٹھی ہائے وائے کر رہی تھی۔ لیاقت نے تکیے پر سر رکھا اور اوندھا سو گیا۔

"اب جب ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ بڑا وقت پڑا ہے تو برداشت کرو۔" چونکہ وہ خود بھی ساری رات بے آرام رہا تھا سو صبح ساڑھے سات بجے جب بچیاں خدا حافظ کہہ رہی تھیں تب آنکھ کھلی ورنہ ساڑھے چھ بجے اٹھنا روٹین تھا۔ عذرا کُنڈی چڑھا کر واپس پلٹی تو نڈھال نظر آرہی تھی۔

"چائے لاؤں آپ کے لیے؟" اس کے بال گیلے جوڑے کی شکل میں لپٹے تھے وہ صبح پھر نہائی تھی۔

"ہوں۔" وہ ہنکارا بھر کر غسل خانے کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں بھی اسے وقتاً فوقتاً ہائے، اُف کی صدائیں آتی رہیں پھر جب وہ چائے کی چسکیاں بھرتا خبریں سن رہا تھا اسے دفعتاً لگا کہ وہ سرتاپا پسینے میں نہا رہی ہے اور اس کے ماتھے پر اور اوپری ہونٹ پر پسینے کے قطرے ہیں اور رنگ...... رنگ زرد، سفید یا ہلدی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ہاں، بس وہ درد...... کل کی طرح پھر درد اٹھ رہا ہے۔" عذرا نے کسی مجرم کی طرح سر جھکالیا۔

"جاؤ کمرے میں لیٹ جاؤ۔ پنکھا چلالو، لائٹ ابھی ہے سو جاؤ تم کام بعد میں دیکھ لینا۔" یہ اس کی طرف سے انتہائی خیال اور نرمی کی۔ عذرا بدقت اٹھی اور اندر بڑھ گئی وہ پھر سے خبروں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ آج اس کی چھٹی تھی اور اتنے سکون سے ریموٹ سے بدل بدل کر چینل دیکھنے کا اپنا مزہ تھا۔ ٹی وی کی آواز مناسب تھی اور وہ بے حد دلچسپی سے متوجہ تھا پھر بھی کبھی کبھار کوئی آہ کان میں پڑ جاتی تو دھیان بٹ جاتا، پل بھر کو آواز کبھی بلند بھی ہوتی تھی اور جب وہ پوری دلچسپی سے بریکنگ نیوز دیکھ رہا تھا تب یکبارگی اسے لگا کہ عذرا چیخی ہو اس نے کان جھٹکے مگر آواز واضح اور بلند تھی اور اب متواتر چیخیں تھیں۔ اتنی دل خراش، اتنی کان میں سوراخ کرتی کہ وہ چھلانگ لگا کر کمرے میں داخل ہوا۔

"کک......کیا ہوا؟" وہ ڈپٹ کر بولا مگر پھر فوراً مدھم پڑ گیا، وہ چارپائی پر گول گیند بنی باقاعدہ چیخ رہی تھی۔

"ہائے اماں مرگئی۔ اماں ہائے، میں نہیں بچوں گی لیاقت حسین...... بلالو کسی کو بلالو، ارے صغراں اماں کو آواز دے لو...... جاؤ لیاقت حسین میں مرگئی ہائے، ہائے اللہ ارے مولا۔" وہ اس کی چارپائی تک بڑھا اسے کندھوں سے پکڑنا چاہا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں گئی لیاقت، ہائے میری بچیاں۔ ہٹ جاؤ، ماردیا ہائے اللہ۔" وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہی تھی۔ لیاقت حسین اب متوجہ ہوگیا تھا۔ "سچ مچ"۔

"تم جاؤ اماں صغراں کو بلاؤ، میں نے نہیں بچنا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے دھکیل دیا نہ جانے دل و دماغ کا کیا فیصلہ تھا مگر یا سچ مگر ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخیں وہ الٹے قدموں باہر نکلا۔

"میں بس ابھی آیا اماں صغراں کو لے کر، عذرا دومنٹ۔" وہ حواس باختہ بھاگا گلی کے کونے والے گھر میں پل بھر میں پہنچا، سرعت سے پیغام دیا ایمرجنسی چہرے سے عیاں تھی۔

"اماں نہار ہی ہیں، دومنٹ میں آتی ہیں۔" اُن کی بہو نے بتایا۔

"وہ......عذرا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ

چیخ رہی ہے، وہ مر رہی ہے۔"

"بھائی لیاقت بس اماں کپڑے بدل لیں، میں نے پیغام دیا ہے بس دو منٹ اللہ خیر کرے گا، آپ چلیں۔" اس نے ہکلا ہکلا کر مزید جلدی کی تاکید کی اور گھر کی طرف سرپٹ دوڑا اس کے لیے عذرا کی ایسی چیخیں بے حد حیران کُن اور...... اور اذیت کا باعث بن رہی تھیں۔ اس نے تو اسے کبھی بلند آواز میں بولتے نہیں سنا تھا ایسا کیا ہو گیا اس کے ساتھ کہ وہ...... ماتھے سے پسینہ پونچھتے اور تقریباً بھاگتے ہوئے بھی اسے حیرت تھی۔ جب اس نے اندر قدم رکھا تو ایک بار پھر خاموشی تھی وہ چونک گیا تو کیا عذرا پھر ڈھکوسلا کر رہی تھی اسے بارہا یہ خیال آیا تھا ان دس دنوں میں کہ عذرا اماں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اسے اُلو بنانے کی کوشش کر رہی ہے وگرنہ وہ پہلے تو کبھی ایسے نہیں تھی، اسے عود کر غصہ آیا وہ جارحانہ انداز لیے اندر آیا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ اسے لگا ساری کائنات بھی رک گئی تھی، اس نے دانت پر دانت سختی سے جما دیے۔ اس کی ہتھیلیاں تربتر ہو گئیں اور شاید آنکھیں خوف و دہشت اور حیرانی سے جیسے حلقوں سے باہر آ گئیں۔ سامنے کا منظر دنیا کا سب سے پرانا اور حقیقی منظر تھا۔ سب کے تصورات میں تھا مگر لیاقت حسین نے ایسا نظارہ پہلی بار دیکھا تھا عذرا کا لان کا دوپٹا سارا کا سارا اس کے منہ کے اندر تھا۔ اس کا چہرہ خطرناک حد تک بگڑ گیا تھا۔ گردن کی رگیں، آنکھوں کی تکلیف، چہرے کے سارے عضلات...... اسے لگا وہ غش کھا کر گر پڑے گا۔ اس نے دروازے کو اتنی سختی سے تھاما کہ ہاتھ کی رگیں پھول گئیں۔ دانت اتنی سختی سے بھینچے کہ جبڑے ایک دوسرے میں شاید دھنس گئے۔ یہ اس کی زندگی کا ناقابلِ فراموش، ناقابلِ بیان اور ناقابلِ یقین منظر تھا۔ اس نے آگے بڑھنا چاہا مگر اس کے قدم جیسے جکڑ گئے۔

"اور اگر میں آگے بڑھ بھی جاؤں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں عذرا کی کیسے مدد کر سکتا ہوں یہ تو ہمیشہ ہی مجھے احساس کرواتا چاہتی تھی، بتاتی تھی میں نے کبھی سنا ہی نہیں۔ میں نے سوچا ہی نہیں کہ دراصل ایک انسان سے دوسرا جیتا انسان حاصل کرنا ہوتا کیا ہے۔" اس کا سُن ہوتا ذہن سوچوں کے ساتھ ڈول رہا تھا۔ دفعتاً عذرا اپنی پوری جان سے ہل گئی اس کا سر چارپائی کے پائے سے جا لگا، ہسٹیریزم ٹوٹ گیا۔ وہ جست بھر کر وہاں تک گیا۔ اس کی آنکھیں بھر بھر آ رہی تھیں۔ پیٹ میں مروڑ سے اٹھ رہے تھے اور رُواں کھڑا تھا۔

"عذرا...... عذرا میں کیا کروں عذرا؟" وہ ہوش میں آ گیا۔ اس کی آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ اس نے عذرا کا چہرہ تھامنا چاہا، وہ جو پیچھے کی طرف گرنے کو تھی، دروازہ بج رہا تھا شاید اماں صغراں آ گئی تھیں وہ آگے کیسے بڑھتا۔ زور زور سے ہاتھ پاؤں مارتا گٹھڑی بنا بالشت بھر سے کچھ زیادہ وجود تڑپ تڑپ کر اپنی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ عذرا نے اپنی لان کی جُھرمُر قمیص کے دامن سے بچے کا منہ اور ناک صاف کیے بچہ یکدم گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ لیاقت حسین کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ وہ شاید بھیگ چکی تھیں اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"لیاقت بیٹا کھول...... دروازہ کھول۔"

"اماں صغراں......" وہ لمبے ڈگ بھرتا سرعت سے دوازے تک گیا۔ پیچھے عذرا ایک بار پھر چیخ رہی تھی۔

"وہ...... وہ بچہ......" لیاقت حسین کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

"ارے تو کاہے رو رہا ہے؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھیں اور "عذرا......" وہ اندر لپکیں۔

"ہائے میں مر گئی۔" ان کی دلدوز چیخ...... جہاں کا تہاں رہ گیا۔ "ارے چولھے پر پانی رکھ۔" پھر ان کی بوکھلائی آوازیں تھیں اور سرپٹ دوڑتا

لیاقت حسین۔

"ارے جُڑواں ہوئے ہیں، میں کس کس کو سنبھالوں۔" ان کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔

"ارے لیاقت چھوڑ سب کچھ...... ٹیکسی پکڑ کسی بڑے اسپتال چل ورنہ کچھ نہیں بچے گا۔ ارے اِدھر تو ذرا آؤ۔" وہ خود بھی ہڑبڑاہٹ کا شکار تھیں اور اسے بھی نچائے دے رہی تھیں۔

"ارے میری بچی آنکھیں کھول۔ یہ...... یہ بے ہوش ہو گئی۔" لیاقت کمرے میں آ گیا۔ عذرا بے دم گردن ڈھلکائے انتہائی بری حالت میں پڑی تھی۔ وہ گھبرا اٹھا اس نے آستین آنکھوں پر رگڑ لی نمی کی چادر جو تن رہی تھی۔ اس نے بہ مشکل خود کو سہارا دیا اور پلنگ پر پڑے بچوں کی طرف لپکا وہ جو آتے ہی چیخ، چیخ کر اپنے آنے کا اعلان کر رہا تھا اور دوسرا جو بے سُدھ، بے حس و حرکت مُردہ حالت میں پڑا تھا۔ اس نے چیختے کو اٹھا لیا اور چارپائی کی چادر کھینچ کر اسے چھپا کر بازو میں گھسیڑ لیا۔ اس نے پاس پڑے تولیے میں بے حس و حرکت وجود بھر لیا۔

"کیا یہ مر چکا ہے......؟" میرا بچہ اس نے پل بھر کو سانس لے کر تولیا کھولا۔ نہ رنگ، نہ روپ بس مُردہ وجود اس کی آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔ اسی گہری دھند میں اس نے دیکھا۔

"آہ...... میری بچی، میری بیٹی آنکھیں کھول۔" اس نے دوسرے بازو کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کے گولے تھے۔ ننھی سی بچی بے حس و حرکت، چادر والے بچے نے ہلچل مچا رکھی تھی۔ اس نے چادر آرام سے فرش پر رکھ دی۔ تیز تیز چلتی سانسوں نے چادر کھول دی۔ اماں صغراں کی تیز چیخ نکلی۔

"ارے اللہ لیاقت دیکھ دیکھ...... ارے یہ تو لڑکا ہے۔" اس نے ایک بار پھر آستین آنکھوں پر رگڑی۔ ذرا منظر واضح ہوا تو سچ تھا، وہ آ چکا تھا جس کے انتظار میں انہوں نے کسی چیز کو شکر کے انداز میں نہیں دیکھا

اک دعا

دعا میرے پاکستان کے لیے
خوشحالی کی آس لیے

سب خوش رہیں آباد رہیں
دل ان کے ہمیشہ شاد رہیں

کریں عزت سے گزر یہاں
ہر پل ہو قائم امن یہاں

ہوں پوری سب کی ضرورتیں
لوٹ آئیں سب کی مسکراہٹیں

حکمران ہو ایماندار یہاں
ہو قوم ذمے دار یہاں

جو قابل ہو اسے پزیرائی ملے
ہر بے گناہ کو رہائی ملے

دل بھرے ہوں محبت کے ساتھ
نہ ہو سلوک نفرت کے ساتھ

رہے قائم ہر دم پاکستان
ہے اختتام اس دعا کے ساتھ

مرسلہ: رفعت غفار، کوئٹہ

تھا۔ لیاقت بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگا۔
''اور...... یہ تیری گود میں کیا ہے؟'' اماں صغراں نے مسرت آمیز لہجے میں اشتیاق سے تیزی دکھائی۔
''بیٹی۔'' لیاقت حسین کی آواز کپکپا گئی آنکھیں پھر بہنے لگیں۔ ''بیٹی ...... خالہ...... میری بیٹی۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے بچی کو بھینچ لیا۔
''مم...... مگر یہ تو روئی ہی نہیں۔'' خالہ کو لگا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا۔

☆☆☆

اماں واپس آچکی تھیں۔ عذرا اسپتال کے پرائیویٹ روم میں ڈرپ لگی بے حد پُرسکون، احساسِ تفاخر سے لبریز نگاہیں لیے دادی کو پوتے کے لاڈ کرتا دیکھ رہی تھی۔ وہ دیکھنے میں پیلی ہلدی، ہڈیوں کا ڈھانچا دِکھتی تھی۔ اندر کو دھنسی آنکھیں مگر ان میں موجود وہ چمک کیا ہی کسی سونے چاندی میں ہوگی۔ اسپتال میں ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ اُمنڈے پڑ رہے تھے۔ مبارک باد دینے کو۔ نہ جانے کون کون مٹھائیوں کے ٹوکرے، مبارک بادیاں، اماں نے اپنے سونے کے بالے اتار کر اللہ کے نام دے دیے۔ پانچوں بچیاں سرشار، خوش، حیران ننھے سے بھائی کو تک رہی تھیں جس نے تیرہ سال پہلے کے بنے کپڑے پہنے تھے۔ اماں کے لیے، عذرا کے لیے جیسے دنیا نے نیا جنم لیا تھا۔ عذرا جیت گئی تھی۔ اس کے کانوں نے یہ رس بھرا جملہ سن لیا تھا کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک فخر سے ایک شعوری بے نیازی کا مظاہرہ کرتی اس بار سچ مچ ساس سے مکر کر کے ناز اٹھوا رہی تھی اور اماں خوش تھیں، وہ عذرا کے ہاتھ کہنے پر بازو تک لپکتی تھیں۔ سارے گلے، سارے شکوے، سب ملال ختم ہوگئے۔ اب دنیا میں اور مانگنے کو کیا رہ گیا تھا سب تو مل گیا ناں...... اور اس سب ہنگامے سے ذرا دور اگلے وارڈ میں شیشے کی دیوار سے ناک چپکائے دونوں ہتھیلیاں شیشے سے جوڑے ذرا ایڑیاں اٹھا کر لیاقت حسین ڈھائی گھنٹے سے اندر پڑے ایک انکیوبیٹر میں رکھی اپنی بچی کو بھیگی پلکوں سے تکتا جا رہا تھا۔ مشینوں کے سہارے سانس لیتا بے حد مختصر وجود، پیلے رنگ کی بے دم بچی لیاقت نظریں باندھے اسے دیکھتا تھا، بنا پلکیں جھپکے اس کے بے دم ننھے سے سینے کا زیر و بم وہ انگلیوں پر جیسے گن رہا تھا۔ ایک دو تین نہ جانے کیوں تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنکھیں بھیگ جاتی تھیں جنہیں وہ ہتھیلیوں سے بختی سے رگڑ لیتا اور وہ ان تین دنوں سے کیا سوچ رہا تھا اسے پتا ہی نہیں چلتا تھا بس خالی الذہن۔
''ارے مسٹر اب کب تک کھڑے رہیں گے۔ بچی ریکور کر رہی ہے، اچھی پروگریس ہے۔ آپ اپنی مسز کے پاس جائیں۔'' سسٹر نے اسے بہت اعتماد سے یقین دہانی کروائی تو وہ نہ چاہتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔ اندر کمرے میں عذرا چوزے کی یخنی پی رہی تھی۔ وہ بے حد کمزور تھی اور بے حد خون کی کمی تھی، اس کے اندر داخل ہونے پر اس نے کن انکھیوں سے عذرا کے چہرے کو دیکھا جہاں بے نیازی کی تھی، تفاخر تھا۔ وہ کندھے جھکائے صوفے پر ٹک گیا۔
''ارے لیاقت دیکھ تو کیسا شہزادہ بنایا ہے میں نے اسے۔'' اماں بچہ اس کے سامنے لے آئیں۔
''جی اماں۔'' اس نے بسم اللہ کہہ کر بچے کے ماتھے پر بوسہ دیا۔
''تو اتنا نڈھال کیوں ہے اور کہاں تھا اتنی دیر سے؟'' اماں کو دھیان آہی گیا۔
''ہاں انہیں کیا ہوا ہے؟ اداس چہرہ، پریشان آنکھیں، بجھے بجھے انداز۔'' عذرا بھی چونکی۔
''وہاں چھوٹی گڑیا کے پاس...... اسے ہی دیکھ رہا تھا۔'' وہ مدھم آواز میں بولا۔
''ارے اسے کیا ہونا ہے ڈاکٹر دیکھ تو رہے ہیں، تیرے کھڑے ہونے سے کیا ہوگا۔'' اماں نے

تھرماس میں سے چائے نکال کر اسے دی۔ لیاقت نے جواب نہیں دیا، کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔
''اور اگر اسے کچھ ہوگیا تو کیا وہ خود کو معاف کر سکے گا۔''
''میں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ میرا پوتا ٹھیک ٹھاک میری گود میں ہے۔ ارے! اگر جو یہ ہوتا اس شیشے کے ڈبے میں تو...... اللہ توبہ!'' اماں نے جھرجھری سی لی اور ہاتھوں سے ناک کان کو چھوا۔ لیاقت نے نگاہ اٹھا کر دیکھا عذرا کے چہرے کے تاثرات بھی یہی کہہ رہے تھے۔ اسے اماں پر غصہ آیا اور عذرا کا یہ رویّہ بالکل درست لگا۔ کیا واقعی اگر ایسا ہوتا تو صورتِ حال بالکل الگ ہی ہوتی۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا اور عذرا نے اسے ایک بار بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ میدان مار چکی تھی اب اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں وہ مرد آچکا تھا جس کے بعد اب اسے کوئی اور خواہش نہ تھی۔ لیاقت حسین کی سالوں پر محیط بے اعتنائی، بے حسی ان چالیس منٹوں میں ختم ہو چکی تھی۔ اسے خبر نہ تھی وہ خود سے شرمندہ تھا، معاشرے سے اور عذرا سے اور ہر عورت سے، ہر ماں سے شاید اب وہ کبھی نگاہ ملانے کے قابل نہیں تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا انسان کتنا حقیر ہے، وہ پانی کے ایک بلبلے سے وجود پاتا ہے اور پھر کس طرح زمین پر گر کے ایڑیاں رگڑتا ہے اور وہ کتنا بے بس ہوتا ہے اور جب وہ کھڑا ہونے کے قابل ہوتا ہے تو خود کو کیا شے سمجھنے لگتا ہے اور کتنا گھمنڈ کرتا ہے۔ اس نے رٹائے قصے کی طرح سن لیا تھا کہ عورت بچے اپنی جان سے جا کر نئی زندگی لاتی ہے اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ جان سے جانا ہوتا کیا ہے اور اگر کافر ہو تو اللہ اللہ پکارتا جنگلوں میں نکل جائے، بے دین ہو تو اللہ والا ہو جائے فقط اس ایک منظر کو دیکھ کر دلوں کو پھیر دینے والا ایک ایسا پل جب اسے لگا کہ اللہ اس کے سامنے کھڑا اسے کہہ رہا ہے۔ لیاقت بس ایک نظر اِدھر بھی...... اس کی چالیس سال کی زندگی اور وہ چالیس منٹ اور لیاقت حسین تجھے شکر کرنا چاہیے کہ خدا نے تجھے بے خبری سے بچا لیا۔
وہ ساری رات اسپتال کے لان میں ہاتھ پیچھے باندھے ٹہل ٹہل کر نہ جانے کیا، کیا سوچ رہا تھا۔
''اگر عذرا مجھ سے نگاہیں نہیں ملانا چاہتی تو وہ حق بجانب ہے۔ میں نے اسے دیا ہی کیا۔ کام تو یہ اسی کا تھا اور اسی کو کرنا تھا مگر وہ میرا اخلاقی سہارا، وہ دل دہی کے جملے، وہ بس ایک بار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر جو اسے اپنے ساتھ کی یقین دہانی کروا دیتا تو زندگی کتنی آسان ہو جاتی اور میں کیسے نگاہیں ملاؤں اپنی بیٹیوں سے اور شاید میں اب کبھی کسی عورت سے نگاہ نہیں ملا سکتا اور عذرا اگر میں ایک مندر بناتا تو عورت کو وہاں بٹھا کر میں شاید سر جھکا کر بقیہ زندگی گزار لیتا۔ خدا کے تمام فیصلے درست ہوتے ہیں۔ اس نے مرد بنایا، اسے اولیت دی پھر اسی کی پسلی سے عورت پیدا کی۔ مرد گھمنڈی ہوگیا اسے ہر شے حقیر نظر آنے لگی پھر شاید خدا نے ترازو کے پلڑے میں دونوں کو ڈالا ہوگا تو مرد کا وزن زیادہ تھا اور اللہ بڑا ہی انصاف پسند ہے۔ توازن اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتا ہے۔ اس نے دوسرے ہی پل کم وزن عورت کی گود میں بچہ دیا، لمحے کا کھیل تھا ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہو گئے پھر آگے جا کر اس نے ماں کے پیروں تلے جنت رکھ دی۔ پُل صراط بعد میں پار کرنا پہلے اس منزل سے تو نکلو اور...... اور میری ماں نے بھی مجھے ایسے ہی جنا تھا۔ اسی تکلیف دہ عمل کے ساتھ اور پھر بیوہ بن کر پالا پوسا میں نے تو بس سن لیا تھا کہ میری ماں نے بڑی مشقتوں سے مجھے پالا اور سننے اور سمجھنے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ حق الیقین، عین الیقین اور میں سارے مراحل سے گزر گیا۔ نہ جانے کیا بات ہے آج چار دن ہو گئے ہیں بس وہ منظر

آنکھوں کے آگے سے ہٹتا ہی نہیں۔'' اس نے چار راتوں کی بے خواب آنکھوں کو رگڑا۔

اگلے دن عقیقے کا ارادہ تھا مگر وہ چھوٹی کے... انکیوبیٹر سے باہر آنے سے پہلے کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا اور ڈاکٹر کہہ رہی تھی اسے آج ڈسچارج مل جائے گا۔ وہ گھر آ کر عقیقے کے بکرے رسی سے باندھتے ہوئے ایک بار پھر حیران تھا۔ عورت اپنے ہی معاملے میں اتنی بے پروا اور سنگدل کیوں بن جاتی ہے۔ اماں نے اسے لڑکے کے حساب سے دو بکرے لانے کو کہا تھا اور بچی کا عقیقہ......؟ عورت خود ہی خود پر اتنا ظلم کیوں اور کیسے کر لیتی ہے؟

☆☆☆

بڑا ہی خوشیوں بھرا وقت تھا گلی میں خوب بڑا شامیانہ لگا تھا۔ دیگیں تھیں مبارک بادیں، ہنسی خوشی...... اماں اپنی خوشیوں میں اتنی مست تھیں کہ ارد گرد سے بیگانہ عذرا ہی کو خیال آیا۔ لیاقت کی ساری توجہ اس چھوٹی بچی کی طرف تھی۔ وہ اصرار کر رہا تھا کہ وہ اسے بھی دودھ دے جبکہ عذرا کا ایسا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا وہ دبا کر دودھ اور یخنی پی رہی تھی کہ دودھ اترے مگر دماغ میں واضح خیال تھا بیٹے کے لیے..... عورت خود ہی عورت کی دشمن کیسے بن گئی..... شاید معاشرہ، لوگ، رویے، ترجیحات اور اور......! پھر اسے خود ہی خیال آیا۔ ''بیٹا مل گیا ہے اسی لیے......'' اس نے ڈھیروں ڈھیر فروٹ، گوشت اور دودھ کے ڈبوں کو دیکھا اس کی آنکھوں میں استہزا کا رنگ آ گیا۔ لیاقت حسین نے دیکھ لیا وہ سر جھٹک کر بچی کے لیے لائے گئے چھوٹے چھوٹے فراک شاپر سے نکال رہا تھا اور یہ خوشی اسے زندگی میں پہلی بار ملی تھی۔ ورنہ اس گھر کی پہلی پانچ پیدا ہونے والی بچیوں نے ہر بار دو دو ماہ تک ناں اور دادی کی طرف سے سلے گئے کرتے ہی پہنے تھے۔ یہ پہلی بچی تھی جس کے لیے بے بی سوٹ خریدے گئے۔ وہ عذرا کا خیال رکھ رہا تھا۔ عذرا بدگمان تو... خوش تھی اور وہ اس کی بدگمانی ضرور دور کر... لیاقت حسین نے فیصلہ کیا۔ وہ اسے بتائے گا کہ... نے کیا دیکھا، کیا محسوس کیا۔ وہ اس کے لیے... سارے محسوسات بتائے گا۔ وہ اسے اس بدگمانی... جلنے نہیں دے گا۔

بے خبری سے جب ہوشمندی کی دنیا میں... رکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کتنا بڑا ناشکرا انسان تھا۔ شاید کبھی غلطیوں کا اعتراف نہ کرتا مگر یہ بھی شاید... حکم تھا کہ اس کے دل پر لگا قفل اس نے کھول... تھا۔ وہ عذرا کو بتائے گا کہ وہ کتنی بیکار زندگی جی... تھا، جانور کی طرح، صبح سے شام بہت عرصہ ایک... دوسرے سے دور بدگمان رہ کر گزار لیا۔ اب وہ ایک... دوسرے سے بات کریں گے۔ دل کی بات، دکھوں... تکلیفوں کی بات۔ وہ اسے باقی ماندہ زندگی بدگمانی... کے بھنور میں پھنس کر ضائع کرنے نہیں دے گا۔ اسے ضرور بتائے گا کہ اس ایک پل نے اس کی زندگی... بدل دی۔ حرف حرف، زیر زبر پیش کے ساتھ۔

وہ کھلے آنگن میں بچی کو کمبل میں لپیٹے ٹہل... کر اسے سلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عذرا اندر... کے ساتھ محو خواب تھی اس نے چاند کی نکھری روشنی... میں کمبل کو کھولا وہ پوری آنکھیں کھولے یک ٹک... کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ لیاقت حسین کی پلکیں بھیگ... گئیں۔ اس نے اسے بانہوں میں بھینچ لیا۔

کہتے ہیں مرد کی زندگی میں فلاں عورت... آنے سے بدلاؤ آ گیا۔ وہ سرتاپا بدل گیا۔ چالیس... سال بعد لیاقت حسین کی زندگی میں وہ لڑکی آئی... جس نے اسے اندر سے، باہر سے، روح سے، ... سے، نظر سے، دماغ سے بدل کر رکھ دیا تھا۔... ناشکروں کی قطار سے نکل کر شکر گزاروں کی قطار... آ کھڑا ہوا تھا۔

ماں کی دعا

اُمِ طیفور

مجھے تقریباً دس منٹ ہو چکے تھے نائرہ کا انتظار کرتے ہوئے...... اس نے کہا تھا کہ وہ سیدھی اپنے دفتر سے یہیں اسپتال آ جائے گی اور اب تو اس کا آفس ٹائم ختم ہوئے پون گھنٹا ہو چکا تھا اور جہاں تک میرا اندازہ تھا اسے تقریباً پندرہ منٹ پہلے تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا کیونکہ اسپتال اس کے دفتر سے محض بیس منٹ کی ڈرائیو کے فاصلے پر تھا خیر...... انتظار تو کرنا ہی تھا۔ میں پچھلے کئی دنوں سے اپنی پھوپی ساس



کی عیادت کے لیے وقت نکالنے کی کوشش کر رہی تھی جنہیں شدید نوعیت کا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ان کی حالت اب گو کہ خطرے سے باہر تھی مگر فی الحال ڈاکٹرز نے انہیں انڈر آبزرویشن رکھا ہوا تھا۔ یہ شہر کا مہنگا ترین پرائیویٹ اسپتال تھا جہاں وہ زیرِ علاج تھیں۔ نائرہ نہ صرف میری فرسٹ کزن بلکہ میری بیسٹ فرینڈ بھی تھی اور میری پھوپی ساس اس کی رشتے میں خالہ ساس لگتی تھیں، یوں ہم دونوں کا سسرال بھی ایک طرح سے مشترکہ تھا اور سسرال کے بیشتر سلسلے ہم دونوں مشترکہ ہی بھگتاتی تھیں۔

نائرہ دو بچوں کی ماں تھی اور ایک ورکنگ وومن بھی...... ایسا ہی کچھ سلسلہ میرا بھی تھا۔ میں بھی ایک انگلش میڈیم اسکول میں ایس ایم کے فرائض انجام دے رہی تھی...... تین بچوں کا ساتھ اور گھر داری کی سو ذمے داریاں...... ایسے میں خاندانی معاملات نمٹانا کبھی کبھار بہت مشکل لگتا ہے۔ آج بہت سے ضروری کاموں سے کنی کترا کر میں نے اور نائرہ نے ”مشترکہ“ طور پر فیصلہ کیا تھا کہ میں اسکول سے اور نائرہ اپنے دفتر سے سیدھی اسپتال چلی آئے اور ہم ان کی عیادت کریں پر حیرت کی بات تھی کہ نائرہ کا ابھی تک کچھ پتا نہیں تھا۔ حالانکہ ورکنگ وومن ہونے کے ناتے ہم دونوں وقت کی پابند اور شیڈول کے مطابق عمل کرنے والی عورتیں تھیں۔

ہو سکتا ہے بہت سے لوگ سوچتے ہوں کہ کام کرنے والی خواتین بدسلیقہ اور بدنظمی کا شکار ہوتی ہیں مگر ہم ان دس فیصد عورتوں میں سے ہیں جو گھر اور باہر یکساں بہتر طور پر مینج کرنا جانتی ہیں...... نہ ہمارے انداز و اطوار بدسلیقہ ہیں اور نہ ہمارے گھروں میں بدنظمی ہے۔ حالانکہ ہم دونوں کو بچوں کے ساتھ ساتھ بیمار ساس سسر سے بھی واسطہ ہے۔ جن کی ہر قسم کی ذمے داری اور فرائض ہم بخوبی نبھاتی آ رہی ہیں۔

میں انہی سوچوں میں گم تھی اور اب میرا انتظار کوفت میں بدلتا جا رہا تھا کہ یک دم مجھے آس پا گڑبڑ کے آثار محسوس ہوئے۔ پہلے پہل تو سمجھ آیا کہ یہ ہڑبونگ کا ہے کی مچی ہے مگر پھر ادھر اُدھر بھاگتی دوڑتی نرسز میں سے ایک کو پکڑ کر میں جلدی سے پوچھا تھا کہ اسپتال میں یک دم افرا کا ہے کو نظر آنے لگی ہے......؟ تبھی اس نے تیز قدم اٹھاتے مجھے بے حد عجلت میں جواب دیا تھا۔

”ایمرجنسی ہے۔ ایک اسکول بس کا ایکسیڈ ہوا ہے۔ بہت سے زخمی بچے لائے جا رہے ہیں بے شمار ڈیڈ باڈیز بھی۔ کم و بیش 100 بچے سوار تھے میں۔ اوور لوڈنگ کی وجہ سے بس موڑ کاٹتے ہو الٹ گئی۔ باقی اس سے زیادہ ابھی کچھ معلوم نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے کاریڈور میں سے گز چلی گئی۔ میں سخت پریشان ہو گئی تھی۔ نائرہ نہ جا کہاں رہ گئی تھی۔ نرسز اور وارڈ بوائز کے حواس با چہرے اور ڈاکٹرز کی اسٹیتھ اسکوپ تھامے پریشانی عالم میں جونیئرز اور دیگر اسٹاف کو جاری ہدایات......

ماحول اس قدر سراسیمہ ہو گیا تھا کہ میرا جی کہ دفع کروں نائرہ کو اور گھر کی راہ لوں...... ا چند لمحوں میں، میں اپنی سوچ پر عمل کرنے ہی والی کہ اسپتال کے داخلی دروازے سے وارڈ بوائز قطار در قطار اسٹریچرز تھامے تقریباً بھاگتے ہوئے ا داخل ہو رہے تھے۔ میرے کان کہیں سے آتی آو کی آوازیں بھی سن رہے تھے۔ یقیناً زخمی اور مر والے کچھ بچوں کے لواحقین پہنچ چکے تھے اور یہ ا کے بین کرنے کی آوازیں تھیں...... میرے دل وحشت گھر کرنے لگی تھی۔ بے ارادہ ہی میں چند اٹھاتی داخلی دروازے کے قریب چلی آئی۔

”یا اللہ......“ پھول سے بچے میری نظر کے سامنے تھے۔ میرا دل کانپ کے رہ گیا تھا۔ روتے، سسکتے اور تڑپتے بچے! بے جان، مردہ، روح بچے۔

کس قدر خوفناک حادثہ تھا۔ کتنی ماؤں کی گودیں اجڑ چکی تھیں اور کتنی ماؤں کی فریادیں اپنے بچوں کی زندگیاں مانگتی، فضا میں ٹھہری سی گئی تھیں۔

میرے لیے یہ ساری صورتِ حال بہت ہولناک اور غیر متوقع تھی۔ میرے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔ میں نزدیکی بینچ پر بیٹھنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی جب میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ دھرا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو نائرہ کا افسردہ اور تھکا ہوا چہرہ میرے سامنے تھا۔

”ٹریفک میں پھنس گئی تھی۔“ مجھے تو نائرہ کی آواز بھی پھنسی پھنسی سی لگی۔ ”اس حادثے کی وجہ سے روڈ بلاک تھا۔ بڑی مشکل سے گاڑی وہیں سائڈ پر لگا کر خود پیدل ہی اسپتال پہنچی ہوں اور باہر جو نظارہ دیکھتی اندر آئی ہوں، یقین جانو قدموں پر کھڑے رہنا دشوار ہے۔“ مجھے لگا نائرہ ابھی رو دے گی، میں نے ڈھارس کی خاطر اسے خود سے لگا لیا اور وہ سچ میں رو دی۔

”بہت سے بچے مرے ہیں آمنہ!“ وہ پھر مجھ سے مخاطب تھی۔ ”بہت بڑا حادثہ ہوا ہے۔ بچوں کی واپسی ہو رہی تھی کسی ٹرپ سے، اوور لوڈنگ یا اوور اسپیڈ کی وجہ سے شاید حادثہ ہوا ہے۔ جو بھی ہے بہت سے خاندانوں کا بہت بھاری نقصان ہو گیا۔ کیسے برداشت کریں گی وہ مائیں جو ابھی یہاں پہنچی بھی نہیں، جو گھروں سے اس امید پر نکلی ہوں گی کہ شاید ان کا بچہ زخمی ہو جانے والوں میں سے ہو شاید......“

نائرہ کی بات کسی ماں کے بین نے کاٹی تھی۔ ہم سے کچھ چند گز کے فاصلے پر کھڑی ایک ماں اپنے بچے کے مرنے کا سن کر سینہ پیٹ رہی تھی۔ وہ قابو میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ اسے زور سے تھامنے اور جکڑنے والے مرد جو یقیناً اس کے رشتے دار تھے...... پوری کوشش میں تھے کہ کسی طرح اسے یہاں سے لے جایا جائے مگر وہ بے حال ہو کر فرش پر بیٹھ چکی تھی اور اس کی دلدوز چیخیں پورے کاریڈور میں گونج رہی تھیں۔ بے اختیار میری اور نائرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنی سسکیوں کی آوازیں ہمیں صاف سنائی دینے لگیں۔

ہم دونوں ہمت کر کے ریسپشن کے قریب جا کھڑے ہوئے کہ ذرا جو داخلی دروازے پر بھیڑ چھٹے تو ہم کیسے بھی باہر نکلنے کی کریں۔

چند لمحے غائب دماغی سے دروازے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد میں نے اپنا رخ بائیں جانب کر لیا۔ وہاں دیوار کے ساتھ ایک اسٹریچر لگا تھا جسے رش کی وجہ سے ابھی اندر نہیں لے جایا جا سکا تھا۔ اس وجود کے چہرے کو کپڑے سے ڈھک دیا گیا تھا مگر میں یہ اندازہ نہیں کر پائی تھی کہ آیا وہ لاش ہے یا پھر کوئی زخمی۔

اگر لاش تھی تو جس چادر سے اسے ڈھکا گیا تھا وہ اتنی اجلی کیسے تھی......؟ مردے کے زخموں سے رستا خون اس میں جذب ہو جانا چاہیے تھا...... اور اگر کوئی زخمی تھا تب بھی اس وجود میں مخصوص تڑپ یا کسمساہٹ مفقود تھی اور پھر وہی اجلی چادر......

حیرت تھی کہ آخر زخموں سے رستا خون چادر پر نشان کیوں نہیں چھوڑ رہا تھا اور زخمی تھا تو فوری طبی امداد کے لیے اسے اندر لے جایا جانا بے حد ضروری تھا۔

میں ایک عجیب سے تجسس اور بے کلی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس انجان، بے کس وجود کی طرف بڑھ گئی۔ اسٹریچر کے پاس پہنچ کر میں نے پلٹ کر نائرہ کو دیکھا جو موبائل فون پر یقیناً ہم دونوں کے گھروں میں دیر ہو جانے کی اطلاع دے رہی تھی۔ چند سیکنڈز سوچتی نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد میں نے رخ موڑ لیا اور احتیاط سے ہاتھ بڑھا کر اس اسٹریچر پر لیٹے وجود کے چہرے کی طرف سے چادر پکڑ کر ہٹا دی۔

”اف...... میرے خدا!“ کس کا لختِ جگر تھا یہ...... اتنا معصوم اور اتنا من موہنا سا بچہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ بچے کی عمر دس سال کے لگ بھگ

تھی۔ گورا رنگ اور روشن پیشانی، چھوٹا سا دہانہ اور چھوٹی سی کھڑی ناک، گردن پر چاند گرہن کا چھوٹا سا سیاہ نشان تھا۔ خوب صورت ہیئر کٹ والے ہلکے براؤن بال بکھر کر ماتھے پر پھیلے تھے۔ ایک کے بعد ایک آنسو بے اختیار میری آنکھوں سے بہتا چلا گیا۔ کاش! یہ بچہ زندہ ہوتا...... میرے دل میں شدت سے خواہش جاگی۔ اس کے یخ ہوئے گال پر دھرے میرے ہاتھ نے اس کے جسم کے بے جان ہونے کی تصدیق کر دی تھی اور مجھے اپنی ٹانگیں بے جان ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کیسا ہنستا کھیلتا بچہ میری نظروں کے سامنے مردہ پڑا تھا۔ اس کی ماں کیسے جھیلے گی؟ وہ تو کچھ دیر میں اپنے جگر کے ٹکڑے کی سلامتی کی دعائیں مانگتی پہنچنے والی ہوگی۔

''یا اللہ! اس کی ماں کو صبر دینا۔'' میرا رُواں رُواں دعا گو تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے سے ہٹتی نہیں تھیں۔ اس کی بائیں آنکھ ہلکی سی کھلی تھی اور نیم وا خوب صورت ہونٹوں کے کنارے سفید پڑ چکے تھے۔ میں نے برستی آنکھوں سے اس کے جسم کو تکا۔ حیرت سی حیرت تھی! اس کا جسم کسی بھی قسم کی چوٹ سے پاک تھا۔ کوئی زخم یا کوئی خراش تک نہیں دکھ رہی تھی۔ اسی لیے خون بھی نہیں رس رہا تھا، تبھی اس کے جسم پر پڑی چادر بے داغ تھی۔

''تو پھر یہ معصوم مرا کیسے؟'' یقیناً کوئی اندرونی چوٹ تھی جو اس کی جان لے گئی تھی...... میں انہی سوالوں، جوابوں میں آنسو بہاتی اس کے سرہانے کھڑی تھی جب نائرہ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ میں نے منہ پھیر کر اسے دیکھا تو وہ بھی یک ٹک اس بچے کو تکتی سسکیاں لے رہی تھی۔ میرے کانوں میں اس کی آواز پڑی۔

''آمنہ! اس بچے کے ہونٹوں کو غور سے دیکھو...... یوں جیسے ''ماما'' پکارتے، پکارتے ساکت ہو گئے ہوں...... ہے ناں......؟'' اس کی سوالیہ نظریں میری جانب اٹھی تھیں جبکہ میں اس کے بالکل پیچھے کھڑی ان دو عورتوں کو دیکھ رہی تھی جو مکمل بکھری ہوئی حالت میں بچے کو دیکھے جا رہی تھیں۔ بچے کو دیکھتے ہی جان گئی تھی کہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک جس کی عمر بہ مشکل 30، 32 سال کی ہوگی، اس بچے کی ماں تھی۔ بچے نے ہو بہو ماں کی شکل چرائی تھی جبکہ دوسری خاتون لگ بھگ پچپاس سال کی ہوں گی، ہو سکتا ہے نانی یا دادی ہوں۔

میں نے نائرہ کا ہاتھ تھاما اور دو قدم پیچھے ہٹ کر ان دونوں خواتین کے لیے جگہ بنائی۔ بچے کی ماں لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے قریب ہوئی اور ہولے سے اس کی آنکھوں پر اپنا سرد پڑتا ہاتھ دھر دیا۔ جو نہ جانے سردی کی شدت سے نیلا پڑا تھا یا اپنے دل کے ٹکڑے کو مردہ دیکھ کر اچانک اس کی رگوں میں دوڑتا خون جم گیا تھا۔ ایک ساتھ کئی آنسو اس کی خوب صورت آنکھوں سے گرے اور بچے کے بالوں میں جذب ہو گئے۔ اس نے دھیرے سے جھک کر بچے کا ماتھا چوما، پھر آنکھیں، پھر ناک، دونوں گال...... اور بس یہاں اس کا صبر جواب دے گیا۔ وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ چہرہ اتنا سرخ ہوا کہ لگتا تھا جلد پھٹ جائے گی لیکن آفرین تھی اس ماں پر کہ اس نے اپنی چیخوں کا گلا، منہ پر چادر کا پلو رکھ کر گھونٹ دیا تھا...... اور ایسا کرنے سے اس کا جسم جھٹکے کھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ آئی دوسری خاتون جو خود بری طرح رو رہی تھیں آگے بڑھیں اور اسے تھام کر سینے سے لگا لیا۔ میں اور نائرہ ان کے کچھ نہ لگتے ہوئے بھی ان کے دکھ کا حصہ بن گئے تھے۔ ہم دونوں ہی آنسو بہانے میں ان کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔

اس عورت نے اپنا چہرہ چادر سے صاف کیا اور پھر بچے کا ہاتھ نرمی سے تھام کر احتیاط سے اس کا جسم ٹٹولنے لگی۔ اس کے بازو، گردن، سینہ، پیٹ، ٹانگیں...... غرض تمام اعضا اس نے جانچ لیے تھے۔

میں اور نائرہ حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ کچھ ایسے ہی تاثرات اس کے ساتھ آئی ادھیڑ عمر خاتون کے بھی تھے۔

''کیا دیکھ رہی ہو میری بچی؟ صبر کرو بیٹا، حواس قائم رکھو میری جان۔'' انہوں نے روتے ہوئے اس سے کہا اور برستے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ''مجھے دیکھو! میں بڈھی یہی دن دیکھنے کو رہ گئی تھی۔ تمہارا بیٹا گیا ہے اور میرے بیٹے کا بیٹا، ہمارا دکھ سانجھا ہے۔ حوصلہ کرو میری جان۔'' وہ خاتون اس بچے کی دادی تھیں یہ اندازہ مجھے اُن کی باتوں سے ہوا۔

''نہیں اماں! میرے حواس قائم ہیں۔'' بچے کی ماں نے اپنے بچے کا مُردہ ہاتھ چوم کر کہا۔ ''آپ کو نہیں پتا اماں! جہاں میرا کلیجا کٹ کٹ کر گر رہا ہے وہیں میرے اللہ نے میری تسکین کا عجب سامان بھی کیا ہے۔'' مجھے اس بے چاری کی ذہنی حالت پر شبہ سا ہوا۔ صدمہ معمولی تو نہیں تھا۔ بچے کی دادی نے ایک تھکی ہوئی سی نظر بہو پہ ڈالی اور ایک فٹ پر استادہ ستون کا سہارا لیا۔ نائرہ نے بھی دکھ سے منہ پھیر لیا تھا۔

''اماں! آپ وہم نہ کریں۔ میرا دماغ نہیں الٹا۔'' بچے کی ماں نے تحمل سے ساس کو مخاطب کیا۔ ''آپ کو پتا ہے اماں...... آپ جس دن سے بڑی آپا کے پاس اسلام آباد گئی تھیں ناں آپ کا پوتا اسی دن سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ ماما! دادو کو واپس بلائیں۔ میں بہت اداس ہو رہا ہوں۔ میں نے بہت سمجھایا کہ تمہاری دادو اپنا چیک اپ کروانے کے لیے تمہاری پھپھو کے گھر اسلام آباد گئی ہیں پر میری ایک نہیں سن رہا تھا وہ اماں...... ایک ہی رٹ تھی اس کی کہ آ کر مجھ سے مل کر پھر سے چاہے واپس چلی جائیں۔ میں نہیں روکوں گا۔'' ایک زخمی سی سسکی بچے کی دادی کے منہ سے نکل گئی۔

''اور دیکھیں اماں! آپ کو بلانے والا خود چلا گیا۔ اماں صبر تو آتے آتے ہی آئے گا ناں۔ پر مجھے افسوس رہے گا کہ میرا بچہ جانے سے پہلے آپ سے مل نہیں سکا۔ کاش آپ صبح اس کے اسکول نکلنے سے پہلے پہنچ جاتیں۔'' اس کے آنسوؤں نے ایک دفعہ پھر اس کی بات اچک لی تھی۔ چند لمحے کا توقف بھی بار گزر رہا تھا۔ میرا دل کر رہا تھا کہ اس بچے کی چھوٹی سی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جان لوں۔

اقوالِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

☆ علم وہ شجر ہے جو دل میں اگتا ہے، دماغ میں پلتا ہے اور زبان سے پھل دیتا ہے۔

☆ کمزور کا یہی زور چلتا ہے کہ وہ پیٹھ پیچھے برائی کرے۔

☆ اپنے بھائی کو مخلصانہ نصیحت کرو خواہ اسے اچھی لگے یا بری۔

مرسلہ: فائزہ شاہ، پشاور

''اماں! آج میرے فصیح کی سالگرہ تھی، میرا بچہ پورے گیارہ برس کا ہو گیا ہے آج۔ میں نے ہمیشہ کی طرح آج بھی کیک بیک کرنا تھا مگر آج پہلی دفعہ اماں میرا کیک جل گیا۔ میں نے سوچا شاید چھوٹے بچوں کی مصروفیات اور گھر کے دیگر کاموں کی وجہ سے ایسا ہوا مگر اماں دوبارہ بناتے ہوئے پورا پیالہ اچانک جھٹکا کھا کر الٹ گیا۔ میں حیران کھڑی فرش پر الٹے پڑے پیالے کو دیکھتی رہ گئی مگر پھر سر جھٹک کر سوچا کہ جانے دوں! کچھ اور بنا لوں گی۔ شام کے لیے فصیح کے کپڑے استری کرنے لگی تو شرٹ جل گئی۔ چھوٹے ہادی نے فصیح کا فیورٹ ٹیڈی بیئر پھاڑ کر لیر و لیر کر دیا۔ حالانکہ اس نے کبھی بڑے بھائی کے کسی کھلونے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ میں کتنی دیر فصیح کے پھٹے ہوئے ٹیڈی میں سے نکلے روئی کے

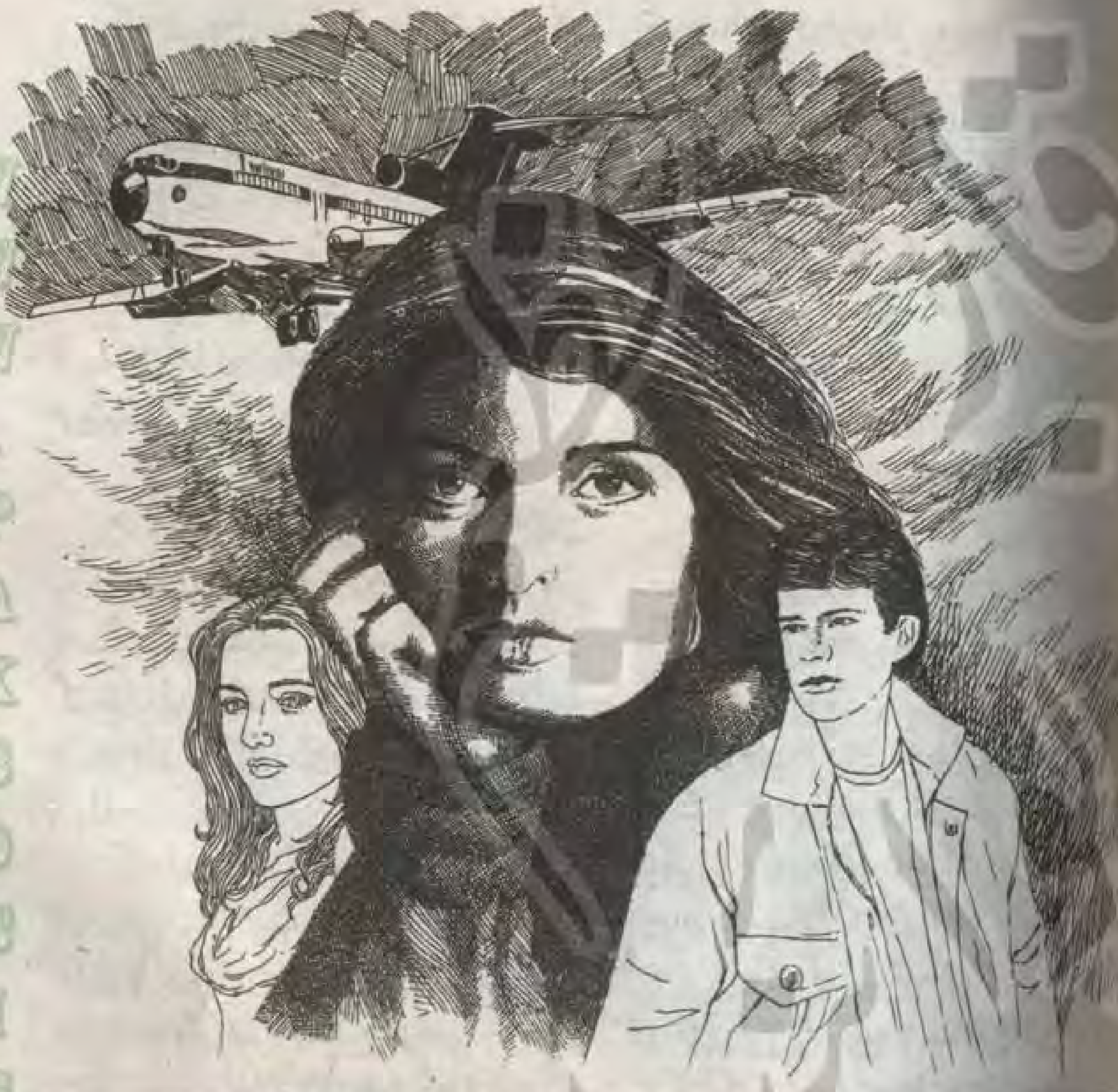
گولے تھامے سن سی بیٹھی رہی...... پتا نہیں کیوں؟ پر اماں مجھے ہول سے اٹھنے لگے تھے۔ میرے دل میں وسوسے چکرانے لگے تھے۔ آپ جانتی ہیں ناں...... میں وہمی نہیں ہوں، پر میں وہم کرنے لگی تھی۔

مجھے نامعلوم سی گھبراہٹ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دل چاہنے لگا کہ بس کیسے بھی ہو فصیح گھر آجائے۔ میری نظریں اس کو صحیح سلامت دیکھ لیں۔ کچھ نہ سوجھا تو رونے لگی۔ آپ کے گھر آجانے سے میرے دل کو کچھ قرار آیا تھا اماں...... لیکن اندر کی بے چینی قائم تھی اور...... اور پھر خبر آگئی اماں، بس ایکسیڈنٹ کی خبر...... ایک بھیانک حادثے کی خبر...... اور میری ممتا نے میرے سینے میں کرلاتے ہوئے بین ڈالنے شروع کردیے۔ میرے پیٹ میں پڑتی گرہیں شدت سے مجھے احساس دلانے لگیں کہ میری گود اجڑ گئی ہے۔ میرا فصیح نام کا موتی میرے خاندان کی مالا سے ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔ میں نے بہت رولیا اماں...... میں نے اسی وقت جائے نماز بچھا کر جی بھر کر رولیا اور اس وقت اماں میں نے سجدے میں جا کر اپنے رب سے بس ایک دعا مانگی کہ، ہاں اماں بس ایک ہی دعا...... ”اے میرے مولا! میں تیری رضا میں راضی۔ تیری چیز تھی تو نے واپس لے لی۔ پر یا اللہ! تو نے مجھے اس بچے کی ماں بنایا۔ میرے دل میں اس کے لیے ممتا کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تو اس جذبے اور احساس کے صدقے جو تجھ میں اپنے بندوں کے لیے ستر ماؤں سے زیادہ ہے، مجھے اپنے فصیح کا مسخ شدہ وجود نہ دکھانا۔ میں اس کی موت کا دکھ تیرے عطا کیے صبر سے سہہ جاؤں گی مگر صرف موت کا میرے مولا...... تکلیف وہ موت کا نہیں...... مجھے ساری عمر کی تکلیف سے بچا لے میرے مالک جو مجھے اس احساس سے ہوتی رہے گی کہ میرا فصیح مرتے وقت کس کرب اور اذیت سے گزرا۔ اسے کہاں کہاں زخم آئے، کہاں سے اس کا پھول سا جسم زخمی ہوا۔ کس درد کے سمندر سے گزر کر اس نے موت کو گلے لگایا۔ جب اسے پہلی خراش آئی ہوگی تو کیسے اس نے ماما کہہ کر مجھے پکارا ہوگا اور کہیں نہ پایا ہوگا۔ ان تمام اذیتوں کے دکھ سے مجھے نجات میں رکھنا میرے رب۔ میرے لیے اپنی اولاد کھو دینا ہی بڑا صدمہ ہے تو مجھے اس کو کٹا پھٹا دیکھنے سے محفوظ رکھ۔ مجھے اس دکھ سے بچالے......“ اور اللہ کا کروڑہا شکر ہے اماں! میرا بچہ ایسے ہی موت کی گود میں گیا ہے جیسے میری گود میں سو رہا ہو...... دیکھیں، الحمدللہ کوئی خراش نہیں، کوئی زخم نہیں یہاں تک کہ رنگت میں بھی فرق نہیں...... میں اپنے رب کا کیسے شکر ادا کروں اماں! اللہ نے میرے بچے کو اور مجھے دونوں کو تکلیف سے بچالیا۔ میرا بچہ سکون سے مر گیا...... بے حد سکون سے۔“

یہ کہتے ساتھ ہی اس بچے کی ماں اور دادی ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رودیں جبکہ مجھے اور نائرہ کو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ کیسا عجیب روپ تھا یہ ماں کا۔ کیا کوئی ماں اس طرح بھی سوچتی ہے...... بیٹے کے چھن جانے سے زیادہ صدمہ اس بات کا ہوتا جو وہ زخموں سے چور مر جاتا...... کیسا انمول روپ تھا یہ ماں کا۔ بلکہ ماں کا ہر روپ ہی انمول ہے۔ کوئی قیمت نہیں ماں کے جذبات و احساسات کی۔ ماں اچھی، بری کچھ نہیں، صرف ماں ہے۔

وہ رب جو ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرنے والا ہے کتنا مہربان ہے اپنی مخلوق پر...... مایوسی کی انتہا پر امید کی ابتدا فرما دیتا ہے اور ہمیں اپنے رب کو کیا لوٹانا ہوتا ہے...... صرف اچھے اعمال...... میں نے آنکھیں موند کر اپنے رب سے معافی اور پناہ مانگی اور اس ماں کے لیے ڈھیر سا حوصلہ اور صبر...

پھر دھیرے سے نائرہ کا ہاتھ تھاما اور اسپتال سے باہر نکلنے کے لیے داخلی دروازے کا رخ کرلیا۔



اِحسان تیرا

نوشین ناز اختر

”اللہ جی...... ہائے میری کمر......“ منزہ نے اپنی کمر پکڑ کر بے اختیار کہا۔

”ارے بنو ابھی تو یہ شروعات ہے ابھی تو آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔“ ماریہ نے پیلا جوڑا اور بیلے پھولوں کا زیور پہنے ہوئی منزہ کو ڈرایا۔ جو ابھی ابھی رسم کے بعد کمرے میں لائی گئی تھی۔

”کیا مطلب......؟“ منزہ شروع ہی سے بے حد بزدل اور سادہ سی تھی۔ اس نے ڈر کر پوچھا۔

"ارے میری جان، پہلے مایوں پھر مہندی پھر بارات، اس کے بعد ولیمہ ان سارے دنوں میں تم کو جیل کے قیدی کی طرح باندھ کر بٹھا دیا جائے گا پھر...... پھر اس کے بعد تمہیں عمر قید سنادی جائے گی۔" ماریہ نے اسے مزید ڈرایا۔

"ماریہ میری شادی ہو رہی ہے، مجھے کوئی کالے پانی تھوڑی بھیجا جا رہا ہے۔" منزہ نے سہم کر مزید کہا۔

☆☆☆

منزہ کی کوئی بہن نہیں تھی۔ ماریہ جو اس کی خالہ زاد تھی وہ ہی اس کی بہن اور دوست تھی۔ منزہ ہر چھوٹے بڑے فیصلے کے لیے ماریہ کی جانب دیکھتی تھی۔ اگر امی ہی اس کی سہیلی بن کر اس کے دل کا حال پوچھ لیا کرتیں تو آج وہ ماریہ پر اس قدر انحصار نہ کرتی۔

"میری جان شادی کالے کیا...... ہر طرح کے لال، پیلے پانی کا نام ہے۔ جہاں شوہر آپ کے وجود کو اپنی جاگیر سمجھ کر دن رات جو مرضی سلوک کرے کوئی اسے کچھ نہیں کہہ سکتا اور جناب...... جہاں سسرال والے لڑکی کو نوکرانی بنا کر کچن کا کام لیتے ہیں۔" ماریہ نے شادی کے بعد والی زندگی کا دہشت ناک نقشہ کھینچا۔

"ماریہ اگر شادی اتنی بری ہے تو امی، ابو میری شادی کیوں کر رہے ہیں؟ میں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں، ان کی اکلوتی بیٹی ہوں، مجھ سے تو ابو ہمیشہ بہت پیار کرتے آئے ہیں پھر وہ مجھے کیوں ایسی جگہ بھیج رہے ہیں؟" منزہ کا معصوم سا چہرہ بے حد خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

"بس یہی اس دنیا کی رسم ہے، لڑکی کو بیاہ دو چاہے وہ جگہ ٹھیک ہو یا نہیں ہو۔" ماریہ نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ وہ معصوم ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد کم عمر بھی تھی اٹھارہ کی بھی پوری نہیں تھی اور اٹھارہ، انیس، سال عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اسے تو ڈھنگ چائے تک بنانی نہیں آتی تھی۔ اس کی ای پرانے خیالات کی خاتون تھیں خود ان کی شا سولھویں برس ہو چکی تھی۔ منزہ کی تو اُن کے خیال بہت مناسب اور اچھی عمر تھی پھر رشتہ بے حد اچھا ورنہ ابو انکار ہی کر دیتے۔ حمزہ ڈاکٹر تھا...... بھائیوں میں سب سے بڑا...... ابو کو ان کا خاندان خاص طور پر حمزہ کی عادات بہت پسند آئی تھیں جبکہ کو حمزہ بھائی کی ڈشنگ پرسنالٹی پسند آئی تھی۔

"بجو قسم سے ہیرو لگس ہیں ان کے زبردست باڈی ہے۔" سلمان کو آج کل باڈی بلڈنگ کا شوق جو ہو رہا تھا اس نے اپنے ڈو دکھاتے ہوئے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ...... تم یہ کس قسم کی باتیں کرتے رہتے ہو۔" فاروق ان سب میں نہ صرف تھا بلکہ بے حد سنجیدہ بھی رہتا تھا۔ مختصراً امی، ابو کو رشتہ اچھا اور مناسب لگا کہ کسی نے انکار بھی نہیں کیا۔

"امی میرا بی اے......؟" منزہ کو سب سے زیادہ اپنی تعلیم ادھوری رہ جانے کا دکھ تھا۔

"محترمہ اب تو سیدھا سیدھا بی ہاہ (بیاہ) ہوگا۔" ماریہ نے منہ بنا کر کہا۔ ان سب میں ماریہ اس کی شادی سے نہایت ناخوش تھی۔

"شاید...... وہ میرے جانے پر اپ سیٹ ہے۔" منزہ نے خود ہی سوچا تھا۔

"یہ اورنج کلر کا لہنگا تمہاری گندمی رنگت کو اور سانولا کر جائے گا۔" جانے ماریہ کو کیا ہو گیا تھا وہ کام میں کیڑے نکال رہی تھی۔ منزہ نے گھبرا کر لہنگا چھوڑ دیا۔

"پھر کون سا لوں......؟" منزہ نے ماریہ سے پوچھا۔

"کوئی بھی لے لو تمہاری رنگت ایسی ہے کہ تقریباً ہر شوخ رنگ میں تمہیں مسئلہ ہوگا۔" ماریہ نے بے حد بے دردی سے کہا۔ منزہ کو ایک دم اپنا کھلتا ہوا گندمی رنگ ماریہ کی سفید رنگت کے آگے گہرا سانولا لگنے لگا۔

"منزہ اب پسند بھی کر لو۔" امی نے اسے ٹوکا۔ وہ ان دونوں کی کھسر پھسر سے بالکل انجان خالہ کے ساتھ بیٹھی اس کی ساس کے لیے سوٹ دیکھ رہی تھیں۔

"امی گھر چلیں، مجھے نہیں کچھ پسند آ رہا۔" منزہ نے بددل ہو کر کہا اسے اورنج کلر کا ایک لہنگا بے حد پسند آیا تھا جس میں مسٹرڈ پیچز تھے اور ان patches پر مختلف پتھروں کی سجاوٹ تھی اور اس کا ڈیزائن بھی تو مہارانی اسٹائل تھا۔

"اُف کتنا پیارا ہے ناں!" اسے پہلی نظر دیکھتے ہی منزہ نے ماریہ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"پاگل ہو گئی ہو لڑکی، شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اور تم ابھی تک غیر سنجیدہ ہو۔" امی کسی کا لحاظ نہیں کرتی تھیں وہ تو بس موقع محل کا لحاظ کیے بغیر اسے ڈانٹ کر ہر جگہ شرمندہ کر دیتی تھیں۔

"مجھے نہیں کچھ اچھا لگ رہا ہے آپ کو جو اچھا لگے وہ لے لیں۔" منزہ نے ماں کے خوف سے ساری پسند حسب معمول ان پر چھوڑ دی۔ اس کا دل چڑیا کا سا تو تھا ذرا سی گرج پر سہم کر تنکے کی طرح ہلنے لگتا تھا۔ امی ہمیشہ سے ہی بہت سخت تھیں جبکہ ابو کی وہ لاڈلی تھی۔

"ٹھیک ہے...... پھر یہ سبز، کاہی اور مسٹرڈ بہت اچھا ہے، یہ لے لو۔" امی نے سب سے مہنگا اور نفیس کام والا ایک لہنگا اس کے آگے کیا۔

"امی یہ مجھ پر سوٹ کرے گا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ارے میری چاند سی بیٹی تو اس میں پری لگے گی۔" خالہ نے کہا۔ منزہ نے مڑ کر امی کو دیکھا ان کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ تھی جو خالہ کی بات کی تائید کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے پھر یہی لے لیں۔" منزہ نے پُرسکون ہو کر کہا۔

جبکہ ماریہ کا موڈ جانے کیوں اتنا خراب ہو گیا تھا۔ وہ جو ہمیشہ بانو بازار کی چاٹ کی بے حد شوقین تھی اس نے کچھ بھی نہیں کھایا اور بے حد خاموش، خاموش سی واپس آ گئی۔

☆☆☆

"حمزہ کی امی تمہارے لیے مہندی کا شگن لائی ہیں۔" امی خوشی سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ وہ جو ماریہ کی خوفناک باتیں سن سن کر اور کچھ تھکن سے نڈھال ہو کر بستر پر لیٹی ہوئی تھی امی کی آواز سن کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یہ دیکھو منزہ بیٹی......" امی نے بہت خوب صورت جڑاؤ کنگن اس کے سامنے کیے۔ "یہ ان کے خاندانی کنگن ہیں جو صرف بڑی بہو کو دیے جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے تم ان کی بڑی بہو ہو۔" امی جانے کیوں اتنی خوش تھیں حالانکہ ان کے خود کے پاس بھی تو طرح، طرح کے خوب صورت زیور تھے۔

"امی ان میں کیا خاص بات ہے، کیا بہت مہنگے ہیں؟" منزہ ان کی خوشی کی وجہ جاننا چاہتی تھی۔

"بیٹا بے شک یہ مہنگے بھی ہیں لیکن یہ ان کے خاندان کا اعزاز ہے جو بڑی بہو کو دعا اور رتبے کی صورت میں دیا جاتا ہے۔" امی کو شروع سے ہی بڑے پن کا پروٹوکول ملا تھا شاید اسی وجہ سے وہ اپنی بیٹی کے لیے بھی ایسا ہی کچھ چاہتی تھیں۔

"اوہ......!" منزہ نے لمبی سانس بھری اسے یہ سب کچھ ابھی بالکل سر سے گزرتا محسوس ہو رہا تھا۔

"میری بیٹی دو روز بعد اپنے گھر چلی جائے گی۔" امی نے ایک دم اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ منزہ کو پہلی بار شادی اچھی لگی۔ اس کی ریزرو سی امی نے اسے پہلی بار اتنی بے تکلفی سے پیار کیا تھا۔ منزہ کو کچھ وہم سا ہوا کہ امی کی آنکھوں میں آنسو

بھی چمک رہے ہیں۔

''کیا واقعی، امی کے لیے میں اہم ہوں؟''

اس نے حیرت سے سوچا۔ منزہ کو ہمیشہ ماں سے شکوہ رہا تھا کہ وہ اسے ہر وقت ڈانٹتی رہتی تھیں۔ شاید وہ اتنی بری اور غیر اہم تھی کہ امی کو ہر وقت اس سے شکایت رہتی تھی۔

''اچھا تم آرام کرو۔ میں سکینہ کے ہاتھ گرم دودھ بھیج رہی ہوں اسے ضرور پی لینا۔'' امی نے شاید پہلی بار بغیر ڈانٹ کے اسے دودھ پینے کو کہا تھا۔

''واہ شادی سے تو انسان کو باعزت مقام مل جاتا ہے۔'' منزہ نے خوشی سے امی کو جاتے دیکھ کر سوچا تھا۔

بہت دنوں سے علی اور سلمان بھی اس کی ہر بات ماننے لگے تھے۔

''ارے، یہ کایا پلٹ کیسی؟'' منزہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''آپ ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ کر جو جا رہی ہیں۔'' سلمان کا لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کا منزہ سے ہمیشہ پھڈا رہا تھا اسے کب معلوم تھا کہ وہ بہن کو اتنا چاہتا ہے کہ اس کے جانے کا سن کر اسے بے حد خالی پن کا احساس ہونے لگا تھا۔

''ارے، میں کیا دنیا سے جا رہی ہوں جو تم اس قدر غمگین ہو رہے ہو۔'' منزہ کا خود دل بھر آیا تھا لیکن اس نے اپنے آنسو کنٹرول کر کے اسے تسلی دی تھی۔

''اللہ نہ کرے بجو!'' سلمان نے سنجیدگی سے کہا۔

''ارے...... تم تو واقعی بہت سیریس ہو گئے ہو۔'' منزہ نے کھلی ہنسی سے کہا۔

''بجو بہنیں جب اتنی اچھی ہوتی ہیں تو پھر انہیں دور کیوں بھیجا جاتا ہے؟'' سلمان واقعی بے حد اپ سیٹ تھا۔

بس منزہ کا ضبط چھوٹ گیا اور وہ اس قدر روئی کہ سب کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ سلمان بے چارے کو خواہ مخواہ بہت ساری ڈانٹ ایک، ایک بندے [illegible] الگ پڑی۔ اس کے گرد کتنی چاہتیں تھیں جن کا [illegible] بے شک منہ سے نہیں ہوتا تھا لیکن وہ بے حد [illegible] حصار رکھتی تھیں۔

☆☆☆

''تم بالکل دب کر نہ رہنا۔''

''ہاں، سب کے ساتھ اتنا گھل مل کر نہ رہنا [illegible] سب تمہیں تر نوالہ جان کر کھا جائیں۔'' ماریہ [illegible] کے وقت تک اپنی سرگوشیاں اس کے کانوں [illegible] انڈیلتی رہی تھی۔ جبکہ وہ حمزہ کی موجودگی سے بے [illegible] پریشان سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد [illegible] کی سوں، سوں کی آواز پر حمزہ بے چینی سے پہلو [illegible] رہا تھا۔ جب کتنی ہی دیر اس کے رونے میں وقفہ [illegible] تو حمزہ نے ایک دم اس کا حنائی ہاتھ تھام لیا۔

''ٹیک اٹ ایزی......'' حمزہ کی گمبھیر آواز [illegible] اور اس کے گرم، گرم لمس پر اس کی ہچکیاں اندر [illegible] گھٹ گئیں۔

''ارے......'' حمزہ نے شرارت سے اسے [illegible] دیکھا جو بالکل چپ ہو گئی تھی ورنہ مسلسل آدھے [illegible] سے وہ رونے سے شغل فرما رہی تھی۔ ایک اس [illegible] چھونے سے وہ کسی ایسے ریکارڈ کی طرح چپ ہو [illegible] جس کا اسٹاپ کا بٹن ہاتھ رکھتے ہی دب جاتا ہو۔

منزہ ایک بار پھر اپنے آپ میں سمٹ گئی تھی۔

''بتول یہ کھانا ابھی تک کیوں رکھا ہوا [illegible] نے دلہن کو کچھ کھلایا نہیں؟'' اس کی ساس کی آواز ایک دم کمرے کے دروازے پر سنائی دی تھی۔

منزہ کو وہ بالکل اپنی امی کی طرح سخت اصول پرست لگی تھیں۔ ان کی خود کی بیٹی [illegible] تاویلیں دے رہی تھی...... بالکل منزہ کی طرح [illegible] بھی تو اپنی ماں کے سامنے ہر وقت صفائیاں [illegible] رہتی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے، یہ کھانا گرم کر وا اور بھابی [illegible]

کھلاؤ اور اسے کچھ دیر آرام کرواؤ، بے چاری جانے کتنی دیر سے بیٹھی ہے۔ حمزہ کو تو ابھی اندر آنے میں دیر لگے گی۔ اس کے دوست اور کزن اسے گھیرے بیٹھے ہیں۔'' ممی جلدی جلدی کہتی باہر نکل گئیں۔

بے شک یہ سارا حکم نامہ اس کی خاطر تھا لیکن انہوں نے ایک پل کو بھی رک کر منزہ سے اس کا حال نہیں پوچھا تھا بلکہ اس پر نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی۔ وہ جو ان کے آنے پر ایک دم الرٹ ہو کر بیٹھ گئی تھی ان کے جانے پر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

اس کی نظر ایک دم بتول باجی پر پڑی کچھ ایسی سکھ بھری سانس انہوں نے بھی بھری تھی شاید۔

''ممی کو ہر کام وقت پر کرنے اور کروانے کی عادت ہے۔'' بتول باجی جانے اسے تسلی دے رہی تھیں کہ اطلاع...... منزہ ٹھیک سے جان نہیں پائی تھی۔ لیکن اس کے اندر ساس کا خوف ابھی سے پنجے گاڑنے لگا تھا اور اس سب کے پیچھے ماریہ کا مسلسل سسرال کا نقشہ کھینچنا گویا ایلس اِن ونڈر لینڈ والا حساب تھا۔

حمزہ شروع سے ہی نوٹس کر رہا تھا۔ اپنی نئی نویلی دلہن کی خوفزدہ پُر حیرت آنکھیں اس سے چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ تبھی تو جب وہ کمرے میں آیا تو جس طرح پانی پیتی منزہ کے ہاتھ سے گلاس چھلکا تھا بے اختیار حمزہ کے دماغ میں بھی ایک جملہ ایلس اِن ونڈر لینڈ گونجا تھا۔

''جی...... جی...... مجھ سے کچھ کہا......؟''

''جی...... جی آپ سے ہی تو ساری عمر مجھے کہنا سننا ہے۔ آخر کو آپ میری بیٹر ہاف ہیں۔'' حمزہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بہت نرمی سے کہا تھا۔ گھبراہٹ، شرماہٹ جانے کیسے عود کر آئی تھی کہ منزہ سے سانس لینی دوبھر ہو گئی۔

''آپ پلیز ایزی ہو جائیں۔'' وہ اب بھی اس کا ہاتھ تھامے اسے تکے جا رہا تھا۔

''مون!'' حمزہ کا پیار بھرا خمار آلود لہجہ منزہ کو اندر تک پگھلا گیا تھا۔

''جی......'' اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر پوچھا۔

''میں آپ کو مون کہوں گا...... میری دلہن کسی چاند سے کم ہے کیا......'' اس نے کہتے ہوئے گول تکیہ ہاتھ بڑھا کر کھینچا اور ٹیک لگا کر آڑا ترچھا لیٹ گیا۔

''جی...... جی؟'' منزہ کی بوکھلاہٹ اب بھی کم نہیں ہوئی تھی۔

''آپ کو جی کے علاوہ کچھ اور بولنا آتا ہے۔'' حمزہ نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی...... جی۔'' منزہ کے منہ سے ایک بار پھر جی نکلا تھا۔

اس بار حمزہ کا قہقہہ بہت بلند تھا اور منزہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکان۔

دونوں کی زندگی کی پہلی harmony تھی۔ دونوں ایک ہی بات پر ہنسے تھے۔ پارٹنرشپ کی پہلی مشترکہ ہنسی کی پہلی بنیاد...... جسے انہوں نے اپنے ہر سکھ دکھ میں شیئر کرنا تھا۔

☆☆☆

''بجو یہ جو آپ کے میاں ہیں۔'' سلمان نے کچھ عجیب انداز سے منزہ کو مخاطب کیا تھا۔

''کیا ہوا......؟'' منزہ نے کچھ حیرت سے بھائی سے پوچھا۔ حمزہ تو سلمان کو بہت پسند تھا پھر......!

''ان کے گرد بہت لڑکیاں گھومتی ہیں، جسٹ لُک ایٹ ہم...... سارے خاندان کی جل پریاں صاحب کو گھیرے ہوئے ہیں۔'' سلمان نے دور کھڑے حمزہ کو دیکھا جو سب سے ہنس، ہنس کر بات کر رہا تھا۔

" he is very jolly ,just nothing" منزہ نے سلمان کو تسلی دی۔

"بجو پھر بھی ذرا آنکھیں کھول کر۔" سلمان نے تھوڑی فکرمندی سے کہا تو منزہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پندرہ سال کا سلمان بڑے بوڑھوں کی طرح نصیحتیں کر رہا تھا۔

"اوئے ہوئے......! تم کب سے اتنے سنجیدہ ہو گئے؟" اس نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

"بجو...... بہنیں کتنی پیاری ہوتی ہیں ناں! اللہ ہمیشہ انہیں پیار کرنے والے ساتھی دے۔" سلمان نے ایک دم منزہ کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر کہا۔ بھائی کے اس روپ پر منزہ حیرت زدہ تھی۔

"سلمان......" منزہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"بجو صرف ایک دن ہوا ہے آپ اس گھر سے گئی ہیں ایسا لگتا ہے پورے گھر کی روشنی ساتھ لے کر چلی گئیں۔ ہر جگہ ایسا ہے کہ جیسے کچھ کمی ہو۔" سلمان چھوٹا تھا اور اسی لیے شاید اتنا expressive بھی تھا ورنہ سب ہی آئے تھے ان سب کے چہروں پر ایک ہی کہانی تھی لیکن بولا کوئی بھی نہیں تھا اور منزہ کی آنکھوں میں چمکتے موتی لڑیاں پروتے چہرے سے گردن تک آن گرے تھے۔

☆☆☆

"ارے میری سالی آدھے گھر والی آئی ہیں۔" حمزہ نے ماریہ کو ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے دیکھ کر کہا۔ وہ ابھی، ابھی اسپتال سے لوٹا تھا۔ چھ فٹ سے اونچا نکلتا قد، مسلز سے بھرپور باڈی، گورا چٹا رنگ وہ کسی فلم کا خوبرو ہیرو لگ رہا تھا۔

"آہ......" ماریہ کے دل سے بے اختیار آہ نکلی تھی۔ اس کے سامنے منزہ تو چھوٹی سی لگتی تھی۔

"منزہ......" ممی نے کچھ برا مناتے حمزہ اور ماریہ کو دیکھا اور منزہ کو آواز دی۔

"جی ممی......" اس نے کچن سے نکلتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"حمزہ آ گیا ہے، جاؤ اس کے کپڑے نکال دو۔" ممی نے منزہ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ بھی کیا تھا لیکن منزہ کے پلے کچھ نہیں پڑا۔

"چلو حمزہ بیٹا فریش ہو جاؤ تم بھی۔" ممی نے بہت زیادہ محتاط انداز میں ان دونوں کو کمرے کی جانب روانہ کیا۔

"بیٹا وہ دونوں میاں بیوی کمرے میں ہیں، تمہیں ان کے پیچھے نہیں جانا چاہیے۔" ماریہ بھی ان کے پیچھے جانے لگی تو ممی نے ذرا سختی سے ماریہ کو ٹوکا تھا۔ ممی کا لہجہ ماریہ کو بہت کچھ جتا گیا تھا وہ بہت برا منہ بنا کر چپکی بیٹھی رہی۔

"بڑی بی تو میری سوچ سے زیادہ تیز اور چالاک نکلیں۔" ماریہ نے دل ہی دل میں کہا تھا۔

☆☆☆

جب سے ماریہ گھر آئی تھی اسے رہ رہ کر منزہ کا خوش اور مسکان بھرا چہرہ یاد آ رہا تھا۔

اس کے اندر تو جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔ حسد کی آگ نظر تو آتی نہیں لیکن یہ اندر سے انسان کی ساری خوب صورتی بھسم کر کے رکھ دیتی ہے۔ ماریہ کے ساتھ بھی تو ایسا ہی تھا۔ وہ منزہ کی ہر اچھی چیز دیکھ کر اسے خوش دیکھ کر ہمیشہ برا محسوس کرتی تھی۔ یہ حسد کا جذبہ بچپن سے پرورش پاتے پاتے اب اس کے ساتھ جوان ہو چکا تھا اور آج منزہ کی خوشی سے بھرپور ازدواجی زندگی ماریہ کو شدید رنج میں مبتلا کر رہی تھی۔

☆☆☆

"ہائے، آپ کیسے ہیں؟" ماریہ بظاہر اچانک لیکن بے حد پلان سے حمزہ سے ٹکرائی تھی۔

"اوہ آئی ایم گڈ۔" حمزہ نے بہت بھلی مسکراہٹ سے جواب دیا تھا۔

"آپ یہاں...... خیریت ہے؟" حمزہ نے ماریہ کی اسپتال میں موجودگی کی وجہ پوچھی۔

"وہ بس میرے پیٹ میں اچانک اتنا pain

اٹھا کہ امی پریشان ہو گئیں۔"

"اوہو ایسا کیا کھایا تھا؟ اب تو آپ بالکل نارمل لگ رہی ہیں۔" حمزہ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کھاتی ہی تو کچھ نہیں ہے۔ دو، دو دن خالی دودھ یا جوس پہ رہ لیتی ہے۔ ڈاکٹر نے بھی ابھی کہا کہ بی بی کچھ تو کھاؤ ورنہ گھونٹ پانی بھی پیو گی تو درد اٹھے گا۔" ماریہ کی امی نے غصے سے کہا تھا۔

"یہ تو ہے ماریہ...... آپ اپنی خوراک پر توجہ دیں ورنہ ایک دن تو بالکل غائب ہو کر رہ جائیں گی۔" حمزہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب گھر کے ڈاکٹر نے نصیحت کی ہے ماننی تو پڑے گی۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب جو حکم آپ کا۔" ماریہ نے اٹھلا کر کہا۔

"چلیں، آپ کو چائے پلواؤں۔ ہمارے کیفے کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے۔" حمزہ نے آداب میزبانی نبھاتے ہوئے کہا اور ماریہ نے بلا تکلف فوراً حامی بھر لی تھی۔

"واؤ...... آپ کے پاس تو آئی فون ہے۔" ماریہ نے حمزہ کے جدید فون کی تعریف کی تھی۔

"آپ کی چوائس بہت اچھی ہے۔ بہت زبردست کلر ہے۔" ماریہ نے ایک دفعہ پھر تعریف کی تھی۔

"اوہ تھینک یو......" حمزہ کو اس کا تعریف کرنا اچھا لگا تھا۔ چائے کے ساتھ حمزہ نے کچھ اسنیکس بھی آرڈر کیے تھے۔ ماریہ کی امی بہت خاموشی کے ساتھ چائے پیتی رہیں جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہوں۔

"آپ نے کس قدر ڈفرنٹ کلر کمبی نیشن پہنا ہے اور کس قدر سوٹ کر رہا ہے آپ پر۔" ماریہ نے تعریف کا سلسلہ مزید بڑھایا۔ حمزہ کو بے حد اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ تعریف ہم جنس سے ہو تو بہت اچھی لگتی ہے یہ تو مخالف جنس سے تعریف تھی۔ جو ہر مرد کو بہت اچھی لگتی ہے۔

"اب آپ مجھے چڑھا رہی ہیں۔" حمزہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تو بالکل خلوص سے آپ کی تعریف کر رہی ہوں۔ آپ کی پرسنالٹی ایسی ہے کہ ہر چیز سوٹ کرتی ہے۔" ماریہ نے تو حد ہی کر دی۔ حمزہ کے اندر تک ٹھنڈک اتر رہی تھی۔ چائے کے اختتام تک حمزہ، ماریہ سے بے حد بے تکلف ہو چکا تھا۔ جیسے وہ سالوں پرانے دوست ہوں۔

ماریہ کی امی اس سارے دورانیے بالکل خاموش تھیں۔ بیٹی کو اس قدر آزادی دے رکھی تھی کہ حمزہ کے ساتھ بے تکلفی پر انہوں نے اعتراض کی رتی بھر شکن ماتھے پر نہیں آنے دی تھی۔

یہ ملاقات ان کی اگلی مزید ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

☆☆☆

"کہاں کی تیاری ہے؟" فاروق نے ماریہ کو تیار ہو کر باہر نکلتے دیکھ کر پوچھا تھا۔ وہ لوگ ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

"آپ سے مطلب......؟" ماریہ نے بے حد بدتمیزی سے فاروق کو جواب دیا۔ آج سے پہلے وہ

احسان تیرا

سکون

ایک صاحب پریشانی کے عالم میں ایک کمرے میں داخل ہوئے اور وہاں بیٹھے صاحب سے مخاطب ہوئے۔ "میں ذہنی اور اعصابی سکون کے سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔"

وہ شخص کاغذات سے نظر اٹھاتے ہوئے حیرت سے بولا۔ "بھلا میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ میں ڈاکٹر نہیں وکیل ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" آنے والے صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ "میں طلاق کے سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

صرف فاروق کو خوش کرنے کا سوچتی تھی اور اس کا رویہ فاروق کے ساتھ ہمیشہ نچھاور ہونے والا ہوتا تھا۔

ایسے میں یوں...... فاروق کے لیے دھچکا ہی تھا۔ اسے ماریہ کے ایسے لہجے کی عادت بالکل نہیں تھی۔

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟" فاروق نے اسے بے حد غور سے دیکھا تھا جیسے وہاں اس کے نقوش میں کوئی تبدیلی آگئی ہو...... اور یہ سچ ہی تھا کہ اس کے نقوش کی ترتیب بدل گئی تھی۔ وہاں بے حد اجنبیت اور غصہ تھا۔

فاروق بہت انا پسند اور بے حد رکھ رکھاؤ والا انسان تھا۔ اپنی عزت دوسروں سے کروانے سے پہلے خود کی بہت عزت کرتا تھا۔

"آپ...... ہمارے گھر، ہماری فیملی کے ساتھ رہتی ہیں، آپ جب تک ہمارے ساتھ رہ رہی ہیں اس گھر کی عزت بھی آپ کے ساتھ منسلک ہے۔ آپ کا ہر، ہر رویہ اس گھر کی نمائندگی کرتا ہے۔ آپ خود کو الگ نہیں کرسکتیں۔ آپ جواب دہ ہیں مجھے اور اس گھر کے تمام بڑوں کو۔" فاروق نے بے حد سنجیدگی اور بہت تفصیل سے جواب دیا تھا۔

وہ دھاڑتا چنگھاڑتا نہیں تھا بلکہ بے حد لاجک سے بات کرتا تھا۔ اس کے لہجے کی سنجیدگی بڑے بڑوں کو سہا دیتی تھی۔

ایک پل کو ماریہ کی ساری باغی سوچ جانے کہاں بھاگ گئی تھی اور وہ بھی سہم کر رہ گئی تھی جیسے اس کی سوچ فاروق نے پڑھ لی ہو۔

"دراصل میں اپنی فرینڈ کی برتھ ڈے پارٹی میں جا رہی ہوں۔" ماریہ کے شعلے بھرے لہجے پر پانی پڑ چکا تھا۔

"اوکے...... کوئی چادر اوڑھ لیں، میں آپ کو ڈراپ کردوں گا۔" فاروق، ماریہ کا مزید کوئی بہانہ سنے بنا باہر نکل چکا تھا۔

"ہونہہ...... یہ بڈھا بابا اور مجھے......" ماریہ پھنکاری تھی۔ اب اسے مجبوراً کسی دوست کے ہاں پہلے ڈراپ ہونا تھا۔ "مجھے امی کو یہ سب بتانا پڑے گا۔ ورنہ یہ تو...... تو یہ پورے گاڈ فادر ہیں۔" ماریہ مسلسل بڑبڑاتی ہوئی اندر پلٹی تھی۔ چادر جو اوڑھنی تھی۔ موصوف کا حکم تھا۔

☆☆☆

"آپ آج بہت لیٹ ہوگئے؟" منزہ نے ٹی وی آف کرتے ہوئے حمزہ سے پوچھا تھا۔ وہ اس کے انتظار میں ٹی وی آن کر کے بیٹھی تھی۔

"ہوں......" اس نے مختصراً جواب دیا تھا اور چینج کرنے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

"کھانا لاؤں؟" منزہ کو حمزہ کافی دن سے بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔

"نہیں کھا چکا ہوں۔" اس نے بے حد روکھے لہجے میں کہا۔

"مگر میں نے نہیں کھایا......" منزہ نے دھیمی آواز میں کہا...... ساتھ ہی بے اختیار ہاتھ مسلے۔

"منزہ...... میری ڈیوٹی کچھ مختلف ہے، اکثر دیر ہو جاتی ہے تم ڈنر پر میرا انتظار نہ کیا کرو، اپنے ٹائم پر کھا لیا کرو۔" حمزہ نے مڑ کر کہا۔ وہ ایک دم بجھ کر رہ گئی۔ وہ اتنی کم عمر تھی کہ اسے اپنے جذبات کا اظہار کرنا اور ان کا احساس دلانا آتا ہی نہیں تھا۔ وہ کہہ ہی نہیں سکی کہ حمزہ آپ کے علاوہ میرا یہاں اور کون ہے...... ایک آپ سے ہی زندگی کی ہر خوشی جڑی ہے، آپ کا انتظار کرنا، آپ کو سوچنا کتنا خوب صورت ہے۔ ایسے میں آپ کے انتظار کے بنا کھا لینا میری اس خوشی کو چھین لے گا۔

وہ بھوکے پیٹ ہی لیٹ گئی۔ کچھ آنسو اس کے گالوں پر لڑھک کر ٹھوڑی تک آگئے تھے۔

حمزہ نے رات کے جانے کس پل کروٹ لی تو بے اختیار اس کی آنکھ کھل گئی۔ زیرو بلب کی روشنی میں سوئی منزہ کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔

شاید روئی بھی تھی۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ حمزہ کے دل کو ایک دم کچھ ہوا تھا۔ وہ بہت معصوم تھی اور وہ اس کے ساتھ کیا کر رہا تھا۔ شاید...... وہ اسے دھوکا دے رہا تھا۔ حمزہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے ایک دم قریب کرلیا۔ منزہ نے کچی نیند سے بھری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گلابی ڈورے حمزہ کو مزید کمزور کر گئے۔

"سوری......" حمزہ کی آواز شدتِ جذبات سے بھاری ہو رہی تھی۔

منزہ نے اپنا آپ اس کے سینے میں چھپا کر اپنی صاف دلی کا مزید احساس دلایا۔ اگلا پل حمزہ کے لیے بہت بے اختیار تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے رشتے میں جو خوب صورتی اور آپس کے ساتھ کا سکون دیا ہے وہ نہ ہوتو شاید انسان حیوانوں سے کہیں بدتر ہو جاتے۔

صبح بہت خوب صورت تھی۔ منزہ بہت چہک رہی تھی، اتنی کہ حمزہ خود چونک، چونک کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ ازدواجی خوشی عورت کو کسی ہار سنگار کی طرح خوب صورت کردیتی ہے۔ حمزہ کو دلی طور پر شرمندگی ہوئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا تھا کہ وہ ماریہ کی جانب تیزی سے بڑھتے قدم روک لے گا۔

☆☆☆

لیکن ماریہ تو کسی اور ہی موڈ میں تھی جس نے حمزہ کی ہر سوچ پر پانی پھیر دیا تھا وہ جس طرف بھی منہ موڑتا تھا، وہ اسی طرف سے آن کھڑی ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بند گلی ہے، جس میں وہ پھنس کر رہ گیا ہو۔ اس کا کمزور نفس تعریف، چاپلوسی اور اداؤں میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

ماریہ حسین تھی لیکن اتنی حسین نہیں تھی کہ حمزہ کو متاثر کرسکتی لیکن اس کی حد سے زیادہ نچھاور ہونے کی ادا اور بات، بات پر حمزہ کی تعریف کرنا اسے بے انتہا اہمیت دینا، حمزہ کو کمزور کر رہا تھا۔ اب حمزہ کے لیے ایک مرحلہ بن گیا تھا خود کو بچانا...... اور وہ آہستہ آہستہ ماریہ کے قریب ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

فاروق کسی کام سے اس شاپنگ مال میں آیا تھا۔ اپنے دوست کے ساتھ ہی وہ مال کے ایک کیفے میں آیا تھا۔ یہاں نیم روشنی اور تیز آواز کے میوزک میں جوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے میں گم تھے۔

فاروق، جس ٹیبل پر آ کر بیٹھا وہاں سامنے ہی ماریہ اور حمزہ ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ فاروق دُہرے شاک میں تھا۔ ماریہ بچپن سے ہی اس سے منسوب تھی۔ دوسری طرف بہنوئی...... اس کی بہن کا گھر اجڑ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں جب ماریہ اور حمزہ کی بے تکلفیاں بڑھیں تو فاروق کی اذیت میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ بے اختیار ہی ان کی ٹیبل پر جا کھڑا ہوا۔

فاروق پر آیا زلزلہ اب حمزہ اور ماریہ کے چہروں پر بھی نظر آرہا تھا۔ بالآخر وہ گھڑی آ ہی گئی جب فاروق نے، بہن کا گھر بچانے کے لیے حمزہ سے دوٹوک بات کرنے کی ٹھان لی۔ اس کے استفسار پر بہنوئی نے بھی کوئی لگی لپٹی نہ رکھی اور اس کی معصوم بہن کا قصور بتا دیا۔

"آپ کی بہن میری زندگی اور دل میں وہ خاص مقام نہیں بنا پائی جو اسے بنانا چاہیے تھا۔" حمزہ کی بات کو فاروق نے کسی زوردار تھپڑ کی طرح سہا تھا۔

"کیا کمی ہے اس میں......؟ آپ کی امانت کی امین نہیں؟ بدصورت ہے؟ دھوکے باز ہے......؟ کیا کمی ہے اس میں جو آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا۔" حمزہ کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا...... نہ ہی وہ کسی سوال کو جھٹلانے کی کنڈیشن میں تھا کیونکہ واقعی وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

☆☆☆

''ماریہ کیا بات ہے آج کل بہت خوش ہو؟'' فاروق ناشتے کی ٹیبل پر اس کے پاس بیٹھ کر ٹوسٹ پر مکھن لگا رہا تھا اور بغور ماریہ کو دیکھ رہا تھا۔

''آں...... ہاں...... شاید۔'' ماریہ جیسے کسی چوری پکڑے جانے پر بوکھلائی تھی۔

''حیرت ہے کہ تم خوش ہو اور تمہیں یقین سے پتا بھی نہیں...... یہ کیسی خوشی ہے۔'' فاروق نے ... ذو معنی بات کی تھی۔

''کیا مطلب ہے؟'' ماریہ نے اپنی تیکھی سی ناک چڑھائی تھی۔

''مطلب کی زبان نہیں ہوتی...... مگر مجھے اپنی زبان میں مطلب سمجھانا اچھی طرح آتا ہے۔'' وہ شعلے برساتی نگاہوں سے اسے دیکھتے باہر نکلا تھا۔

☆☆☆

''ٹھیک ہے تم باجی سے بات کرلو، یہ تو گھر والی بات ہے کوئی تکلف تو ہے نہیں۔'' ابو نے امی کی بات سن کر کہا تھا۔

''یہ تو ہے......'' امی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ انہیں بھی تسلی تھی کہ یہ تو واقعی گھر والی بات تھی۔ بچپن سے تو ماریہ کو مانگا ہوا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ سے ماریہ کو بہو کے روپ میں سوچا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ ماریہ کی سوچ کس قدر بدل چکی تھی۔ وہ خود کو کس روپ میں کس جگہ دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''نہیں، خالہ سے کہیں کہ یہ نہیں ہوسکتا۔'' ماریہ نے ماں کی بات سن کر غصے سے کہا۔

''لیکن میں ان سے کہوں کیا؟'' ماریہ کی امی نے پریشانی سے پوچھا۔

''صاف اور سچ......'' اس کا لہجہ کسی حد تک خطرناک تھا۔

''کیا سچ......؟'' ماریہ کی ماں نے پوچھا۔

''امی پلیز بچوں والے سوال نہ کریں، آپ میری حمزہ میں دلچسپی سے واقف ہیں۔'' ماریہ نے غصے سے کہا تھا۔

''میں نے بہت سوچا ہے ماریہ، یہ بہت مشکل ہی نہیں ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ حمزہ اگر راضی تھا تو پہلے رشتہ دیتا اب تو بہت مشکل ہے پھر ہم اس ... میں تو رہتے ہیں اور یہاں سے ہی کھاتے ہیں ... طرح تو ہم کہیں کے بھی نہیں رہیں گے۔''

''میں حمزہ سے بات کرتی ہوں تب تک آپ خالہ کو روکے رکھیں، سمجھ نہیں آتی فاروق نے مجھے ... کے ساتھ دیکھا بھی تھا پھر بھی کیسے اس بات کو ... دوبارہ رشتے کی بات کررہا ہے۔ بڑا ہی بے غیرت ہے۔'' ماریہ نے ہنستے ہوئے کہا...... اس ہنسی میں ا... کا یہ غرور بھی شامل تھا کہ وہ چھوڑے جانے کے قا... شے نہیں تھی۔

☆☆☆

''مجھے پہلے منزہ سے بات کرنی ہوگی۔'' ماریہ کی بات سن کر حمزہ نے سنجیدگی سے ماریہ سے کہا تھا۔

''کیسی حماقت کرتے ہیں آپ؟ منزہ کو پتا ... کا مطلب ہے کہ یہاں سارے گھر والوں کو خبر ہوجائے گی اور ہمارے لیے وہاں کی زمین بھی تنگ ہوجائے گی۔ آپ میرے اور میری ماں کے لیے رہنے کا بندوبست کریں۔ ہم وہاں سے نکلتے ہیں اور پھر ہمارا نکاح ہوجائے تو آپ ساری دنیا کو بتادیں مجھے اعتراض نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی پروا۔'' ماریہ نے بے حد بے نیازی سے کہا تھا۔

''ہوں......'' جواباً حمزہ کی ہوں بہت فکر مند اور پُرسوچ تھی۔ وہ خود کو کسی شکنجے میں پھنسا محسوس کررہا تھا۔ منزہ کا بے قصور اور معصوم چہرہ اور دوسری جانب ماریہ کی جانب جھکا دل...... اس کے لمس او... پیار کی شدتوں کو آزما لینے کے بعد وہ کہیں اور کا نہیں رہا تھا۔ وہ خود کو دو حصوں میں بٹا محسوس کررہا تھا لیکن اسے کچھ کرنا تو تھا لیکن کیسے؟ یہ اس کی سمجھ ...

نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

''یار فاروق میں نے ابھی ابھی تمہارے بہنوئی اور تمہاری کزن ماریہ کو سر امجد کے روم سے نکلتے دیکھا تھا۔ تمہاری کزن تو تمہاری منگیتر بھی ہے نا؟ میں نے ان کے جانے کے بعد سر امجد سے پوچھا کہ یہ دونوں کیوں آئے تھے تو پتا چلا کہ اپنے شناختی کارڈ وغیرہ جمع کروا کر گئے ہیں۔ کل دونوں کورٹ میرج کررہے ہیں۔'' ایڈووکیٹ احمد جو فاروق کا دوست تھا، آج کل بیرسٹر امجد کے چیمبر میں بیٹھتا تھا اور جونیئر وکیل کے طور پر جاب کررہا تھا۔ اس نے فاروق کو فون کرکے کہا تھا۔

فاروق کے سر پر جیسے دھماکا ہوا تھا۔ وہ خود کو ایک دم بہت بے بس محسوس کررہا تھا۔

''یار تم ایک فیور کرنا اگر رات تک میں تمہیں کال کروں تو تم فوراً آجانا۔'' فاروق نے بے حد بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ضرور یار...... منزہ میری بھی بہن ہے۔ اس کا گھر بچانے کے لیے میں جو کرسکا ضرور کروں گا۔'' احمد نے فوراً اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ فاروق کو فوراً کچھ سمجھ نہیں آئی۔ اسے دادی اماں کی بچپن سے پڑھائی ایک نصیحت یاد آگئی۔ ''جب کوئی ایسی مشکل آن پڑے جہاں دل ودماغ کوئی مدد نہ کرے تو حاجت کے نوافل پڑھ کر اللہ سے مدد مانگنی چاہیے۔'' فاروق نے ایسا ہی کیا۔

وہ اپنی بہن کا صرف گھر نہیں بچانا چاہتا تھا وہ تو پھر بھی بس سکتا تھا کسی کے ساتھ بھی ساری دنیا میں ہزاروں لڑکیوں کی طلاقیں ہوتی ہیں۔ ان کے گھر ٹوٹتے ہیں اور دوبارہ اللہ کے حکم سے بستے ہیں۔ وہ اپنی بہن کا دل بچانا چاہتا تھا۔ اپنی معصوم بہن کا انسانوں پر اعتبار بچانا چاہتا تھا۔ اپنے بوڑھے ہوتے ماں، باپ کا سکون بچانا چاہتا تھا۔ اپنے چھوٹے

بھائی کی بے فکری بھری زندگی بچانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گھر اجڑ کر دوبارہ بس جاتے ہیں لیکن اعتبار، سکون، بے فکری اور دل اجڑ کر بسنا قسمت سے ہوتا ہے۔ زیادہ تر یہ اجڑ کر بستے نہیں ہیں اور دلوں کو ساری زندگی کا روگ لگ جاتا ہے۔ جیسے ہی فاروق نے نوافل ختم کیے گھر کا لینڈ لائن نمبر دوبارہ بجا تھا۔ وہ دعا مانگتے مانگتے اٹھا تھا۔ دوسری جانب منزہ کی ساس تھیں ان کے ہاں نواسی کی پیدائش ہوئی تھی اور وہ اپنی سمدھن سے بات کر کے اپنی خوشی شیئر کرنا چاہتی تھیں۔ تین نواسوں کے بعد اللہ نے انہیں نواسی دی تھی۔

فاروق کو بس چند سیکنڈ لگے تھے فیصلہ لیتے۔ اسے ایک دم سے اس مسئلے کا حل نظر آیا تھا۔

''آنٹی، مجھے آپ سے بہت اہم بات کرنی ہے اور بہت جلد...... یہ میری بہن کی زندگی کا مسئلہ ہے۔''

''خیریت ہے بیٹا......؟ منزہ سے ابھی میری گھر بات ہوئی تھی۔ وہ تو ٹھیک تھی ایسی کیا بات ہے......؟'' منزہ کی ساس کا گھبرانا بے حد نیچرل تھا۔

''آنٹی پلیز آپ حمزہ یا منزہ سے کوئی بات نہ کریں...... بس مجھے اجازت دیں کہ میں ابھی آ کر آپ سے اسپتال میں مل لوں۔'' فاروق کے لہجے میں بے حد منت تھی۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ انہیں ملنے کے لیے حامی بھرنی ہی پڑی۔

''ٹھیک ہے آجاؤ۔'' انہوں نے گرین سگنل دے دیا تھا۔

☆☆☆

فاروق اور اس کے دوست کی ساری بات سن کر انہیں شرمندگی اور غصے نے بیک وقت گھیرا تھا۔ وہ مزاج کی سخت ضرور تھیں لیکن اصولی تھیں کسی کی حق تلفی کرنے کی روادار نہ تھیں۔ انہیں اپنے بیٹے کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔

''بیٹا تم مجھ سے جو تعاون چاہتے ہو، میں کروں گی۔'' انہوں نے خلوصِ دل سے ... بھری تھی۔

''تھینک یو آنٹی...... میرے لیے بھی دعا کر... جو کام میں کرنا چاہتا ہوں۔ عافیت کے ساتھ ... تکمیل تک پہنچ جائے۔'' فاروق نے بے حد ... سے کہا تھا۔

''انشاء اللہ!'' انہوں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

☆☆☆

''یہ سب کیوں فاروق......؟'' امی ا... دونوں بہت حیران تھے۔ فاروق کی ڈیمانڈ اور ام... سن کر وہ حیران تھے۔

''امی یہ احمد آپ کے پاس بیٹھا ہے، پوچھ... کہ کمپنی کو ڈاکومینٹس آج ہی چاہئیں ورنہ میر... کورس کا چانس نہیں ہے۔ احمد کو میں ڈاکومینٹس د... کر آج ہی اسلام آباد بھیجنا چاہتا ہوں۔'' فاروق... ماں باپ سے بے حد اصرار سے کہا تھا۔ جواباً امی... کو فاروق کی اتنی عجلت کو مجبوراً قبول کرنا پڑا تھا۔

''ٹھیک ہے ہم نکاح میں ابھی کسی رشتے دا... نہیں بلائیں گے ورنہ رشتے دار بہت باتیں بنا... گے۔ بعد میں تم لوگوں کی شادی پر اکٹھے ہی بلا... گے۔'' امی نے بد دلی سے کہا۔

صبح تک اس گھر میں تقریب کی کوئی پلا... نہیں تھی اب بیٹھے بٹھائے وہ تقریب ارینج کر... جس کا ارمان انہیں بڑے عرصے سے تھا۔ ایسے... فوراً وہ اپنے ارمان پورے نہیں کر سکتی تھیں۔ ا... بس اسی بات کا دکھ تھا۔

''ٹھیک ہے امی، آپ اب خالہ کو بھی سب بتا... آدھے گھنٹے بعد مولوی صاحب آجا... گے۔'' فاروق نے تو کھلبلی مچا دی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' امی، خالہ کے گھر کی جانب بڑھی تھیں۔

☆☆☆

''یہ سب کیا بکواس ہے؟ میں نہیں کر رہی فاروق سے نکاح۔'' ماریہ نے چلا کر ماں کو انکار کیا تھا۔

''تو بتا دو میں کیا کروں؟ تمہیں کہا بھی تھا کہ حمزہ سے بات کرو مگر تم نے کوئی قدم نہیں اٹھایا اور یہاں پر میں پھنس کر رہ گئی ہوں۔ کیا کہہ کر انکار کروں۔ تمہارے ساتھ خود بھی سڑک پر آجاؤں کیا؟'' خالہ نے غصے سے کہا تھا۔

ماریہ نے زچ ہو کر حمزہ کو ایک بار پھر فون ملایا مگر وہ بار بار کٹ رہا تھا۔ گھر فون کیا تو منزہ کی چھوٹی نند نے ہی ہر بار اٹھایا اور بتایا کہ بھائی باہر نکلے ہیں پتا نہیں کہاں گئے ہیں۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ منزہ کو فون کیا تو وہ خود راستے میں تھی یہاں آنے کے لیے۔ اس کی آخری بار حمزہ سے صبح بات ہوئی تھی۔ ماریہ کو حمزہ پر بے حد غصہ آیا تھا کہ کیسی بیوی ہے جسے اپنے میاں کے محلِ وقوع کا پتا نہیں تھا۔

''حمزہ...... حمزہ پک اپ دا فون۔'' ماریہ بار بار ٹرائی کرتی جاتی اور کال کر رہی تھی لیکن کوئی رسپانس نہیں تھا۔

''امی میں خود جا کر پتا کرتی ہوں۔'' ماریہ نے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر امی نے زور سے اسے کھینچا۔

''تمہیں اس وقت گھر سے باہر بھیج کر میں ساری زندگی خاندان والوں کو منہ نہیں دکھا سکتی۔'' ماریہ کی امی نے بے حد سخت لہجے میں کہا۔

''امی مجھے جانے دیں، میری زندگی کا سوال ہے۔'' وہ تڑپ رہی تھی۔

''ہماری زندگی کا سوال تھا تبھی تو اتنے عرصے سے بکواس کر رہی تھی کہ تمہیں جو چاہیے عملی طور پر بندوبست کرو۔ میں نے بہت ساتھ دیا تمہارا مگر اب اس عمر میں بڑھاپے میں سڑک پر آجاؤں...... نہ بابا...... نہ...... میں کسی طور پر یہ رسک نہیں لے سکتی۔'' امی نے صاف جواب دیا تھا۔

ماریہ کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ قسمت ایسے پلٹا کھائے گی اور وہ جیتی بازی ہار جائے گی۔ کل صبح وہ اور حمزہ نکاح کرنے والے تھے سب ٹھیک چل رہا تھا۔ بہت پلاننگ کے ساتھ...... لیکن ایک دم جیسے سب گڑبڑ ہو گیا تھا۔ کوئی بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ جو یہ سب ایک دم کرنا پڑ رہا تھا لیکن وہ کہاں چُوکی تھی یہ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

حمزہ کو اس نے اسپتال، گھر، ہر دوست ہر جگہ ڈھونڈا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے ایوائڈ کر رہا تھا لیکن کیوں......؟ وہ تو اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کے بنا اس کا دم گھٹتا لگتا تھا۔

''حمزہ......'' ماریہ ایک دم رو پڑی تھی۔ ''تم کہاں ہو......؟ مجھ سے میری زندگی کا حق چھینا جا رہا ہے۔'' ماریہ نے بے حد بے بسی سے سوچا۔

وہ بہت غلط کرنے جا رہی تھی لیکن اسے اپنا غلط اقدام غلط نہیں لگ رہا تھا بلکہ اپنے ساتھ فاروق کا نکاح زیادتی اور غلط لگ رہا تھا۔

دوسری جانب فاروق کی intention s بہت سچی تھیں۔ اللہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ تبھی تو صرف آدھے گھنٹے بعد ماریہ تجمل سے وہ ماریہ فاروق ہو چکی تھی۔

فاروق نے جب نکاح نامے پر سائن کیے تو اسے بے اختیار احساس ہوا کہ جیسے اس نے چڑیا کے پر کاٹ دیے ہوں۔ لیکن ساتھ ہی نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا کہ وہ ایسی عورت کو کیونکر بیوی کا درجہ دے گا جو کردار کی غازی ہرگز نہ تھی۔

☆☆☆

حمزہ کی امی نے جھوٹ موٹ کا ہارٹ اٹیک کا ڈراما رچا کے بیٹے کو روک لیا تھا۔ اسے بہن کی بیٹی دکھانے کے بہانے بلا کر وہ حمزہ کے لیے ایک دیوار بن گئی تھیں۔ بہن نے حمزہ کا سیل فون اس افراتفری میں تھمایا...... ماں کبھی کہیں اور کبھی کہیں درد کی پکار لگا کر بیٹے کو مصروف اور پریشان رکھے رہیں۔ کوئی

تین گھنٹے بعد حمزہ کو اندازہ ہوا کہ اس کی امی کو جان کا خطرہ نہیں ہے بس کوئی ٹینشن تھی لیکن پھر بھی وہ رات بھر اپنی ماں کے ساتھ رہا کیونکہ اس کی ماں اسے ہر پل ساتھ دیکھنا چاہ رہی تھیں۔

حمزہ کو لگا کہ امی کچھ اپنی کیفیت سے گھبرا گئی ہیں۔ اس کا ان کے پاس ٹھہرنا ہی بہتر ہوگا۔ اس سارے دورانیے میں امی نے اتنا پریشان رکھا کہ اسے اپنے فون کے دور ہونے کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔ اس دوران بتول باجی سب میسج اور کال ہسٹری ڈیلیٹ کر چکی تھیں۔ یہ سب انہوں نے حمزہ اور منزہ کی بھلائی کے لیے کیا تھا اور وہ اپنے کیے پر بالکل شرمندہ نہ تھیں۔ حمزہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی زندگی بدل چکی ہے، کل نکلنے والا سورج اپنے ساتھ اس کے لیے کیا شاکنگ نیوز لا رہا تھا جو اسے واقعی ہلانے کے لیے کافی تھی۔

☆☆☆

"السلام علیکم!" منزہ کی چہکتی آواز پر حمزہ نے آنکھیں کھولی تھیں۔

"وعلیکم......" حمزہ آدھا سا جواب دیتا آنکھیں ملتا اٹھا تھا۔

"امی اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا، مجھے کیوں نہیں بلوایا؟" منزہ نے ساس کے گلے لگ کر کہا جو بظاہر چہرے پر نقاہت سجائے آرام سے بستر پر لیٹی تھیں۔ رات بھر حمزہ نے ماں کے سرہانے گزاری تھی۔ اسے امی نے کسی طرف توجہ دینے ہی نہیں دی تھی۔ جب بھی ان کی آنکھ کھلتی تو وہ حمزہ، حمزہ کی پکار لگا دیتی تھیں۔ حمزہ حقیقت میں گھبرا گیا تھا۔ اس کی امی تو بہت بہادر عورت تھیں، انہیں اتنا کمزور پڑتے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"تم ایک آدھ دن کو تو میکے جاتی ہو کیوں تنگ کرتی، میں تو اپنے حمزہ کے پاس تھی۔ میرے لیے میرے اللہ کے بعد میرا بیٹا کافی ہے۔ کیوں حمزہ......؟" امی نے مان سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"بالکل امی......" اس نے ماں کے ہاتھ چومتے ہوئے کہا اور دروازے پر کھڑے فاروق کے دل نے بے اختیار اس عورت کو سلام کیا تھا جس کی سختی اور اصول پرستی کی وجہ سے سب گھبراتے تھے۔ آج انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ زبان کی سخت ضرور تھیں لیکن دل کی بے حد اچھی انسان تھیں۔

"آؤ فاروق کیسا رہا تمہارا فنکشن؟" حمزہ کی امی خبر کا آفیشل بلاسٹ کرنے والی تھیں۔

"جی آپ کو فون پر تو بتایا تھا کہ یہ میرے کورس پیپرز کی وجہ سے اچانک کرنا پڑا۔ اس لیے کچھ بھی نہیں کیا، آج امی نے آپ سب کو کھانے پر بلایا ہے اگر آپ کی طبیعت ٹھیک ہو تو ہم کھانا آج کر لیتے ہیں ورنہ جب آپ بہتر محسوس کریں تب ہم کر لیں گے۔" فاروق کی باتیں حمزہ کو بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔

"حمزہ، بھائی کو مبارک باد تو دو اس کا کل نکاح تھا مجھے فون کر کے بلایا تھا لیکن پھر میری طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ مجھے تو کچھ یاد ہی نہیں رہا۔" انہوں نے اس طرح بات خود پر لی کہ حمزہ کبھی منزہ سے نہ بلانے کا شکوہ تک نہیں کر سکتا تھا۔

"بے شک آنٹی آپ بہت عظیم ہیں۔" فاروق نے دل ہی دل میں انہیں سراہا تھا۔

"مبارک ہو، کہاں ہوا آپ کا رشتہ......؟" حمزہ نے کچھ شرمندگی سے فاروق کو مبارک باد دی کیونکہ حمزہ کے ساتھ فاروق اپنی منگیتر کو دیکھ چکا تھا پھر وہ تقریباً ان کی آپس میں دلچسپی بھی جان چکا تھا۔ ماریہ سے اس کا رشتہ ٹوٹنے کی وجہ وہ دل سے جانتا تھا۔ اس لیے وہ جانتا تھا کہ فاروق بھی اب ماریہ کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کرے گا۔ یقیناً اس کا رشتہ کسی اور کے ساتھ ہوا ہوگا۔

"خیر مبارک...... میرا رشتہ تو open تھا۔ secret تھا۔ ماریہ میرے بچپن کی منگیتر تھی اب وہ میری منکوحہ ہے۔" فاروق نے ایک، ایک لفظ پر زور دیا تھا۔

حمزہ کو ایک دم لگا جیسے اس کے سر پر دھماکا ہوا تھا لیکن نہیں شاید یہ نہیں تھا بلکہ اسے لگا تھا کہ وہ کسی دلدل میں دھنس گیا ہو۔

"کیا...... کیا......؟" حمزہ تو جیسے اس بات پر اچھل پڑا تھا۔ حمزہ کی امی کو بیٹے کا چہرہ دیکھ کر دکھ ہوا تھا لیکن اندر سے اپنے بیٹے کا گھر بچتا دیکھ کر سکون بھی آ گیا تھا۔

"جی...... اس میں کوئی حیرت کی بات تو نہیں ہے۔" فاروق نے نہایت کانفیڈنس سے کہا تھا۔ حمزہ کا چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا تھا۔

"آنٹی میں پھر چکر لگاؤں گا۔ آپ کا جو پروگرام ہو، آپ مجھے انفارم کر دیجیے گا۔" فاروق کے دل میں نفرت کے بگولے اٹھنے لگے تھے۔ جب سے اس نے نکاح نامے پر دستخط کیے تھے۔ اس کے دل میں آگ سی لگی تھی۔ ایک عجیب سی نفرت تھی۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ یہ کیوں ہے۔ اس لیے خود سے ہی گھبرا رہا تھا۔ اسی گھبراہٹ میں وہ ایک دم باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"تم!" فاروق نے بے حد نفرت سے ماریہ کو دیکھا تھا۔ "یہ تمہارا خوب صورت چہرہ تمہارے بدصورت دل کا ساتھ نہیں دے رہا...... یہ تو تمہارے دل جیسا ہونا چاہیے ناں......؟" فاروق کی پھنکارتی ہوئی آواز ماریہ کی روح تک کو دہلا گئی تھی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب ماریہ نے دکھتے وجود کے ساتھ دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ چکرا کر گر گئی۔ اس کی سزا کا فیصلہ کر کے اس کا ناخدا خراٹے لے کر بے حد سکون سے سو رہا تھا۔ ماریہ کو اس نرم بستر پر سونے کی

اجازت نہیں تھی۔ وہ زمین پر بیٹھی تھی۔ فاروق نے اسے بیلٹ سے مارا تھا۔ دبئی آنے تک وہ خاموش تھا۔ آج اس کے دفتر کے قریبی لوگوں نے ان کا کھانا کیا اور ان کے گھر کو سجایا تھا۔ وہ بھی فاروق کے ایک دوست کی بیوی کی مدد سے تیار ہوئی تھی۔ بظاہر سب ٹھیک تھا لیکن جیسے ہی قریبی لوگوں اور احباب کی دھند دونوں کے قریب سے چھٹی تو فاروق نے اسے اس کی اصلیت یاد دلا دی تھی۔

فاروق اس کا مقام تو باڈی پر لے آیا تھا۔ ماریہ کی زندگی کا بھیانک اور نہ ختم ہونے والا دور شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

"سوچتی ہوں کہ خدا اور اس کا انصاف کیسا ہوگا...... جب، جب میں فاروق کی جانب سے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتی ہوں تو دعا کرتی ہوں کہ میں مرجاؤں پر مجھے مرنے سے بھی ڈر لگتا ہے اگر میرے گناہوں کی سزا اس دنیا میں اتنی کڑی ہے تو اس بارگاہ میں میری سزا کیا ہوگی، وہ سب جہانوں کا خالق و مالک ہے۔" ماریہ نے بے حد نقاہت سے آمنہ آنٹی کو بتایا تھا وہ اس کے زخم صاف کر رہی تھیں۔

"تم اپنے گھر والوں کو کیوں نہیں بتاتیں؟ تین سال...... گزشتہ تین سال سے تم روز مار کھاتی آ رہی ہو، زخمی ہو کر دنوں بے سُدھ پڑی رہتی ہو، تمہارے اپنے تمہیں بچالیں گے...... تم انہیں بتاؤ تو۔" آمنہ آنٹی نے نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر کہا تھا۔

"آمنہ آنٹی...... ! میری ماں تو...... میری پہلی فون کال پر ہی مر گئی تھی۔ یہاں آئے مجھے چار ماہ ہو چکے تھے...... جب ایک دن مجھے فاروق کا موبائل مل گیا، میں نے گھر کال کر کے اپنی ماں کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ مجھے لگا کہ وہ مجھے آزاد کروائیں گی لیکن وہ تو اسی رات خود زندگی سے آزاد ہو گئیں۔" ماریہ سسک سسک کر رو دی۔

آمنہ آنٹی نے بے حد دکھ سے ماریہ کے وجود کو دیکھا تھا۔

"اب پیچھے میرا... دکھ درد پوچھنے والا کوئی نہیں۔ میں اکیلی ہوں بالکل اکیلی......" وہ بری طرح رو رہی تھی۔

"بیٹی تین سال ہو گئے جبکہ تم نے اپنا گناہ تو بھی کیا، معافی بھی مانگی پھر تمہارا مجازی خدا کیوں تمہیں معاف نہیں کرتا......؟ ایک گناہ گار تو بچے دل سے اگر توبہ کر لے تو اس کا رب بھی اسے معاف کر دیتا ہے مگر ہم انسان......" وہ چپ ہو گئی تھیں۔

"آنٹی آپ کو میرے گناہ کا اندازہ ہے؟" ماریہ نے اپنی طرف سے آمنہ آنٹی پر کوئی راز منکشف کرنا چاہا۔

"ہاں، پتا ہے تم اپنی کزن کے شوہر کے ساتھ ناجائز تعلق رکھے ہوئے تھیں اور شادی بھی کرنے جا رہی تھیں اور وہ کزن تمہارے شوہر کی بہن تھی، ہے نا......؟ تین سال سے دیوار پار تمہاری چیخوں اور تمہارے گناہوں کی کہانی میں مسلسل سن رہی ہوں۔"

آمنہ آنٹی کا اپارٹمنٹ ساتھ ہی تھا۔ وہ نومسلم تھیں مگر ایک سچی مسلمان تھیں ان کے شوہر ان سے تیرہ سال چھوٹے تھے۔ وہ بہت نرم خو اور بہت نیک انسان تھے۔ آنٹی سے ان کی محبت کی شادی ہوئی تھی اور گزشتہ تیس پینتیس سال سے وہ بے حد پُر محبت ازدواجی زندگی بسر کر رہے تھے۔ احمد انکل کی زندگی کے ہر سکھ دکھ میں آمنہ آنٹی ساتھ کھڑی ہوتیں۔ ان کے دو ہی بیٹے تھے، ایک امریکا میں تھا دوسرا کینیڈا میں۔ ان کو اولاد کی تابعداری، کامیابی اور خوشی حاصل تھی۔ وہ بہت مطمئن تھے، دن کے آدھے حصے میں وہ اپنے اسٹور پر ہوتے آدھا حصہ ان کا مسجد میں بچوں کو قرآن پاک پڑھانے میں گزرتا دونوں میاں بیوی کو پیسے اور دولت کی لالچ نہیں تھی۔

دونوں نے اپنی زندگی حقوق العباد ادا کرنے میں وقف کر رکھی تھی۔ ایسے میں جب وہ دیوار پار ماریہ کی چیخیں سنتیں تو بے حد دکھی ہو جاتی تھیں۔ کئی بار ماریہ سے کہا کہ وہ یہاں کی پولیس کو فون کر دے یا اپنے گھر پاکستان فون کر دے مگر وہ نہیں مانتی تھی۔ ایسے جیسے وہ اپنی اس زندگی کو قبول کر چکی ہو۔

"ماریہ تم کیا سمجھتی ہو، تمہارا گناہ اللہ کی رحمت سے بڑا ہے تو پھر تم اللہ سے نہ معافی مانگو نہ ہی اس سے امید رکھو۔" آمنہ آنٹی جاتے جاتے اس سے کہہ گئی تھیں درحقیقت وہ اس کے لیے سوچ کا ایک نیا در کھول گئی تھیں۔

☆☆☆

"فاروق صاحب آپ اس بار عید اپنے گھر پاکستان میں کریں گے؟" فاروق ظہر کی نماز پڑھ کر کمرے میں آیا تو...... اس کے دفتر کے ایک ساتھی نے پوچھا تھا۔

"آہ...... ہا...... ہاں شاید......" فاروق ہمیشہ پاکستان جانے کے نام پر بوکھلا جاتا تھا۔ گزشتہ تین سالوں میں وہ خود ایک دوبار چند دن کے لیے پاکستان گیا تھا لیکن اس کے اکیلے پاکستان جانے پر سب کے سوالات سے گھبرا کر وہ جلد ہی واپس آ گیا۔ ایسے میں وہ کسی تہوار کے آنے پر بوکھلا جاتا۔ یہاں پر موجود لوگوں کے سوال...... اُدھر پاکستان میں موجود لوگوں کے سوال...... اور اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ کیا وہ ماریہ کو سزا دے رہا تھا یا وہ خود قیدِ تنہائی کاٹ رہا تھا۔

والدین اور بہن بھائی سے دور وہ کیا کر رہا تھا۔ ماریہ کو سزا دینے کے لیے خود کو سب سے دور کر دیا تھا۔ کیا ماریہ کی سزا اتنی اہم تھی کہ وہ اپنی زندگی کے اتنے اہم دن ضائع کر دے۔ اسے اپنی جوانی کے ضائع ہونے کا بھی ایک دم سے دکھ ہونے لگا تھا۔

آج جب وہ گھر آ رہا تھا تو ایک مختلف سوچ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اسے زندگی کا سکون حاصل کرنے کے لیے بلاشبہ ایک نیک عورت کا ساتھ بھی چاہیے تھا۔

☆☆☆

عجیب سلسلۂ جستجو ہے
جہاں سے ختم ہو رہا ہے
وہیں پہ ایک اور کچھ شروع ہے
عجیب سلسلۂ جستجو ہے

"اے میرے ربّ! بے شک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے لہٰذا تو میری مغفرت فرما، چنانچہ اللہ نے اسے بخش دیا، بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔" جوں جوں ماریہ اس دعا کو پڑھتی جاتی تھی اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ مایوسی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔

"اے میرے رب! بے شک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے......" ماریہ کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ "لہٰذا تو میری مغفرت فرما۔" ماریہ کو دعا مانگتے مانگتے فاروق کے بیلٹ سے مارے گئے کوڑے یاد آ گئے اس کا دل پھر ڈگمگایا کہ کیا واقعی جو مانگ رہی ہے وہ اسے ملے گا بھی کہ نہیں۔

"بے شک وہ بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔" دعا کا آخری حصہ ایسا تھا کہ ماریہ کو اپنے جلتے جہنمی جسم پر ایک دم ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا۔

"ہاں...... میں یہ کیوں بھول گئی کہ اللہ تو بہت مہربان اور بخشنے والا ہے۔" ماریہ کے دل و دماغ نے ایک دم سے اسے اندھیرے سے روشنی میں لا کھڑا کیا تھا۔

یہ باترجمہ دعا آمنہ آنٹی نے اسے لا کر دی تھی۔ وہ سالوں سے نماز نہیں پڑھ رہی تھی۔ اتنے عرصے سے فاروق نے اسے جہنمی کا ٹائٹل دیا تھا، اسے لگتا تھا کہ نماز نیک لوگوں کا کام ہے اور وہ چونکہ بری عورت ہے تو اس کا نماز پر بھی حق نہیں ہے۔

آج جب وہ آمنہ آنٹی کے ہمت دلانے پر نماز

کے لیے کھڑی ہوئی تو ایسا لگا کہ وہ نماز بھول گئی ہو۔ آمنہ آنٹی نے اسے ہمت دلائی تھی۔ بہت ہمت اور مشکل سے وہ خود کو اپنے رب کے حضور کھڑا کر پائی تھی۔ اٹک، اٹک کر اپنے آنسوؤں کی یلغار میں وہ بہ مشکل نماز مکمل کر پائی تھی۔

یہ اس کی توبہ کی پہلی نماز تھی! ایک گناہ گار کی شرمندگی کا اظہار تھا۔ وہ سالوں سے اس توبہ کے موقع کو ترس رہی تھی لیکن ایک احساسِ کمتری اور مایوسی میں فاروق نے اسے بری طرح مبتلا کر دیا تھا کہ وہ اتنی زیادہ گناہ گار ہے کہ اس کی معافی ناممکن تھی لیکن آج اس کے گرد اندھیرا چھٹا تو اس نے جانا کہ وہ دنیا میں تنہا نہیں ہے بلکہ اس کا اللہ اس کے ساتھ ہے۔

☆☆☆

"بھائی پاکستان چکر لگائیں ناں آپ دونوں...... امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ آپ لوگوں کو دن رات یاد کرتی ہیں۔" منزہ نے فاروق سے فون پر اظہار کیا تھا۔

"آں...... ہاں...... میں کوشش کروں گا کہ جلد ہی چکر لگاؤں۔" فاروق کو اپنی آواز بے حد کمزور محسوس ہوئی تھی۔

"نہیں بھائی! اس بار کوشش نہیں...... یقیناً آنا ہے۔ چار سال ہو گئے آپ تو پردیس جا کر اپنوں کو ہی بھول گئے۔"

"نہیں منزہ، میں ضرور آؤں گا۔" اس نے بہن کو یقین دلایا تھا۔

"بھائی اکیلے نہیں ماریہ بھابی کو بھی ساتھ لے کر آنا ہے، امی کا اصرار اور حکم دونوں ہی ہیں۔ اللہ جانے انہوں نے خواب میں خالہ کو کیا کہتے دیکھا ہے، اب اٹھتے بیٹھتے ایک ہی رٹ ہے ماریہ کو پاکستان واپس بلاؤ...... میری بہن کو تکلیف ہے، میں نے خواب دیکھا ہے۔" فاروق نے فون بند کر دیا تھا۔ منزہ کہہ رہی تھی اور فاروق نے حیرت سے سامنے فرش پر لہولہان پڑی ماریہ کو دیکھا تھا۔ جس پر ابھی وہ اپنا بہت سارا غصہ نکال کر ہٹا تھا۔ وہ روز بروز خاموش سے خاموش تر ہو گئی تھی اور اس کی خاموشی فاروق کو بہت زیادہ تاؤ دلاتی تھی۔

پہلے وہ اس سے معافیاں مانگتی تھی۔ گڑگڑاتی تھی اب عرصہ ہوا وہ بس مار کھائے جاتی اور چپ رہتی یا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہتی۔ ایسے میں فاروق کو بے حد غصہ آتا تھا وہ آپے سے باہر ہو جاتا کہ وہ کس ڈھٹائی سے بس اسے دیکھے جاتی ہے اور اب پہلے کی طرح معافی کیوں نہیں مانگتی۔ "تو کیا ماریہ کی یہ حالت اس کی مری ماں کے لیے تکلیف کا باعث ہے؟ جس کی وجہ سے میری ماں بھی تکلیف میں ہے۔ تو میں اس کی اصلیت سب کو بتا دوں گا۔"

اس نے حقارت سے اسے گالی دی۔

مگر نہ جانے کیوں یہ سب کرنے کے بعد بھی فاروق کو چین نہ ملتا تھا۔ وہ مار مار کر خود بھی تھک جاتا تھا مگر پھر بھی تسکین نہیں ہو پاتی۔ وہ خود بھی قیدِ تنہائی اور نارسائی کا دکھ جھیل رہا تھا اور پھر...... وہ بھی ایک کمزور انسان ثابت ہوا۔ دبئی جیسے آزاد ماحول میں وہ بھی پارسا نہ رہ سکا۔ ماریہ کو جلاتے اور تڑپاتے اس نے اپنے آپ کو تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا۔ علینہ جو اکثر اسے بزنس پارٹیز میں ملا کرتی تھی اس کے قریب آتی چلی گئی اسے ایک سیٹلڈ گراؤنڈ انسان اٹریکٹ کر گیا تھا اور فاروق جو اپنے دکھوں کا مارا تھا نفس کا شکار ہو چلا۔ اب تو اتنی ہمت بھی اس میں آ گئی تھی کہ دونوں ماریہ کے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے میں گم ہو جاتے اور ماریہ کچھ کہہ بھی نہ پاتی شاید حسد کا جذبہ اس میں ختم ہو چکا تھا یا فاروق سے کبھی اسے رغبت ہی نہیں تھی جو اب کسی اور لڑکی کے لیے رقابت محسوس کرتی مگر چار سال میں اس نے اپنے ماضی

کے کیے پر فاروق سے چار ہزار مرتبہ تو معافی ضرور مانگی ہوگی اور اب وہ اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز رہتی یا اپنی ہتھیلیاں رب کی بارگاہ میں پھیلائے رکھتی۔ آج بھی جب علینہ کو فاروق کے ساتھ اس قدر بے تکلف ہوتے دیکھا تو اس کے دل سے ایک آہ نکلی تھی۔

"فاروق تم نے مجھے چار سال تک اذیت میں مبتلا رکھا کوئی لمحہ ایسا نہ گیا جب تم نے میری بھول، میری غلطی، میرے گناہ کا احساس نہ دلایا ہو مگر مجھے اس بات کا دکھ نہیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ تم مجھے جس گمراہی کی سزا دے رہے تھے اسی راہ پہ تم بھی چل نکلے ہو، جو سزا اور شرمندگی میں کاٹ رہی ہوں میری تو دعا ہے کہ میرا دشمن بھی اس مرحلے سے نہ گزرے۔" دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کی پھیلی ہتھیلیوں میں جذب ہو گئے۔ اس کی آنکھیں رو رو کر بے رونق سی ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

"تم ایک ہفتے سے زیادہ وہاں نہیں رہو گے اور اس مصیبت کو وہاں ہی چھوڑ آنا سمجھے۔" علینہ انہیں ائر پورٹ چھوڑنے آئی تھی مگر بہ آواز بلند فاروق کو نصیحتیں کر رہی تھی۔ ماریہ جہاز میں اس کے ساتھ ایسے بیٹھی جیسے کوئی انجان اور اجنبی بیٹھا ہو۔ اس کا دھیان کہاں تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ سارے رستے فاروق اسے دھمکاتا آیا تھا۔ اس نے ایک بار بھی اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ کیا سوچتی رہی تھی، وہ ذہنی طور پر کہاں رہتی تھی۔ فاروق کے لیے وہ ایک عرصے سے بند دروازہ بن کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

حمزہ نے جانماز لپیٹ کر اپنے دونوں بچوں کو دیکھا تھا جو اس کے دائیں بائیں آ کر بیٹھ گئے تھے۔

"پاپا......! جوائے لینڈ......" دونوں نے مطالبہ کیا تھا۔

فرسٹ کزن

ایک قصاب، ڈاکٹر کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "میں آپ کا فرسٹ کزن ہوں۔"

ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

قصاب اطمینان سے بولا۔ "وہ اس طرح کہ میں بکروں کی کھال کھینچتا ہوں اور آپ انسانوں کی۔"

مرسلہ: ارم خالد...... اوکاڑہ

"اپنی ماں کو تیار کر لو پھر چلتے ہیں۔" حمزہ کافی بدل گیا تھا وہ بہت پُرسکون ازدواجی زندگی جی رہا تھا۔ جڑواں بچے اس کی زندگی کی رونق کو مزید بڑھا گئے تھے۔

☆☆☆

جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ فاروق نے مڑ کر اپنے ساتھ بیٹھے بُت کو دیکھا وہ ایک دم چونکا تھا۔

ماریہ خطرناک حد تک پیلی پڑ چکی تھی۔

"ماریہ......!" فاروق نے گھبراہٹ سے اسے پکارا وہ ایک دم آگے کو گری تھی۔ فاروق نے بے اختیار اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا تھا۔

"مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اس کا رب ہے نہایت غالب، بہت معاف کرنے والا۔"

ماریہ نے بہ آواز بلند سورۂ ص کی آیت پڑھی تھی۔ اس پل اس کی آنکھیں بند تھیں۔ فاروق نے حیرت سے اسے دیکھا، اس نے ایک دم آنکھیں کھول دی تھیں اب وہ فاروق کو دیکھ رہی تھی۔

"آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے......" ماریہ کی سانسیں اکھڑی تھیں وہ اس

کا رب ہے...... نہایت غالب، بہت معاف کرنے والا۔'' ماریہ کی سانسیں ایک دم سے تیز ہوئی تھیں اور وہ ایک دم ایک جانب لڑھک گئی۔ فاروق کو ایک عجیب سا احساس ہوا تھا جیسے اس کے ہاتھ سے کوئی ریت سی پھسل گئی ہو۔ جہاز میں اسٹریچر پر ڈال کر میڈیکل کا عملہ سیدھا ایمر جنسی روم میں لے کر پہنچا۔ وہاں موجود ڈاکٹر نے برین ہیمبرج بتایا تھا۔ جب تک ایمبولینس پہنچی ماریہ کے وجود میں سے اس کی روح آزادی حاصل کر چکی تھی۔ فاروق کو کچھ پل تو یقین ہی نہیں ہوا۔ فوری طور پر اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ دکھی ہو یا خوشی محسوس کرے۔ ایک ایسی ناپسندیدہ ہستی اس کی زندگی سے جا چکی تھی جس کے ہونے پر اسے بے حد تکلیف ہوتی تھی لیکن اس سب کے باوجود جانے کیوں اس کا دل خالی سا ہو گیا تھا۔ اسے ایک دم خود اپنا وجود ادھورا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ ایسا کیوں تھا وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

جب وہ ماریہ کی ڈیڈ باڈی لے کر آیا تو تپتی دوپہر جون کے مہینے میں ایک دم بارش شروع ہو گئی تھی۔ امی، ابو، سلمان، منزہ دکھ سے ماریہ کو دیکھتے رہ گئے، اتنی کمزور ہڈیوں کا ڈھانچا وہ پہچانی تک نہیں جا رہی تھی۔

''ماری...... میری بیٹی...... !'' امی اپنی لاڈلی بھانجی کی یہ حالت دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ وہ چلی گئی تھی بہت ساری خاموشی اور سوال چھوڑ کر۔ فاروق کی حیرت نہ ختم ہوتی تھی۔ وہ خود کو خالی ڈبے کی طرح لڑھکتا محسوس کر رہا تھا۔ اسے دفنا کر وہ اسی کمرے میں آ کر لیٹا تھا جو کبھی اس کا تھا کروٹیں لیتے لیتے جب وہ تھک گیا تو وہ بے اختیار اٹھ کر اس بیگ کے پاس آ بیٹھا تھا جو ماریہ کا تھا۔ چھوٹا سا بیگ صرف ایک سوٹ، ایک چادر اور ایک ڈائری پر مشتمل اسے ایک دم یاد آیا کہ اس نے آج تک ماریہ کو گرمی سردی کا کوئی لباس نہیں خرید کر دیا تھا۔ اس کے پاس ضرورت کی کوئی چیز تھی یا نہیں تھی اس نے کبھی نہیں پوچھا تھا۔ گھر میں کبھی کھانے یا پینے کو کچھ ہو یا نہیں ہو اس نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ ماریہ کیا کھاتی تھی......؟ اس کے دماغ میں پہلا سوال گونجا تھا۔ وہ تو کھانا باہر کھا آتا تھا، کبھی کبھی دودھ گھر آتا تھا چائے کے لیے...... اس نے تو کبھی راشن بھی گھر میں نہیں ڈالا تھا۔ کبھی کبھار اس کے ساتھ گھر میں کھانے کی کوئی چیز آ جاتی یا کبھی پھل وغیرہ تو پھر ماریہ چار پانچ سال کہاں سے کھاتی رہی اور زندہ رہی......؟ کون اسے کھلاتا تھا...... وہ کیسے زندہ تھی...... فاروق جیسے زلزلوں میں آ گیا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا، ہوش کا پہلا چھینٹا پڑا تھا اور وہ لرز رہا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے ماریہ کی ڈائری نکالی تھی۔

''دن قیامت، وقتِ حساب......

2007ء

کیسے پوچھوں......؟
ہے ایسا کیوں......؟
بے زباں سایہ جہاں ہے
خوشی کے پل
کہاں ڈھونڈوں، بے نشاں سا وقت بھی ہے یہاں
جانے کتنے لوگوں کو یہ گلے ہیں
زندگی سے کئی فاصلے ہیں
اس جتنے سپنے ہیں آنکھوں میں
لکیریں جب چھوٹیں ان ہاتھوں سے، بے وجہ
جو بھیجی تھی دعا
وہ جا کہ آسماں سے یوں ٹکرا گئی
کہ آ گئی ہے لوٹ کے صدا
سانسوں نے کہاں رخ موڑ لیا
کوئی راہ نظر میں نہ آئے
دھڑکن نے کہاں دل چھوڑ دیا
کہاں چھوڑے ان جسموں نے سائے

یہی بار بار سوچتی ہوں تنہا میں یہاں
میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے یادوں کا دھواں
جو بھیجی تھی دعا......
وہ آسمانوں سے یوں ٹکرا گئی
کہ آ گئی ہے لوٹ کے صدا......

آگے ڈائری ٹوٹے پھوٹے جملوں سے بھری پڑی تھی۔ فاروق اچانک ایک صفحے پر آ کر رکا تھا۔

اگر تو میرا پیدا کرنے والا ہے۔
اگر تو مجھے موت دینے والا ہے۔
تو میری سزا کا حق بھی تیرا ہے......
تو پھر میری معافی کا حق بھی تیرا ہے۔

اے اللہ......
تو کبھی تو میری طرف بھی دیکھ لے۔
مجھے اے اللہ انسانوں کے سپرد نہ کر۔
نہ میری سزا، نہ میری معافی انسانوں کے حوالے کر نہ ہی میری رسوائی انسانوں کے حوالے کر......

میں جانتی ہوں، میں مانتی ہوں کہ تو رحمان ہے تو مجھے معاف کر دے گا اور رسوائی سے بھی بچائے گا۔ بے شک تو نے آمنہ آنٹی اور انکل احمد کی شکل میں مجھ پر اپنا کرم کیا ہے۔

2011ء ماریہ
جو مانتی ہے کہ اللہ رحمان اور معاف کرنے والا ہے۔''

☆☆☆

2012ء

''اے اللہ فاروق کو اس رسوائی اور سزا میں نہ ڈالنا جو مجھے ملی۔ وہ اچھے سے برا بن رہا ہے۔ میں جانتی ہوں ''اچھا'' بننا اور ثابت کرنا سب سے مشکل ہے۔ اللہ تو اسے بچا لینا...... کیونکہ جو سزا رسوائی میں ہے وہ بہت بھیانک ہے جو سزا ضمیر کی ہے جو تنہائی کی ہے وہ بہت بری ہے۔ کل میں پاکستان جا رہی ہوں۔ اے اللہ تو میری خطا کو اگر معاف کر دے گا تو مجھے میرے وطن کی مٹی مل جائے گی۔''

ماریہ کی آخری تحریر تھی ڈائری میں جہاں شروع سے آخر تک مخاطب اللہ کی ذات تھی۔

فاروق کے کانوں میں بے اختیار ماریہ کے الفاظ گونجے تھے۔

''مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اس کا رب ہے نہایت غالب، بہت معاف کرنے والا۔'' فاروق کو زمین و آسمان آپس میں ملتے محسوس ہوئے تھے۔ ایک آئینہ سامنے موجود تھا جہاں اسے اپنا آپ ایک دم نظر آ گیا تھا۔ وہ ماریہ کو سزا دیتے ہوئے خود فرعون بن بیٹھا تھا۔ فاروق ایک دم زمین پر بیٹھ کر رو دیا۔ وہ خود کو کتنا پارسا سمجھ رہا تھا۔ کمرے میں ہر طرف بہت سارے آئینے اُگ آئے تھے اور ہر آئینے میں فاروق کو اپنا آپ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

''کون......؟'' فاروق نے پوچھا۔

''میں حمزہ......'' اور وہ اندر آ گیا۔ ڈھیر ساری خاموشی ان کے بیچ آن کھڑی تھی۔ وہ کتنے ہی پل ایک دوسرے کو صرف دیکھتے رہے تھے۔

''وہ میں......'' حمزہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رسماً ہی سہی وہ آیا تو تھا فاروق سے افسوس کرنے منزہ کے مجبور کرنے پر لیکن یہاں آ کر اس کے پاس الفاظ ختم ہو گئے تھے۔

''میں آپ کی وائف کا افسوس کرنے آیا تھا۔'' حمزہ نے تھوک نگل کر نظر چرا کر کہا تھا۔ اسی پل منزہ بھی بچوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔

''یہ دونوں بہت تنگ کر رہے ہیں آپ ذرا انہیں آئس کریم دلا لائیں۔'' حمزہ نے بچوں کی فرمائش کو غنیمت جانا اور فوراً انہیں لے کر باہر نکل گیا تھا۔ فاروق خاموشی سے حمزہ کے خوب صورت بچے اور اس کا مطمئن چہرہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

یہ شہرِ خموشاں تھا۔ بہت سالوں بعد وہ پاکستان آیا تھا۔ وہ ائرپورٹ سے سیدھا قبرستان ہی آیا تھا۔ ماریہ کی قبر سبزے سے بھری ہوئی تھی۔ فاروق کا سفید رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ ساری بازی ہار کر جیتی سوئی پڑی تھی۔

"تم بہت بُری ہو۔" دعا مانگ کر ہمیشہ کی طرح فاروق نے اسے مخاطب کیا۔ "کوئی ایسے بھی جاتا ہے؟ میں نے سارا وقت تمہیں سزا سنائی کم از کم مجھے سزا سنا جاتیں کوئی بدلہ ہی لے لیتیں! بدلہ کیوں نہیں لیا؟ لیکن تمہیں پتا ہے مجھے خود کو ہمیشہ اچھا بنے اور دِکھانے کا شوق تھا۔ میں تو آج بھی اس عادت سے جان نہ چھڑا پایا۔" فاروق کی آواز بھرا گئی تھی۔ "تم جو اچھائی میرے ساتھ کرگئی تھیں میں تو ضرور تم سے بدلہ لوں گا...... یہ سوچ کر آج میں نے ایک بہت بڑا ادارہ قائم کرلیا ہے جس میں اسلام کی تبلیغ اور اخلاقی تعلیم اس طرح دی جارہی ہے کہ لوگوں کو ڈرا کر نہیں پیار سے اس اچھائی کے قافلے میں شامل کیا جاتا ہے۔ پہلے والا فاروق جو گناہ گاروں کو ہانک کر جہنم کی طرف لے جاتا تھا۔ اسے پہلے بھی حق نہیں تھا کہ کسی کو جہنم کی طرف ہانکے یا جنت کی گارنٹی دے لیکن اب تو وہ کسی کی امید ختم نہیں کرتا۔"

فاروق نے آمنہ آنٹی اور احمد انکل کے ساتھ مل کر اسلام کی اخلاقیات اور حُسن سلوک کے دروس کا اہتمام کیا۔ ایسا ادارہ جو ربّ کائنات اور اس معلم اخلاق ﷺ کے ارشادات کو عام کررہا تھا کہ جس کا مقصد اسلام کی مثبت تصویر پیش کرنا تھا نہ کہ منفی...... اس کی قبر پر بیٹھا وہ آنسو بہا رہا تھا کہ معافی تو ربّ العزت بھی اپنے گناہ گار بندے کو دے دیتا ہے مگر وہ خود کیسا مسلمان تھا کہ اپنے جیسے ایک مسلمان کو معاف نہ کرسکا اسی پچھتاوے کے مداوے کے لیے اس نے ماریہ کے نام سے ادارہ قائم کرلیا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں بھائی؟" منزہ نے بھائی کے قریب آکر پوچھا تھا۔

"آں...... ہاں...... کچھ نہیں۔" فاروق نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"یہی ناں...... کہ قصور وار دونوں تھے اور سزا ایک کیوں سہہ کرگئی؟"

منزہ نے دھماکا کیا تھا۔

فاروق حیرت اور جھٹکے سے پلٹا تھا۔

"ہاں بھائی...... ماریہ نے خالہ کے فوت ہونے پر مجھے ساری سچائی بتادی تھی۔ وہ اس کی پہلی اور آخری کال تھی پھر بھی میں نے اپنی زندگی اسی طرح گزاری کیونکہ یہ ماریہ کی خواہش تھی کہ جس گھر کو بچانے کے لیے آپ انسان سے حیوان بن گئے وہ گھر ضرور بچنا چاہیے تو میں نے اپنی بھابی، بہن اور دوست کی خاطر اپنا گھر بچالیا پھر کچھ عرصے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میری کسی کوتاہی سے حمزہ بھٹک گئے تھے میں بھول گئی تھی کہ میں کون سی پرفیکٹ ہوں جانے کس بات پر اللہ پکڑلے پھر وہ جب لوٹے تو مکمل میرے تھے اور میرے بچوں کے تھے۔ بھائی آپ تو میرا اچھا کرنے نکلے تھے لیکن خود کا برا کیوں کرلیا۔ کیوں اپنا گھر نہ بسایا؟ دل بڑا کرکے معاف بھی تو کرسکتے تھے۔" منزہ پوچھ رہی تھی اور فاروق پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر رہ گیا۔

"میری تو شروع دن سے اس کے ساتھ گھر بسانے کی نیت نہیں تھی تو پھر کیسے گھر بستا، میں نے تو بس چڑیا کے پَر کاٹنے کی نیت کی تھی...... اور اسی طرح میری بہن کا گھر بچ پاتا۔" فاروق کی آواز دکھ سے بھاری ہوگئی تھی۔

"وہ تو وقتی سزا پاکر اپنے سب کام ٹھیک کرگئی تھی یہاں تک کہ اپنی واپسی بھی وہ ٹھیک کرگئی ہاں صرف اپنی......" دو آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

☆☆☆



مَیں ماں بھی تو ہوں

عقیلہ حق

پانچ فٹ چھ انچ سے نکلتا قد...... کسا کسا خوب صورت سنگِ مرمر سے تراشا ہوا بدن...... اور اس بدن پر سجی سیاہ نیٹ کی ساڑی، صراحی دار گردن میں سجا ہیروں کا نیکلس اور کلائیوں پر آنکھوں کو خیرہ کرتی وائٹ گولڈ اور ہیروں کی چوڑیاں...... بے حد حسین انگوٹھیوں سے سجی مخروطی انگلیاں، متناسب تراشے ہوئے ناخنوں پر سجی نیل پالش...... ماہرانہ انداز سے چہرے کے حسین نقوش کو ابھارتا ہوا میک اپ

...... یاقوتی لبوں سے لپٹی لپ اسٹک اور کمر پر پھیلے سیاہ بالوں کا آبشار......

اس نے مسکراتی نظروں سے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں اپنا بھرپور جائزہ لیا اور پھر ڈریسنگ ٹیبل پر سجے اَن گنت پرفیومز میں سے lady poison کی بوتل اٹھا کر...... وہ اپنے آپ کو...... خوشبو میں مہکا ہی رہی تھی کہ کمرے کے داخلی دروازے سے آنے والی آواز نے جیسے اس کے ہاتھ جکڑ لیے اور آئینے میں نظر آتے عکس کو دیکھ کر تو وہ جیسے پتھر کی ہوگئی۔

☆☆☆

''تو تم نے ہاں کر ہی دی......'' برسوں پرانا شکوہ اس کے کانوں میں گونجا...... اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

ہر طرف خاموشی تھی...... آدھی رات بیت چکی تھی، کمرے کی ہر چیز نائٹ بلب کی روشنی میں عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ اسے ایسا لگا کہ لفظوں نے کہنے والے کا وجود دھار لیا ہے۔ اس نے گھبرا کر برابر میں گہری نیند سوتے عباس کو دیکھا...... اس کے چاروں طرف الفاظ گونج رہے تھے...... شور بڑھتا جا رہا تھا، اس نے اس خوف سے آنکھیں بند کر لیں کہ کہیں اس کے چاروں طرف گونجتا شور...... عباس کو نہ جگا دے۔

☆☆☆

تابندہ نے چائے تھرماس میں نکالی اور پہلے سے تیار ٹرے میں تھرماس رکھ کر بیڈ روم میں چلی آئی...... شام کے پانچ بج رہے تھے...... عباس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا اور آفس سے آنے کے بعد وہ سب سے پہلے چائے پیتا تھا...... اور شادی کے ان بارہ سالوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ تابندہ نے ٹائم کا خیال نہ رکھا ہو۔

تابندہ ایسی تھی تو نہیں...... لیکن وقت اور...... ذمے داریوں نے اسے سرتا پا بدل دیا تھا...... جس دن وہ عباس کے ساتھ نکاح کی ڈور میں باندھی گئی... بھول گئی کہ وہ کیا ہے؟ لیکن یاد رہا تو صرف یہ کہ اس پر بے حد مان تھا...... اور ابا نے وقتِ رخصت اس کے سر پر کپکپاتا ہوا ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

''بیٹا اچھی بیٹیاں سسرالوں میں عزت اور... کے ساتھ رہ کر ماں، باپ کی عزتوں کو زندگی دیتی ہیں... اب تم یہ بھول جانا کہ تم اپنے ابا کی لاڈلی بیٹی ہو بلکہ یاد رکھنا کہ اب تم کسی کی بہو اور کسی کی بیوی ہو...... میں... سے جب ہی خوش ہوں گا جب عباس خوش ہوگا...... ہمیشہ یہ یاد رکھنا کہ عباس کیا چاہتا ہے۔ عباس کس بات پر خوش ہوتا ہے اور کس پر ناخوش...... عباس کیا پسند... ہے اور کیا ناپسند......!''

اور عباس وقت کا پابند تھا اور وقت کی پابندی پسند کرتا تھا اور تابندہ سب کچھ بھول گئی تھی...... تھیں تو صرف ابا کی نصیحتیں...... یاد تھا تو صرف یہ کہ عباس کیا چاہتا ہے! اس کی اپنی کیا عادتیں تھیں اسے بھول چکی تھی۔

☆☆☆

''یا اللہ تم ابھی تک پڑی سو رہی ہو...... اٹھو منحوس، کالج نہیں جانا کیا؟'' وہ جو آرام سے لحاف میں منہ دیے سو رہی تھی...... روشاطہ کی آواز پر گھبرا کر اٹھ گئی۔

''او مائی گاڈ...... آٹھ بج گئے اور تم مجھے اب اٹھا رہی ہو۔'' وہ لحاف پرے پھینک کر بستر سے اٹھتے، اٹھتے ناراضی سے بولی۔

''سب سے بڑی بات تو یہ کہ میں تمہاری ملازمہ نہیں ہوں...... دوسری اہم بات یہ ہے کہ مجھے قطعی شوق نہیں ہے کہ ہر روز تمہاری شکل دیکھوں، میرا بس چلے تو میں بھی تم کو یعنی miss late کو کالج کے لیے لینے نہیں آؤں بلکہ تمہارے گھر کے آگے سے گاڑی کا ہارن بجاتی نکل جاؤں...... لیکن میں اپنے بھائی کا کیا کروں؟ جس کی گاڑی کے روز صبح تمہارے دروازے کے سامنے بریک لگ جاتے ہیں اور پھر اس کی گاڑی تمہیں لیے بغیر اسٹارٹ ہی نہیں ہوتی...... وہ خود تو تمہارے چکر میں لیٹ ہوتا ہی ہے، میری بھی پہلی کلاس مس ہو جاتی ہے۔''

روشاطہ نے روز کی طرح اسے کھری کھری سنائیں کہ تابندہ کی وجہ سے تقریباً ہفتے میں چار دن تو اس کی پہلی کلاس نکل ہی جاتی تھی لیکن تابندہ بغیر برا مانے ہنستی رہی اور تیار ہوتی رہی۔

''ویسے میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم ہمارے آنے سے پہلے تیار کیوں نہیں ہو سکتیں جبکہ میں صبح اٹھ کر سب سے پہلے تمہیں کال کرتی ہوں کہ اللہ کے واسطے اٹھ جاؤ...... لیکن میں ہی کیا...... خالہ جان خود تمہاری حرکتوں سے پریشان ہیں، وہ کل خود ہی بتا رہی تھیں کہ ایک کالج کیا، تم تو ہر جگہ ہی لیٹ ہو جاتی ہو...... ان بے چاری کو تو یہ حسرت ہے کہ تم کوئی کام تو وقت پر کر لو، ویسے ایک مشورہ ہے اگر تمہارے نزدیک اس بیش قیمت کلاک کی کوئی حیثیت نہیں ہے تو یہ کسی غریب ہی کو دے دو۔'' روشاطہ نے تابندہ کو شولڈر پر بیگ لٹکا کر کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... اچھا خالہ کی بھانجی، اب چلو باقی مشورے، لیکچر سب راستے میں دے دینا......'' اس نے پیچھے مڑ کر پیر پٹختے ہوئے روشاطہ کو چھیڑا۔

''راستے میں...... اوہو...... وہ...... وہ ہمارا بھائی ایک لفظ بھی کہنے دے گا...... اس کا بس چلے تو کالج دو گھنٹے تاخیر سے کھلوائے...... سورج تمہارے اٹھنے کے بعد نکلے...... ساری دنیا تمہارے لیے بدل جائے...... لیکن کوئی تمہیں کچھ نہ کہے......'' روشاطہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

روشاطہ، تابندہ کی خالہ زاد تھی...... دونوں میں گہری دوستی تھی...... تابندہ کی لاابالی طبیعت کے باوجود روشاطہ کی اس میں جان تھی اور جان تو اس میں طوطے کی بھی تھی...... اور وہ طوطا...... کون تھا؟

''میری سمجھ میں نہیں آتا تابندہ، تم آگے زندگی میں کیا کرو گی۔'' روشاطہ نے فکرمندی سے کالج کاریڈور میں چلتے چلتے رک کر بڑی بے پروائی سے چیونگم چباتی تابندہ سے اپنے دل میں اٹھتے خدشے کا اظہار کیا۔

''اوہ...... بات تو سوچنے کی ہے، آگے زندگی میں...... کیا ہوگا؟'' تابندہ نے اپنے اوپر مصنوعی فکرمندی طاری کی اور پھر روشاطہ کے حد درجہ سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر اس کا بے ساختہ قہقہہ نکل گیا۔

☆☆☆

''عباس...... چائے!''

عباس نے کپ ہاتھ میں لیا تو بے ساختہ اس کی نظر دیوار پر لگی کلاک پر ٹھہر گئی، جہاں روز کی طرح 5:10 بج رہے تھے اور پھر خود بخود اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''تابندہ کتنی پنکچوئل ہے۔'' وہ روز کی طرح صرف سوچ کر رہ گیا۔ امی کتنا سمجھاتی تھیں۔

''تابندہ ایک بے پروا، غیر ذمے دار، ضدی اور اپنے باپ کی لاڈلی ہے...... تمہارے اور اس کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق ہے...... ٹھیک ہے وہ میری بھتیجی ہے، میں تمہاری خوشی کے لیے اس کو بیاہ تو لائی ہوں لیکن عباس اسے سر پر مت چڑھنے دینا، اس کو ہمیشہ دبا کر رکھنا، میں تو اس کی پھوپی ہوں صحیح پر بھی ٹوکوں گی تو بھائی سے بھی بُری بنوں گی اور بھتیجی سے بھی لیکن تم اس کے شوہر ہو، غلط بھی کرو گے تو کوئی ٹوکنے والا نہیں...... اور......''

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' تابندہ کی آواز اسے ماں کی یادوں سے باہر کھینچ لائی۔

''کیا مطلب...... کیا میں کچھ سوچ بھی نہیں سکتا......؟'' عباس کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

''کیا ہوا عباس......؟ ناراض کیوں ہو رہے ہیں

ہیں، ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟'' تابندہ کے لہجے میں ان کہی ناراضی گھل گئی۔

''نہیں، تم نے کچھ نہیں کیا بلکہ تم عورتیں تو کچھ کرتی ہی نہیں ہو...... گھروں میں بیٹھ کر آرام کرتی ہو، عیش کرتی ہو اور ہم مردوں کی زندگی عذاب کرتی ہوں، حد ہوتی ہے...... حماقتوں کی، اب بندہ سوچے بھی تو تم سے پوچھ کر اور یہاں کیوں کھڑی ہو، کوئی کام نہیں ہے تمہیں...... جو ہر وقت میرے سر پر مسلط رہتی ہو۔'' عباس نے ہمیشہ کی طرح بات کا بتنگڑ بنادیا...... وہ تابندہ کے لیے ایسا ہی تھا...... جھگڑالو...... ناشکرا اور روکھا پھیکا...... اور تابندہ جو خوشگوار موڈ میں آج عباس کا انتظار کر رہی تھی کہ اس نے pc میں ٹیبل بک کروا رکھی تھی کہ آج اس کی شادی کی سالگرہ تھی...... چپ کی چپ رہ گئی کہ عباس کے سامنے ایسے ہی اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔

کہتے ہیں عورت کی چُپ مرد کو توڑ دیتی ہے، ہراساں کردیتی ہے لیکن اس کی چپ سے عباس کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

☆☆☆

وہ موڈی تھی، شادی کے بعد وہ سارے موڈ بھول گئی...... وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتی...... عباس کا بزنس کئی ممالک میں پھیلا ہوا تھا، وہ اکثر غیر ممالک کے دوروں پر رہتا، تابندہ گھر بھی سنبھالتی تو کاروبار کے پیچ وخم بھی دیکھتی، رشتے داریاں بھی نبھاتی تو بچوں کو بھی پورا وقت دیتی، عباس کی محبت حاصل کرنے کے لیے اس نے ہر کوشش کر ڈالی، اپنے آپ کو مٹا ڈالا...... لیکن عباس کا رویہ اکثر اسے پریشان اور دُکھی کر دیتا اور وہ ذہنی یورش سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو جسمانی طور پر بے پناہ مصروف رکھتی...... سال بھر بعد ہی اس کی گود میں مریم آگئی...... اور اس نے غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو نظر انداز کر کے مریم کو اپنے سینے میں سمولیا...... اسے مریم سے شدید محبت تھی، وہ اس کی بیٹی تھی...... اور پھر اسے پتا چلا محبت صورت بدل دیتی ہے، اصول بدل دیتی ہے، جہاں بدل دیتی ہے، زاویۂ نگاہ حتیٰ کہ زندگی کا فلسفہ تک بدل دیتی ہے...... اور وہ بھی بدل گئی۔

☆☆☆

''عباس!'' اس نے کافی دیر سے خاموش اور لاتعلق سے بیٹھے عباس کو مخاطب کیا...... عباس جو کتاب پڑھنے میں مگن تھا، کتاب ہی پڑھتا رہا۔ جیسے کچھ سنا ہی نہیں ہو۔

''عباس!'' اب اس کے رویے میں دبا دبا غصہ تھا۔

''کہو!'' عباس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس کو لاتعلقی سے دیکھتے ہوئے بیزار لہجے میں پوچھا۔

''پلیز بند کریں اس کتاب کو اور میری بات سنیں۔'' اب تابندہ کی قوتِ برداشت ختم ہو رہی تھی۔

''کیا ہے یار...... ایک دن چھٹی کا ہوتا ہے وہ بھی بندہ چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔'' عباس نے بیزار ہو کر کہا۔

''ہم بھی سارا ہفتہ آپ کی چھٹی کا انتظار کرتے ہیں۔'' تابندہ سوچ کر رہ گئی۔

''عباس شام کو امی نے کھانے پر بلایا ہے... آپ چلیں گے ناں؟'' اس نے پتھر کے صنم سے پوچھا۔

''میں...... میں کیا کروں گا جا کر، تم چلی جاؤ...... میں نے روکا تو نہیں۔'' عباس اسے بہت دور محسوس ہوا۔

''جانے کو تو میں جاسکتی ہوں لیکن اچھا نہیں لگتا، ہماری خالائیں وغیرہ سب آرہی ہیں، آپ بھی نہیں جاتے، میں اکیلی چلی جاتی ہوں، اچھا نہیں لگتا، میرا بھی دل چاہتا ہے کہ آپ میرے ساتھ ہوں اور روشاطہ تو آٹھ، نو سالوں کے بعد امریکا سے آئی ہے، وہ کیا سوچے گی...... سب آپ کو پوچھتے ہیں ناں!'' تابندہ سے اصرار کیا۔

''تو میں کیا کروں؟ پوچھتے ہیں تو پوچھیں۔

نہیں جانا ہے تو جاؤ...... پلیز مجھے تنگ مت کرو، تم چاہو تو دو چار دن اپنی اماں کے گھر رہ لینا، تم بھی خوش ہو جاؤ گی اور میں بھی چند دن تمہارے بغیر آرام سے گزار لوں گا۔'' عباس نے سفاکی کی انتہا کر دی۔

عباس اس کی طرف دیکھے بغیر اٹھ کر اندر کی طرف چل دیا، یہ دیکھے بغیر کہ وہ ایک عورت جو گھر بسانے کی تمنا میں ریزہ ریزہ ہو رہی ہے، اپنے آنسو اپنے آپ سے بھی چھپانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی ہے۔ آنکھوں میں آئے آنسو وہ اسے دکھانا نہیں چاہتی اور اس صدمے کو بھی چھپانا چاہتی تھی جو اس کے رویے سے اسے پہنچا تھا کہ وہ اسے پیر کی جوتی سمجھتا ہے، سمجھے لیکن اس کی ایک عزتِ نفس بھی تو ہے...... کہ عورت انا، عزتِ نفس کے بغیر ادھوری ہے اور وہ ایک مکمل عورت تھی۔

☆☆☆

''پتا ہے آج پارٹی میں سب ہی میری تعریف کر رہے تھے......'' تابندہ نے کوٹ ہینگر کر کے الماری میں لٹکاتے ہوئے عباس سے کہا۔

''اچھا......'' عباس نے چینل سرچنگ کرتے ہوئے کہا۔

''اور کیا جناب! اور وہ جو آپ کے دوست ہیں ناں، علی جعفران کی بیگم تو بار بار کہہ رہی تھیں...... عباس بھائی تو بہت خوش نصیب ہیں...... وہ تو ہر وقت آپ کے قصیدے پڑھتے رہتے ہوں گے......' ہائے رے...... لوگوں کی خوش فہمی، انہیں کیا پتا تعریف اور قصیدے تو دور کی بات، آپ نے تو شاید آج تک مجھے غور سے دیکھا بھی نہیں ہوگا......'' تابندہ نے عباس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر شکوہ کر ڈالا۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے، میں کیا کروں؟ تم اچھی ہو، جبھی تو تم سے شادی کی ہے۔''

''اچھا لگنے اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' تابندہ کی آنکھوں نے شکوہ کیا۔

"تم میرے گھر میں رہتی ہو، میری بیٹی کی ماں ہو، اس وقت میرے بیڈروم میں موجود ہو...... کیا یہ محبت نہیں ہے؟" عباس نے اس کی آنکھوں میں مچلتا شکوہ بھی پڑھ لیا تھا۔

"نہیں، یہ محبت نہیں ہے، یہ سمجھوتا ہے، تعلق ہے، گزارہ ہے لیکن یہ محبت نہیں ہے، محبت اظہار مانگتی ہے، دلیل مانگتی ہے، ثبوت چاہتی ہے، محبت میں تو اتنی گرمی ہوتی ہے کہ وہ پورے وجود کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے، تن من قطرہ قطرہ پگھلتا ہے...... محبت اشتہار بن جاتی ہے، اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو احساس کیوں نہیں ہوتا...... میرا وجود تمہاری محبت سے ریزہ ریزہ کیوں نہیں ہوتا...... شاید اس لیے کہ ہمارے درمیان محبت ہے ہی نہیں... اور اگر تم محبت کرتے ہو تو ظاہر کرو، گناہ کی طرح چھپاتے کیوں ہو۔" تابندہ سلگتے ذہن کے ساتھ سوچے چلی جارہی تھی اور عباس نہ جانے کب گہری نیند میں ڈوب چلا تھا۔

محبت میں شب بیداری عورت کا مقدر ٹھہرتی ہے کیونکہ عورت محبت کرتی ہے تو پامال ہونا چاہتی ہے...... اور مرد تو دریافت کا پرندہ ہے اور جب عورت کو دریافت کرلیتا ہے تو اپنے ساتھ زندگی گزارنے کے جرم میں عورت کو اس قدر تھکا دیتا ہے کہ اس کی آنکھوں کے ساتھ دل بھی رونے لگتا ہے...... اور دل تو تابندہ کا بھی۔

☆☆☆

"میں نے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، ویل مینرڈ ہاؤس کیپر کا بندوبست کرلیا ہے اور وہ خاتون کل صبح آجائیں گی۔" تابندہ جو سارے کام نمٹا کر رات کے اس پہر دودھ کا گلاس عباس کے لیے لے کر آئی تھی اس کی بات سن کر حیران رہ گئی۔

"کیا مطلب؟ ہاؤس کیپر...... لیکن کیوں؟ کیا ضرورت ہے؟" تابندہ حیران ہوئی۔

"ضرورت ہے، میں چاہتا ہوں یہ مکان گھر نظر آئے۔" عباس کی نظریں بدستور لیپ ٹاپ پر تھیں۔

"تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں، میں آج تک اس مکان کو گھر نہیں بنا سکی، یہاں کوئی ڈسپلن نہیں ہے عباس کہنے سے پہلے آپ کو سوچنا چاہیے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں تھک گئی آپ کی آپ کے خاندان کی، آپ کے گھر کی خدمت کرتے کرتے اور آپ کہہ رہے ہیں یہ چار دیواری گھر نہیں ہے...... آپ ایک چھوڑ دس ہاؤس کیپر رکھیے لیکن میری محنتوں اور خدمتوں کی قبر پر نہیں۔ میں نے کیا کمی چھوڑی سمجھ میں نہیں آتا۔" آنسو تھے کہ دل پر گر رہے تھے اور ہونٹ ہمیشہ کی طرح ایک دوسرے میں پیوست اور وہ سوچوں کے گرداب میں چکرا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔" سوچوں کے گرداب میں ڈوبتے ابھرتے اس کے منہ سے نکلا۔

"تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں؟" عباس نے رسماً پوچھا۔

"نہیں...... بات دراصل یہ ہے عباس کہ عورت زندگی میں بہت بڑے بڑے کام بھی انجام دے لیتی ہے اگر اس کے کاندھے پر ہمت بڑھانے کی تھپکی دی جائے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ منہ سے نکل ہی گیا۔

"لیکن تھپکی والا کام بھی تو کیا ہو۔" عباس کے سرد لفظوں نے...... ہیٹر کی حدت سے گرم کمرے میں برف بھر دی، بستر، تکیہ، میز، کرسی سب برف سے ڈھک گئے۔ پورے کمرے کی ہر چیز سرد ہوگئی اور اس ٹھنڈک نے تابندہ کے وجود کو بھی برف سے ڈھانپ دیا۔

"آپ درست کہہ رہے ہیں، غلطی میری ہی ہے، میں نے اپنی آدھی زندگی آپ کو خوش کرنے میں صرف کردی لیکن آپ کیسے خوش ہوسکتے ہیں آپ کو اپنے آگے کوئی نظر ہی نہیں آسکتا......" تابندہ کی آنکھوں سے بہتے گرم آنسوؤں نے برف میں

راستہ بنایا۔

"مد مقابل کوئی خاص چیز ہو تو نظر بھی آئے......!" لفظ تھے یا بھالا تابندہ گم صم سی ہوگئی۔ بس پھر کہنے کے لیے رہ کیا گیا۔ وہ سوچ کر رہ گئی...... "ان مردوں کو کون سمجھائے، زیور، کپڑوں کا ڈھیر، روپیہ، پیسہ، عورت کو اطمینان تو دے سکتے ہیں لیکن خوشی اور اعتماد، عورت کو مرد کی محبت ہی دیتی ہے، عورت، محبت فنا ہونے کے لیے کرتی ہے وہ اپنی محبت میں پامال ہوجاتی ہے اگر عورت سے محبت کے دو بول، بول دیے جائیں تو وہ ساری زندگی مرد کے پاؤں میں بلی کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں وہ محبت کے لیے سرگرداں رہتی ہے، اپنی جان ہلکان کرتی ہے، راتوں کی نیند قربان کرتی ہے، کبھی دوست کبھی ہمراز اور کبھی محبوبہ بن جاتی ہے اور بدلے میں کیا چاہتی ہے محبت بھرا اعتماد اور مان......! اور یہ مرد جب نوازنے پر آتے ہیں تو ملکہ بنا کر تخت پر بٹھا دیتے ہیں گھر کی... دانی بنا دیتے ہیں اور جب پامال کرتے ہیں تو مٹی میں ملا دیتے ہیں، ایسا کردیتے ہیں کہ عورت آئینہ دیکھنے سے بھی ڈرنے لگتی ہے۔"

"کیا ہوا؟ یہ کمفرٹر تو چھوڑو...... جو بھی سوچنا ہے، سامنے صوفے پر بیٹھ کر سوچو...... لیکن مجھے تو سونے دو۔" عباس نے تابندہ کی گہری خاموشی سے اکتا کر کہا۔

"دکھ اس بات کا ہے کہ آپ نے ہمیشہ مجھے ایک عورت سمجھا، انسان نہیں سمجھا، ہماری کون سی محبت کی شادی تھی لیکن میرا خیال تھا ساتھ رہنے سے ایک دن دو انسان ایک دوسرے کے ساتھ محبت کی ڈور میں بندھ ہی جائیں گے...... میں نے کوشش کی حتی الامکان کوشش کی ایک محبت بھرا گھر بناؤں لیکن ایک آدمی اکیلا کیا کرسکتا ہے...... دکھ اس بات کا ہے کہ آپ کبھی اس انا اور حاکمیت کی سیڑھی سے اتر کر آئے ہی نہیں لہٰذا آپ کو کبھی میرے اندر کوئی اچھی بات نظر ہی نہیں آئی...... بلکہ یہ کہنا...... زیادہ درست ہوگا کہ آپ جیسے مرد کبھی کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتے......" تابندہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور عباس کے برابر والے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی کہ ایک ہی بستر پر سونا بھی مقدر ہوچکا تھا اب انسان اپنی تقدیر سے تو نہیں لڑ سکتا۔

"میں کوئی غیر تو نہیں تھا...... تم مجھے جانتی تھیں...... شادی کے لیے ہاں کیوں کی تھی؟" عباس نے کہتے ہوئے سائڈ لیمپ بجھا دیا۔

برسوں پرانا شکوہ، سوال بن کر ایک بار پھر سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

"ممی......" رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا...... کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے جلدی سے سائڈ لیمپ آن کیا تو دیکھا، دروازے پر اس کی دس سالہ بیٹی مریم سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

"جی، میری جان...... خیریت؟" اس نے گھبرا کر جلدی سے بیٹی کو ہاتھ سے اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔

"ممی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، لگ رہا ہے بہت سارے بھوت میرے کمرے میں آگئے ہوں۔" مریم نے ماں سے لپٹتے ہوئے خوفزدہ انداز میں کہا۔

"تو بیٹا! رات کو ڈراؤنے پروگرام کیوں دیکھتی ہو، ڈر تو لگے گا ناں، آیت الکرسی پڑھی تھی آپ نے یا نہیں ہے؟" تابندہ نے معصوم سی مریم کے بالوں میں محبت بھری انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ممی آیت الکرسی پڑھی تھی اور چاروں قل بھی...... لیکن ممی پھر بھی ڈر لگ رہا ہے...... میں آپ کے پاس سو جاؤں؟"

"میرے پاس......" اس نے برابر میں سوئے عباس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے اور عباس کے بیچ

میں بستر پر موجود فاصلے کو دیکھا۔ "ہاں ایک تمہارا وجود ہی تو ہے جو ہر رات مجھے اس بستر پر لا پٹختا ہے۔" وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

"ممی...... پلیز...... میں یہاں سو جاؤں؟" مریم بہت خوفزدہ تھی۔

"نہ بیٹا آپ کے بابا ڈسٹرب ہوں گے...... ایسا کرو، اپنے کمرے میں چلو، میں وہیں چلتی ہوں، آپ کے کمرے میں آپ کے پاس سو جاتی ہوں...... ٹھیک ہے۔" تابندہ نے بستر سے کھڑے ہو کر مریم کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلتے ہوئے اسے سمجھایا۔

اور مریم، مریم میں تو اس کی جان تھی...... وہ اس کی ایک ہی بیٹی تھی...... اکثر جب وہ پریشان، اکیلی اور اداس ہوتی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ کسی کو تو شریکِ راز کرے، کوئی ایک تو ایسا کاندھا ہو، جس پر سر رکھ کر وہ رو سکے اور جب اس کی کوکھ میں امید کی کونپل پھوٹی تو ہزاروں ماؤں کے برعکس اس نے اللہ سے بیٹی مانگی تھی...... اور پھر اللہ نے اسے بیٹی دے دی...... اکثر جب عباس کا سرد رویہ اس کے اعصاب کو برف کی طرح سرد کر دیتا تو وہ مریم کو سینے سے لگا لیتی اور پھر مریم کی محبت کی گرمی سے اس کی آنکھ سے گرم گرم آنسو اس کے علم میں آئے بغیر اس کے بالوں میں جذب ہو جاتے۔

☆☆☆

"تابندہ اچھی لڑکی ہے، خوب صورت، تعلیم یافتہ، سلجھی ہوئی، سمجھدار، بالکل ویسی جیسی ایک عورت کو ہونا چاہیے لیکن بیوی...... بیوی کو سمجھدار نہیں ہونا چاہیے...... تابندہ ایک پرفیکٹ عورت ہے اور عورت کو پرفیکٹ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ پرفیکٹ عورت سے ہم جیسے مرد خوش نہیں ہو سکتے۔

تابندہ مجھے شادی سے پہلے پسند تھی، میں نے اماں کو بہت مشکل سے تابندہ کے لیے راضی کیا تھا...... لیکن شادی کی پہلی رات مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ وہ لڑکی نہیں ہے جس کے ساتھ رہ کر میں اپنی برتری قائم رکھ سکوں...... یہ بہت جلد میرے برابر اور پھر مجھ سے بہت آگے کھڑی ہوگی...... اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا، میری ماں نے مجھے اے کلاس بنا کر پالا اور پھر ساری زندگی میں نے ساری دنیا کو بی کلاس ہی سمجھا میں تابندہ کو بھی بی کلاس ہی سمجھتا تھا لیکن چند دنوں ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اے پلس ہے او مائی گاڈ میں گھبرا گیا...... مجھے اپنی حاکمیت اور برتری کا تخت ہلتا ہوا محسوس ہوا اور پھر میں اس کے سامنے ایک روایتی شوہر کے روپ میں جا کھڑا ہوا میں نے اس پر، اس کی شخصیت و اعتماد پر اپنی انا پرست مردانگی کا وزنی پتھر رکھ دیا اور وہ رسموں، رواجوں میں لپٹی، ماں باپ کی عزت سنبھالنے اور گھر بسانے کی خواہش میں دبتی چلی گئی...... مجھے اس کی بہت سی عادتیں پسند ہیں، اس کی فرمانبرداری میرے لیے نعمت ہے، اس کی انتظامی صلاحیتیں میرے گھر کے لیے اللہ کی رحمت ہیں، اس کی ذہانت، اس کی برجستگی، اس کا اعتماد، اس کی ہر بات مکمل ہے لیکن میں اعتراف نہیں کرسکتا، میں اعتراف نہیں کروں گا کیونکہ میرا اعتراف اس کے اعتماد کو تقویت دے گا...... وہ پہلے جیسی بااعتماد تابندہ بن جائے گی اور مجھے خود مختار عورتیں بالکل پسند نہیں...... وہ جو صورت شکل، تعلیم، مزاج، اخلاق، ہر چیز میں مجھ سے بہتر ہے، جس کا احساس شاید اسے خود بھی نہیں اور نہ ہی میں ہونے دوں گا...... اور جب اسے میں، میری ذات یعنی عباس مرتضٰی کو خوش رکھنے کے لیے پریشان دیکھتا ہوں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے، ہر مرد کو محکوم عورت پسند ہے اور میں بھی تو ایک مرد ہی ہوں ناں!" عباس یہی کچھ سوچتے سوچتے سو گیا۔

☆☆☆

"ہیلو......" مسلسل بجتی بیل سے تنگ آکر آخر اس نے فون اٹھا لیا۔

"کیسی ہو؟" ماؤتھ پیس میں آواز ابھری۔

وہ آواز جسے وہ سن کر گن ہو گئی...... اس آواز کو تو وہ قبر میں لیٹ کر بھی پہچان سکتی تھی لیکن یہ آواز......

☆☆☆

"تو تم نے ہاں کر دی......" وہ جو مہمانوں کے جانے کے بعد...... برتن دھونے کے بعد کچن کیبنٹ میں دھلے برتن خشک کر کے لگا رہی تھی۔ رضا کے سوال پر پلٹی نہیں بلکہ خواہ مخواہ ہی صاف سلیپ کو کپڑے سے صاف کرنے لگی۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں تابی......" رضا کی آواز میں شکوہ تھا۔

وہ خاموش رہی۔

"میں جانتا ہوں بلکہ میں تم کو تم سے زیادہ جانتا ہوں، تم آنسو پینے کی کوشش مت کرو...... بس مجھے اتنا بتا دو...... کہ تم نے اپنی مرضی سے رشتہ قبول کیا ہے یا......" رضا کہتے کہتے خاموش ہو گیا کہ حلق میں پھنستے آنسوؤں نے اس کو مزید بولنے نہیں دیا۔

☆☆☆

"بیٹا تمہاری بڑی پھوپی نے اپنے بیٹے عباس کے لیے تمہارا پیغام دیا ہے، عباس اچھا ہے، تعلیم یافتہ ہے، اعلیٰ عہدے پر ہے...... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری خالہ رضا کے لیے تمہارا ہاتھ مانگ رہی ہیں، تمہاری رضا سے بہت دوستی ہے، تم اپنی خالہ کے گھر میں بہت گھلی ملی ہو لیکن بیٹا میری بہن نے ساری زندگی مجھ پر احسانات کیے ہیں...... انہوں نے صرف مجھے دیا ہے، میرے ماں، باپ کے بعد وہ میری ماں بھی تھیں اور باپ بھی...... آج زندگی میں پہلی بار کچھ مانگا ہے...... میں فیصلے کا اختیار تمہیں دیتا ہوں...... لیکن فیصلے کے اختیار کے ساتھ ساتھ میں یہ سوال بھی کرتا ہوں کہ کیا تم مجھے میری بہن کے احسانات اتارنے کا موقع دو گی؟" احمد علی نے اختیار بھی دیا اور کوئی راہ بھی نہیں چھوڑی۔

ورزش سے علاج

آسٹریلوی ماہرین کا کہنا ہے کہ ورزش سے بلڈ پریشر، ذہنی دباؤ اور ڈپریشن پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اچھی ورزشیں ان امراض کے لیے دواؤں سے بھی زیادہ مفید ہوتی ہیں۔ مینٹل ہیلتھ فاؤنڈیشن کی تحقیق کے مطابق ذہنی امراض کے ڈاکٹرز ڈپریشن میں مبتلا افراد کو ورزش کے بجائے ادویات تجویز کرتے ہیں۔ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ ایک دہائی میں ڈپریشن سے بچاؤ کی ادویات تجویز کرنے کی تعداد دگنی ہوگئی ہے لیکن تحقیق سے پتا چلا ہے کہ... ڈپریشن کے مریضوں کو ورزشوں سے اتنا ہی فائدہ پہنچتا ہے جتنا کہ ان ادویات سے جبکہ ادویات کے مقابلے میں اس کا نقصان بھی کوئی نہیں ہے۔ ورزش کرنے سے انسانی دماغ ایسا کیمیائی مواد خارج کرتا ہے جو ذہنی صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ اس سے قبل 2004ء میں اسپتالوں کے رہنما اصولوں میں خطرناک حد سے کم ڈپریشن کے مریضوں کو ورزشوں کا مشورہ دینے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن مینٹل ہیلتھ فاؤنڈیشن کو تحقیق سے پتا چلا ہے کہ ملک میں ڈاکٹروں کی نصف تعداد ڈپریشن میں مبتلا افراد کو ایکسر سائز ریفرل اسکیم تک رسائی حاصل تھی جبکہ ہر چھ میں سے ایک فرد معاشی تنزلی کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہے۔

مرسلہ: کلثوم عباس، کراچی

وہ جو آج یونیورسٹی سے واپسی پر رضا کے ساتھ آئس کریم کھاتی ہوئی ابھی گھر پہنچی تھی اسے لگا جیسے ساتوں آسمان ایک ساتھ دھڑ دھڑ اس کے سر پر آگرے ہوں اور وہ ان کے ملبے تلے دب گئی ہو...... اس کی آرزوؤں اور اس کی خواہشوں کا دم گھٹ گیا ہو...... اس نے پُر امید نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور پھر غیر ارادی طور پر خود بخود اس کا سر اقرار میں ہل گیا۔

☆☆☆

''بتاؤ ناں تابی......'' وہ اسی طرح دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔

''ہاں!'' تابندہ کے منہ سے سسکتا ہوا نکلا...... اور وہ جو بہت مان سے اس کے راستے میں آ کھڑا ہوا تھا...... تابندہ کے منہ سے اقرار سن کر جیسے مٹی کا ڈھیر بن گیا...... اور وہ ہٹا تا ٹا تڑ سا اس کے راستے سے ہٹ گیا اور تابندہ اس کے پاس سے گزر کر اندر اپنے کمرے میں چلی گئی کہ دل کو سمجھانے کے لیے بہت سارا رونا تھا اور رونے کے لیے اسے تنہائی چاہیے تھی۔

☆☆☆

''یہ نہیں ہے رضا کہ مجھے تم سے محبت نہیں...... میں نے اپنی زندگی میں صرف تم سے ہی محبت کی ہے، تم ہی میرے واحد دوست، میرے مزاج آشنا، ہمدرد، ہم مزاج، غمگسار ہو، تم وہ ہو جس کے بغیر جینے کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا تم میرے لیے بہت کچھ ہو، لیکن ابا...... جنہوں نے آج تک صرف دیا ہی دیا ہے...... مگر آج پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا ہے تم ہی بتاؤ رضا کیا میں اپنے باپ کو خالی ہاتھ لوٹا دیتی...... نہیں لوٹا سکتی تھی...... یاد رکھنا رضا اگر آج میں اپنے باپ کو مایوس کرتی تو زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں بھی مایوس کر سکتی تھی...... میں جانتی ہوں تم مجھ سے ناراض ہو گے...... جس دن تم میری مجبوری سمجھو گے تمہاری ساری ناراضی ختم ہو جائے گی۔ تم سے...... رضا تم سے آج میں دستبردار ہو رہی ہوں۔ رضا تم اچھی طرح جانتے ہو کہ منافقت تو میرے مزاج میں پہلے ہی نہیں...... آج تک تم میرے دل میں رہے تو میں نے کبھی کسی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا...... کسی کو بھی ایک دم دل سے نہیں نکالا جا سکتا...... اور تم...... تم تو رضا ہو...... تم میرے لیے عام نہیں ہو...... لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وقت ہر یاد کو دُھند لا دیتا ہے...... اور دھند میں تو اکثر اپنی جگہ مجھے پہاڑ بھی نظر نہیں آتے...... آج میں نے عباس کے نام کی انگوٹھی پہن لی ہے...... میرے شعور نے اس رشتے پر سمجھوتا کر لیا ہے...... جلد ہی میرا لاشعور بھی قبول کر لے گا...... آج سے پہلے میں نے کبھی عباس کو غور سے بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اب میں عباس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی کہ میں رشتوں میں سچائی کی قائل ہوں...... میں چاہتی ہوں کہ میں سچے دل اور جذبے کے ساتھ عباس کی زندگی میں داخل ہوں...... میں عباس سے محبت کرنے کی کوشش کروں گی...... امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔ تم کبھی میرے خوابوں میں نہ آنا کہ میں کوشش کروں گی کہ میں عباس کے خواب دیکھوں...... یہ مشکل بہت ہے لیکن ناممکن تو نہیں...... ہے ناں رضا...... تم سمجھ رہے ہو ناں؟'' رات بھر وہ تکیے سے باتیں کرتی رہی...... تکیہ اس کے آنسوؤں سے بھیگتا رہا...... اور یہ تکیے کتنے بڑے راز دار ہوتے ہیں اس کا اندازہ اسے آج پہلی بار ہوا تھا۔

☆☆☆

''کیسی ہو تابی......؟'' لہجہ بے قرار تھا۔

"I am sorry this is wrong number"

اس نے پُراعتماد لہجے میں کہتے ہوئے فون کریڈل پر رکھ دیا۔

''رضا......'' اس کے اندر سے آواز آئی۔

''کیا رضا پاکستان آگیا؟'' اس نے الجھے ہوئے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''لیکن اس نے مجھے فون کیوں کیا؟ میں اس سے بات نہیں کر سکتی...... میں تابی نہیں ہوں، میں مسز تابندہ عباس ہوں...... اور مسز تابندہ عباس اس سے بات کرنا نہیں چاہتی۔'' اس نے پُراعتماد انداز میں اپنے اندر کی تابی کو ڈانٹا۔

☆☆☆

اس نے آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا، کالے کپڑے اس کے دودھیا بدن پر چمک رہے تھے...... ہلکے ہلکے میک اپ میں اس کے چہرے کے حسین نقوش بہت زیادہ حسین لگ رہے تھے۔ مسکارے اور آئی لائنر سے سجی آنکھیں بہت دلکش لگ رہی تھیں...... اس نے سیاہ ہینڈ بیگ اٹھا کر مریم کو آواز دی۔

''مریم...... مریم چلو بیٹا دیر ہو رہی ہے۔''

مریم کی دوست کی برتھ ڈے تھی اور وہ جانے کی ضد کر رہی تھی...... تابندہ جو ایک بہت ذمے دار ماں تھی، وہ مریم کو کہیں اکیلے نہیں بھیجتی تھی وہ جانتی تھی کہ بیٹی امانت ہوتی ہے اور وہ امانت کو امانت کی طرح پال رہی تھی...... گو آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن مریم کے لیے تو وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔

''مریم......'' اس نے دوبارہ آواز دی...... ''کہاں ہو بیٹے؟''

''ممی میں نہیں جا رہی...... نانو آئی ہیں۔'' باہر سے مریم کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔

''اماں...... اماں آئی ہیں...... اماں کیسے آگئیں؟'' خود سے ہم کلام ہوئی وہ تیزی سے باہر آئی اور پھر وہ جہاں تھی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی کہ اس لمحے کے بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا...... کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ زمین نے ہمارے پاؤں جکڑ لیے ہیں...... ہم چل نہیں سکتے...... ہم سانس نہیں لے سکتے...... وہ بھی ایک ایسی ہی صورت حال کا شکار تھی...... تابندہ کی آنکھیں ناقابلِ یقین منظر دیکھ رہی تھیں۔ لاؤنج میں اماں کے ساتھ بڑے اطمینان سے رضا براجمان تھا۔

''کیسی ہو؟'' رضا نے کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تم......'' اس کے لب تھرتھرائے۔

''کون آیا ہے......؟'' عباس نے اسٹڈی سے باہر آ کر پوچھا...... اور وہ جو رضا کو دیکھتے ہی برسوں پیچھے چلی گئی تھی، عباس کی آواز سے حال میں واپس آگئی۔

''عباس، یہ میرے کزن رضا ہیں، امریکا میں رہتے ہیں کچھ دن پہلے ہی آئے ہیں اور اماں کے ساتھ آپ سے خاص طور پر ملنے آئے ہیں......'' اس نے عباس کے برابر میں کھڑے ہوتے ہوئے رضا کا تعارف کرایا۔ تعارف کراتے ہوئے رضا کی مسکراتی آنکھوں کو اپنے مقام اور حیثیت کا بھی احساس دلایا۔

''بھئی مجھ سے ملنے کیوں آئیں گے...... تمہارے رشتے دار ہیں، تم ہی سے ملنے آئیں گے۔'' عباس نے آہستگی سے سرد لہجے میں اس سے کہا۔

لیکن رضا کے تیز کانوں اور ذہن نے الفاظ

بڑبولا

الیکشن میں مرا مدِمقابل
کچھ ایسی بے یقینی سے کھڑا ہے
کہ سوتے میں بھی بول اٹھتا ہے اکثر
مرا جلسہ، مرا جلسہ بڑا ہے

شاعر: انور مسعود
پسند: فاطمہ حسن، اسلام آباد

اور لہجہ دونوں نوٹ کر لیے۔
وہ برسوں سے عباس کے بارے میں سن رہا تھا اور آج واضح ثبوت مل گیا تھا۔
تابندہ کی چمکتی آنکھوں میں در آتی شرمندگی رضا کو تکلیف دے گئی اور جب عباس نے شرمندہ سی کھڑی حسین و جمیل تابندہ کو دیکھا تو نہ جانے کیوں اسے اپنی طاقت اور حیثیت کا بڑا عجیب سا احساس ہوا اور وہ مسکراتا ہوا واپس اسٹڈی میں چلا گیا اور رضا سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گیا۔

☆☆☆

"رضا ویسا ہی ہے بااخلاق، ویل مینرڈ، گریس فل......" رات کو بستر پر لیٹتے ہی سب سے پہلے تابندہ کو خیال آیا۔

☆☆☆

"تابی بالکل بدل گئی ہے، وہ ہنس مکھ، لاابالی، پُراعتماد، شعروشاعری کرنے والی تابی تو نہیں تھی...... وہ تو کوئی ذمے دار، سمجھدار ماں اور ایک تابعدار بیوی تھی۔ اس کی زندگی بہت محدود تھی، اس گھر کے ہر کونے میں تابندہ تھی...... آج میری ملاقات مسز تابندہ عباس سے ہوئی...... تابندہ کے وجود میں تابی نہیں تھی اور میں تو تابی سے ملنے گیا تھا...... اپنی تابی سے۔"

☆☆☆

"تمہیں کیا ہو گیا ہے تابی......؟" آج جب تابندہ اپنی ماں کے گھر آئی تو اتفاق سے رضا بھی چلا آیا۔
"کیا ہو گیا ہے؟ جیسی تھی ویسی ہی ہوں لیکن تم کیوں میری فکر میں ہلکان ہوتے رہتے ہو؟" تابندہ نے رُکھائی سے کہا۔
"اس لیے کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف تمہاری فکر کی ہے صرف تمہاری...... تم اب ہنستی کیوں نہیں ہو؟" رضا کے لہجے میں محبتوں کی شدتیں تھیں۔
"پہلے میں تابندہ احمد علی تھی اور آج مسز تابندہ عباس......! فرق تو آئے گا ناں اور ایک بات تم مجھے تابی مت کہا کرو...... میں ایک بار پھر بتا رہی ہوں اور میں اب مسز تابندہ عباس ہوں۔ یہ بات اب تمہیں سمجھ لینی چاہیے......" تابندہ نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں رضا کو ٹوکا۔
"ہو گی تم ساری دنیا کے لیے مسز تابندہ عباس...... لیکن میرے لیے تم تابی تھیں...... تابی ہو اور تابی ہی رہو گی...... وہ تابی جو ہنستی تھی تو دنیا گنگنانے لگتی تھی، وہ تابی جو نظر اٹھاتی تھی تو ہوا ٹھہر جاتی تھی، وہ تابی جو چلتی تھی تو......"
"پلیز اسٹاپ اٹ...... میں یہ سب باتیں کرنا چاہتی ہوں اور نہ ہی سننا چاہتی ہوں، تم میری پُرسکون زندگی کو درہم برہم کرنا چاہتے ہو...... تم واپس کیوں آئے ہو...... تم نے کہا تھا اب تم کبھی واپس نہیں آؤ گے...... سنو میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں، ہاں میں عباس کے ساتھ بہت خوش ہوں......" تابندہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی یہ دیکھے بنا کہ رضا نے اس کی کسی بھی بات پر یقین نہیں کیا کہ ہمیشہ سے وہ تابندہ کی آنکھوں میں چھپے آنسو دیکھ لیتا تھا اور وہ آنسو اس نے آج بھی دیکھ لیے تھے۔

☆☆☆

گھر کی تعمیر چاہے جیسی ہو
اس میں رونے کے لیے جگہ رکھنا

آج رضا کی باتوں نے اسے بہت رُلایا کہ ایسی محبتوں کی تو وہ اب عادی ہی نہیں رہی تھی...... کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ ابا کے سینے سے لگ کر بہت روئے...... انہیں بتائے کہ ان کی محبتوں کی قیمت ادا کرتے کرتے اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اس کی روح بھی چھلنی ہو گئی ہے...... لیکن ابا...... ابا تو اس کی شادی کر کے ایسے مطمئن دکھتے کہ وہ چاہنے کے باوجود کچھ کہہ ہی نہیں پاتی...... کبھی دل چاہتا کہ اماں کی گود میں منہ چھپا کر سو جائے، کبھی نہ اٹھے، جب بھی اماں اس کے لاڈ اٹھاتیں تو اس کا دل چاہتا کہ اماں کو روک دے اور کہے اماں اب آپ کی لاڈلی کی اوقات دو کوڑی کی ہے۔ آج بھی وہ یہی سوچ کر آئی تھی کہ صبح، صبح عباس نے آج اسے بہت باتیں سنائیں، اس کا صرف یہ قصور تھا کہ عباس کا موڈ مین آفس جانے سے پہلے بلیو کی جگہ گرے شرٹ کا بن گیا تھا اور بجلی چلی گئی تھی...... اور وہ اسے قصوروار ٹھہراتا رہا اور وہ بے قصور معافیاں مانگتی رہی...... لیکن آج بھی ہمیشہ کی طرح اماں کے اطمینان بھرے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ سب کچھ بھول گئی، وہ کیسے اپنے چاہنے والوں کو تکلیف دے سکتی تھی۔
لوگ کہتے ہیں عورت اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بھول سکتی...... ہاں یہ بات درست ہو گی...... لیکن ایک عورت یہ ضرور کرتی ہے کہ اپنی پہلی محبت کو دل کی گہرائیوں میں دھکا دے کر تالا لگا دیتی ہے...... اور چابی گہرے سمندروں میں پھینک دیتی ہے...... لیکن رضا...... رضا چابی ڈھونڈ رہا تھا...... رضا اس تالے کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا...... تابندہ خوفزدہ تھی، وہ تالے پر تالا لگا رہی تھی اور رضا...... اس کی ہر کوشش کو بے سُود کر رہا تھا۔

☆☆☆

"پیارے بھائی رضا...... خوش رہو......
تم تو جوگ ہی لے کر بیٹھ گئے، تم کب آؤ گے؟ پیارے تمہاری زندگی میں ایسے بہت سارے رشتے ہیں جو تمہیں بہت یاد کرتے ہیں...... تم نے پوچھا تھا تابندہ خوش تو ہے؟ تابندہ کیسی ہے؟ وہ خوش ہے یا نہیں، وہ لاکھ جھوٹ بولے لیکن میں جانتی ہوں، سب سمجھتے ہیں خوشی اور سمجھوتے میں فرق ہوتا ہے۔ تم تابندہ کو دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے، وہ تو سرتاپا بدل گئی ہے، ہماری تابندہ تو کہیں گم ہو گئی ہے، اس کی ہنسی کہیں کھو گئی اب وہ تابندہ نہیں بلکہ مسز تابندہ عباس ہے۔ تمہیں یقین نہ آئے تو آ کر دیکھ لو...... اپنا خیال رکھنا۔

تمہاری بہن
روشاطہ"
رضا نے روز کی طرح سونے سے پہلے روشاطہ کا وہ خط نکال کر پڑھا جو اس کی واپسی کا سبب بنا تھا۔

☆☆☆

تابندہ ہر ممکن کوشش کرتی کہ اس کا اور رضا کا کبھی سامنا نہ ہو۔ رضا اس کے سامنے آتا وہ اپنے گھر آ جاتی...... وہ فون کرتا، وہ ریسیو نہیں کرتی، وہ نمبر بدل بدل کر فون کرتا اور جو غلطی سے ریسیو بھی کر لیتی تو فوراً بند کر دیتی...... رضا اسے جھنجوڑ رہا تھا...... وہ اس کے وجود میں دراڑیں ڈال رہا تھا...... وہ تابندہ میں تابی کو کھوج رہا تھا۔

☆☆☆

"پلیز تابی پلیز میرا فون بند مت کرنا، میں صرف تمہاری خاطر آیا ہوں، اپنی تابی کے لیے پلیز میری بات سن لو...... کیا تم اپنے دوست، رضا کی بات بھی نہیں سنو گی۔" تابندہ خاموش رہی لیکن اس نے فون بند بھی نہیں کیا۔
"thank you Taabi" میں جانتا ہوں تمہاری شادی ہو چکی ہے، تم ایک بہت اچھی اور وفادار بیوی ہو...... لیکن تابی تمہاری اپنی بھی تو ایک زندگی ہے تم صرف...... بیٹی...... بہن...... بیوی تو نہیں ہو بلکہ ان سب کے ساتھ تم جیتی جاگتی سینے میں دھڑکتا ہوا دل رکھنے والی ایک عورت بھی تو ہو...... ہو ناں؟" رضا نے تائید چاہی لیکن تابندہ سانس روکے اور چہرے پر بہتے آنسوؤں کے ساتھ صرف سنتی رہی۔
"میں یہ تو نہیں کہہ رہا کہ تم عباس کو چھوڑ دو، گھر کو نظر انداز کر دو، اپنے ابا کا مان توڑ دو، میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور اس کا کچھ حصہ صرف اپنے لیے بسر کرو...... اس تابی کے لیے جسے زندگی اور زندگی کے تمام رنگوں

سے عشق تھا۔ ہم ساتھ بیٹھیں، باتیں کریں، ماضی کو یاد کریں، اپنی، اپنی یادوں کی پٹاری کھولیں، تم پہلے کی طرح ہنسو اور میں تم کو ہمیشہ کی طرح ہنستا ہوا دیکھوں، میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ ہم ماضی کی محبت کو دُہرائیں، ایک دوسرے سے عشقیہ باتیں کریں...... ہم ایسا کر بھی کیسے سکتے ہیں لیکن کچھ وقت سب سے الگ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تو گزار سکتے ہیں ناں...... تم پہلے والی تابی بن جاؤ اور میں تمہارا رضا...... تم سب کا کتنا خیال رکھتی ہو، عباس کا ابا کا اماں کا کبھی تم نے سوچا تمہارا کون خیال رکھتا ہے...... عباس کو تم پسند تھیں اس کی اماں نے اپنے احسانات کے بدلے تمہیں مانگ لیا اور تمہارے ابا نے تم سے اپنی محبتوں کا تاوان وصول کر لیا...... تمہاری اماں، جو جانتی تھیں کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے وہ خاموش رہیں، اب کوئی کسی کو کیا بتائے کہ زندہ رہنے اور جینے میں بہت فرق ہوتا ہے، تم زندہ ہو لیکن......!‘‘

رضا سانس لینے کے لیے رکا...... اور تابندہ کے آنسو چہرے پر سے ہوتے ہوئے اس کے گریبان کو بھگونے لگے...... رضا تالا توڑنا جانتا تھا...... تابندہ کا ڈر یقین میں بدل رہا تھا۔

’’میں چاہتا ہوں ہم پہلے کی طرح دوست بن جائیں...... میں تم سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا...... تم نے میرا سب کچھ چھین لیا تابی، کیا میری ایک خواہش پوری نہیں کرو گی...... میں جانتا ہوں تم بھی تنہا ہو، میں تمہارے دکھ اور تنہائی بانٹنا چاہتا ہوں، تم کو ابا کی فکر ہے ناں، ارے انہیں کیسے پتا چلے گا کہ ہم کبھی کبھار فون پر بات کر لیتے ہیں...... تم کو اماں کی پریشانی ہے ناں، میں وعدہ کرتا ہوں انہیں یا خاندان میں کسی کو بھی حتیٰ کہ روشاطہ کو بھی کبھی ہوا نہیں لگے گی کہ ہم رابطے میں ہیں...... تم عباس سے ڈرتی ہو ناں اپنی عزت کی فکر ہے ناں تو تابی تمہاری عزت میری عزت ہے، تمہاری عزت کے لیے تو میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں...... میرا وعدہ ہے تمہاری عزت پر میں کبھی کوئی حرف نہیں آنے دوں گا...... تم مجھ سے ملنے آؤ گی ناں اپنے رضا سے ملنے...... اور جان تمہارے اندر تو میری جان ہے جیسے جن کی جان طوطے میں ہوتی ہے...... اور تابی......‘‘

وہ بولے چلے جا رہا تھا اور تابندہ گم صم سی فون پکڑے کھڑی تھی...... برسوں سے لگے زنگ آلود تالے کی چابی رضا کے ہاتھ لگ گئی تھی۔

☆☆☆

آئینے میں نظر آتے عکس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ ساکت نظروں سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔

’’ممی......! آپ کہیں جا رہی ہیں کیا؟‘‘ دس سالہ معصوم سی بیٹی اس سے پوچھ رہی تھی اور جیسے لفظ ممی اس کے چاروں طرف گونجنے لگا۔ آئینہ...... لپ اسٹک...... بلش آن...... مسکارا...... گردن سے لپٹا نیکلس، جسم سے لپٹی ساڑی، باڈی اسپرے اور پرفیوم سے مہکتا بدن سب ممی، ممی کہنے لگے۔ اس کے چاروں طرف لفظ ممی ناچنے لگا۔ ہنسنے لگا...... رونے لگا...... اس نے آنکھیں بند کر کے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور پھر وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی...... اس سارے فسانے میں وہ یہ بھول گئی تھی کہ بہن، بیٹی اور بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ماں بھی تو ہے اور عورت شاید ہر رشتے سے بے وفائی کر سکتی ہے لیکن جب وہ ماں بن جاتی ہے تو وہ صرف ماں ہوتی ہے اور اس وقت بھی تابندہ ہر رشتے کو فراموش کر کے صرف ماں بن گئی تھی...... اس نے پیچھے مڑ کر معصوم مریم کو دیکھا...... اور پھر اسے اپنے سینے سے لگا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

’’نہیں بیٹا، آپ کی ممی کہیں نہیں جا رہیں۔‘‘ اور دُھندلائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ چہرے پر سجا ہوا میک اپ صاف کرنے لگی۔

چھوٹی سی بات

شمیم فضل خالق



’’کیا مصیبت ہے...... نیند کیوں نہیں آ رہی......؟‘‘ زارا نے جھنجلا کر کمبل اپنے پیروں سے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے سوچا...... قریب کے بیڈ سے رابی کے خراٹے سن سن کر وہ اور زیادہ تپ رہی تھی۔

’’یا اللہ...... مجھے رابی کی بہن ہوتے ہوئے کیوں اس قدر حساس بنا ڈالا...... جبکہ یہ، یہ اتنی......

بے پروا ہے کہ اسے احساس تک نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔" وہ زیادہ دیر تک صبر نہ کر سکی تو لپک کر اس کا کمبل کھینچ کر اسے گہری نیند سے جگا دیا۔

"کیا مصیبت ہے زارا...... سونے کیوں نہیں دے رہی ہو؟"

"تمہارے مسئلے نے میری راتوں کی نیند اُڑا دی ہے اور ایک تم ہو کہ گدھے، خچر سب بیچ باچ کر اس اطمینان سے سو رہی ہو کہ......" اس نے مارے غصے کے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

"زارا پلیز...... میری نیند خراب مت کرو، تمہیں تو پاگل کتے نے کاٹا ہے لیکن مجھے کسی پاگل کتے نے نہیں کاٹا۔ سو تم جاگتی رہو اور مجھے سونے دو۔" اور واقعی اتنا کہہ کر چند منٹ بعد رابی پھر سے گہری نیند میں چلی گئی۔ زارا نے بے بسی سے کمبل میں لپٹی خراٹے لیتی رابی کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کمبل اپنے اوپر لے کر سونے کی کوشش کرنے لگی...... لیکن وہ ساری رات زیادہ تر جاگتی اور سوچتی رہی...... اور فجر کے وقت تو آنکھوں نے گویا دوبارہ بند نہ ہونے کا سگنل دے دیا...... رابی اب بھی بے خبر سو رہی تھی۔ ایک نظر اس پر ڈالتی وہ بے آواز قدموں سے اپنے بیڈروم سے باہر نکل آئی...... سارے گھر میں خاموشی اور سناٹے کا راج تھا سوائے دادی کے کوئی بھی صبح جلدی نہیں اٹھتا تھا اور آج تو سنڈے تھا۔ سنڈے کو تو سارے گھر والوں کی صبح لنچ کے ٹائم پر ہوتی تھی۔ کچن سے کھٹر پٹر کی آواز آ رہی تھی...... صبح فجر کے وقت ماسی صغراں اپنا اور دادی کا ناشتا تیار کیا کرتی تھی، وہ سیدھی دادی کے کمرے میں گھس گئی۔ دادی فجر پڑھ چکی تھیں اور اب خاصی فریش بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں...... اسے دیکھ کر بری طرح چونک گئیں۔

"کیا ہوا زارا...... تم آج اتنی جلدی کیسے اٹھ گئیں......؟" وہ دادی کو سلام کرنے کے بعد اُن کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گئی اور کسلمندی سے اپنا سر اُن کے کندھے پر رکھ دیا۔

"نیند نہیں آ رہی تھی دادی......"

"نیند ویسے تو نہیں روٹھتی بیٹیا...... کوئی وجہ ہوتی ہے۔" دادی نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"دادی......!" وہ سوچ میں ڈوبے لہجے میں بولی۔ "میں دراصل رابی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"ارے......!" دادی ہنس پڑیں۔ "رابی کے بارے میں کیا سوچنا...... اس کی کشتی تو کنارے لگ گئی ہے خیر سے...... اب تم اپنے متعلق سوچو...... تمہارے اور اس کے بیچ دو سال کا فرق ہے...... تو بس شادی میں بھی اتنا ہی فرق ہونا چاہیے۔"

"دادی......" وہ اپنی دُھن میں بولنے لگی۔ "آپ لوگوں نے رابی کے لیے کیوں ہاں کر دی ہے؟"

"ارے، ارے...... کہاں تو خدیجہ خالہ کو اتنا پسند کرتی تھیں اور کہاں اب......" وہ دادی کی بات کاٹتے ہوئے فوراً کہنے لگی۔

"لیکن دادی...... خدیجہ خالہ کو پسند کرنے کا یہ تو مطلب نہیں ناں...... کہ ہم ان کی محبت میں رابی کو جھونک دیں آگ میں۔" دادی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"آگ میں......؟ کیا کہہ رہی ہو لڑکی تم...... کس نے آگ میں جھونکا ہے تمہاری بہن کو؟" وہ منہ بسورنے لگی۔

"ایک ایسے لڑکے سے اس کی شادی طے کر دی ہے آپ سب نے...... جو امریکا میں رہ رہا ہے، جسے کسی نے دیکھا نہ بھالا...... معلوم نہیں وہ کن عادات و اطوار کا مالک ہے...... بس امریکا کا نام سنا...... خدیجہ خالہ کو دیکھا اور ہاں کر دی۔" دادی کچھ دیر سوچتی رہیں پھر بڑے مطمئن انداز میں بولیں۔

"بیٹا! خدیجہ بہشتی خاتون ہے...... اس کا بیٹا بھی اس کا پرتو ہوگا...... اور خدیجہ کا بیٹا اگر بھلا مانس نہ ہوتا تو خدیجہ کبھی رابی کا رشتہ نہ مانگتی...... یہ تم بھی

جانتی ہوگی۔" دادی نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"ہاں دادی...... یہی ایک بات اطمینان کی ہے لیکن پھر بھی لڑکی دیتے ہوئے بہت سی باتیں سوچنی پڑتی ہیں اور پھر لڑکی بھی رابی جیسی...... جو اللہ میاں کی گائے ہے۔ پتا نہیں امی اور آپ نے کیسے اتنی جلدی ہاں کر دی۔ آپ کو کچھ وقت تو لینا چاہیے تھا اس سلسلے میں...... اور لڑکے کے اخلاق اور کردار کے بارے میں اپنے طور سے معلومات کرنی چاہیے تھی ناں!"

"ہاں بیٹا...... ایسا کرنا تو چاہیے تھا لیکن جب خدیجہ نے کہا کہ اس کا بیٹا امریکا میں رہتے ہوئے بھی پرانے خیالات کا مالک ہے، اسے اپنی ماں کی پسند پر بھروسا ہے، وہ رابی کو نہ نیٹ پر دیکھنا چاہتا ہے نہ کسی اور طرح...... بس وہ جیسی بھی ہے اسے منظور ہے...... ہم نے پھر کوئی بات نہیں کی۔" دادی نے سر ہلا کر اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں دادی...... یہ غلط ہے، آج کے دور میں ایسا ممکن ہی نہیں...... اپنے ملک میں اس طرح شادیاں نہیں ہوتیں نہ کہ وہاں...... معلوم نہیں اندر کی کیا بات ہے۔" زارا نے اپنا سر زور، زور سے نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ بے حد تشویش کے عالم میں بول رہی تھی۔ ماسی صغراں دادی کا ناشتا لے کر آئی تو وہ الجھی الجھی سی دادی کے کمرے سے باہر آ گئی۔

☆☆☆

رابی بہت مگن، بے حد خوش تھی...... تتلی کی طرح کمرے کے اندر سے باہر اور باہر سے اندر ہوتی رہی جبکہ زارا کو ایک انجانی سی فکر نے گھیرے میں لیا تھا...... وہ ایسی ہی حساس تھی...... دوسروں کے درد کو اپنے دل میں محسوس کرنے والی اور یہاں تو معاملہ اس کی عزیز از جان بہن رابی کا تھا...... ماں سے وہ دن میں کئی کئی بار اس موضوع پر بحث کرتی...... سب مطمئن تھے سوائے اس کے...... اس دن جب اس کی فکریں حدوں کو چھونے لگیں تو وہ خدیجہ خالہ کے گھر جا پہنچی۔ خدیجہ خالہ، امی کی پھوپی زاد بہن تھیں...... بے حد نرم خو...... ہمدرد اور اچھے مزاج کی عورت تھیں...... اپنے بیٹے کامران کو انہوں نے بہت چھوٹی عمر میں خود سے جدا کر کے پڑھنے کے لیے اپنے دیور کے ساتھ امریکا بھیجا تھا...... یہاں ان کی دو بیٹیاں تھیں جن کی انہوں نے شادیاں کر دی تھیں۔ میاں کے بعد وہ تنہا تھیں اور اب چاہتی تھیں کہ کامران کی شادی کر کے خود بھی اس کے ساتھ امریکا چلی جائیں یا کامران مستقل یہاں آ جائے۔ کامران، امریکا میں اپنی پڑھائی ختم کر کے اب وہاں ایک اچھی جاب کر رہا تھا...... اسے اپنے چچا کی سپورٹ حاصل تھی۔ خدیجہ خالہ ہر سال امریکا جاتی تھیں۔ کامران پاکستان کم کم آتا تھا اور اتفاق سے اگر آیا بھی تو زارا کے گھر میں کسی سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی، ہاں غائبانہ طور پر سب ہی اس سے واقف تھے کہ خدیجہ خالہ کی باتوں میں کامران ہی کامران ہوتا تھا...... جب انہوں نے رابی کا ہاتھ اس کے لیے مانگا تو سب کو یہ رشتہ بہت پسند آیا سوائے زارا کے...... ناپسند تو زارا کو بھی نہیں تھا لیکن اس کے دل میں توہمات تھے، خدشات تھے جبکہ رابی بہت خوش تھی وہ اُلٹا زارا کے اس قدر وہمی ہونے پر اس کا مذاق اڑایا کرتی...... زارا آج اپنے خدشات مٹانے کے لیے خدیجہ خالہ کے گھر آئی تھی۔

"ارے آؤ آؤ...... آج یہ چاند کیسے راستہ بھٹک کر میرے گھر میں آ گیا۔" انہوں نے لپک کر زارا کو گلے لگا لیا...... پھر اسے بڑی محبت سے اپنے بیڈروم میں بٹھایا اور نوکر کو پُرتکلف چائے لانے کا کہا۔ ان کا انداز ایسا نثار کر دینے والا تھا کہ زارا کو اپنے خیالات پر شرمندگی محسوس ہوئی لیکن آج اسے اپنے من سے یہ کانٹا نکال دینا تھا۔

"اچھا...... اب کہو...... آج خالہ کی یاد کیسے آ گئی؟" انہوں نے ایک بار پھر اسے اپنے ساتھ

لگاتے ہوئے پوچھا۔

''خالہ......'' اس نے بھی مزید لگی لپٹی رکھے بغیر کھل کر بات کرتے ہوئے کہا۔ ''دراصل مجھے رابی کی بہت فکر ہو رہی ہے۔''

''اچھا...... لیکن کیوں جان...... خیر تو ہے ناں؟'' خدیجہ خالہ کو سخت حیرت ہوئی۔

''خالہ...... کیا رابی، کامی کے ساتھ چل سکے گی...... میرا مطلب ہے...... وہ زیادہ تر امریکا میں رہا ہے جبکہ رابی سادہ سی لڑکی ہے...... اوپر سے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں۔''

''تمہاری بات کو میں غلط نہیں کہوں گی...... اگرچہ کامی میرا تابعدار بیٹا ہے اور اس نے بڑی خوشی اور آسانی سے میری چنی ہوئی لڑکی بغیر دیکھے قبول کرلی ہے...... ویسے بھی وہ شروع سے کہتا تھا کہ وہ شادی کسی پاکستانی لڑکی سے ہی کرے گا لیکن تمہاری طرح کی باتیں کچھ دنوں سے میرے ذہن میں بھی آرہی تھیں...... سو میں نے اسے بلایا ہے اور وہ چند دنوں تک پاکستان آنے والا ہے۔ تب رابی اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ لیں گے...... ایک دوسرے سے مل لیں گے۔'' خالہ اس کے ہاتھ پر محبت سے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

''کیا......؟'' وہ خوشی سے بے اختیار اچھل پڑی...... اسے ایسا لگنے لگا جیسے اس کا دل بادلوں کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا ہو...... جیسے ایک بہت بڑا بوجھ اس پر سے ہٹ گیا ہو۔ مارے خوشی کے اس نے خدیجہ خالہ کے گلے لگ کر بے اختیار ان کے پے در پے کئی بوسے لے ڈالے...... خالہ بے اختیار ہنسنے لگیں۔

''ارے تو کیا سمجھتی ہے، کامی میرا بیٹا ہے تو کیا رابی میری بیٹی نہیں...... ارے اس کا میں زیادہ سوچتی ہوں بہ نسبت کامی کے۔''

''اس میں کیا شک ہے خالہ......'' زارا محبت بھری نظروں سے خدیجہ خالہ کو دیکھتے ہوئے ممنون لہجے میں بولی۔ بہت ساری باتیں کرنے کے بعد جب وہ ان کے گھر سے آرہی تھی تو اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا...... وہ قدم کہیں رکھ رہی تھی اور وہ پڑ کہیں اور رہے تھے۔ ترنگ میں آکر اس نے رابی کی پسند کا پزا خریدا اور گھر آگئی۔

''لو موٹو...... تم بھی کیا یاد کروگی کہ کس رئیس بہن سے پالا پڑا تھا۔'' ڈبا اس کے سامنے لہراتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی تو رابی نے حیران نظروں سے اسے دیکھا...... چند دن سے وہ بے حد بجھی بجھی اور گم صم سی دکھائی دے رہی تھی۔ رابی کو پتا تھا کہ وہ اس قدر اپ سیٹ صرف اس کی وجہ سے ہے لیکن آج ایسا کیا انوکھا ہو گیا تھا جو وہ یک دم خوش باش اور فریش دکھائی دے رہی تھی۔

''پزا تو میں خیر کھا ہی لوں گی...... لیکن تم بتاؤ آج طبیعت میں اس قدر جولانی کیوں ہے، کہیں کچھ مل گیا ہے کیا......؟'' وہ ڈبا نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''جانتی ہو میں کہاں سے آرہی ہوں؟''

''ہاں جانتی ہوں کہ تم پزا لے کر آرہی ہو۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''لیکن وہاں سے جانے سے پہلے میں ایک اور جگہ گئی تھی۔'' زارا نے جاسوسی بھرے لہجے میں کہا۔

''اچھا زیادہ سسپنس نہ پھیلاؤ اور فوراً سے پیشتر بتادو۔'' رابی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی اور ساتھ میں پزا کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔

''میں تمہاری سسرال گئی تھی...... اور سب کچھ صحیح کر کے آرہی ہوں...... اور یہ پزا تمہیں اسی خوش خبری کے طفیل کھانے کو مل رہا ہے۔'' نوالہ رابی کے حلق میں پھنسنے لگا تھا...... اس کی آنکھیں مارے دکھ اور حیرت کے پھٹنے لگیں۔

''تم نے...... کامی کے ساتھ...... میرا رشتہ ختم کرادیا......؟'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

''ہاں میں گئی تو اسی ارادے سے تھی لیکن خدیجہ خالہ بڑی گریٹ خاتون ہیں، معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے طے ہی پا گیا۔'' اس کے چہرے کے بگڑتے نقوش پر نظریں ڈالتے ہوئے زارا بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی۔ وہ بھی شاک کی کیفیت میں تھی۔

''کیسا معاملہ...... کیا کیا تم نے...... بتاؤ مجھے جلدی سے۔'' رابی کے دل کو پنکھے لگے تھے جبکہ وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

''کامی کو خدیجہ خالہ نے بلایا ہے...... وہ جلد پاکستان آنے والا ہے۔ وہ تمہیں دیکھے گا، تم سے ملے گا، تم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تو ٹھیک ورنہ...... ٹائیں ٹائیں فش ہو جائے گا......'' وہ شرارت سے مکا ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔ رابی کے دھڑکتے دل کو تھوڑا سا قرار نصیب ہوا لیکن زارا پر اس کو بھر کر غصہ بھی آیا۔

''تم رشتوں کو کھیل سمجھ بیٹھی ہو زارا...... رشتے اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹتے۔'' وہ خفگی سے کہہ رہی تھی۔

''یہی تو میں چاہتی تھی رابی...... کہ تم دونوں کے درمیان رشتہ ہو جائے تو وہ مضبوط ہو...... تمہیں بن دیکھے...... تم سے بنا ملے وہ اس شادی پر تیار ہو جائے اور کل کو تم اس کے معیار پر پوری نہ اتریں تو......؟ بس اس لیے میں پریشان تھی۔'' زارا نے ایک نظر اس کے سنجیدہ چہرے پر ڈالی اور سنجیدگی سے بولی۔

رابی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا وہ پزا کھانے میں مگن رہی...... زارا جانتی تھی جب وہ بات نہیں کرنا چاہتی تو کوئی مائی کا لعل اسے بات کرنے پر آمادہ نہیں کرسکتا تھا...... سو وہ ایک گہری سانس لے کر دادی سے بات کرنے چل دی...... دادی اس کی سہیلی کم اور دوست زیادہ تھیں...... اس وقت بھی وہ لکڑی کے کسی پرانے کنگھے سے اپنے بال سنوار رہی تھیں...... دادی کے بال سفید ضرور ہوئے تھے لیکن اب بھی خاصے لمبے اور گھنے تھے۔

''دادی...... آپ کے بال اس لیے اتنے لمبے اور گھنے ہیں کہ آپ لکڑی کے کنگھے سے بال کنگھی کرتی ہیں۔''

''اور نہیں تو کیا......'' دادی اپنے بالوں کے بیچ اپنی مانگ کو انگلی سے سیدھی کرتے ہوئے بولیں۔ ''آج کل تو برش اور پلاسٹک کی کنگھیوں نے بالوں کا ستیاناس کردیا ہے...... اوپر سے شیمپو اور وہ بال سکھانے کی مشین...... ان سب کے ہوتے ہوئے بال کب زندہ رہ سکتے ہیں بھلا؟''

''اچھا...... آپ ہیئر ڈرائیر کی بات کررہی ہیں۔'' وہ دادی کے بال سکھانے والی مشین کی بات پر مسکرا کر بولی۔

''ہاں...... بھئی جب اس مشین سے گرم ہوا نکل کر بالوں کو سکھاتی ہے تو بالوں کی جڑیں اس گرمی سے جل جاتی ہیں اور بال بے چارے جھڑنے لگتے ہیں۔'' زارا کو اچانک اپنی بات یاد آگئی کہ وہ کیوں ان کے پاس آئی تھی۔ وہ بڑے جوش سے دادی کو بتانے لگی۔

''دادی...... آج میں خدیجہ خالہ کے گھر گئی تھی۔''

''ایں!'' دادی بڑی شدت سے چونکیں۔ کنگھی ان کے بالوں میں پھنس کر رہ گئی اور وہ اپنی پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگیں۔ زارا نے ان کا ہاتھ تھاما اور محبت سے ان کا ہاتھ تھپتھپانے لگی۔

''میری بات تو سنیں دادی...... میں بڑی خوش خبری لے کر آئی ہوں۔'' پھر اس نے دھیمے دھیمے انداز میں دادی کو ساری بات بتادی۔

''یہ تو بہت اچھا ہوگا اگر کامی یہاں آجائے...... وہ بھی ہماری بچی کو دیکھ لے گا اور ہماری بچی بھی اس سے مل لے گی...... اسے بھی اپنی پسند نا پسند کا اختیار تو ہونا چاہیے۔'' دادی ساری بات سننے کے بعد کھل کر ہنس دیں۔

''اختیار تو ہے دادی...... لیکن وہ آج کل کی لڑکی نہیں ہے...... وہ تو پرانی شمیم آرا اور صبیحہ خانم ہے...... بس جس کے پلے بندھ گئی اسی کی ہو کر رہ گئی...... اب کامی جیسا بھی ہو، ہوگا تو اس کا مجازی

خدا اور اس کے بدلے کوئی شہزادہ بھی قبول نہیں کرے گی وہ؛ مجھے تو فکر یہ تھی کہ اگر کامی کو وہ نیک پروین پسند نہ آئی تو کیا ہوگا......؟" وہ ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ "اب تو شادی سے پہلے فیصلہ ہوگا...... کامی کو اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہوگی تو شادی ہوجائے گی نہ ہوئی تو......؟" آخری بات پر دادی جو اس کی باتوں پر مسکرا رہی تھیں چونک پڑیں۔

"کیا اناپ شناپ بولے جارہی ہو...... وہ کون سا ایسا راجا اِندر ہے جو میری پھول سی بچی کو ریجیکٹ کرے گا۔ آخر رابی میں کمی کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے دادی...... چھوڑیں ان باتوں کو تو آپ برا نہ مانیں بس مجھے ایسے ہی ایک لکڑی کا کنگھا منگوادیں...... میں آج سے اپنے سارے ہیئر برش ڈسٹ بن میں ڈال دیتی ہوں۔"

"یہ تو میرے پرانے بکسے میں بہت پڑے ہوئے ہیں۔ آج کل یہ کہاں ملتے ہیں، اچھا دے دوں گی، پر سنو...... اپنی امی کو بھیج دو...... یہ تمہاری والی خوش خبری تو اسے سنادوں۔" دادی نے ہنس کر کہا۔

☆☆☆

ڈائننگ روم میں پڑی ہوئی بارہ چیئرز کی ٹیبل یہاں سے وہاں تک کھانے کی اشیا سے بھری ہوئی تھی...... کامران اتنی ساری چیزیں دیکھ کر سٹ پٹا گیا۔

"آنٹی...... ہم تو صرف دو بندے آپ کے ہاں آئے ہیں لیکن آپ نے اتنا زیادہ انتظام کیا ہے۔ آخر یہ سب کھائے گا کون؟"

"ہم ہیں کھانے والے...... آپ دو بندے ہیں لیکن ہم تو چار بندے ہیں...... میں، رابی امی اور دادی...... اور چپکے سے ایک بات کہوں...... عام حالات میں ہمیں اتنا اچھا کھانا نصیب بھی نہیں ہوتا...... سو آج ہم ڈٹ کر کھائیں گے۔" زارا شرارت سے ہنستے ہوئے بولی۔ کامی بے اختیار ہنس دیا۔

"زارا بہت شرارتی ہے...... یہ اپنی باتوں سے ماحول کو ہر دم شگفتہ بنائے رکھتی ہے۔" خدیجہ خالہ بے ساختہ ہنس کر کامران سے کہنے لگیں۔

"ہاں...... یہ تو پتا چل رہا ہے...... اور آپ......" وہ رابی کی طرف جھک کر بولا۔ "آپ بولتی بھی ہیں یا ہمیشہ چپ رہتی ہیں۔" زارا کی انتہائی کوششوں کے باوجود رابی نے سادہ سے کپڑے پہنے جو لباس زارا نے اس کے لیے منتخب کیا تھا...... اس نے اسے ریجیکٹ کردیا...... اور اب سر پر دوپٹا لیے بالکل خاموش میز کے سرے پر کامی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی آہستگی سے کھانا کھا رہی تھی۔

"ارے بیٹا...... بولتی ہے، بولنے پر آجائے تو چپ نہیں رہتی...... بس زارا کی بہ نسبت تھوڑی شرمیلی ہے۔" دادی نے محبت سے رابی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

کھانا بڑے اچھے ماحول میں کھایا گیا...... امی، دادی اور زارا سب کو کامران بہت پسند آیا تھا...... وہ ایک سادہ سا انسان تھا جو نہ تو زیادہ انگریزی جھاڑ رہا تھا اور نہ اس میں کوئی نخریلا پن تھا...... لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ امریکا سے آیا ہے...... امی اور دادی کی باتوں میں وہ بڑی دلچسپی لے رہا تھا...... زارا کی شوخی بھری باتوں کو وہ انجوائے کر رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ وہ ایک گہری نظر رابی پر بھی ڈال لیتا تھا...... کامران اور خدیجہ خالہ کے جانے کے بعد گھر کے سارے لوگ بہت خوش تھے...... بعد میں جب لاؤنج میں محفل جمی تو دادی نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

"بھئی واہ...... مزہ آگیا...... کیسا بیبا بندہ ہے کامران، لگتا ہی نہیں کہ امریکا جیسے ملک سے آیا ہے۔"

"اور کھانے میں ذرا نخرا نہیں دکھایا جو بھی ڈش آگے کی...... اس میں تھوڑا سہی...... لیکن ضرور کھایا...... زارا کے ساتھ تو بہت بے تکلفی ہوگئی پہلی ملاقات میں...... جیسے سالیوں سے مذاق چلتا ہے ویسے ہی مذاق کرتا رہا......" امی اور زارا نے بھی تائید کی۔

"دادی...... ہم کو وہ پسند آیا...... یہ تو ٹھیک ہے لیکن اسے بھی رابی پسند آئی ہوگی یا نہیں...... مجھے یہ فکر کھائے جارہی ہے۔" زارا نے پھر کچھ تشویش کا اظہار کیا۔

"اے لو...... ہماری بچی کوئی ناپسند کرنے والی ہے کیا؟ ہزار جان سے نثار ہوا ہوگا...... امریکا میں ایسا حسن کاہے کو دیکھا ہوگا۔" دادی نے محبت سے رابی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ زارا نے رابی کو دیکھا...... گلابی رنگ کے کپڑوں میں وہ سچ مچ کسی گڑیا کی طرح پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ سنہری بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر پڑی بہت حسین لگ رہی تھی۔

"ہاں...... لیکن دادی ہمیں ان دونوں کو موقع دینا ہوگا کہ یہ ایک دو ملاقاتیں اور کرلیں۔ اسی طرح وہ ایک دوسرے کے بارے میں کچھ جان سکیں گے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" زارا نے ایک گہری سانس لی۔ دادی سر ہلا کر پُرسوچ لہجے میں بولیں۔

"مجھے اعتراض نہیں اس بات پر...... اب جبکہ وہ اس مقصد کے لیے آیا ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ رابی سے ملے...... بات چیت کرے بلکہ دونوں ایک دوسرے کو جانچ لیں...... تبھی کوئی حتمی فیصلہ ہو۔" زارا کو دادی پر بے اختیار پیار آگیا...... دادی پرانے زمانے کی ضرور تھیں لیکن پرانے خیالات کی مالک نہیں تھیں اور امی تو دادی کی ہر بات سے متفق ہوتی تھیں ویسے بھی گھر میں فیصلے کا اختیار دادی کو حاصل تھا۔ ابا بڑی جلدی گزر گئے تھے۔ امی دو بیٹیوں کے ساتھ تنہا رہ گئی تھیں تبھی دادی کا مضبوط وجود جیسے ان کے گرد مضبوط حصار بن گیا تھا...... مالی طور پر کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن ابا کے بعد جو خلا پیدا ہوگیا تھا دادی کے وجود نے کسی حد تک وہ خلا بھر دیا تھا...... ابا کی زندگی میں بھی دادی ہر فیصلہ خود کرتی تھیں اور بعد میں تو اپنی بہو اور پوتیوں کے لیے جیسے وہ سائبان بن گئیں...... رابی کے چہرے پر بکھرے خوب صورت رنگوں نے زارا کو بتادیا تھا کہ رابی کو کامی سے مل کر مایوسی نہیں ہوئی تھی...... رابی کی نیچر ایسی تھی کہ اگر کامی جیسا بھی ہوتا...... رابی کو وہ قبول ہی ہوتا......" شاید یہ رابی کی قسمت اچھی ہے کہ کامی میں بہت ساری خوبیاں نظر آرہی ہیں۔ ایسی ہی خوبیاں جو خدیجہ خالہ میں ہیں۔" زارا نے سوچا۔

زارا کی کوششوں سے ہی بعد میں رابی اور کامی کی ایک دو ملاقاتیں بھی ہوئیں...... یہ ملاقاتیں ان کے گھر میں ہی ہوتی تھیں۔ زارا تو خیر اِدھر اُدھر ہوجاتی لیکن دادی اور امی بھی ان دونوں کو تنہائی فراہم کرتیں۔

اس دن زارا یونیورسٹی سے گھر لوٹی تو گھر میں بڑی خاموشی تھی۔

"رابی تو خیر سو رہی ہوگی کہ سونا اس کی فیورٹ ہابی ہے لیکن دادی اور امی تو اس وقت نہیں سوتیں؟" زارا نے سوچا...... ماسی کچن میں کھٹ پٹ کر رہی تھی۔

"ماسی...... سب لوگ کہاں ہیں؟ میرا مطلب ہے امی اور دادی......؟" کچن کے دروازے پر کھڑے ہوکر اس نے ماسی سے پوچھا۔

"چھوٹی بی بی تو اپنے کمرے میں اور بڑی بی بی اپنے کمرے میں ہیں۔"

"امی اور دادی نے کھانا کھالیا؟"

"نہیں، بس رابی بی بی نے کھالیا تھا...... ان دونوں نے نہیں کھایا......" وہ چونک پڑی۔

"کیوں...... امی اور دادی تو دوپہر کا کھانا بڑی باقاعدگی سے کھاتی ہیں۔ آج کیوں نہیں کھایا؟" الجھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں...... حالانکہ آج ان کی پسند کا کچنار گوشت بنایا تھا...... شاید کوئی پریشانی ہے۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

زارا کے دل کو دھڑکا سا لگ گیا...... کچھ دیر وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر ایک دم بولی۔

"تم ایسا کرو ماسی...... کہ ٹرالی میں تین بندوں کا کھانا دادی کے کمرے میں لے آؤ...... میں امی کو بھی وہیں لاتی ہوں۔"

ماسی تو اچھا کہہ کر کام میں لگ گئی جبکہ وہ پہلے دادی کے کمرے میں آ گئی۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی تھیں لیکن آج بیڈ پر لیٹی خلاؤں میں جیسے کچھ گھور رہی تھیں۔ آہٹ پر چونکیں اور زارا کو دیکھ کر مسکرا دیں لیکن زارا کو یہ مسکراہٹ بڑی بجھی بجھی سی لگی۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے دادی، آج آپ نے لنچ کیوں نہیں کیا؟"

"بس ویسے ہی۔" دادی نظریں چُراتے ہوئے بولیں۔ "صبح ہیوی ناشتا اچھا خاصا کر لیا تھا تو اس وقت کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"اور امی کا؟" اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "کیا آپ دونوں کا ایک ساتھ کھانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"اب مجھے تمہاری ماں کا کیا پتا...... وہ اپنی مرضی کی مالک ہے...... میں اپنی مرضی کی......" دادی نے فقط اتنا ہی کہا۔

"نہیں...... آپ اپنی مرضی کی مالک ہوتے ہوئے بھی مجھے جواب دہ ہیں۔ بتائیں، کیا بات ہے؟" دادی سٹ پٹا کر رہ گئیں۔

"بات...... بات کیا ہونی ہے، کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تو اس میں کوئی بات کہاں سے آ گئی؟"

"کھانے کو گولی ماریں، بس مجھے وہ بات بتا دیجیے جس نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے۔" دادی سمجھ گئیں کہ زارا اس طرح تو انہیں چھوڑے گی نہیں...... وہ کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی، ٹھنڈی سانسیں بھرتی رہیں...... زارا انہیں کھوجتی نگاہوں سے دیکھتی رہی...... پھر وہ نظریں جھکا کر دھیمے لہجے میں بولیں۔

"کامران نے رابی کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" ایک تیر تھا جو بڑے زور... زارا کے دل میں کھُب کر رہ گیا...... اس کا رنگ... زرد ہو کر رہ گیا...... فوری طور پر تو اس سے کچھ... بولا گیا...... دادی کا جھریوں بھرا چہرہ غم والم کی تصـ... بنا ہوا تھا اور وہ زارا سے نظریں نہیں ملا رہی تھیں۔

"رابی کو پتا چل گیا ہے کیا؟" بڑی دیر بعد... رک رک کر بولی۔

"نہیں...... اسے کچھ پتا نہیں...... یہی تو... ہے کہ جب اسے پتا چلے گا تو......؟" دادی نے... میں سر ہلایا۔

"کیا وجہ بتائی اس نے......؟" دادی کی بات... کاٹتے ہوئے وہ بے قراری سے بولی۔ دادی اسے... تفصیل بتانے لگیں۔

"آج تمہاری خدیجہ خالہ گھبرائی... آئیں...... وہ بہت رو رہی تھیں اور بار بار ہم... معافیاں مانگ رہی تھیں کہ کامی، رابی سے شادی نہیں... کرنا چاہتا...... وہ کہہ رہا ہے رابی بہت حسین ہے... پاکباز اور باحیا لڑکی ہے...... لیکن امریکا میں وہ میرے... ساتھ نہیں چل سکے گی جبکہ......" دادی نے رک کر ایک... نظر اس پر ڈالی اور پھر دھیمی آواز میں کہنے لگیں۔

"وہ رابی کے بجائے تم سے شادی کرنا چاہتا... ہے۔" زارا کو لگا جیسے کمرے کی چھت اس پر آن گری... ہو جیسے کمرے کی دیواروں نے آکٹوپس کی طرح... اسے اپنے پنجوں میں گھیر رکھا ہو۔ جیسے وہ سانس لینے... کے قابل نہ رہی ہو۔ کچھ دیر تو اسے ایسا لگا جیسے اس کی... سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو گئی ہو لیکن یہ... ایک لمحہ تھا وہ جلد ہی اپنے آپے میں آ گئی۔ غصے... شدت نے اس کے سارے وجود کو جیسے جھلسا کر رکھ... تھا۔ اس نے زیادہ دیر نہیں سوچا بس سیدھی گھر... نکل آئی اور تبھی دم لیا جب تک خدیجہ خالہ کا گھر... نہیں آیا۔ آندھی طوفان کی طرح گاڑی اُڑاتی ہوئی... لے گئی تھی۔

"خالہ گھر پر ہیں کیا؟" ماسی اینہ سے سامنا... ہوتے ہی اس نے پوچھا۔

"نہیں، ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔ طبیعت کافی... خراب تھی۔"

"اور ان کا بیٹا کامران؟" اس نے پوچھا۔

"وہ اپنے کمرے میں ہیں۔" ماسی نے جواب دیا۔

"میں سٹنگ روم میں جا رہی ہوں ان کو وہیں... بھیج دو۔" وہ تیز تیز قدموں سے سٹنگ روم کی... جانب چل دی۔

"آداب عرض کرتا ہوں۔" کامران جانے... سٹنگ روم میں داخل ہوا، وہ اپنے آپ میں... گم تھی کہ اسے پتا ہی نہ چل سکا۔ کامران اس کے... سامنے ہی دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا تھا جبکہ اس نے... جواب دینے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

"کیا بات ہے زارا...... آپ ناراض ہیں؟" ...سنجیدہ صورت پر بکھری ناراضی وہ ایک نظر میں... بھانپ گیا سو خود ہی بولا۔

اس کا دل چاہا ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر... دے مارے لیکن بہ مشکل اپنی اس خواہش پر قابو پایا۔

"تو آپ کا کیا خیال ہے کہ میں آپ کی اس... جرأت پر خوشی کے شادیانے بجانا شروع کر دوں؟" ...وہ بپھرے لہجے میں بولی۔

"کیسی جرأت؟" وہ حیران ہو کر پوچھ رہا تھا۔ ...اب کے بڑے زور کا جھٹکا لگا کیا خبر دادی کو... غلط فہمی ہوئی ہو لیکن انہیں خدیجہ خالہ نے خود بتایا ہے۔ ...الجھ سی گئی جبکہ کامران کے چہرے پر ایسا کچھ نہیں... سوائے حیرت کے۔ اب اس نے صاف، صاف... بات کرنے کی ٹھانی۔

"کامران صاحب، کیا آپ نے خدیجہ خالہ... سے کوئی بات کی ہے؟"

"کیسی بات؟" وہ ہنوز حیرت کے سمندر میں... غوطہ زن تھا۔

"اپنے رشتے کے حوالے سے رابی کے سلسلے میں۔" اپنے اندر کا غصہ قابو میں کرتے ہوئے اس نے صاف، صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

"ہاں۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بے ریا لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے رابی اس ماحول میں آسانی سے ایڈجسٹ نہیں ہو سکے گی جس میں ہم رہتے ہیں۔"

"آپ نے اس کے بجائے میرا نام لیا ہے؟" اس کا تن من سلگنے لگا تھا۔

"ہاں۔" اب کے پھر اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے ہر ماحول میں ایڈجسٹ ہونے والی نیچر کی لڑکی لگتی ہیں۔"

"آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ بھڑک کر بولی۔ "یہ پاکستان ہے مسٹر...... امریکا نہیں۔ رابی نے آپ کے حوالے سے کچھ خواب دیکھے ہیں اور آپ کو کوئی حق نہیں کہ وہ خواب آپ اس کی آنکھوں سے نوچ ڈالیں اور رہی میں تو یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں آپ کی اس تجویز کو خوشی، خوشی مان لوں گی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں لڑکیاں مٹی کی مادھو کے مانند ہوتی ہیں جو امریکا سے آنے والے رشتے کو اپنے لیے خوش قسمتی سمجھتی ہیں چاہے وہ اس کی بہن کی لاش پر چل کر آئے۔ کتنی غلط سوچ ہے آپ کی۔" وہ رُندھے ہوئے لہجے میں بولے جا رہی تھی۔

"یاد رکھیں میرا نام آئندہ اپنی زبان پر مت لائیے گا۔ سنا آپ نے؟" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سٹنگ روم سے باہر جانے لگی تھی لیکن کامران جو ایک سنگی مجسمے کے مانند بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا اچانک جیسے ہوش میں آ گیا۔ وہ لپک کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"زارا پلیز بیٹھ جائیں... بیٹھ کر اس مسئلے کو سُلجھاتے ہیں۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ اتنی دور سے اسی لیے آئے تھے کہ رابی کو دیکھیں گے، پرکھیں گے اور فیصلہ کریں گے تو فیصلہ آپ نے کر دیا لیکن مجھے غصہ اس بات پر ہے کہ آپ نے میرا نام کیوں لیا؟" وہ شدید غصے میں تھی۔

"مجھے رابی بہت پسند ہے اتنی زیادہ کہ میں انکار کر کے اسے کھونا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کی شرمیلی طبیعت نے مجھے اس فیصلے پر اکسایا ہے ورنہ دل ایک فیصد بھی اس فیصلے کے لیے آمادہ نہیں تھا اور رہی آپ کی بات تو مجھے اس کے لیے زبردستی خود کو آمادہ کرنا پڑا کیونکہ اگر میں دوٹوک انکار کر دیتا تو مما کا دل بہت زیادہ ٹوٹ جاتا اور یہ میں نہیں چاہتا تھا۔" وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ جھوٹ بھی ہو سکتا تھا لیکن کامران کے لہجے میں ایسی کوئی بات ضرور تھی کہ زارا کو لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ بہت دیر لگی اسے خود کو سنبھالنے میں آخر بڑی ہمت سے گویا ہوئی۔

"میں اپنی بہن کی طرف سے کوئی مقدمہ نہیں لڑوں گی۔ آپ کو بھلانے میں اسے وقت ضرور لگے گا لیکن آخر کار وہ آپ کو بھولنے میں کامیاب ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگی تو وہ پھر اس کے سامنے آ گیا۔

"آپ اس طرح نہیں جا سکتیں زارا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ حیرت سے کہنے لگی۔ "اب کوئی فائدہ نہیں بات ختم ہو چکی ہے۔"

"نہیں، بات ختم نہیں ہوئی ہے۔ رابی کو میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اگر میں نے اس سے شادی سے انکار کیا ہے تو یہ بھی اس کی بہتری کے لیے۔ میں اپنی محبت میں خود غرضی نہیں چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ بہت سیمپل نیچر کی ہے اور اسے خود کو بدلنا آسان نہیں ہو گا جبکہ امریکا کی زندگی بہت تیز رفتار ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس دوڑ میں پیچھے رہ جائے۔ میں اسے وہاں کی تیز رفتاری کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتا تھا۔ کیا میں نے اس کے لیے غلط سوچا؟" وہ بے قراری سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"آپ نے اپنے لیے غلط سوچا کامران صاحب جو محبت کرتے ہیں وہ اپنی محبت کو بیچ راہ میں چھوڑ کر نہیں جاتے۔ آپ رابی کے لیے ایک اچھے ساتھی بنیں گے ہر قدم پر اس کا ساتھ دیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ آپ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہ چل سکے۔ آپ نے محبت کی طاقت کو آزمایا نہیں۔ کچھ وہ آگے سرکے گی اور کچھ آپ پیچھے آئیں گے تو فاصلے خود بخود سمٹتے چلے جائیں گے اور آپ کو امریکا یا پاکستان سے کیا لینا دینا۔ آپ دونوں تو ایک دوسرے کے جیون ساتھی بنیں گے۔ آپ دونوں کی زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ گزریں گی تو زندگی آسان ہوتی جائے گی۔ یاد رکھیں محبت کی طاقت سے بڑی کوئی اور طاقت نہیں اور اسی طاقت کے ذریعے انسان مضبوط تر بنتا ہے۔" وہ بڑے ٹھوس لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اچانک ہی کامران کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔ چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

"سوری زارا، میں یہ فلسفہ سمجھ ہی نہیں پایا۔ اتنی چھوٹی سی بات میں نہیں سمجھ پایا کہ محبت زندگی ہے اور اس کے آگے چھوٹی موٹی رکاوٹیں کچھ نہیں۔" وہ اس کے پاس آ کر بولا۔

"مما سے تو میں معافی مانگ لوں گا لیکن تمہاری امی آئی مین آنٹی اور دادی مجھے معاف کر دیں گی کیا...... اور خاص کر رابی؟"

اچانک ہی زارا کے چہرے پر شادابی پھیل گئی۔ مارے خوشی کے اس کی باچھیں کھلنے لگیں۔ اب اسے گھر جانے کی جلدی تھی کہ جب تک رابی نیند سے بیدار ہوتی اسے ممی اور دادی کو سمجھانا تھا کہ رابی کو کچھ معلوم نہ ہونے پائے۔ وہ مسرور تھی کہ اس نے اس چھوٹی سی بات کا سرا پکڑ لیا تھا۔

تین پہر کا جیون

دردانہ نوشین



میں یاراں احمد، پنجاب یونیورسٹی سے حال ہی میں فارغ التحصیل ہو کر خانہ بدوشی سے خانہ نشینی میں آئی ہوں، ایقہ کے کمنٹس کیا یاد آئے سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ میں چہرے کے حساب سے عام نقوش رکھتی ہوں مگر مجھے میری دودھیا رنگت، جسمانی خدوخال اور قد و قامت نے کچھ خاص بنا دیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ کئی لڑکیاں بہانوں سے میرے حسن کے جلوے دیکھنے آتی تھیں۔ بے تکلف دوست

شانے پر ہاتھ مار کر کہتیں۔ ”یار تیری کیا بات ہے تو تو سلیبریٹی ہے بنی بنائی......“ تو کیوں ناں مجھے اپنے آپ پر ناز ہوتا......لڑکے تو رفتہ رفتہ میرے گھر تک پہنچنے لگے۔ اپنی ماؤں تک کو بھیجنے لگے مگر میرے بابا نے سوچ سمجھ کر میرا رشتہ ڈاکٹر عامر حبیب سے طے کیا جو لینڈ لارڈ کا بیٹا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک وجیہہ نوجوان تھا۔

☆☆☆

سب نے کہا چاند سورج کی جوڑی ہے، منگنی کے بعد آٹھ ماہ تک ہم نے ایک دوسرے کی محبت کو دلوں میں بسالیا اور رچالیا۔ یہ ایک یادگار وقت تھا۔ ڈاکٹر عامر نے جناح گارڈن میں مجھے سامنے بٹھا کر غزل لکھی تھی حالانکہ وہ شاعر نہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے سامنے بٹھا کر میرا بُت تراشو، اس نے کہا یہ تو کوئی ماہر سنگ تراش بھی نہیں بنا سکتا، ہوش وحواس کھودے گا اور ہم پھر خوب ہنسے تھے۔ زندگی کتنی مد بھری تھی جیسے تتلیوں کی دھنک......مہکتے پھولوں کی صبا۔

☆☆☆

عامر حبیب اور میری......یعنی ہماری شادی ہوگئی تھی۔ اللہ نے ہمیں چاند سا بیٹا دیا۔ جس کا نام ابد عامر رکھا۔ عامر کی پروموشن بھی ہوگئی تھی۔ چار سُو خوشیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ابد سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا، ابد کی پیدائش کے بعد میرا وزن کچھ بڑھ گیا تھا مگر میں نے پوری توجہ سے اپنا وزن کم کیا اور پھر پہلے کی طرح اسمارٹ ہوگئی۔ مجھے باورچی خانے کے کاموں سے کوفت ہوتی تھی، اس سے ہاتھ اور ناخن خراب ہوتے تھے۔ عامر نے میرے لیے ایک ماہر باورچی رکھ دیا تھا۔ وہ میرا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ ڈنر ہم اکثر باہر کرتے۔ ہمارا گھر ایک پوش ایریا میں تھا جہاں اردگرد پڑھی لکھی اور خوش حال فیملیز رہتی تھیں۔ جہاں لیڈیز آپس میں کم کم میل جول رکھتیں جو بھی تھا مگر ڈریسنگ کے معاملے میں سب کانشس تھیں۔ میری ڈریسنگ سب سے جدا ہوتی اور میں لباس کے معاملے میں ٹرینڈ سیٹر کہلائی جاتی کچھ خواتین تو ہو بہو نقل کرتیں مگر مجھ پر ہر لباس کچھ زیادہ ہی جچتا۔

ایک مرتبہ میں ٹی وی چینل کے مارننگ شو میں گئی اور کمال یہ ہوا کہ مجھے ٹی وی ڈرامے کا ایک کیریکٹر بھی آفر ہوا۔ تھی ناں ایک ناقابلِ یقین بات......مگر عامر کو میرا ایکٹنگ جوائن کرنا پسند نہیں آیا۔ شاید میں عامر سے منوالیتی اور منوانے کا سلسلہ جاری رکھتی مگر مجھے میری طبیعت کی تبدیلی نے دوسری بار خوشخبری کا احساس دلایا۔ ایک بار پھر ڈھیلے ڈھالے لباس اور موٹاپے کا خوف الگ......میں ڈپریسڈ رہنے لگی مگر امی اور دوستوں نے سمجھایا۔ اولاد جوڑوں کی مثالیں دیں اور کہا۔

”تمہاری فیملی مکمل ہوجائے گی۔ دو بچے تو ہونے چاہئیں۔“ میں نے بھی دوسرے بچے کے لیے خود کو آمادہ کرلیا۔ عامر کو بچے اچھے لگتے تھے اور وہ میرے ہر حلیے میں میری ستائش کرتے تھے۔ ایک دوست نازلی نے مجھے حاملہ خواتین کے خوب صورت آرام دہ اسٹائلش ملبوسات کے میگزین لادیے۔ واقعی ان ملبوسات نے میری شخصیت کے حسن کو دوبالا کردیا۔ پھر میں ڈیلیوری کے لیے امی کے ہاں چلی گئی۔ اللہ نے ابد کی پیاری سی بہن مناہل دے دی......میرا گھر میری جنت، میرے بچے میرے چاند کے ٹکڑے......زندگی ایک چمکتی ہنسی۔

☆☆☆

وقت کا پہیا دھیرے دھیرے چلتا رہا۔ تیرہ سالہ ابد اور گیارہ سالہ مناہل کو اسکول روانہ کرکے میں گیٹ سے لوٹی تو چکر سا آگیا۔ بچوں کی اسکولنگ، کوچنگ، عامر کا رات دیر تک انتظار نیند پوری نہیں ہورہی تھی شاید......چائے پینے کا ارادہ ترک کرکے سونے کے لیے بیڈروم میں چلی گئی۔

ان دنوں عامر اپنے والدین کے ہمراہ حج پر جانے کی تیاری کررہے تھے۔ میرے پاس میری امی کو آکر رہنا تھا۔ روزمرہ کی مصروفیات عامر کے نہ ہونے سے فزوں تر ہوگئیں۔ ذمے داریوں کا بوجھ زیادہ محسوس ہوتا۔ عامر کی عدم موجودگی کے چالیس دن چالیس مہینے لگ رہے تھے لیکن عامر خوش اور پُرجوش تھے، ان کا اشتیاق دیکھ کر مجھے شرمندگی ہوتی......عامر شروع سے نماز پنجگانہ کے عادی تھے۔ اب وہ داڑھی بھی رکھنے لگے تھے۔ تراشی ہوئی سیاہ وسفید داڑھی انہیں زیادہ پُروقار اور پُرکشش بنارہی تھی۔ وہ میچور لگتے مگر مجھے دیکھ کر سب کہتے تم ویسی کی ویسی ہو۔ میرا وزن متناسب رہا۔ میں اڑتیس سال کی عمر میں اٹھائیس کی بھی نہیں لگتی تھی۔ انہی دنوں چھوٹی بہن تارے کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ امی اور میرے درمیان یہ موضوع ہی کافی تھا۔ باتوں کے ساتھ ساتھ ہم نے تارے کے جہیز کی خریداری کے چکر بھی لگانا شروع کردیے۔ تارے کے یونیورسٹی میں آخری دن تھے وہ فون پر گپ شپ کرتی رہتی۔ عامر کی واپسی کے ساتھ شادی کی تاریخ طے ہونا تھی۔ ایک دوپہر غسل کے دوران میں نے دائیں چھاتی میں کچھ سخت حصہ محسوس کیا۔ یہ کوئی دو انچ کی جگہ تھی۔ اس میں کوئی درد یا تکلیف نہیں تھی۔ شاید میں کہیں انجانے میں ٹکرائی ہوں اور اندر کی سوجن ہے۔ میں نے باہر نکل کر سوچا امی سے بات کی تو خواہ مخواہ پریشان ہوجائیں گی۔ کہا کبھی میں یہ چالیس دن گزر گئے۔ عامر واپس آئے تو حج کی مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ لگ بھگ مہینہ گزر گیا تھا کہ پھر ایک رات مجھے لیٹے لیٹے بریسٹ میں سخت جگہ کا احساس ہوا۔ میں نے عامر کو متوجہ کیا ان کے تاثرات میں سخت سنجیدگی کے سائے دیکھ کر میں ہراساں ہوگئی۔

”کب سے ہے، پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

دعا

یہ دعاؤں کے ہیں جو سلسلے
ہمیں جوڑتے ہیں اُسی ذات سے
میری رب سے ہے یہی دعا
تجھے رحمتوں سے نواز دے

مرسلہ: نفیسہ نہال، لاہور

میں ساری مصروفیات گنواتی رہی۔

”اس کا مطلب ہے کہ کم از کم چار مہینے ہوچکے ہیں۔ حد ہوگئی۔“ انہوں نے اتنا کہا تو میں رونے لگی۔ ویسے میں آج تک حیران ہوتی ہوں۔ میں نے اتنی بے نیازی اور جہالت کا مظاہرہ کیونکر کیا تھا اتنا وقت کیسے گزر گیا تھا مگر شاید ایسا ہونا ہی تھا۔ عامر مجھے تسلیاں دینے لگے۔

”کل ہی میموگرافی کراتے ہیں۔“ مگر میرا دل اب ڈوب چکا تھا۔ مجھے لگا کہ میں بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوچکی ہوں۔

اس رات کی صبح میں صبح والی کوئی چمک نہیں تھی۔ بچوں کو اسکول روانہ کرکے ہم کلینک چل دیے۔ عامر ڈاکٹر تھے لہٰذا ٹائم لینے اور انتظار کرنے کی مجبوری نہ ہوئی تھی لیکن آج میں لائن میں بیٹھ کر برے وقت کو اپنے سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر کے کمپیوٹر کی اسکرین نے بیماری کی تصدیق میں دیر نہ کی۔ مجھے بریسٹ کینسر تھا۔ اب محض کٹیگری، پھیلاؤ، گہراؤ کی رپوٹیں باقی تھیں۔ مجھے لگا کہ میں میز سے اتر کر اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہوسکوں گی۔ میری دنیا اندھیر ہوچکی تھی۔ پتا نہیں کیوں ڈاکٹر دُرِ صبیح اور اس کے شوہر پروفیسر ڈاکٹر حوصلہ افزائی کے جملے بول رہے تھے، کہہ رہے تھے کہ اب کینسر بھی ٹائیفائڈ، ملیریا کی طرح قابلِ علاج ہے اور مجھے لفظ کینسر کا اپنی ذات سے منسلک ہونا ہی ناقابلِ برداشت لگ رہا تھا۔ ڈاکٹرز

میرے شوہر کو الگ لے گئے تھے مجھے معلوم تھا عامر نے مجھے مرض کی کوئی ہولناکی نہیں بتائی۔

عامر گاڑی چلا رہے تھے ان کا زبردستی تھمایا ہوا جوس میرے ہاتھ میں تھا اور میں خالی خالی نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ آتے ہوئے ان راہوں میں امید کا شائبہ تھا مگر جاتے ہوئے تو اتنا حبس تھا کہ دم گھٹتا تھا۔ علاج، رقم، صبر، سمجھوتے کی پلاننگ ہم دونوں کے دماغوں میں چل رہی تھی۔

پھر میرا اکمرا تھا، میں بیڈ پر اوندھی پڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں چلا رہی تھی۔ ''ایسا نہیں ہوسکتا، یہ جھوٹ ہے، ڈاکٹروں کے نزدیک یہ مذاق ہے۔ معمول کی بات ہے، وہ ہنستے مسکراتے ہمیں مرض بتادیتے ہیں۔ میرے ساتھ ایسا کیوں ہو، میں نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟''

عامر نے مجھے سینے سے لگایا۔ بوسے دیے، اپنے اشکوں کو پی کے میرے اشک پونچھے آخر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ایسے نہ بولو باراں......بس کرو یار......کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی کفر کا کلمہ منہ سے نہ نکل جائے۔''

''عامر تم مجھے چھوڑ جاؤ گے؟'' میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں رگڑ کر لال بھبو کا چہرہ اٹھا کر عامر سے سوال کیا۔

''کبھی نہیں جانی......کیسی بات کی تم نے، کبھی ایسا نہیں ہوسکتا، ایسی بات پھر منہ سے نہ نکالنا، تم نے تو مجھے انسانی سطح سے گرادیا۔'' عامر نے فرطِ جذبات سے پھر ایک بار مجھے سینے سے لگالیا۔ توقف کے بعد اپنے آنسوؤں کا گولہ نگل کر بولے۔

''جانی......آغا خان جاکے دیکھو، شوکت خانم دیکھو، کسی بڑے اسپتال میں دیکھ لو، کینسر کے اَن گنت پیشنٹ ہیں...... بارو! تمہارے شوہر کے پاس کروڑوں کی زمینیں ہیں، ان کو بیچ کر پیسہ پانی کی طرح بہادوں گا، ان کو دیکھو جن کے پاس بخار کی دوا لینے تک کے پیسے نہیں، روز کی روٹی میسر نہیں، اللہ انہیں بھی آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔'' سچ کہوں تو تمام لفظ میری سماعتوں سے اجنبی ہو کے گزر رہے تھے، میرے اندر بھانبھڑ تھا.... کیوں...... کیوں؟ کیوں؟ کا غوغا تھا۔ حالانکہ وہ تو پہلا درد تھا۔ آگے درد کا دریا تھا۔ اب علاج میں مزید دیر کے لیے کوئی وقت نہیں تھا۔ اب ایک دن بھی ضائع کیے بغیر گھر، آرام دہ نیند، بچوں کا ساتھ چھوڑنا اور اسپتال داخل ہونا تھا۔

شوکت خانم میموریل اسپتال نے کھلی بانہوں سے ایک اور درد گزیدہ کا استقبال کیا۔ مستعد عملہ، ہمدرد معاون معالج، صفائی ستھرائی، ہائی جینک ماحول اور فوری سروس نے جیسے کسی ترقی یافتہ ملک کا تاثر دیا۔ ڈاکٹرز کی پہلی کونسلنگ کا لبِ لباب یہ تھا کہ مجھے نسائی حُسن سے محروم ہونا تھا۔ اور یہ کہ حسن ثانوی چیز ہے زندگی اولین ترجیح ہے، زندگی ہی اصل نعمت ہے، مجھے بتایا گیا کہ بے شمار خواتین جن میں زیادہ تر جوان تھیں اور کچھ نوجوان اور غیر شادی شدہ بھی وہ بریسٹ ریموو سرجری کے بعد سالوں سے صحت مند زندگی گزار رہی ہیں۔ ڈاکٹروں کی فکرمندی جسم کا ایک حصہ ریموو کرنے سے متعلق نہ تھی بلکہ اس کی روگس کی اعضائے رئیسہ تک رسائی سے تھی۔ وہ مجھے شفقت سے شاک کی کیفیت سے نکل آنے کی تلقین کرتے رہے اور میرے شوہر کے بھرپور تعاون کی تحسین کرتے رہے۔

ایک شاک تو میرے اندر تھا دوسرا شاک معاشرتی ردِعمل کا تھا جو مسلسل جاری رہتا ہے حتیٰ کہ امی، بہنیں، عامر کے گھر والے، اہلِ کالونی سب کے لیے میں عجوبہ تھی۔ مقامِ عبرت تھی...... ہم لوگ کتنی آسانی سے کسی دکھی کو اپنی ترحم و تضحیک بھری گفتگو کا نشانہ بنالیتے ہیں۔ ''بے چاری'' اور ''ایسی تھی'' کے صیغہ استعمال کرتے ہیں اور ہمیں دل آزاری کے گناہِ کبیرہ کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ کیا دل توڑنے کا

علیم صرف کسی لڑکی کا، کسی لڑکے کا محبت بھرا دل توڑنا ہوتا ہے؟ دل توڑنے والوں کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ کب کس کا دل ٹوٹا۔

وہ بھی دن گزرے کہ کیموتھراپی اور دوائیوں کے زیرِ اثر میری انگلیوں اور ہاتھوں میں گرفت کی قوت نہ رہی تھی۔ جسم کھوکھلا ہوگیا تھا۔ کوئی مجھے پانی پلاتا تو لگتا احسان کیا ہے، میں نلکیوں اور پٹیوں میں جکڑی رہی۔ میرے سر کے بال گر چکے تھے......اور جب لمبے عرصے بعد میرے حساب سے تو گویا برسوں بعد آئینہ میرے ہاتھ میں آیا تو ایک اُجڑا ہوا پھیکا ڈھال چہرہ جس کا سر سیاہ اسکارف سے ڈھکا تھا میرے سامنے تھا...... کہاں گیا غمزہ و ناز......؟ میں اس شیشے میں چمکتی دمکتی باراں کو ڈھونڈتی کھوجتی ہار گئی۔ کوئی نوحہ سا میرے لہو میں بہتا چلا گیا۔ ابد اور منا بل میرے اس چہرے پر پیار کرتے رہے! میری بہن تارے میرے سامنے سر پر جوڑا دوپٹا ماتھے تک لپیٹ کے آتی تھی حالانکہ اس نے کبھی سر پر دوپٹا نہیں لیا تھا۔ عامر مجھے اس روپ میں دیکھتے ہوئے محبت سے دیکھ بھال کرتے تھے، امی سرد راتوں میں اسپتال کے لان میں رو رو کے دعائیں مانگتی تھیں...... ''یہ سب مجھ سے بے لوث پیار کرتے ہیں'' بے شک میری زخمی روح کا ناسور کیوں بن گیا تھا۔ میرا صرف بدن ہی زخمی نہ تھا روح بھی زخمی تھی۔ میری زخم خوردہ روح پر مرہم رکھنے والی وہ مثالی لڑکی کبھی نہ بھولے گی...... وہ بھی آٹھ سال بیشتر اسی اسپتال میں علاج کے لیے داخل رہی تھی اور چھبیس سال کی بھرپور عمر میں ایک چھاتی سے محروم کردی گئی۔ مکمل میڈیکل فٹنس رپورٹ کے بعد دو سال پہلے اس نے شادی کی اور ایک بچی کی ماں تھی۔

اس مثالی لڑکی کا نام مثالِ زینب تھا۔ مثالِ زینب کے اب کمر تک لمبے بال ہیں مگر وہ گاؤن اور اسکارف اوڑھتی تھی۔ جب میں نے پہلی بار آئینہ دیکھ کر ٹوٹے دل سے اپنے بائیں اسٹول پر رکھا تو دیکھا سامنے وہ کھڑی تھی۔ اس نے مسکرا کر سلام کیا۔ مجھے اُجلی خوش باش صحت مند خواتین دیکھ کر خوشی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنا مختصر تعارف کرا ڈالا جو یہ تھا۔

''کینسر کی سابقہ مریضہ......مثالِ زینب۔''

میری کوفت کچھ کم ہوئی۔ اس نے اپنی مسکراہٹ کو قائم رکھتے ہوئے کہا۔

''پیاری باراں احمد (نام کی تختی بیڈ پر تھی) تمہاری آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں، تمہارے چہرے پر جو پیلاہٹ اور سوجن ہے یہ جلد ختم ہوجائے گی اور جب صحت یابی میں تمہارا روحانی



زندہ باد

موسم سرما رخصت ہو رہا تھا اور گرمیوں کی آمد آمد شروع ہو رہی تھی۔ سوچا آج الماریوں کی دیکھ بھال کرلوں۔ ان کی صفائی کرلوں لیکن پہلے کس الماری سے کام شروع کروں۔ ہاں، پہلے اپنی اس الماری سے کام شروع کروں جس میں رسالے رکھتی ہوں۔ خاص طور پر پاکیزہ رسالہ...... الماری کھولی سب رسالے باہر نکالے اور برآمدے میں تخت پر رکھوادیے۔ اتنے میں میری پڑوسن آگئیں جن کو ہم سلیقہ بیگم کہتے ہیں۔ واقعی سلیقہ بیگم ہیں، ہر چیز خوب حفاظت سے رکھتی ہیں۔ خاص طور پر اپنے جہیز کی چیزیں...... ڈرائنگ روم پر خاص توجہ ہوتی ہے۔ خیر سے شادی کو پندرہ سولہ سال بیت گئے ہیں مگر ڈرائنگ روم کی سجاوٹ ابھی تک ویسی ہی ہے جیسی جب تھی۔ شوہر بہت اچھی پوسٹ پر ہیں، گھر میں خوش حالی ہے۔ اللہ نے ایک بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا ہے۔ دونوں بہت ذہین اور خوب صورت ہیں۔ اللہ نے ہر نعمت سے نوازا ہے دیگر رشتے داروں کی طرح ہمارے گھر میں بھی ان کے سلیقے کی دھوم ہے۔ ہمارے سرتاج اس بات کے بہت معترف ہیں۔ اس پر میرا ان سے اختلاف ہوجاتا ہے۔ اتنا سلیقہ بھی اچھا نہیں...... اتنا وقت گزر گیا، جہیز کی ہر چیز سینے سے لگائے بیٹھی ہیں۔ ڈرائنگ روم کی ہر چیز اپنا رنگ و روپ کھو چکی ہے۔ پردے، قالین سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں۔ کپڑا کہیں کہیں سے گھس چکا ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کیا رنگ تھا اور کیسے گل بوٹے تھے۔ صوفے الگ اپنی عمر تمام کرچکے مگر وہ ابھی تک ان ہی کی جھاڑ پونچھ میں لگی رہتی ہیں۔ شوہر پریشان اپنے دوستوں کو اس ڈرائنگ روم میں کیسے بلائیں۔ بچے الگ پریشان کیسے اس بوسیدہ سے ڈرائنگ روم میں اپنے کلاس فیلوز کو بلائیں۔ کئی بار یہ معاملہ زیر بحث آیا کہ اب ڈرائنگ روم کا حلیہ بدل دیں مگر ان کو ان سب چیزوں سے اتنا پیار ہے کہ وہ سنتا تک گوارا نہیں کرتیں۔ خیر میں نے ان کو خوش آمدید کہا۔

''کیسے صبح صبح آنا ہوا؟'' ساتھ ہی ملازمہ سے چائے کا بھی کہہ دیا۔

''اتنے سارے رسالے ہیں آپ کے پاس۔'' میری بات کا جواب دیے بغیر وہ رسالوں میں الجھ گئیں۔ ''اتنے سارے رسالے ہیں اور وہ بھی پاکیزہ! مجھے تو پاکیزہ بہت پسند ہے۔ اکثر پڑھتی رہتی ہوں۔ برا نہ مانیں تو کچھ رسالے لے جاؤں؟'' محترمہ ذرا کنجوس بھی ہیں رسالے اِدھر اُدھر سے لے کر پڑھتی ہیں۔

''بصد شوق آپ ضرور لے جائیں۔'' کچھ دیر بات چیت رہی پھر چلتے وقت وہ کچھ رسالے لے گئیں اور میں اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ ہفتہ بعد آئیں بہت افسردہ، پریشان۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے ان کو اس طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔

رسالے دیکھ کر کہنے لگیں۔ ''کیا بتاؤں کل شام تک تو ہمارے شوہر نامدار ٹھیک ٹھاک تھے۔ ہنس بول رہے تھے رسالے دیکھ کر کہنے لگے آخر کیا لکھا ہوتا ہے ان میں جو اتنے شوق سے پڑھتی ہو۔ رات پڑھتے پڑھتے سو گئے۔ دفتر جاتے ہوئے کہنے لگے۔ ''یہ اپنے جہیز کا دقیانوسی سامان اٹھا کر پھینک دو شام کو دوسرا نیا فرنیچر لاؤں گا۔ ڈرائنگ روم خالی ہو۔'' میں پریشان کہ ان کو اچانک کیا ہوگیا۔ ان کے جانے کے بعد بستر کی چادر اور تکیہ درست کرنے لگی تو پاکیزہ رسالہ کھلا رکھا دیکھا غالباً پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے۔ میں نے جو صفحہ دیکھا۔ انجم انصار نے کسی ڈرائنگ روم کا نقشہ پیش کیا تھا۔ جلترنگ میں جو لکھا تھا، لگتا تھا وہ میرے ہی ڈرائنگ روم کا ذکر ہے۔ وہی کچھ تھا جو میرے ڈرائنگ روم میں تھا۔ رسالہ بہت پرانا تھا پتا نہیں کب انجم انصار نے میرا ڈرائنگ روم دیکھ لیا۔ ہائے انجم انصار تم سے خدا سمجھے، اب میں تم کو کیا کہوں۔'' شام کو ان کے گھر میں اِدھر اُدھر سامان رکھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اختر بھائی نیا فرنیچر لے آئے تھے۔ دونوں بچے خوشی سے بھرپور آواز میں اونچا اونچا بول رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ان کا بیٹا مٹھائی کا ڈبا لیے آیا اور خوش خوش بتانے لگا۔

''آنٹی آئیں ہمارا ڈرائنگ روم دیکھیں۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اب میں اپنے دوستوں کو بلا سکوں گا۔'' جاتے وقت پاکیزہ زندہ باد کا نعرہ لگا گیا وہ۔

تحریر: بنت عزیز الرحمٰن، راول پنڈی

ارتقا شامل ہوگا تو تمہارا چہرہ ستاروں کی طرح چمکے گا انشاء اللہ...'' وہ رکی اور پھر بولی۔ ''جیسے میرا۔'' میں اس کے کمپلیمنٹ پر بے ساختہ مسکرا دی۔ جانے کتنے ہفتوں بعد خود بخود مسکراہٹ آئی تھی۔ مسکرانے کا عمل مجھے خاصا اجنبی سا لگا اور میں نے جلدی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

''میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے مزید کہا۔

''بیٹھو......'' میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ بیٹھتے ہوئے مجھے بتانے لگی۔

''میں یہاں روٹین کے چیک اپ کے لیے آتی رہتی تھی اب تو میرا آنا ڈاکٹرز ویلکم کرتے ہیں...... اپنی تین ماہ کی بچی کا نام میں نے صبرِ زینب رکھا ہے۔ تمہی بتاؤ، جناب زینبؓ سے بڑھ کر صبر کس نے کیا؟ باراں تم یقیناً اداس ہو، میں بھی کچھ کم اداس نہیں رہتی تھی۔ آنسو بہتے رہتے تھے اس لیے کہ تب میرا ذہن ایک چھوٹے دائرے سے آگے سوچتا نہیں تھا۔ ویسے تمہیں بھی پتا ہوگا خالق نے ہمیں a big capacity کا دماغ دیا ہے مگر ہم اسے بس ننھا سا خرچ کرتے ہیں، قریب کی خوشی اور قریب کے غم کے سوا ہمیں کچھ نظر نہیں آتا۔ مصلحتِ ربانی سمجھنا کھیل نہیں ہوتا...... ہمارے رسول ﷺ کی ایک دعا ہے۔'' مجھے رنج و حزن سے دور رکھ۔'' بھلا کون سا رنج و حزن؟ یہی دنیاوی اپروچ کا؟ چھوٹے گھاٹے کا؟ جسے ہم اپنی حیات اور سوچ پر مسلط کرکے پھیلا دیتے ہیں اور وہ ہماری قیمتی و نایاب زندگی کھا جاتا ہے۔''

''زینب...... یہ چھوٹا رنج نہیں ہے۔'' میں کسمسائی۔

''دیکھو...... کئی بندوں کے پیدائشی عضو نہیں ہوتے۔ کئی حادثاتی طور پر کھو بیٹھتے ہیں، ہمارا جسم بھی اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے۔ عطا تو عطا ہوتی ہے ملکیت نہیں ہوتی۔ میں تمہیں ایک قلم، ایک دوپٹا، ایک رنگ عطا کروں پھر ان میں سے ایک چیز واپس اٹھالوں تو کیا تم مجھ سے جھگڑو گی؟ بھلا تم اُن چیزوں کے لیے کیوں جھگڑو گی جنہیں لے کر بھی تم نے کتنا برتنا تھا؟ خوب صورت مکمل اور توانا بدن لے کے بھی آخر چند برسوں بعد اسے زیرِ خاک ہی ملانا ہے۔''

''تم ہر بات ٹھیک کہہ رہی ہو زینب۔'' میں نے عجیب انداز سے کہا۔

''نہیں مثالِ زینب۔''

''ہاں مثالِ زینب مگر میں تمہارے جتنی اعلیٰ ظرف نہیں ہوں۔ میں تو مذہب کو بس ہلکا سا جانتی ہوں میں ہمیشہ کامل رہی ہوں، میں اس کمی کے ساتھ کیسے جیوں گی اور ایک بات یہ ہے کہ مجھے اپنے شوہر کی محبت ترس لگے گی بلکہ کسی کی بھی محبت...''

''انشاء اللہ تم سمجھ جاؤ گی۔'' اس نے اتنا ہی کہا۔

اس کے بعد ہماری کچھ ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ ہمیشہ سفید اسکارف اور گرے گاؤن میں خوشبو کی طرح دلوں کو چھوتی پاکیزگی لیے اور ہمیشہ مسکراتی ہوئی دکھائی دی۔ اس دن بھی وہ میرے لیے ایک خوب صورت گلدستہ لائی تھی۔

''باراں جب ماڈل جیسی لڑکی تھی (یہ اسے میں نے بتایا تھا) تو اس نے ماڈل بنانے والے کا کتنا شکریہ ادا کیا؟ جس کی عطا پر unlimited ستائش سمیٹی اس غنی کا کتنا شکریہ ادا کیا؟ اس کو تو تم سے، مجھ سے اور اپنی بے زبان مخلوق سے ہوا میں اُڑتے اس پرندے سے یکساں محبت ہے مگر اس نے عطا کو یکساں کیوں نہیں رکھا۔ چاہتا تو رکھ سکتا تھا، ہے ناں؟'' میں کچھ بھی بول نہ پائی بس سنتی رہی۔

''ہمارے لیے ہر نعمت فار گرانٹڈ...... پھر بھی

کی ہو تو ہم پوچھتے ہیں، ہمارے ساتھ یہ کیوں ہوا؟ کیا اب بھی تمہارے پاس بے حساب نعمتیں نہیں؟"

"کچھ نہیں رہا۔" میری سرد آہ زبان بن گئی۔

"کچھ نہ رہنا وہ ہوتا ہے جو حضرت ایوب علیہ السلام سے ہوا۔ گھر، مال، دولت، مویشی، سرمایہ، خادم، شان، جوان اولاد، تن بدن صحت، دیکھنا، سننا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، صبر کے آخری افق تک صبر کیا۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھا چلو یہ بتاؤ تمہیں میری یہ باتیں بور تو نہیں کرتیں؟"

"نہیں۔"

"اور بیماری سے پہلے...... میں ایسی باتیں کرتی تو بور ہو جاتیں؟" میں لمحہ بھر سوچ کر صداقت سے بولی۔ "بلکہ سننا پسند نہ کرتی۔"

"تو تم نے روحانی ارتقا کی طرف قدم بڑھا دیے، میری بہن۔" وہ مسکرا کر مجھ سے ہاتھ ملانے لگی۔

☆☆☆

میں چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو وہ مجھے اور عامر کو اسی مرض میں مبتلا ایک چھیالیس سالہ مریضہ کے گھر لے گئی۔ چھوٹے سے گھر کے صحن میں نیم کے درخت تلے کھٹولے پر نیم غنودگی سے کراہ رہی تھی اور دکھی آوازیں نکال رہی تھی۔ اس کی ساس مرغیاں، انڈے بیچتی، شوہر ریڑھی بان تھا۔ علاج کے لیے اسپتال تک جانے کا کرایہ جب تک جوڑا، بہت دیر ہو چکی تھی۔ کینسر گردے اور ریڑھ کی ہڈی تک پھیل چکا تھا۔ مثالِ زینب نے اسے پیڈسٹل فین لے کر دیا درد کم کرنے والے انجکشنز اور دوائیں لے کر جاتی۔ اسی نیم کے درخت تلے مثالِ زینب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"خدا کی قسم مجھے زندگی کا کوئی ارفع مقصد نظر نہیں آتا سوائے انسانیت کی خدمت کے۔ خواہ میٹھی زبان سے، کام کرنے والے ہاتھوں سے، پیسے سے، ہر میسر وسیلے سے...... ہزار دعائیں ہیں سرطان کا اسپتال بنانے والوں کے لیے باراں۔ ایسے ہی کام کریں استطاعت والے، انسانیت کی خدمت میں جو لطف، حلاوت اور سکون ہے وہ ہمیں دو جہاں میں ہارنے نہ دے گا۔ سلامت رہو باراں۔" ایک بھرپور مصافحے کے بعد وہ رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

میری بیماری کو چار برس بیت گئے۔ میں تندرست ہو گئی۔ عامر استنبول (ترکی) میں تعینات ہوئے اور اب ہم وہی رہتے ہیں۔ عامر نے اگر مجھ سے پہلے زندگی کو سنجیدگی سے سمجھ نہ لیا ہوتا تو ممکن ہے میرا صرف جسمانی تعلق والے شوہر کی سطحی سوچ سے سامنا ہوتا۔ اگر ایسا بھی ہوتا تو میں نے سوچ لیا تھا میں نے اپنے لیے زندہ رہنا ہے۔ محبت دینی ہے اس کی واپسی کا انتظار نہیں کرنا۔

میں اب اپنے شانوں تک بڑھے بال ڈھانپتی ہوں اور جسم کی نمائش سے مجھے نفرت ہو گئی ہے حالانکہ بظاہر میں مکمل نظر آتی ہوں اور میرا جسم بھدا یا موٹا نہیں، ہمیں تو اللہ نے ڈائریکٹ کہا ہے اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر پھیلا لو کاش میں یہ پہلے جانتی۔

مجھے اب خوب صورتی یا لباس کی تعریف سن کر خوشی نہیں ملتی۔ جب میری پندرہ سالہ بیٹی مناہل کو دیکھ کر عورتیں کہتی ہیں۔ "خوب صورت لڑکی ہے۔" "سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔" وہ جواباً کہتی ہے تو مجھے اندر سے سچی خوشی ہوتی ہے۔

میں سوچتی ہوں یہی وہ کمی تھی جسے راست ہونا تھا۔ یہی وہ مصلحت تھی جو تربیت کی اگلی کڑی کو ٹیڑھا ہونے سے بچانے کے لیے تھی یا شاید مصلحت اب بھی پوشیدہ ہو، میں یہ نہیں کہتی کہ میری کہانی ہر سرطان کی مریضہ کی کہانی ہے مگر میری کہانی میں کوئی امید ضرور انہیں بھی مل سکتی ہے۔



اک بار پھر

نسرین خالد



جیسے ہی سب نے سنا کہ شاہ زیب بھائی کے ہاں بیٹی ہوئی ہے، سب کے منہ اتر گئے۔ پریشے کو سب کے اترے ہوئے منہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا۔

"کیا بیٹیاں اتنی بری ہوتی ہیں؟" اس نے دکھ سے سوچا۔ اس کے خاندان میں جب کوئی بیٹی پیدا ہوتی تو سب ہی غمگین ہو جاتے تھے۔

"ماں! یہ بیٹیاں اتنی بری ہوتی ہیں کیا کہ ان کی پیدائش پر سوگ منایا جائے؟" بابا جان کے جاتے ہی

اس نے ماں سے پوچھا۔

"نہیں، بیٹیاں تو بہت پیاری ہوتی ہیں۔" ماں نے پیار سے اس کا گال چھوا۔

"تو پھر ان کے آنے پر اتنے دکھ کا اظہار کیوں کیا جاتا ہے؟" پریشے نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"اس لیے شاید کہ ماں، باپ کو ان بیٹیوں کے نصیب سے ڈر لگتا ہے اور کبھی کبھی یہ بیٹیاں ماں، باپ کے لیے آزمائش بن جاتی ہیں۔"

"آزمائش...... وہ کیسے؟" پریشے اُن کی بات سے تھوڑا الجھ گئی۔

"تم یہاں بیٹھو، تمہیں ایک کہانی سناتی ہوں۔" آمنہ خان نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے اپنے سامنے بٹھالیا۔ وہ الجھی الجھی سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے ناں، تمہارے بابا جان کی ایک بہن بھی تھیں۔"

"جی۔" پریشے نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ بچپن میں فوت ہوگئی تھیں۔"

"نہیں...... وہ مری نہیں، وہ اب تک زندہ ہے۔"

"ک...... ک...... کیا؟" پریشے حیرت سے چلّائی۔

"زر مینے تمہارے بابا جان اور تینوں چچاؤں کی بہت لاڈلی تھی سب سے چھوٹی اور اکلوتی ہونے کی وجہ سے سب ہی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ اسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔" پریشے حیرت سے آنکھیں پھیلائے انہیں سن رہی تھی۔ وہ اب تک شاک میں تھی اس کی ایک پھپھو بھی ہیں اور اسے آج تک پتا نہیں چلا۔

"اس زمانے میں ہمارے خاندان میں کوئی لڑکی نہیں پڑھتی تھی مگر وہ پڑھنے کے لیے شہر گئی تھی۔ آغا جان بہت سخت گیر انسان تھے مگر زر مینے کی ضد کے سامنے ہمیشہ ہتھیار ڈال دیتے تھے اور پھر چاروں بھائی بھی اس کے حمایتی تھے مگر اس نے کسی کا نہ سوچا۔" آمنہ خان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ایسا کیا کیا تھا انہوں نے؟" پریشے نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"وہ کہیں چلی گئی تھی...... پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے اپنے ایک پروفیسر سے کورٹ میرج کرلی تھی۔ سب نے بہت ڈھونڈا اسے مگر وہ نہیں ملی۔ باپ اور بھائیوں کی عزت کی دھجیاں اُڑا کر وہ ایسی گم ہوئی کہ آج تک نہیں ملی۔ اس کی اس حرکت پر تمہارے بابا اور تینوں چچا دہاڑیں مار مار کر روئے تھے۔ آغا جان کو تو ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا۔ وہ زندگی کی بازی ہار گئے تھے۔ انہیں یقین ہی نہیں آیا تھا کہ جس بیٹی کو انہوں نے اتنے ناز و نعم سے پالا تھا وہ ایسے ان کا سر جھکا دے گی۔ بس پھر اس دن سے زر مینے مر گئی اور اب خاندان میں کوئی بیٹی پیدا ہوتی ہے تو سب کے چہروں پر خوف آجاتا ہے کہ کہیں...... کہیں پھر سے ایک اور زر مینے نہ پیدا ہوجائے جو ان کا سر شرم سے جھکا نہ دے۔ ان کی عزت کو ملیا میٹ نہ کردے۔ بس یہی ڈر ہے ان سب کو۔"

آمنہ خان نے آج اس کے بہت سے سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔ اسے یاد تھا جب اس کا یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہورہا تھا تو بابا جان بالکل نہیں مان رہے تھے مگر جہان بھائی بھی اس کی حمایت میں اُڑے رہے تھے۔

"تم نہیں سمجھوگے جہانزیب خان، لڑکیوں کے لیے زیادہ پڑھائی خطرناک ہوتی ہے۔" بابا جان نے اپنے ضدی بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کون سی حدیث میں لکھا ہے بابا جان؟" جہانزیب اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔

"کل کو کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔" بابا جان نے انہیں سمجھانا چاہا۔

"کوئی اونچ نیچ نہیں ہوگی، پریشے میری بہن ہے وہ کبھی ہمارا سر نیچا نہیں کرسکے گی، اس بات کی گارنٹی تو میں آپ کو دیتا ہوں۔" جہان نے اعتماد سے کہا۔

حیدر خان خاموشی سے اسے دیکھے گئے۔ کبھی ایسا ہی اعتماد انہیں زر مینے پر تھا۔

"آ...... آپ ایک بار اس پر اعتماد کرکے تو دیکھیں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں وہ خاندان کی عزت پر کبھی حرف نہیں آنے دے گی۔"

اور پھر حیدر خان کو اس کی ضد کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑ گئے۔ جہانزیب ان کا لاڈلا اور ضدی بیٹا تھا۔ پریشے کا ایڈمیشن یونیورسٹی میں ہوگیا۔ وہ چھٹیوں میں گھر آئی ہوئی تھی۔ شاہ زیب بھائی کی بیٹی کا سن کر سب کے اترے چہرے دیکھ کر آج اس نے ماں سے وجہ پوچھی اور آج اس کی برسوں کی الجھن دور ہوگئی تھی۔

☆☆☆

ہشام کی بات پر وہ حق دق رہ گئی تھی اس کی نظروں میں چھپی پسندیدگی اسے نظر تو آتی تھی مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسے اظہار بھی کردے گا حالانکہ وہ سب کچھ جانتا تھا۔

"تم...... تم کیا کہہ رہے ہو ہشام، تمہیں پتا ہے ناں میری منگنی میرے چچا کے بیٹے سے ہوچکی ہے۔" پریشے نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"صرف منگنی ہی ہوئی ہے ناں، منگنی تو ٹوٹ بھی سکتی ہے۔"

"مگر بابا جان کبھی منگنی نہیں توڑیں گے، تمہیں معلوم تو ہے ہمارے خاندان میں منگنیاں نہیں ٹوٹا کرتیں۔"

"مجھے سب پتا ہے پری، مجھے یہ بھی پتا ہے کہ تمہارے بابا کبھی تمہاری شادی مجھ سے نہیں کریں گے۔" ہشام نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔

"حالانکہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔" ہشام نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے ہونٹ کاٹنے لگی نفی میں سر ہلانا مشکل لگا۔ حقیقت سے نظریں چرائی نہیں جاسکتیں۔

"بولو، کرتی ہو ناں مجھ سے محبت؟" وہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ پریشے بے بسی سے اسے دیکھے گئی۔ وہ کیوں اسے اس آزمائش میں ڈال رہا ہے۔

"کیوں ان رسموں، رواجوں میں جکڑی ہوئی ہو، توڑ دو ان زنجیروں کو، ہم کورٹ میرج کرلیتے ہیں

میں تمہیں بہت دور لے جاؤں گا۔ تمہارے باپ بھائیوں کی پہنچ سے دور۔" ہشام نے اس کی ہمت بڑھانی چاہی۔

"کورٹ میرج......؟" پریشے کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

"ایک اور زرمینے......" پریشے نے عجیب سی نظروں سے ہشام کو دیکھا۔ وقت خود کو دُہرا رہا تھا۔ کل یہیں زرمینے کھڑی تھی اور آج پریشے...... ہشام اس کے جواب کا منتظر تھا۔

وقت بھی جیسے تھم گیا تھا۔ وقت بھی منتظر تھا پریشے کے جواب کا...... کیا پریشے بھی وہی فیصلہ کرے گی جو زرمینے نے کیا تھا۔ ایک بار پھر بھائیوں کا مان ٹوٹے گا ایک بار پھر حویلی میں صفِ ماتم بچھے گی' ایک بار زرمینے مری تھی اب پریشے مر جائے گی۔

"بولو...... مجھ سے محبت کرتی ہو ناں؟" ہشام کو اس کی خاموشی بری لگ رہی تھی۔ اس لیے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"اگر یہ محبت ہے کہ میں اپنے باپ، بھائیوں کی عزت کی دھجیاں اُڑا کر تمہارے ساتھ چل پڑوں تو آئی ایم سوری ہشام خان میں تم سے محبت نہیں کرتی۔" پریشے کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ محبت سے دستبردار ہونا آسان نہیں ہوتا۔

"اگر یہ محبت ہے کہ میں اپنے بابا جان کو جیتے جی مار دوں تو میں، میں تم سے محبت نہیں کرتی۔" ہشام کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پریشے یہ سب کہے گی۔

"آپ اس پر ایک بار اعتماد کر کے تو دیکھیں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ خاندان کی عزت پر کبھی حرف نہیں آنے دے گی۔" اسے جہان بھائی کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔

"پریشے میری بہن ہے، وہ کبھی ہمارا سر نیچا نہیں کرے گی۔" اتنا مان، اتنا اعتبار...... وہ کیسے ان کا مان توڑ سکتی ہے، وہ کیسے ان کے اعتبار کی دھجیاں اُڑا سکتی ہے۔" پریشے نے ایک کرب سے سوچا۔

"اگر اپنے بھائی کا مان توڑنا محبت ہے تو مجھے معاف کر دینا ہشام میں تم سے محبت نہیں کرتی۔"

"ایسے...... ایسے مت کہو پری۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔" ہشام کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"تمہیں میں نے بتایا تھا کہ میں جو یہاں پڑھ رہی ہوں وہ صرف جہان بھائی کی وجہ سے، ان کی سپورٹ کی وجہ سے میں یہاں تک پہنچی ہوں۔ پتا ہے آج سے بیس سال پہلے بھی ایسے ہی ایک جہانزیب نے اپنی بہن پر اعتماد کیا تھا مگر اسے ایک ہشام مل گیا تھا وہ پگلی اس ہشام کے سنگ چل دی اپنے خوابوں کو حقیقت بنانے، اپنے پیاروں کو جیتے جی مار کر اس نے اپنی منزل پالی تھی۔ اگر آج پھر وہی کہانی دُہرائی گئی ناں تو پھر کوئی بھائی اپنی بہن پر اعتماد نہیں کرے گا۔ ہمارے خاندان سے کوئی پریشے پڑھنے کے لیے شہر نہیں آئے گی۔" ہشام خاموشی سے سن رہا تھا۔

"اس لیے ہشام مجھے معاف کر دینا، میں تم سے محبت نہیں کرتی۔" پریشے رکی نہیں فوراً وہاں سے چل دی۔

ہشام وہیں گھاس پر جھکا تھکا سا بیٹھ گیا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا، اگر وہ میرے نصیب میں نہیں تھی تو مجھے ملی کیوں؟"

جہانزیب خان ساکت کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی کام سے شہر آیا تھا تو واپسی پر پریشے سے ملنے یونیورسٹی آ گیا۔ اسے ڈھونڈتے ہوئے جب وہ یہاں پہنچا تو یہ سب دیکھ کر اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں مگر پریشے کی باتیں سن کر اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

اس نے ایک نظر نیچے بیٹھے شخص کو دیکھا وہ ہر لحاظ سے پریشے کے لیے بہترین تھا اس نے سیکنڈوں میں سوچ لیا تھا کہ اب اسے بابا جان سے ایک اور ضد کرنی ہے۔

☐

دعائے خیر

رفاقت جاوید



فوزیہ نے دوپٹے سے سر کس کر باندھا اور پلنگ پر لیٹ کر ہائے ہائے کا ورد کرنے لگیں۔ سر تھا کہ درد کے مارے پھٹنے کو تیار تھا۔ ملک کرامت حسین شان بے نیازی سے باہر جا چکے تھے۔ تینوں بیٹیاں دُرِ شہوار، میمونہ اور دردانہ اپنے کمرے میں سکتے کے عالم میں خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ اِک طویل توقف کے بعد دردانہ ہمت کر کے اٹھی اور سیدھی ماں کے کمرے میں چلی گئی۔ ماں کی ناگفتہ بہ

حالت دیکھ کر دردانہ نے انہیں پین کلر دی اور نہایت ملائمت سے اُن کا سر دبانے لگی۔ وہ اپنی ہی سوچ میں محو تھی۔ سر درد جونہی بہتر ہوا تو فوزیہ نے بیٹی کے ہاتھوں کو چوم لیا تو دردانہ کی آنکھوں میں بے بسی کی جھڑی ابل پڑی۔ بسا اوقات انسان کس قدر بے بس و مجبور ہو جاتا ہے کہ نیر بہائے بنا سکون نہیں ملتا۔ دل میں بھڑکتے ہوئے شعلے مدھم نہیں پڑتے مگر چنگاریاں ذرا سی ہوا پر شعلوں میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگاتیں۔

''بیٹا کیا بات ہے؟ وجہ جانتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھی ہوں۔'' فوزیہ نے بے حد دکھی لہجے میں کہا۔

''امی! اچھا بھلا رشتہ تھا۔ ابو کے انکار کی وجہ میری سمجھ سے تو بالاتر ہے۔ آپ انہیں سمجھانے کی کوشش تو کریں۔ امی جب ماں ہی کمزوری اور بے بسی کا شکار ہو جائے تو اولاد تو جیتے جی ہی جہنم رسید ہو گئی ناں۔ ہم تو عالمِ برزخ میں لٹکی ہوئی بیٹیاں ہیں آپ کی۔ ہماری خاطر ہی ذرا مضبوط ہو جائیں۔'' دردانہ نے ماں کے چہرے پر تفکر کی ابھرتی ہوئی شکنوں کو دیکھ کر قدرے آہستگی سے کہا مگر الفاظ خاصے زہر آلود تھے۔

''تم مجھے خاموش ہی رہنے دو، یہ زبان چل نکلی تو رک نہیں پائے گی اور گھر فساد کا اکھاڑا بن کر رہ جائے گا۔ تم یہاں سے اٹھو، جاؤ اپنا کام کرو، شام ہونے کو ہے، ابھی تک چولھا ٹھنڈا پڑا ہے۔ تمہارا باپ ہم سب کی چٹنی بنا کر کھانا کھا سکتا ہے، جانتی تو ہو...... اور بڑی کو جا کر کہو کہ سوگ منانے کا وقت گزر چکا ہے، خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرے۔ شادی...... شادی اس بکواس میں کیا رکھا ہے، سراب ہے یہ، سراسر سراب کے سوا کچھ نہیں، اسے جا کر سمجھاؤ۔'' وہ سخت ناگواری سے بولیں۔

''امی! مجھے تو اب سو فیصد یقین ہو چلا ہے کہ ہماری تمام زندگی اس گھر کے چولھے جھونکتے ہی بیت جائے گی، کیا ہم اپنے مقدر میں محض حسرتیں اور آہیں ہی لکھوا کر پیدا ہوئی ہیں؟ کیا ہمیں سکون و اطمینان کی کوئی ضرورت نہیں؟ یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے، کاش کہ ہم پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتیں، موت سے بدتر ہے ہماری زندگی۔'' وہ تلخی و تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

''شادی کے لڈو ذائقے میں شیریں مگر اثرات بہت کڑوے ہوتے ہیں، ہر شادی شدہ عورت سے پوچھ دیکھو...... اس لیے زیادہ دکھی ہونے کی ضرورت نہیں، اپنی سہیلیوں کی سچی جھوٹی شیخیوں پر کان دھرنے کے بجائے اپنی آنکھوں پر بھروسا رکھو، میری زندگی پر غور کرو کہ عملاً اِک زندہ لاش بن چکی ہوں۔'' وہ نہایت نرم لہجے میں احتجاج کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئیں۔

''ہم تینوں بہنیں آپ کے ساتھ زندہ لاشیں بننے سے انکار کرتی ہیں امی۔ ہمارے رشتے طے کرنے...... کا عمل اتنا پیچیدہ ہو جائے گا کتنی حیرت کی بات ہے، یہ ابو کے بنائے ہوئے قانون اور ضابطے توڑنے کے لیے ہی بنائے گئے ہیں، ہم ان کے تمام ظالمانہ و بے رحمانہ اصولوں کے خلاف جلوس نکالنے والی ہیں، اپنے شوہر کو بتا دیجیے گا۔'' جارحانہ انتباہ لہجے میں نمایاں تھا۔

''زبان کو لگام دو تم ہوش میں نہیں ہو، یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ اتنے جوتے لگاؤں گی کہ چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ یہ مت بھولو کہ تمہارا باپ ایسی نا ہنجار اولاد کو زندہ در گور کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔'' فوزیہ کے رگ و ریشہ میں غصہ سرائیت کر گیا تھا۔

''ہم آپ پر ناقابلِ برداشت بار ہیں امی، آپ نے ہمیں تعلیم دلا کر شعور کو بیدار کرنے کا ظلم کیوں کیا؟ اور اب ہمیں اپنے حقوق کے حصول کی خاطر ایک لفظ بولنے کی اجازت تک نہیں مگر آج میں

آپ کو اپنے دل کی آواز سناؤں گی اور آپ کو سننا ہو گی ہر صورت...... میں یعنی دردانہ ملک آپ کی بڑی دو عدد بے وقوف، نادان اور کم ہمت بیٹیوں جیسی ہرگز نہیں...... وہ بزدل آپ کے لحاظ اور آپ کی عزت کا پاس رکھتے ہوئے آپ کے دو بدو فرمانبرداری اور تابعداری کا ڈھونگ رچاتی ہیں، یقین مانیے گا پیٹھ پیچھے اعتراضات کی ایک فہرست کھل جاتی ہے، آپ کے تمام مظالم اور ستم اُن کے ہوش و حواس پر نفرت و حقارت کی پرچھائیاں بن کر قابض ہو جاتی ہیں، بات تو سچ ہے کہ آپ دونوں شرافت اور خاموشی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، وہ دن دور نہیں، جب وہ آپ کے فرسودہ خیالات کے خلاف نعرہ بلند کریں گی، اس کمزور بنیاد پر کھڑے اس گھر کی دیواریں ہل جائیں گی، بھونچال برداشت نہیں کر پائیں گے آپ لوگ۔ تب آپ کو اس بات کا احساس ہو گا۔'' وہ عجیب انداز میں ماں سے مخاطب تھی۔

''اچھا تو دھمکیاں دینے آئی ہو مجھے؟ میری بیٹیاں تو بسم اللہ کا تخم ہیں، مجھے خطرے کی بو تو تمہاری باتوں سے آ رہی ہے، تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو؟ کوہِ قاف کی پری یا شہزادی؟ تمہارے ابو بہت جہاندیدہ اور پائے کے وکیل ہیں، میں تو ان کے فیصلے پر ان کا ہی ساتھ دوں گی۔'' ماں زہر آگیں لہجے میں بولیں۔

''میرا خیال ہے امی آپ کو میرا مؤقف سمجھ نہیں آیا۔ میں کھلے لفظوں میں اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ میں آپی اور باجو کی طرح منافق نہیں، نہ ہی ان کی طرح اپنی خواہشات کو آپ کے فیصلوں پر قربان کر کے داد و تحسین وصول کرنے کا شوق رکھتی ہوں۔ امی خدا کے لیے میری بات سمجھیں، آپی کے بارے سوچیں اُن کے پاس زیادہ وقت نہیں رہا گھر بسانے کا۔ وہ آپ کی اپنی اولاد ہیں۔'' اور ماں نے اس کی تمام باتوں کے جواب میں منہ پھیر لیا تھا۔

☆☆☆

ملک کرامت حسین ایک نا اہل وکیل تھے، اپنے جذباتی اور بے صبرے پن کی وجہ سے نہ تو نام کما سکے نہ ہی دولت کی دوڑ میں آگے نکل سکے۔ ان کے گھر میں وہی ہوتا تھا جو وہ چاہتے تھے، مزاج میں ضد اور غصہ ہم وزن تھا۔ تین عدد بیٹیاں بیچلرز کرنے کے بعد گھر میں قید ہو چکی تھیں۔ بیٹا دبئی گیا تو واپس پلٹ کر نہ آیا۔ عتاب کے لیے بیٹیاں نظروں کے سامنے تھیں۔ ان کی قوتِ گویائی سلب کرنے اور ان کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھنے میں البتہ وہ خاصے ماہر تھے۔ بیوی تو کسی کھاتے میں نہ آتی تھیں، اس لیے اسے پل بھر میں جوتی کی نوک پر لے آنا کوئی ان سے سیکھے۔ بقول ملک صاحب اسے ہی مردانگی، انا اور غیرت کہتے ہیں۔

وہ فائلیں بکھیرے اپنے کیس پر غور و خوض کر رہے تھے کہ فوزیہ اضطراری کیفیت میں ان کے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ کر ان کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''ملک صاحب ایک بات کہوں؟ برا تو نہیں منائیں گے؟''

''ایسی بات ہی مت کرو...... ضرور کوئی اول فول ہی بکنے والی ہو، جو بھیگی بلی بنی بیٹھی ہو۔'' وہ ان کی طرف دیکھے بغیر ہی بولے تو وہ تلملا اٹھیں۔

''آپ سے بات کرنے کا مطلب ہے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا مگر کیا کروں مجبور ہوں، بیٹا آپ کی سختیوں سے تنگ آ کر باہر چلا گیا۔ اب بیٹیاں اگر بغاوت پر اتر آئیں ناں تو بہت برا ہو گا۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں، ہاں!''

''کیا کر لیں گی میرا......؟ بولو سب کی زبانیں کاٹ دوں گا...... ٹانگیں توڑ دوں گا، کیا سمجھتی ہیں خود کو میرے مدِ مقابل کھڑی ہو جائیں گی۔'' وہ غیظ و غضب سے بولے۔

''ان نصیبوں جلی کو راہِ راست پر رکھنا ماں کا

اہم فرض ہے، بیٹیوں کے معاملات میں باپ کی دخل اندازی سراسر بے غیرتی اور بے حیائی ہے، اس لیے تم غور سے سن لو۔ انہوں نے کسی قسم کا احتجاج کرنے کی کوشش کی تو تمہارا سر کچل کر رکھ دوں گا سمجھ گئیں؟"

"اچھا...... اچھا۔" وہ سر ہلا کر بولیں۔ "میں نے تو آپ کا رعب داب خوب سہہ لیا، ہر جائز ناجائز بات پر جی حضوری کر کے اپنی جان بخشی کراتی رہی۔ اب نکل آئیں اپنی جھوٹی آن بان کے چنگل سے۔" وہ تنک کر بولیں۔

"اب دھمکیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیجیے۔ بہتری اسی میں ہے اور بڑی کے رشتے کا فیصلہ کیجیے۔ آج کا رشتہ مجھے ہر لحاظ سے بے حد پسند آیا ہے۔"

"تم خاموش رہو...... روز بروز سر پر چڑھ کر ناچنے لگی ہو، فیصلہ کر لو، یہ کوئی مذاق نہیں، اپنا کام کرو، ورنہ جانتی ہو تم سے نپٹنا تو مجھے خوب آتا ہے۔" وہ چیخنے کے انداز میں بولے۔

"ماضی میں تو کچھ کر نہ سکے۔ اب جو دل میں آئے کر ڈالیں۔ مجھے منظور ہے، میں بھی روز روز کی بک بک سے تنگ آ گئی ہوں۔" وہ اکڑ کر بولیں۔

"اگر تم نے ان نادان لڑکیوں کی باتوں کا اثر لیا تو پرچا ہاتھ میں تھما کر گھر سے باہر نکال دوں گا۔" وہ غصے میں لرز اٹھے۔

"اب میں ان دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں، ایک بات مت بھولیے گا۔ میں اپنی جوان اولاد کو چھوڑنے والی نہیں، نہ ہی اپنے اس گھر کو۔" وہ پہلے تو لرزیں پھر خود پر قابو پا کر بڑی دلیری سے بولیں تو ملک صاحب حیرت و تجسس سے دیکھنے لگے...... میز پر ایک زوردار گھونسا مارا اور باہر نکل گئے۔

☆☆☆

دُرِ شہوار نے جونہی ہوش سنبھالا تو اپنوں اور غیروں کی طرف سے رشتوں کا تانتا بندھ گیا۔ میمونہ اور دردانہ بھی ساتھ ہی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھیں۔ اگر ملک صاحب چاہتے تو تینوں کے رشتے یکے بعد دیگرے کر کے فارغ البال ہو جاتے مگر وہ تو اس معاملے میں ایسے دقیانوسی، کم حوصلہ اور قدامت پسند نکلے کہ ہر رشتے پر پہلے تو سیخ پا ہوتے، فوزیہ کے سمجھانے بجھانے پر اگر مان بھی جاتے تو شجرۂ نسب کے الجھاؤ میں پھنس کر رہ جاتے۔ لڑکے کی تعلیم اور ماہانہ انکم کو انتہائی ضروری سمجھنا جائز تو تھا مگر بے جا قسم کی مین میخ نکالنا ناقابلِ برداشت ہو جاتا تھا اگر بیوی کے کہنے پر طوعاً و کرہاً خاموش رہتے تو تاثرات سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر کے بھگا دیتے۔ اسی آنکھ مچولی میں دُرِ شہوار بتیس سال کی ہو گئی مگر ملک صاحب اپنے تجربات و مشاہدات سے سبق نہ سیکھ پائے۔

آج بھی قابلِ قبول رشتے کی چھان بین میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ حقارت و غیر یقینی سے ان کے خاندان کا حسب، نسب اور شجرے کے بوسیدہ اور سال خوردہ پرت پر گفتگو کرتے ہوئے ایسا نکتہ نکال لائے کہ وہ لوگ اپنا سا منہ لے کر واپس چلے گئے۔ کئی سالوں سے یہ سلسلہ چل رہا تھا جس کے روح فرسا اثرات بچیوں کے ہر عمل سے نظر آنے لگے تھے۔

فوزیہ کے اعتراض پر گھر کی مایوسی، ناامیدی اور اداسی پر طعنوں و تشنوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ کھینچا تانی کا بازار گرم رہتا اور گھر کا ماحول میدانِ کارزار کا سماں پیش کرتے ہوئے بیٹیوں کو مزید ہراساں و پریشان کرنے لگا تھا۔ ملک صاحب کے اس جارحانہ رویے کو دیکھ کر رشتے داروں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ اپنی یک طرفہ غیر مناسب سوچ کے مطابق کہ نکھری اجلی سفید دودھ کے مانند چادر پر کالے رنگ کا بدنما پیوند کیونکر لگائیں۔ ان کے سینے پر پتھر کی بھاری اور ذہن پر یخ بستہ برف کی سِل کو کوئی ذی روح انچ بھر نہ ہلا سکا۔

اسی کشمکش میں چند مہینے گزر گئے اور ایک اور رشتہ جو اُن کی حیثیت کے لحاظ سے قابلِ ستائش اور

یومِ مزدور

انگریزی سال کے پانچویں مہینے کی پہلی تاریخ یعنی یکم مئی کو مزدوروں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں کے کنونشن ہالز اور سیمینار رومز میں پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ لوگ مزدوروں کے عالمی دن اور ان کے حقوق سے متعلق دھواں دھار تقاریر کرتے ہیں۔ ان کی مشکلات پر مگرمچھ کے آنسو بہائے جاتے ہیں۔ اعلانات بھی ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد شاندار قسم کے لنچ، ڈنر یا ریفریشمنٹ نوش فرما کر لوگ اپنی خوب صورت ائر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں سوار ہو کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں لیکن وہ مزدور جس کے نام پر چند بول ادا کر کے یہ لوگ اپنا پیٹ بھرتے ہیں وہ بے چارہ اس روز یعنی اپنے عالمی دن پر بھی کام سے رخصت نہیں لے سکتا۔ وہ روزانہ کے معمول کے مطابق بیسیوں اینٹیں اپنی کمر پر لادے سیکڑوں سیڑھیاں چڑھ رہا ہوتا ہے۔ شاید اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آج اسی کے لیے عالمی دن منایا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ لاتعداد مزدور ایسے بھی ملیں گے جنہوں نے اپنے بچوں کو بھی اپنے ہمراہ کام پر لگا رکھا ہے۔ اس کے باوجود دو وقت تو کیا انہیں ایک وقت کی روٹی بھی بہ مشکل ہی مل پاتی ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اپنی غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کتنے ہی گھرانے اپنے بچوں کو ٹھیکیداروں کے ہاتھوں چند روپوں کے عوض فروخت کر چکے ہیں۔ یہ بچے سڑکوں پر، کمپنیوں میں، دکانوں پر، کارخانوں میں، گیراج میں انتھک محنت کرتے نظر آتے ہیں لیکن انہیں اس محنت اور مشقت کے عوض کیا ملتا ہے؟ شاید بلکہ یقیناً کچھ بھی نہیں۔ کتنے ہی ادارے بنے، کتنی ہی تحریکیں چلیں اور کتنی ہی انجمنوں نے بچوں کی مزدوری کے خلاف آواز اٹھائی لیکن اصل مسئلہ جوں کا توں رہا۔ یہ یقیناً صرف سوچ کا نہیں بلکہ عمل کا مُحل ہے۔ ...... مرسلہ: میمونہ عزیز، کراچی

قابلِ غور بھی تھا سامنے آ گیا۔ موسیٰ، دُرِ شہوار کا کلاس فیلو تھا۔ بہت سلجھا ہوا اور اچھے خاندان کا پروردہ تھا۔ آج کل ایک پرائیویٹ کمپنی میں منیجر کی پوسٹ پر فائز تھا۔ پوش ایریا میں خوب صورت گھر، اپنی ذاتی گاڑی...... دونوں کا جواں دل زمانۂ طالب علمی سے ایک دوسرے کا گرویدہ تھا۔ مگر عدم اعتمادی دونوں کے درمیان اِک مضبوط اور ناقابلِ عبور دیوار کی طرح حائل رہی۔ دُرِ شہوار کے کانوں تک جب یہ مژدۂ راحت پہنچا تو وہ اندر ہی اندر شرما کر جھوم سی گئی۔ ابو سے خوش آئند آس اور امیدیں وابستہ کر کے بہنوں کو موسیٰ کے بارے میں تفصیلاً بتانے لگی مگر بہنوں کے چہروں پر امید کی ہلکی سی رمق بھی نہ ابھری۔ اس کا دل اداسیوں اور مایوسیوں کی اتھاہ گہرائی میں جا ڈوبا۔ اک طویل توقف کے بعد دُرِ شہوار نے ایک سرد آہ بھری اور پھر گویا ہوئی۔

"تم دونوں خاموش کیوں ہو؟ کیا یہ رشتہ بھی ناقابلِ قبول ہے اگر اسے ٹھکرا دیا تو پھر اس در پر ایسا موزوں رشتہ کبھی نہیں آئے گا...... اور ہمیشہ کے لیے میں تم دونوں کی راہ میں روڑا بن کر رہ جاؤں گی۔

جب تک یہ روڑا اٹکا رہے گا تم دونوں کا بھی میری طرح اس گھر سے ڈولی کے بجائے جنازہ ہی اٹھایا جائے گا۔ اس لیے میری التجا ہے کہ کم از کم تم دونوں امی کو تو اعتماد میں لے سکتی ہو کہ مجھے موسیٰ ہمیشہ سے بہت پسند تھا۔ اس کی ہم راہی میں میری زندگی پُرسکون اور پُرمسرت گزرے گی۔ اس کی میں گارنٹی دیتی ہوں۔ اس لیے اس رشتے کو ہاتھ سے مت جانے دیں، بس کسی طرح ابو کو منا لیں۔" وہ بھرپور اعتماد اور جوش سے بولے جا رہی تھی اور وہ دونوں پچھلے تجربوں کی بنیاد پر افسردگی و ترس کے جذبات لیے اسے تکے جا رہی تھیں۔ دُرِ شہوار نے ان کی خاموشی کو بھانپ کر نصف آہ اندر ہی دبا لی۔

"تو ٹھیک ہے، میری سفارش مت کرو، گھاٹا صرف میرا ہی نہیں۔ خسارے میں تم دونوں بھی رہو گی۔" اب کے اس نے تنبیہی انداز اپنایا۔

"ہمیں علم ہے آپی، افسوس کہ بہتر حالات کا قیاس ناممکن ہے، ابو کے قواعد و ضوابط کے ریلے میں خوشی کی کوئی رمق ہمیں نہیں ملے گی۔ چند سالوں کی بات ہے آپی، یہ جو ذہن کی پکار ہمیں اپنا گھر بسانے

پراکسائی رہتی ہے، مدھم پڑجائے گی، آپ اپنے دل کو مضبوط رکھیں، ابو کی ضد وہٹ دھرمی کے سو روپ ہیں۔" وردانہ کا اندازِ گفتگو حقیقت پر مبنی تھا، دُرِشہوار کی آنکھیں اشک بار ہوتی چلی گئیں۔

"وردانہ اگر تم اتنی کم ہمت پڑگئیں تو ہم دونوں پنکھے سے لٹک کر جان دے ڈالیں گی، تمہیں امی سے بات کرنا ہوگی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ تم کیسے انہیں رام کرسکتی ہو۔ میرے ساتھ ہی میمونہ کے رشتے کو بھی ہاں کردیں۔ وہ لوگ بھی بہت شریف النفس ہیں۔" دُرِشہوار نے تڑپ کر کہا۔

وردانہ نے یہ سب احوال ماں کو سنا دیا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں کیونکہ شوہر کی جابر اور ضدی فطرت کا عصا ان کی زبان گنگ کرگیا۔ وردانہ کے باربار غیرت دلانے پر فوزیہ نے ہمت پکڑی اور ملک صاحب سے عاجزانہ طریقے سے بات منوانے کی کوشش کی۔ کبھی بچیوں کی عمر بڑھنے کے خوف سے ڈرایا، کبھی ان کے تاریک اور حسرت زدہ مستقبل کی بھیانک تصویر پیش کرکے دھمکایا پھر اُن کے بڑھاپے کی تنہائی اور محتاجی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہوہی گئے کہ اس رشتے کو بھی پرکھنے میں مضائقہ ہی کیا ہے؟ بیگم کو لڑکے والوں کو بلانے کا اجازت نامہ تو مل گیا مگر ان کے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ خدا خدا کرکے مہمانوں کی آمد ہوئی۔ بیٹیوں میں چہ مگوئیاں اور پیش گوئیاں طول پکڑنے لگیں۔ گھر بھر کی صفائی ستھرائی اور پھر ٹرالی کی سج دھج اور بیٹیوں کے استری شدہ صاف ستھرے زیب تن لباس اور پُرامید چہرے دیکھ کر وہ چونک سے گئے۔ اس سے پہلے کہ موسیٰ کی ماں دُرِشہوار کے دیدار کے لیے ڈرائنگ روم سے باہر لاؤنج میں آتیں۔ ملک صاحب نے تفصیلاً پوچھ گچھ کے بعد ایسا اچھوتا اور نازیبا نکتہ نکالا کہ سب ان کی عقل پر ماتم کناں ہوئے بغیر نہیں رہ سکے کیونکہ موسیٰ کی نانی کا تعلق ملک ذات کے بجائے مغل ذات سے تھا۔ خون میں ایسی آمیزش تو انہیں کسی صورت منظور نہیں تھی۔ نہایت بے دردی اور سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے لحاظی سے انہیں ٹکا سا جواب دیا اور سرعت سے باہر نکل گئے۔ موسیٰ کی ماں نے اپنی اس ہتک آمیزی پر وہاں ایک سیکنڈ رکنا گوارا نہیں کیا۔ چائے کی پیالی میز پر رکھ کر، شرمندگی اور تاسف سے فوزیہ کو دیکھا اور انہیں ملال بھری تسلی کی تھپکی دے کر باہر نکل گئیں۔ گھنٹے میں ہی وہ ان کے ماحول سے آشنا ہوچکی تھیں، بچیوں کا رشتہ نہ ہونے کی وجوہات کھل کر سامنے آگئی تھیں۔

☆☆☆

"باعزت اور باوقار لوگوں کا یہ شیوہ نہیں ہوتا کہ گھر آئے مہمانوں کو یوں حقارت وتحقیر سے دھتکار دیا جائے۔ ملک صاحب ہم اسی جرم کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ اب ہماری بچیوں کے لیے آسمان سے فرشتے نازل ہونے سے تو رہے۔ آخر اسی زمین پر بستی خدا تعالیٰ کی مخلوق سے ہی لڑکے کا انتخاب کیا جائے گا۔ آج اس رشتے کو اک معمولی سی بات پر رد کرنے کا افسوس مجھے چین نہیں لینے دے رہا۔ مانیں نہ مانیں رشتہ لاجواب تھا۔" فوزیہ بیچ پا ہوتی بولے جارہی تھیں۔ اور ملک صاحب انہیں کھاجانے والی نظروں سے گھورے جارہے تھے۔

"تم بکواس بند رکھو، کہاں یہ گھسیارے اور کس برِیڈ (mix breed) کے تیتر بٹیر لوگ، تمہاری عقل... تو ہر رشتے پر گھاس چرنے نکل جاتی ہے۔ تمہارا بس چلتا تو ان معصوم بچیوں کو کب کا جہنم میں جھونک دیا ہوتا۔ ان سے اپنی جان چھڑانے کا جو منصوبہ تم نے بنا رکھا ہے بہت بھیانک اور جان لیوا ہے۔ میں ان کا دشمن نہیں، ٹھوک بجا کر چھلنی میں چھان کر فیصلہ کرنے کو اولیت دیتا ہوں۔ جاؤ جاکر چولہا ہانڈی کرو، کپڑے اور برتن دھوؤ۔ یہی تمہارا کام ہے بس...... یہ فیصلے ویصلے کرنا عورتوں کا کام نہیں۔ اپنی حیثیت پہچانو اور اپنی ناسمجھی اور کم عقلی

میرے ذہن میں انڈیلنے کی کوشش مت کرو۔ یہاں ایسی بے ہودگی کی کوئی جگہ نہیں۔"

لہجہ اتنا ہتک آمیز تھا کہ وہ احساسِ تضحیک سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں حالانکہ یہ انہونی اور عجب بات نہیں تھی۔ ہر رشتے کے انکار کے بعد ایسے ہی دل دُکھانے والے ڈائیلاگ بولے جاتے اور گھر کئی مہینوں تک سوگواری کی نذر ہوجاتا۔ پھر سے آنے والا نیا رشتہ چند دنوں کے لیے حالات معمول پر لے آتا اور فوزیہ نئے سرے سے امید وبیم کے نشے میں ڈوبتی ابھرتی تیاری میں مصروف ہوجاتیں۔ اس بار کے انکار نے گھر کی فضا میں کشیدگی اور تناؤ کو غیر معمولی طور پر بڑھا دیا تھا کیونکہ دُرِشہوار کی طرف سے جو آمادگی اور پسندیدگی تھی، بچیاں کمرے میں مقید اور ماں سارا وقت سرباندھے پلنگ توڑا کرتی تھیں۔ ملک صاحب نے گھر میں آزردگی اور خفگی کو محسوس تو کرلیا تھا مگر اپنے فیصلے کو بدلنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں شک ہوچلا تھا کہ ہو نہ ہو یہ رشتہ دُرِشہوار کی شہ پر آیا ہے، یونیورسٹی کے زمانے میں اس کا کلاس فیلو ہونے کا ناتا انہیں گمبھیر سوچوں میں الجھائے رکھتا تھا۔ اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتے رہتے مگر اپنا خدشہ کسی سے بیان نہ کیا۔ یہ ان کی غیرت کو گوارا نہیں تھا۔

اِدھر دُرِشہوار کی زبان تو بند تھی لیکن سوچوں پر تو باپ کا پہرہ نہ تھا۔ کبھی تو اس کا ذہن باغیانہ خیالات کی آماجگاہ بن جاتا اور کبھی خود کو ہی لعنت ملامت کرکے چپ کرالیتی۔ مگر اس کے دل میں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی باغیانہ خواہش دبنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ اس کا من دہائی دے رہا تھا کہ وہ اپنے بے لگام اور منہ زور جذبات کو جوانی کے دھارے میں بہہ جانے دے۔ حیا اور نسوانی وقار کے پردوں کو چاک، چاک کرڈالے اور اس ماحول کو خیرباد کہہ کر ایسی حسین ودل پذیر دنیا کی باسی بن جائے... جسے وہ اپنی پناہ گاہ کہنے کی حقدار ہو اور ایسی محفوظ آغوش ہو کہ کبھی کم مائیگی اور بے بسی کا احساس تک نہ ہو لیکن ہر بار کی طرح وہ پھر سے آنسوؤں سے اپنے دکھ وغم دھوتی چلی گئی۔ اپنی روایات کا پاس اپنے خاندان کی ذلت ورسوائی کا اندیشہ اور والدین کے پچھتاوؤں کا دکھ اور اپنی شرافت وعزت کا لحاظ اس کے پاؤں کی بھاری بھرکم بیڑیاں بن گئیں۔ آج بھی وہ زمانے بھر کی ان دیکھی رنگینیوں کو اپنے دامن میں بھرنے کی ناکامی پر تلملا اٹھی۔ وہ ابو کے تجویز کردہ اصولوں، راہوں پر گامزن رہنے پر اکتفا کرگئی۔ اشکبار آنکھوں سے اس نے اپنے سامنے دھندلے اور سال خوردہ آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس کا دلکش حسن اس سے بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کا سحرزدہ سراپا اس سے شکوہ کررہا تھا اور دل میں جذبات واحساسات کی شوریدگی قلب وذہن پر غالب آچکی تھی۔ دل نے پھر سے گستاخانہ انداز میں سوچا مگر طبعاً اگلے ہی لمحے ذہن کی پکار پر وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی...... اور اپنے کنوارے جذبوں اور نئی نویلی سوچوں پر پھر سے بند باندھ کر اپنی زندگی میں رواں دواں ہونے کے لیے تیار ہوگئی کیونکہ ابو کا تیار کردہ پل صراط پار کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس پر پاؤں رکھتے ہی وہ جہنم رسید ہونے کے خوف سے سوکھے پتے کے مانند لرزتی ہوئی خود کو لعنت ملامت کرتی میمونہ کو بھی سنبھلنے کی تلقین کرنے لگی...... اور وردانہ کو بھی گوشۂ تنہائی سے نکلنے پر آمادہ کرتی ہوئی کچن کی جانب چل پڑی جہاں کاؤنٹر پر استعمال شدہ برتن بکھرے ہوئے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

☆☆☆

وردانہ حسرت ویاس کی تصویر بنی اپنی سوچوں میں غلطاں تھی۔ اس سانحے کے بعد اسے اپنی آپی کی کروڑوں کی قیاس آرائی مضطرب کررہی تھی کہ وہ دونوں یہاں سے کفن پہن کر ہی نکلنے کی امید رکھیں۔ وہ تڑپ اٹھی تھی۔ بلکتے ہوئے خود سے سرگوشی کی کہ میں ابو کی خواہش کے مطابق خاموشی اور شرافت کے

کھونٹے سے بندھی رہ کر صوفیانہ و شریفانہ زندگی بسر کرنے کو گناہ تصور کرتی ہوں۔ قدیم آدرش اور فرسودہ خیالات کی بھینٹ چڑھنے سے پہلے وہ کسی عملی قدم کے بارے میں سوچنے لگی...... اور یک دم اس نے مسکرا کر موبائل پر اک شناسا سے نمبر پر فون کر دیا۔

لمبی چوڑی گفتگو کے بعد اس کا ذہن لمحہ بہ لمحہ حسن و شباب کی سرکش موجوں کی گرفت میں الجھتا چلا گیا۔ اسی الجھاؤ اور تناؤ میں اس نے کوئی فیصلہ کیا اور رات کی تاریکی میں وہ اپنی خواہشات کے تقاضوں کا آنچل تھامے اور جو ادراک ماں کی تربیت اور باپ کی سخت مزاجی سے اس کے حصے میں آیا تھا، اس کی سیسہ پلائی ہوئی تمام دیواروں کو پھلانگ کر گھر سے روپوش ہوگئی۔ جس کا فیصلہ دُرِ شہوار نہ کر سکی اس نے بہ آسانی کر لیا تھا۔

گھر میں کہرام کا مچنا اِک فطری امر تھا۔ دُرِ شہوار اور میمونہ اس کی اس حرکت پر پریشان و ہراساں ہو گئیں۔ ان پر زندگی اور تنگ کر دی گئی۔ فوزیہ اپنی جگہ مارے ندامت کے شوہر سے نظریں دوچار کرنے سے قاصر تھیں۔ ملک صاحب گھر بھر میں بیٹی کی اس بے باکانہ حرکت پر پھنکارتے پھرتے۔ دوسروں کے سامنے زبان نہ کھولتے۔ حیلے بہانوں سے ہر جگہ فون کر کے بیٹی کی مخبری کرنے لگے مگر ہر طرف سے ناکامی نے ہی سامنا کیا تھا لیکن ابھی تک انہیں اپنی غلطی کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ ہر گناہ، جرم اور غلطی کی ذمے دار فوزیہ کی تربیت تھی۔ اب وہ بھی خاموشی سے تمام لعن طعن سن کر دردانہ کو ہی موردِ الزام ٹھہرانے لگی تھیں۔ بات تو سچ تھی کہ اپنا خالص خون ہی عزت کی ہولی کھیل گیا۔ انہیں دغا دے گیا۔ ملک صاحب نے تو اپنے چہرے پر رعب و داب کے رنگ چڑھائے پردے داری میں چپ سادھے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔ فوزیہ بھی منہ پر پٹی باندھے بیٹھی تھیں کہ چند دنوں بعد دردانہ کی ای میل دیکھ کر ملک صاحب کا سر گھوم گیا۔ مارے غصے کے منہ سے جھاگ ابل پڑا۔ فوزیہ نے ملائمت سے انہیں ٹھنڈا پانی پلا کر تسلی و تشفی دینے کی کوشش کی۔ مگر ہمیشہ کی طرح ان کے بھیجے میں کچھ نہ بیٹھا۔ جو منہ میں آیا بولے چلے گئے۔ ذرا غصہ کم ہوا تو پیشانی سے عرقِ جلال کو خشک کر کے ای میل پڑھنے لگے۔

"میری قابلِ احترام ہستی

آپ کو میرا خلوص اور پیار بھرا سلام!

میں اپنے تاریک مستقبل کے پیشِ نظر اتنا بڑا اور اہم فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگئی۔ میں آپ سے فقط ایک سوال کرنے کی گستاخی کر رہی ہوں کہ آپ کو ہماری عمریں اتنی تیزی سے گزر جانے کا احساس کیوں نہیں ہو رہا۔ ابو آپ کی تینوں بیٹیاں اپنی شرافت اور پاک دامنی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ کیا ہمیں اس کی سزا دی جا رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے ابو؟ ہم نے کیا قصور کیا ہے؟ ہمیں اس دنیا میں لانے کے ذمے دار آپ خود ہیں پھر مجرم ہمیں کیوں ٹھہرایا گیا ہے۔ اسی فرسٹریشن کے نتائج میں نہ چاہتے ہوئے میں اپنے محلے کے ایک لڑکے سے والہانہ پیار کرنے لگی۔ مجھے علم تھا کہ آپ کسی قیمت پر میری شادی اس سے نہیں کریں گے کیونکہ وہ آپ کے معیار پر پورا اترنے سے کوسوں دور ہے۔ اس لیے آپ کی بے جا خواہشات کی کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت نے مجھے کورٹ میرج کرنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے امید ہے کہ میرا کیا ہوا یہ خوش آئند فیصلہ اور اٹھا ہوا بے باک قدم دُرِ شہوار اور میمونہ کے لیے بھی مشعلِ راہ ہوگا، انشاء اللہ۔ اگر آپ فراخ دلی سے مجھے معاف فرماتے ہیں تو میں اپنے جیون ساتھی کے ہمراہ آپ کی دعائیں لینے کی خواست گار ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے میرے اس فیصلے سے عمر بھر کے لیے ایک بہترین سبق سیکھ لیا ہوگا کہ ہر بچہ اپنی الگ اور منفرد فطرت کا مالک ہوتا ہے۔ میں دُرِ شہوار نہیں بن سکتی۔ اس کی طرح بزدل، ڈرپوک اور قربانی کا بکرا بننے کا مجھے قطعاً شوق نہیں۔ ہر عمارت کو تاج محل کا نام دینا مناسب ہے نہ ہی ہر سیپی سے موتی کی امید

رکھی جا سکتی ہے۔ ابو ایسی توقعات رکھنے والے لوگ عاقبت نااندیش اور ناقابلِ فہم گردانے جاتے ہیں۔ پلیز میرے تحریر کردہ ایک، ایک لفظ پر دھیان دیجیے گا...... اور سوچیے گا کہ میں درست کہہ رہی ہوں کیا آپ اپنی جگہ پر سو فیصدی درست ہیں...... اگر میں غلطی پر ہوں تو مجھے انفارم کرنا مت بھولیے گا...... تاحیات آپ کو اپنی منحوس شکل نہیں دکھاؤں گی اور انشاء اللہ بہت جلد اپنی آپی اور باجو کو اس قیدِ تنہائی سے آزادی دلا کر انہیں دور بہت دور آکاش کی بلندیوں کی سیر کراؤں گی۔ جہاں ان کے ہم سفر ان کے ساتھ ہوں گے۔ ان کی زندگی ان کی پسند کے مطابق ہوگی اور جنت کا گہوارہ ان کا گھر ہوگا۔ اور ہم کبھی پلٹ کر آپ کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گی۔ نہ ہی آپ کی یاد میں تڑپ اور کسک ہمیں ستائے گی۔ ابو! ماں بہت یاد آئے گی۔ مجبور، بے بس اور مظلوم...... جس کی زندگی میں کبھی شنوائی نہیں ہوئی۔ میں آپ کو ایک بات سمجھانا چاہوں گی۔ جس سے انکار کرنا سراسر کفر ہے۔ نکاح کرنا سنت ہے۔ یہ ہمارے فرائض کے زمرے میں آتا ہے۔ میں نے آپ پر زیادتی نہیں کی، نہ ہی بے انصافی برتی ہے۔ جب آپ ہی والد ہونے کے ناتے اپنے فرائض کو پسِ پشت ڈالنے پر شاداں و فرحاں ہیں تو پھر ہمیں اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق پہنچتا ہے اور میں نہ ہی اپنے اس فیصلے پر آپ کے اور دنیا والوں کے سامنے نادم ہوں۔ پسندیدگی گناہ نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی سزا تجویز کی گئی ہے۔ بلکہ اس کی اجازت دی گئی ہے۔ میرا شریکِ سفر میری تمام مجبوریوں سے باخبر ہے۔ میں جس جگہ پر پاؤں رکھتی ہوں وہ وہاں بے پناہ محبت و عقیدت بھری نظریں بچھا دیتا ہے۔ میں نے جس شریکِ سفر کا انتخاب کیا ہے۔ وہ آئیڈیل تو نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک انسان کے اندر تمام خوبیاں سما نہیں سکتیں۔ پھر ہم اپنے من گھڑت دیوتا کی جستجو میں اپنے قیمتی وقت کا زیاں کیوں کرتے ہیں؟ پلیز ابو میری باتوں پر غور ضرور کیجیے گا۔ دل پر گراں گزریں تو اپنی غصے کی لاٹھی سے ان کا قلع قمع کر دیجیے گا۔ مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور آپی اور باجو کے لیے فیصلہ کرنے میں دیر مت کیجیے گا۔ ورنہ وہ بھی مجبور ہو جائیں گی میری طرح۔ معاف فرمائیے گا۔

آپ کی بیٹی دردانہ!"

دردانہ کی خودرائی اور بے باکی پہلے ہی تہلکہ مچا گئی تھی۔ رہی سہی کسر میل نے نکال دی۔ دونوں بہنیں نفرت و حقارت سے دردانہ کو برا بھلا کہتے نہ تھکتی تھیں۔ اب انہیں یقین ہوگیا تھا کہ دردانہ کی اس بے حیائی اور دیدہ دلیری کا پردہ فاش ہوتے ہی وہ بھی حقارت سے دیکھی جائیں گی اور یکسر اپنے ہاتھوں پر سہاگ کی مہندی کے رنگ کی موہوم سی امید بھی غارت ہو جائے گی۔ سپنوں کے شہزادے کا ہمیشہ کے لیے قتال ہو جائے گا کیونکہ معاشرے میں اس غلطی کی بخشش کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

بھلا بامِ ثریا سے پاتال میں تماشا بننے والے خاندان کی طرف کوئی عزت دار نگاہ اٹھا کر انہیں سینے سے کیونکر لگائے گا جبکہ اس گھر کی عزت کی پاسداری رکھنے والی ہی بے راہ رو ہوگئی۔ ایسی سوچیں شب و روز ان کے ذہن پر غالب رہتیں۔

گھر کی فضا تو سالہا سال سے مکدر تھی۔ اب بھی چہروں پر اضطراری اور پریشانی ہویدا تھی۔ فوزیہ کے ہونٹوں پر آہوں کے ہمراہ بیٹی کے لیے بددعا نکلتی جبکہ یہ غیر متوقع عمل تھا۔ ملک صاحب کے ہونٹوں پر چپ کا تالا لگ گیا تھا۔ اپنے دفتر میں سر جھکائے سوچوں میں گم رہتے۔ گھر کی سہمی ہوئی فضا، بجھا سا ماحول اور چہروں پر بے بسی، چال ڈھال میں لاغرپن کب تک پردے میں رہتا۔ خاندان والے دردانہ کی غیر موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے سرسری طور پر اس کا ذکر باتوں، باتوں میں کرنے سے باز نہ آتے۔ جنہیں فوزیہ مختصر سا جواب دے کر خود کو مطمئن کر لیتیں... کہ وہ کراچی پھپھو کے پاس گئی ہوئی

ہے مگر کب تک جھوٹ کا سہارا لیا جاتا۔ ایک دن تو حقیقت کھل کر سامنے آنے کے خدشے پر بھی دہل جاتے کہ آنے والا وقت نہ جانے اپنے ساتھ کتنے ہی طوفان لے کر وارد ہونے کو ہے۔

☆☆☆

"فوزیہ بہن ہم آپ کی چوکھٹ اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک دُرِشہوار کی آپ حامی نہیں بھر لیتیں۔ اب ہمارا اوڑھنا بچھونا یہاں ہی ہے۔" موسیٰ کی ماں نے فوزیہ کے بار بار انکار پر حتمی اور آخری فیصلہ سنا دیا اور ڈرائنگ روم میں ہی صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئیں۔

"زبردستی اور زور آوری سے تو رشتے ہونے سے رہے۔ بے شک آپ کے تمام دلائل ٹھوس اور حقیقت پر مبنی ہیں مگر میں مجبور ہوں۔ آپ کو میرے شوہر کے موڈ کا اندازہ تو ہے ہی۔ اپنی بات پر اڑ جائیں تو پھر خاموشی ہی بہتر ہے۔ آپ خود جہاندیدہ اور عقل مند خاتون ہیں۔ آپ کو علم تو خوب ہوگا کہ شوہر سخت مزاج کا ہو تو پھر بیوی کی دال نہیں گلتی۔ اس رشتے سے انکار کے بعد اقرار کرنا ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لیے آپ ضد اور زبردستی سے دور ہی رہیں تو بہتر ہوگا۔ میں خواہ مخواہ میں چکی کے دو پاٹوں میں پس جاؤں گی۔ مجھ پر رحم کیجیے اور تشریف لے جائیں۔" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"جب شیر دہاڑنے لگے اور بے قابو ہو جائے تو اسے رام کرنے کے لیے اس کے آگے گوشت کا انبار لگا دیتے ہیں۔ آپ نے اپنی ازدواجی زندگی میں یہ تک تو سیکھا نہیں۔ بیٹیوں کو کیا درس دیا ہوگا فوزیہ بہن۔ ایسی ہی ماؤں کی بیٹیاں زندگی، دکھوں کی آماجگاہ میں گزارتی ہیں۔" وہ ذومعنی بات سے انہیں اور بے بس کر گئیں۔

"آپ نے بالکل درست فرمایا مگر ایسا بھی تو ہے کہ جب گھر کی چوکھٹ کا کتا ہی جان و مال کا رکھوالا نہ رہے اور پاگل پن کے مرض میں مبتلا ہو کر بھونکتا چلا جائے تو مالک اسے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق خاموش کرواتا ہے... اس کی بیماری کا علاج نہیں کروا سکتا۔" انہوں نے ذومعنی جواب عمدہ طریقے سے دے کر ان کی طرف غور سے دیکھا۔

"ملک صاحب اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ وہ اپنی جبلت کے پیشِ نظر اپنے باؤلے ضمیر کی آواز سن کر اسے راہِ راست پر لانا ہی نہیں چاہتے۔ ضمیر کو بھی اپنے مطابق ہی ڈھال لیا ہے انہوں نے...... ورنہ وہ دل کے برے نہیں ہیں۔ بیٹیوں پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ شاید اس لیے اتنے شکی مزاج اور بے ہمت ہو گئے ہیں کہ فیصلہ کرنا ان کے بس میں نہیں رہا۔" وہ مزید یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

اگلے لمحے ہی ملک صاحب نگاہیں نیچی کیے ڈرائنگ روم میں وارد ہوئے۔ فوزیہ سرتاپا لرز اٹھیں۔ موسیٰ کی ماں بھی تیزی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ شاید وہ ان کی گفتگو سن کر نہ جانے کون سی قیامت سمیت اندر آئے ہیں۔

"بہن جی! بھائی صاحب کو بھی ساتھ ہی لے آتیں۔ آج ہی دعائے خیر کی رسم ادا ہو جاتی۔" وہ صوفے پر بیٹھ کر نہایت عاجزی و انکساری سے بولے۔

فوزیہ نے مسمار فولادی قلعے کو حیرت و تجسس سے دیکھا۔ آہ اولاد بھی کتنی ظالم اور کبھی نہ ختم ہونے والی آزمائش کا نام ہے کہ اونچے شملے اور غیرت مند والدین کو بھی ناکوں چنے چبوا دے۔ پل بھر میں ان کی اعلیٰ وارفع ہستی کو ریزہ ریزہ کر کے دھرتی کا حصہ بنا ڈالے۔ آج سماں ایسا ہی تھا۔

"بہت بہت شکریہ بھائی صاحب۔ ہم زندگی بھر آپ کے احسان مند رہیں گے۔ میں ابھی اور اسی وقت باپ اور بیٹے کو بلا لیتی ہوں۔ نیکی کے کام میں دیری خوشیوں کو نگل لیتی ہے۔" وہ مسرت آمیز لہجے میں بولیں۔

جونہی موسیٰ مع والد صاحب کے ان کے گھر پہنچا تو اپنی فطرت پر جبر کر کے ملک صاحب نے اشکبار آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ہاتھ دعائے خیر کے لیے اٹھا دیے۔ فوزیہ کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی امڈ آئی تھی۔ نہ جانے یہ آنسو خوشی کے تھے یا دردانہ کی عدم موجودگی کے تھے۔

"فوزیہ، میمونہ کے رشتے کے بارے میں بھی میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ انہیں کل لنچ پر انوائٹ کر لو۔ دعائے خیر کہہ کر شادی کی تیاری شروع کرتے ہیں۔" ملک صاحب نے مُردنی آواز میں کہا اور باہر نکل گئے۔

جب یہ مژدۂ راحت دُرِشہوار کے کانوں تک پہنچا تو خاموش اور صابر بیٹی بھاگنے کے انداز میں ابو کے کمرے میں آ گئی۔ اپنی بے ترتیب پھولی ہوئی سانسوں کو درست کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

"ابو آج موسیٰ آپ کی توقعات پر پورا کیسے اترا؟ اس کے شجرۂ نسب میں گڑبڑ ہے۔ اس کا رنگ بھی گندمی ہے۔ تنخواہ بھی قلیل ہے۔ یہ معما حل کرنا میرے لیے مشکل ہو گیا ہے کہ آپ نے اپنے معیار اپنے اصولوں اور قانون کی کسوٹی کیوں تج دی۔ ان لوگوں کو آناً فاناً کیسے قبول کر لیا؟" اس کے ہر لفظ میں سانپ کے منکے کا زہر اور بچھوؤں کے ڈنک کی اذیت نمایاں تھی۔ وہ نظریں جھکا کر پژمردہ لہجے میں بولے۔

"کاش دردانہ کی زندگی تاریکیوں اور ذلتوں کے سپرد ہونے سے پہلے ہی میں سبق سیکھ جاتا۔ بیٹا زندگی میں وقت شناسی کا ہتھیار کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ ورنہ انجام میرے جیسا ہوگا۔ خوشی خوشی اپنے گھر جانے کی تیاری کرو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں...... اور کل ہی میمونہ کی دعائے خیر سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ بھی میں نے کر لیا ہے۔ کاش دردانہ واپس آ جائے اپنے شریکِ حیات کے ہمراہ...... میرے گھر کے دروازے اس کے لیے کھلے ہیں۔" دُرِشہوار حیرت سے ابو کو دیکھتی چلی گئی۔

دونوں کی شادی کی تیاریاں روز بروز زور پکڑتی گئیں مگر گھر کی گہما گہمی اور رونق میں اداسی و مایوسی کی آمیزش چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ ملک صاحب نے دل پر پتھر کی سل رکھ کر بتائے بغیر دردانہ کو ای میل کر کے اپنے بدلے ہوئے خیالات کا اظہار کیا اور اس سے معافی کی عرضداشت پیش کر دی۔ چند گھنٹوں بعد دردانہ کی طرف سے جواب موصول ہوا تو وہ بے تابی سے پڑھنے لگے۔

"میرے پیارے ابو!

آئی ایم سوری، میں نے آپ کو ذہنی انتشار میں مبتلا رکھا۔ میرے سپنوں کا شہزادہ آپ ہی منتخب کرنے کے حق دار ہیں کیونکہ آپ کا کیا ہوا فیصلہ نیک نیتی اور بغیر کسی طمع و لالچ کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ میں بڑے تایا جی کے گھر میں محفوظ ہاتھوں میں ہوں۔ آپ بے فکر رہیں، کل ہی آپ کے حضور واپس آ رہی ہوں۔ ایک بار پھر معافی کی التجا کرتی ہوں۔ گھر میں سب کو میری طرف سے مبارک باد پہنچا دیجیے گا۔ یو آر ویری گریٹ ابو! آئی لو یو۔"

وہ ایک دم ٹھٹک کر لرز گئی۔ وہ یہ انکشاف کرنا نہیں چاہتی تھی کہ تایا جان نے موسیٰ کے والد صاحب کو تمام حالات بتا کر وہاں دوبارہ جانے پر رضا مند کیا تھا کیونکہ لوہا گرم تھا۔ کامیابی کی امید تھی۔

ملک صاحب ایک دم سے اٹھے۔ آج چال میں نقاہت نہیں تھی۔ چہرے کی لکیروں میں تناؤ کے بجائے مسکراہٹ کی شگفتگی تھی اور ہونٹوں کا تالا کھل گیا تھا۔ زبان شیرینی میں نہائی ہوئی تھی۔ بہنوں کا بس چلتا تو وہ دردانہ کے ہر قدم پر اپنی جان نچھاور کر دیتیں اور ماں اس کے ہر لفظ پر سجدہ ریز ہو جاتیں کیونکہ اسی کی ہمت نے آج ابو کو قائل کر لیا تھا۔ گھر گل و گلزار بن چکا تھا۔

□

وہ آئے بزم میں......

نزہت اصغر



جذبۂ حب الوطنی سے معمور شخصیت ساجدہ حبیب سے پُرکیف گفتگو

عزیز قارئین! آج ہمارے ساتھ ایک ایسی پیاری، پُرخلوص اور شفیق ہستی موجود ہیں کہ جن کے بارے میں یہ مصرعہ کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے...... سوفیصد پورا اترتا ہے۔

ساجدہ حبیب صاحبہ دنیائے ادب کا ایک بڑا معتبر نام ہیں۔ یہ وہ روشن ستارہ ہیں کہ جن کی روشنی



(دائیں سے) ساجدہ حبیب، عذرا رسول، انجم انصار اور نزہت اصغر

سے استفادہ حاصل کرنے والوں کی قطار در قطار ہے۔ ڈائجسٹ کی دنیا کی یہ نابغۂ روزگار مصنفہ وہ منفرد اور قابلِ تقلید اندازِ فکر رکھتی ہیں کہ جن کے قلمی شاہکار وطن کی مٹی کی خوشبو سے معطر ہیں۔

ان کی تحریروں میں رشتوں کی پہچان ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام اہلِ وطن ان کے سگے رشتے دار ہیں اور ان کے ہر دکھ تکلیف پر ان کا دل تڑپتا رہتا ہے۔ یہ وہ حساس قلب و ذہن رکھنے والی ہستی ہیں کہ جو رواداری، خلوص، چاہت اور اپنائیت کے جذبوں میں پور پور ڈوبی ہوئی ہیں۔ ساجدہ آپی کی سب سے بڑی خصوصیت یا وصف جو مجھے حد درجہ محسوس ہوا وہ یہ کہ انہیں عزت و مان سب کو اچھی طرح دینا اور نبھانا آتا ہے۔ یہ لفظوں سے صرف کھیلتی نہیں بلکہ ان کی تحریر میں عملی اظہار محسوس ہوتا ہے۔ ان کے اندازِ تحریر میں گہرائی و گیرائی ہے جبھی وہ تحریر قاری کے دل پر اثر کرتی ہے۔ قارئین میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ کسی بھی تحریر کو پڑھ کر اس کے سحر میں کھو جانا اور دل میں انقلابی کیفیت محسوس ہونا ہی اس تحریر کی کامیابی کی دلیل ہے۔ یہ وہ لکھاری ہیں جو اپنے مداحوں کو زمین سے جُڑے رہنے کا سلیقہ سکھاتی ہیں پاک سرزمین کی محبت میں ڈوبی ان کی تحریریں قاری کے مشامِ جاں کو بوئے کشورِ حسین سے معطر و مسحور کیے رکھتی ہیں۔

عزیز قارئین آج کی اس بزم میں اسی مایہ ناز، سینئر ترین مصنفہ اور ادارے سے گہری پُرخلوص۔ وابستگی رکھنے والی ہستی سے ملاقات لیے حاضر ہیں۔

پاکیزہ ✧...... سب سے پہلے تو ساجدہ آپی، ہم آپ کو اپنی اس بزم میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ یہ عرض کیجیے کہ ایک عرصے بعد پاکیزہ کے ذریعے قارئین سے مخاطب ہونا کیسا لگ رہا ہے؟

ساجدہ حبیب ✧...... پیاری نزہت۔ اس قدر محبت اور عزت افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ یقیناً میں بہت خوش ہوں اس لیے کہ واقعی ایک عرصے بعد مجھے اپنے پاکیزہ قارئین سے مخاطب ہونا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں اپنے قارئین کی مشکور ہوں کہ انہوں نے کبھی مجھے فراموش نہیں کیا۔ میں لکھوں یا نہ لکھوں انجم انصار

......کے توسط سے بہنوں کی محفل میں میرا ذکرِ خیر کسی نہ کسی حوالے سے ضرور ہوتا ہے۔ اس امر کے لیے میں آپ سب کی بے حد شکر گزار ہوں۔

پاکیزہ ✧......آپ نے اپنے قارئین کو اپنی تازہ تحریروں سے محروم کیوں کر دیا۔ اس کی وجہ کوئی اور مصروفیت ہے؟

ساجدہ حبیب ✧......شکر الحمدللہ کہ اپنے ادبی کیریئر کے ابتدائی تیس سالوں میں میری تحریریں باقاعدگی سے چھپتی رہیں۔ دراصل میں اِک آمد کی کیفیت کے تحت لکھتی ہوں۔ آمد نہ ہو تو باوجود کوشش کے کبھی نہیں لکھ سکتی۔ اب یہی دیکھ لیں کہ وردی، وعدہ اور وفائیں کے بعد تین سال کے عرصے میں میری کوئی تحریر سامنے نہیں آئی حالانکہ گزشتہ سال ماہِ اپریل میں سیاچن کے محاذ پر رونما ہونے والے سانحے کے بارے میں ساری صورتِ حال ذہن میں تو گردش کرتی رہتی ہے لیکن میں ابھی تک اسے احاطۂ تحریر میں نہیں لا سکی۔ اس لیے کہ فقط اس سانحے کے بارے میں نہیں...... بلکہ وطنِ عزیز میں برپا ہر اِک قیامتِ صغریٰ کو دیکھ کر ہر محبِ وطن پاکستانی کی طرح میرا دل بھی خون کے آنسو روتا ہے اور اب کوئی اور مصروفیت تو کوئی خاص نہیں بس عجیب سا ڈپریشن ضرور طاری رہتا ہے کہ خدا جانے اس ارضِ پاک کو کس کی نظر لگ گئی؟ اور یہ کہ...... کیا کبھی ان حالات میں بہتری آئے گی؟ یہی سوچ کر جب قلم اٹھاتی ہوں تو عجیب وحشت سی ہوتی ہے۔ بہرحال ان دنوں طبیعت قدرے بہتر ہے۔ انشاءاللہ کوشش کروں گی کہ میرے قارئین میری تحریروں سے محروم نہ رہیں۔

پاکیزہ ✧......آپ کے قلمی سفر کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اگرچہ بیشتر قارئین آگاہ ہوں گے مگر پھر بھی ہم جاننا چاہیں گے۔

ساجدہ حبیب ✧...... شعور کی منزل پر پہنچتے ہی لکھنے اور پڑھنے کا شوق بیدار ہو چکا تھا۔ بچوں کے ادب سے قطع نظر میں نے نثر نگاری میں مضامین اور افسانہ لکھنے کی کوشش سے اپنے اس سفر کی شروعات کی۔ اس ضمن میں پہلا افسانہ جماعت نہم میں پہنچتے ہی لکھ ڈالا کیونکہ جماعت ہشتم تک اردو کی استانی صاحبہ محترمہ عظمت یزدانی کی طرف سے اس قسم کی تحریروں پر بڑی زبردست پابندی عائد تھی۔ جس میں ہیرو، ہیروئن کے روایتی تصور کے ساتھ عشق جیسی خرافات پر مبنی تحریریں قلمبند کی جائیں۔ چنانچہ جماعت نہم میں پہنچنے کے بعد جب ہم نے منشی پریم چند کا ”غم نہ داری بُز بخر“ پڑھ لیا اور جناب غلام عباس کے افسانے ”اوورکوٹ“ سے متاثر ہوئے تو ایک ایسی تحریر لکھی۔ جس میں ہیروئن بے چاری تو ظالم سماج کے دکھ سہہ کر قبل از وقت اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے اور ہیرو صاحب زمانے کے بے کراں ستم سہنے کے بعد جب خودکشی کرنے کا سوچتے ہیں تو پنکھے کے ساتھ رسی باندھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے عین وقت پر ان کی سابقہ محبوبہ اچانک نمودار ہو کر ان کی اس کوشش کو ناکام بنا دیتی ہیں پھر دونوں شادی کر لیتے ہیں اور ہیروئن پر تین حرف بھیج کر ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ اس افسانے کا نام ”اِک شہیدِ راہِ الفت“ رکھا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ آنِ واحد میں اس افسانے کی خبر ایک حقیقت بن کر تمام جماعت میں پھیل گئی۔ میری کلاس فیلو زرینہ بٹ عرف بھولو پہلوان نے اپنے بھاری وزن کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کاپی میرے ہاتھ سے چھینی اور استانی صاحبہ کی جماعت سے غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بھاری آواز میں یہ تحریر ساری جماعت کو سنائی۔ احباب کا خیال تھا کہ چونکہ اس افسانے کا مرکزی خیال اس زمانے کے مشہور اداکار وحید مراد اور اداکارہ زیبا بیگم کی ایک سپر ہٹ فلم سے ملتا جلتا تھا لہٰذا ہیروئن کی وفات پر تو آنسو بہائے گئے لیکن ہیرو کی بے وفائی پر یعنی کہ خودکشی جیسے فعل سے ہٹ کر شادی جیسی حماقت کرنے پر خوب



آرمی ائیر ڈیفنس لیڈیز کلب کے زیرِ اہتمام جشنِ بہاراں کے موقع پر (دائیں سے) ساجدہ حبیب، مسز اویس، خطیر حسن خان، فاطمہ سلیم اعوان، یاسمین سلیم اور شازیہ جلال کے ساتھ

مذمت کی گئی۔ اس شور شرابے کو سن کر استانی صاحبہ تشریف لائیں۔ اب کاپی ان کے ہاتھ میں تھی اور اس عظیم تحریر کی مصنفہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ محترمہ عظمت یزدانی صاحبہ نے اس تحریر پر اِک نظر ڈالی صفحات پلٹ کر آخر تک پڑھا اور پھر فرمایا۔

”تم لکھ تو سکتی ہو لیکن ابھی قبل از وقت ہے۔“ اس کے بعد انہوں نے مسودے کے فقط چار ٹکڑے کیے اور میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ یعنی کہ اِک شہیدِ راہِ الفت کو انہوں نے واقعی شہید کر دیا اردو کا پیریڈ ختم ہوا تو ہماری آنکھوں سے رواں آنسوؤں کی جھڑی نے تمام جماعت کو باقاعدہ طور پر ہم سے تعزیت کرنے پر مجبور کر دیا۔ ہماری ایک دانش ور کلاس فیلو نے ہمیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بات نہیں ساجدہ، تم اسے دوبارہ لکھ لینا۔“ اور ہم نے رُندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”ایسی تحریریں بھلا روز روز کہاں لکھی جا سکتی ہیں۔“

پیاری نزہت یہ خوب صورت یادیں میں اپنے قارئین سے شیئر کر رہی ہوں۔ امید ہے جواب کی طوالت تمہیں پریشان نہیں کرے گی۔ (ہرگز نہیں آپی) بہرحال...... اس حادثے کے بعد کالج لائف تک کوئی افسانہ نہ لکھ سکی کیونکہ یہ حادثہ واقعی اتنا شدید تھا کہ بقول شخصے ”برسوں تک اس کے اثرات باقی رہے۔“ نومبر 1970ء میں تھرڈ ائیر میں داخلے کے بعد میں نے باقاعدہ طور پر اپنا پہلا افسانہ سہارا کے نام سے لکھا چونکہ اس افسانے کا ہیرو فوجی افسر تھا۔ اسی بنا پر اسے پسندیدگی کی سند عطا کی گئی۔ 1965ء کی جنگ کے بعد کسی بھی تحریر میں فوجی افسر کا کردار اس تحریر کو اوجِ ثریا تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا تھا۔ لہٰذا سہارا کو پسند کیا گیا۔ گورنمنٹ کالج میر پور آزاد کشمیر میں اکنامکس کے استاد جناب اکرم طاہر صاحب شاعری بھی فرماتے تھے۔ آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد کے توسط سے میرا ایک مضمون ان کی نظروں کے سامنے آیا پھر ان کی نظرِ کرم سہارا پر پڑی۔ استادِ محترم لاہور سے شائع ہونے والے اس زمانے کے مشہور رسالے ”ماہنامہ حور لاہور“ میں ایک مستقل سلسلہ ”کیریئر وومن“ کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ باکمالِ مہربانی انہوں نے ”سہارا“ کو شنوائی بخشی اور اپنے توسط سے یہ تحریر ”ماہنامہ حور لاہور“ میں شائع ہونے کے لیے ارسال کی گئی۔ یہ افسانہ شائع ہوا تو میری

خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ''حور'' کے کئی شمارے خرید کر احباب کی لمبی چوڑی فہرست میں بانٹے گئے۔ اس موقع پر میرے بھائی راجا فاروق افضل نے دادی جان (مرحومہ) کے سامنے جو تبصرہ کیا وہ تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ انہوں نے فرمایا۔ ''بے جی کوئی دیگ شیگ پکوا کر بانٹیں، آپ کی لاڈلی دنیائے ادب کا آفتاب بن کر چمکنے والی ہے۔'' پھر یہ سلسلہ کچھ اس طرح چل نکلا کہ ''حور'' میں ''تمنا کا لہو'' شائع ہوا۔ ان ہی دنوں پاکیزہ کا اجرا ہوا تو میں نے اپنے کالج میگزین ''سروش'' میں شائع شدہ افسانہ ''چتا'' کے نام سے ''پاکیزہ'' میں بھیج دیا۔ یہ افسانہ چھپ گیا لیکن میں اس سے بے خبر رہی۔ دوستوں نے مطلع کیا تو اس شمارے کا حصول ایک ناممکن امر بن گیا کہ یہ شمارہ تو ہاتھوں ہاتھ بک چکا تھا۔ بڑی مشکل سے یہ شمارہ ملا۔ اس کے بعد کی تحریر ''کون جیتا کون ہارا'' کے نام سے پاکیزہ میں شائع ہوئی تو ایک سہیلی نے فون پر بتایا کہ بھئی تمہارا افسانہ چھپا تو ضرور ہے مگر میرے بچے اس رسالے کا حشر نشر کر چکے ہیں۔ یہ 1978ء کی بات ہے۔ ان دنوں ہماری پوسٹنگ پشاور میں تھی۔ مسز میجر (اب بریگیڈیئر ریٹائرڈ) وقار نوید کے توسط سے ایک مہربان علم دوست شخصیت تک ہماری ٹوٹی پھوٹی اور تقریباً بے معنی تحریروں کی خبر پہنچی تو انہوں نے توجہ فرمائی اور ماہنامہ دوشیزہ کراچی کے لیے ہماری ایک تحریر ''دوپٹا'' کے نام سے ارسال فرمائی گئی۔ محترمہ رخسانہ سہام مرزا اور رعنا فاروقی نے اسے شرفِ قبولیت بخشا۔ محترم جناب سہام مرزا نے راہنمائی فرمائی۔ رعنا فاروقی نے بلاشبہ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور بلاشبہ میری تحریروں پر محنت کی۔ ستمبر 1979ء میں حبیب صاحب کی پوسٹنگ ملیر کینٹ کراچی ہوگئی۔ یہاں ادبی رفقاء کی شفقت نصیب ہوئی۔ پاکیزہ کی محترمہ صفیہ ملک اور خواتین ڈائجسٹ کی امت الصبور نے باکمالِ مہربانی میری ہر تحریر کو نمایاں جگہ دی۔ ''دوشیزہ رائٹر ایوارڈز'' ملنے پر ادبی حلقوں میں پزیرائی ملی اور پھر دوستی، محبت اور خلوص کا یہ سفر انجم انصار اور نزہت اصغر کی معیت میں محترمہ عذرا رسول کے ساتھ آج تک جاری ہے۔

پاکیزہ ✧......آج کل ڈائجسٹ کی رائٹرز ٹی وی چینلز پر بہت پزیرائی حاصل کر رہی ہیں آپ کو یہ سب کیسا لگتا ہے؟

ساجدہ حبیب ✧...... ظاہر ہے کہ مجھے اس امر کی بہت خوشی ہے۔ نزہت میں نے وہ دور دیکھا ہے جبکہ ڈائجسٹ میں لکھنے والوں کی ادبی حیثیت کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا تھا۔

(اور شاید اب بھی نہیں) ہماری ان لکھاری بہنوں نے ادب کی اس اجارہ داری کو توڑنے کے لیے بے حد محنت کی ہے۔ وہ پرنٹ میڈیا سے نکل کر الیکٹرانک میڈیا تک آگئی ہیں اور ماشاء اللہ ان کی تحریریں ڈرامائی تشکیل کے بعد معاشرے پر مثبت اثرات مرتب کر رہی ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک بہترین کامیابی ہے۔

پاکیزہ ✧......پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا جُدا جُدا ہیں تو کسی ناول کی ڈرامائی تشکیل میں ناول کا اصل حسن برقرار رہتا ہے؟

ساجدہ حبیب ✧......جی نہیں، اکثر اوقات تو کہانی اور کرداروں کو کچھ اس طرح مسخ کر دیا جاتا ہے کہ ناول کا اصل حسن تو کیا......کہانی ہی باقی نہیں رہتی بلکہ کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔

پاکیزہ ✧......آج کل انٹرنیٹ اور موبائل کلچر ہے۔ اس سے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں؟

ساجدہ حبیب ✧...... ساری قوم بخوبی جانتی ہے کہ سائنس کی اس ترقی نے ہمارے معاشرے کو تنزلی کی کس حد تک پہنچا دیا ہے چونکہ ہمیں ہر چیز کو مثبت کے بجائے منفی انداز میں لینے کی عادت ہے لہٰذا اس کلچر نے بھی ہمارا جو حشر کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔


ساجدہ حبیب اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ

پاکیزہ ✧......چالیس سال قبل کی لڑکی کی سوچ اور آج کی لڑکی کی سوچ میں کیا تقابل کریں گی؟

ساجدہ حبیب ✧...... یہ ایک طویل عرصہ ہے، پیاری نزہت، چالیس سالوں میں چار نسلیں جوان ہوجاتی ہیں تو پھر سوچ میں ایک واضح فرق بھلا کیوں کر نہیں ہوگا؟ رہی بات بنیادی سوچ کی تو آج کے دور میں لڑکیوں کی وہ بے حجابی بہت کھٹکتی ہے۔ جسے ''بولڈنیس'' کا نام دیا گیا ہے۔ اسی ''بولڈنیس'' کی وجہ سے لڑکیوں میں قوتِ برداشت اور سمجھوتے کی کمی ہے۔ ہمارے دور میں سماج، معاشرہ، رسم رواج اور مشرقیت کے علاوہ بزرگوں کے فیصلوں کو زندگی میں آگے اور اپنی ذات کو بہت پیچھے رکھا جاتا تھا جبکہ آج کل ایسا نہیں ہے۔ اب اس ضمن میں نئی نسل کے دلائل ماشاء اللہ اتنے وزنی ہوگئے کہ بزرگوں کے لیے ماسوائے خاموشی اختیار کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ چالیس سال پہلے کے لوگ اپنے بزرگوں کی مرضی سے جیتے تھے آج کے دور میں اپنی مرضی سے جینے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بس یہی فرق ہے۔

پاکیزہ ✧......شادی سے پہلے کا زمانہ کیسا تھا؟ کیا شادی کے بعد اس زمانے کی یادوں نے کبھی ستایا؟

ساجدہ حبیب ✧......شادی سے پہلے کا زمانہ بے حد شاندار تھا۔ کوئی ذمے داری نہیں تھی۔ بے فکری اور تھا اور سکون تھا۔ شادی کے بعد اس دور کی یادیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں اور یادیں تو ہمیشہ ستاتی ہیں۔ میں بنیادی طور پر ناسٹلجیا کی مریض ہوں اور ہمیشہ اپنے ماضی میں زندہ رہتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......کچھ اپنے اسکول اور کالج لائف کے بارے میں بتائیں......کوئی خوشگوار یادیں؟

ساجدہ حبیب ✧......یہ دلکش یادیں تو زندگی کا سرمایہ ہیں، میں ان سنہری دنوں کی یادوں کو ''پاکیزہ'' کے ایک سلسلے ''مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا'' کے لیے لکھ چکی ہوں۔ ان خوب صورت یادوں کو حدِ تحریر میں لانے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ اب تم نے یاد دلا ہی دیا ہے تو یادوں کے اس سرمائے میں سے چند یادیں قارئین کے لیے نکال ہی لائی ہوں۔

میں یقیناً بڑی خوش قسمت تھی کہ رشتے داری کے ہر سنگِ میل پر مجھے بے حد پیار نصیب ہوا۔ لاشعور سے شعور تک کے سارے لمحات لاعلمی میں گزر گئے۔ میرا بچپن بہت ہی خوب صورت تھا۔ یہ سن ساٹھ کا عشرہ تھا اور میرے اسکول کا زمانہ......گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول مظفر آباد آزاد کشمیر کا وہ ماحول اور بیتا ہوا ہر ایک منظر ابھی تک میری یادوں میں زندہ و تابندہ ہے۔ جہاں سے میں نے اپنی تعلیم کے ابتدائی مدارج طے کیے۔ وہ بڑی وضع داری کا زمانہ تھا۔ تمام اساتذہ کرام پُرخلوص، مہربان اور لگن سے کام کرنے والے لوگ تھے۔ یہ ہماری قوم کی وہ قابلِ احترام نسل تھی۔ جس کی قربانیاں ایک ملک کو بنانے اور ایک ملت کو ایک پلیٹ فارم تلے

جمع کرنے کے سلسلے میں کام آئیں۔

کلاس روم کی اپنی دنیا بے حد حسین ہوا کرتی۔ پڑھائی سے زیادہ شرارتوں پر دھیان رہتا۔ ہمیشہ سے اردو میں میرے نمبر بہت اچھے آتے۔ میری ان یادوں میں سن انیس سو پینسٹھ اور سن اکہتر کی یادوں کے کئی کردار ابھی تک زندہ ہیں۔ میرے آباؤ اجداد کا آبائی پیشہ سپاہ گری تھا۔ چنانچہ فوج کی زندگی سے آج تک گہرا تعلق رہا۔ فوج آپ کو ہمیشہ ایک بہترین زندگی عطا کرتی ہے۔ نظم وضبط، تناسب و ترتیب اور قرینہ وسلیقہ...... زندگی گزارنے کے یہ سب انداز اس ادارے کی دین ہیں۔ میرے دادا جان محترم نے ہماری تعلیم و تربیت میں ان تمام چیزوں کو روا رکھا اور حُبِ الوطنی کا درس گویا کہ گھٹی میں ڈالا۔ اپنے بچپن میں ہم نے کشمیر کی سرزمین پر کھڑے ہو کر پاک سر زمین کے مقدس ترانے سے اپنی ہر صبح کا آغاز کیا۔ ہم آج بھی الحاقِ پاکستان کے حامی ہیں۔ چنانچہ جب جنگ کا آغاز ہوا تو گویا یہ ہماری عملی زندگی کا پہلا جہاد تھا۔ جبکہ ساری قوم ایک محاذ پر تھی۔ آج جبکہ میں اپنی نئی نسل کے بے حد آسودہ حالات اور معمولات دیکھتی ہوں تو دعا کرتی ہوں کہ وطن سلامت رہے اور جنگ کبھی نہ ہو۔ کالج اور یونیورسٹی کا دور ہنگامہ خیز رہا۔ آج کے دور کے بہت سے اہم نام ہمارے ہم مکتب تھے۔ آل پاکستان مباحثے، مشاعرے اور دیگر غیر نصابی سرگرمیاں جاری رہتیں۔ اخبار کی ہر خبر کو پڑھنا میرا مشغلہ تھا۔ میں ابراہیم جلیس اور ابن انشا کے کالم ”وغیرہ وغیرہ“ اور آپ سے کیا پردہ“ کی کٹنگ محفوظ رکھا کرتی تھی۔ حور اور زیب النسا باقاعدگی سے پڑھنا...... حور میں لکھنے والی مصنفات اکثر رومانی تحریریں لکھتیں۔ قدرت اللہ شہاب سیارہ ڈائجسٹ میں لکھا کرتے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی تحریر کے بغیر کوئی پرچا مکمل نہ ہو پاتا۔ ادبی افق پر بشریٰ رحمان کا نام طلوع ہوا۔ ان کا اندازِ بیان خوب صورت اور ہر ایک سطر گویا دل میں اتر جانے والی ہوتی۔ شوکت رانا ”حور“ میں لکھتیں۔ ان کا افسانہ ”جنگلی“ آج تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ میرے لکھنے کا محرک ایک غریب عورت کے بے تحاشا بہتے ہوئے آنسو تھے جو میرے قلم کی سیاہی بن گئے۔ بچپن بڑا ظالم پنچھی ہے۔ بہت جلد پرواز کر کے آسمان کے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے مگر گہرے انمٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ دنیائے ادب نے مجھے احسانات کے بوجھ تلے دبا رکھا ہے۔ میں کبھی یہ قرض ادا نہ کر سکوں گی کہ اس دنیا نے مجھے ایک نام دیا، ایک پہچان دی۔ دوستوں کا ایک وسیع حلقہ دیا اور وہ قارئین عنایت فرمائے جو میری تحریروں کے منتظر رہتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... قلم و قرطاس کے اس سفر میں چھوٹی بڑی کیا مشکلات پیش آئیں۔

ساجدہ حبیب ✧...... کوئی خاص مشکلات پیش نہیں آئیں بلکہ فضلِ تعالیٰ۔۔ اسباب بنتے چلے گئے اور پھر ڈائجسٹ کی دنیا میں ایک نمایاں مقام اور قارئین کا ایک باشعور و محبِ وطن حلقہ میسر آیا۔ جنہوں نے حبُ الوطنی پر مبنی میری تحریریں اور بطورِ خاص کشمیر کے حوالے سے لکھے گئے ناولٹ کو بے حد سراہا۔

پاکیزہ ✧...... جب کسی تحریر کے حوالے سے قارئین سراہتے ہیں تو کیسا لگتا ہے؟

ساجدہ حبیب ✧...... مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے اور بقول شخصے لکھنے کا عزم جوان ہو جاتا ہے۔ یہ تحریریں میری ذات اور زندگی کی پہچان ہیں لہٰذا یہ امر میرے لیے باعثِ مسرت ہے۔

پاکیزہ ✧...... اب تو آپ کے افسانے اور ناولٹ کتابی شکل میں آرہے ہیں، ان مجموعوں کی اشاعت پر کیسا ردِعمل سامنے آیا؟

ساجدہ حبیب ✧...... الحمدللہ...... بہت اچھا ردِعمل دیکھنے کو ملا...... دوست احباب اور قارئین نے بے حد پزیرائی بخشی، آرمی ایئر ڈیفنس لیڈیز کلب میں



ساجدہ حبیب محترمہ جیلانی بانو اور محترمہ ہاجرہ مسرور کے ساتھ

میرے ناولٹ ”وردی، وعدہ اور وفائیں“ کے لیے تقریبِ رونمائی منعقد کی گئی اور سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے تحریر کردہ اس ناولٹ کی تعریف کی گئی کہ برسوں بعد جب یہ سانحہ جاں نثار کرداروں کے روپ میں سامنے آیا تو یہاں تک کہا گیا کہ یہ تحریر بہتے آنسوؤں کے ساتھ پڑھی گئی ہے۔ پیاری نزہت یہ ایک اجتماعی دکھ ہے، جس کے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ ”دل درگاہ اور دیا“ کو بھی پزیرائی حاصل ہوئی۔

پاکیزہ ✧...... کیا ادبی تحریروں میں مرد حضرات اور خواتین لکھاری کے اسلوبِ نگارش میں فرق ہوتا ہے؟

ساجدہ حبیب ✧...... جی ہاں، بالکل، ایک نمایاں اور بنیادی فرق ہوتا ہے چونکہ سوچ ہی مختلف ہوتی ہے لہٰذا تحریر میں اس کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... ایک اچھے قلمکار کے لیے کیا کیا اوصاف ضروری ہیں؟

ساجدہ حبیب ✧...... کوئی بھی تحریر خواہ کسی بھی معاشرے، مذہب یا ملک میں لکھی جائے وہ ہر مصنف کی ذہنی سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ انسانی سوچ ہی وہ بنیادی نقطہ ہے جس پر تحریر کے غلط یا پھر صحیح ہونے کا دارومدار ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک اچھے قلمکار کے لیے سوچ کی بلندی، اعلیٰ ظرفی، حب الوطنی اور معاشرے میں رواداری کے ساتھ زندگی گزارنے کے اوصاف بہت ضروری ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کی تحریروں میں پُرکیف منظر نگاری خصوصاً وادیِ کشمیر کے حوالے سے بہت خوب ہوتی ہے۔ کبھی کہانی کے تناظر میں بیرونِ ملک کے مناظر کی تفصیل لکھنے کا بھی خیال آیا؟

ساجدہ حبیب ✧...... کہانی جس خطۂ زمین کے حوالے سے بھی لکھی جاتی ہے، اسی کے بارے میں منظر نگاری بھی تحریر کے عمل میں لائی جاتی ہے۔ میری زیادہ تر کہانیاں وادیِ جنت نظیر کشمیر کے حوالے سے ہیں، لہٰذا ان میں اسی پس منظر کی عکاسی نظر آتی ہے۔ 1993ء میں انگلینڈ سے واپسی پر میں نے ایک ناولٹ ”جائے پناہ“ کے نام سے لکھا تھا جو پاکیزہ اکتوبر 1994ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اگرچہ اس کہانی کی بنیاد تو تحریکِ آزادیِ کشمیر پر مبنی تھی لیکن یہ انگلینڈ کے پس منظر میں لکھی گئی تھی۔ لہٰذا تمام تر منظر نگاری بھی اسی پس منظر کے حوالے سے تحریر کی گئی تھی۔

پاکیزہ ✧...... آپ کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت جذبۂ حب الوطنی میں ڈوبے جذبات و خیالات ہیں جو آپ کو ہم عصروں میں ممتاز مقام دیتے ہیں۔ اس کے بارے میں کیا کہیں گی؟

ساجدہ حبیب ✧...... یقیناً حُبِ الوطنی کا یہ درد، اپنے وطنِ عزیز سے محبت اور اپنے پیارے قائد کی اس عظیم الشان قوم کی اس زبوں حالی کا یہ دکھ میں نے کچھ زیادہ ہی پالا ہے۔ شاید یہ اپنے اپنے احساس کی

بات ہے اور میرے دادا جان محترم کی اس تربیت کا نتیجہ بھی...... جنہوں نے اس دور کے باقی بزرگوں کی طرح حُبّ الوطنی کا درس ہمیں گھٹی میں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن سے اس وقت تک ہماری سوچ کا محور اپنا وطن اور صرف وطن ہے اور یہی سوچ اور احساس ہماری تحریروں پر بھی محیط ہے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے موضوعات اگرچہ متنوع مگر گمبھیر اور مادرِ وطن کی مٹی اور اس سے محبت کے گرد گھومتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل اور صرف عورت کے گرد گھومتی کہانیاں کیا آپ کو اٹریکٹ نہیں کرتیں؟

ساجدہ حبیب ✧...... پیاری نزہت، میں بھی اسی معاشرے کا ایک حصہ ہوں، جہاں عورت کا وجود ایک مظلوم کردار کے طور پر اکثر سامنے آتا ہے اور عورت کا استحصال کرتے ہوئے اس کے بنیادی حقوق تک چھین لیے جاتے ہیں۔ میں نے اس معاشرتی رویّے پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل اور صرف عورت کے گرد گھومتی کہانیاں اٹریکٹ تو ضرور کرتی ہیں لیکن ہر تحریر میں فقط صنفِ نازک کی مظلومیت کا رونا ہی روتے رہنا مجھے پسند نہیں۔ آج کی عورت نسبتاً آزاد اور باشعور ہے۔ وہ اپنے حق کے لیے لڑنا جانتی ہے اور اپنے گھریلو مسائل کو بخوبی حل کرنا بھی جانتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی تحریر میں عورت کو ایک انتہائی مظلوم کردار میں پیش کرنا کچھ زیادہ مناسب عمل نہیں ہے۔

پاکیزہ ✧...... ایک زمانے میں ڈائجسٹ کی رائٹرز کو اہلِ ادب کے ایک خاص طبقے کی جانب سے نو لفٹ کا بورڈ ملتا تھا اور آج انہی رائٹرز کے ڈرامے ہر طبقۂ فکر سے واہ واہ سمیٹ رہے ہیں آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

ساجدہ حبیب ✧...... ہمارے ہاں زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ملکی ادب پر بھی اجارہ داری کا غلبہ ہمیشہ رہا۔ میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب فقط کسی بھی ڈائجسٹ کی رائٹر ہونے کے حوالے سے ہم لوگ زبردست تنقید کا شکار تھے۔ ہماری ادبی حیثیت کو قطعی طور پر تسلیم نہ کرتے ہوئے کبھی سوچا ہی نہیں گیا کہ یہ ڈائجسٹ اور ان میں شائع شدہ ادب کہاں کہاں تک پہنچتا ہے دیگر دوسرے عوامل کی طرح ہمارا ادب بھی عوام اور خواص میں بٹا ہوا تھا۔ جب ڈائجسٹ کی دنیا سامنے آئی اور اس توسط سے یہ ادب عوام تک پہنچا تو اس اجارہ داری میں دراڑ پڑنے لگی۔ عوام میں پڑھنے کا شعور اجاگر ہوا تو اس خاص طبقے کو بڑی ٹھیس پہنچی۔ آج بھی آپ دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ خواتین لکھاری کے ڈرامے بامقصد ہونے کے باوجود خواہ مخواہ تنقید کا شکار ہیں اور یہ کہا جارہا ہے کہ ”ڈائجسٹوں میں لکھنے والے ڈراما نگار بن گئے ہیں۔“ حالانکہ ان خواتین رائٹرز کے ڈراموں کو جو پزیرائی حاصل ہوئی وہ سب کے سامنے ہے۔

پاکیزہ ✧...... آج کے اس الیکٹرانک دور میں کتابوں کی اہمیت اور ضرورت کس حد تک ہے؟

ساجدہ حبیب ✧...... اس الیکٹرانک دور میں دنیا تو اگرچہ ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے لیکن اب نظریں کتاب کے بجائے چند انچ کی اسکرین پر مرکوز ہو چکی ہیں۔ ہمارے اس دور کے بچے کتاب جیسی اہم چیز کی اہمیت سے نہ تو آشنا ہیں اور نہ ہی انہیں اس امر کا احساس دلانے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ شاید اب مطالعے کا دور گزر چکا۔ کتاب سے کمپیوٹر تک کے اس سفر میں ہم ادبی ورثے سے محروم تو ہو چکے لیکن خدا جانے ہمیں اس ورثے کے کھو جانے کا قطعی کوئی غم کیوں نہیں ہے۔ آج ہم انٹرنیٹ کی دنیا میں خوش ہیں اور یہ جانے بغیر مطمئن ہیں کہ ہم تنزل کے کس دور کی طرف جا رہے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے نزدیک مختلف رسائل میں شائع ہونے والی تحریروں کو فی زمانہ کیسا ہونا چاہیے؟

ساجدہ حبیب ✧...... آج ہم جس تنزلی کا شکار ہیں، ہمارا معاشرہ جس نہج پر پہنچ چکا ہے ہمارے ملکی

حالات جس انتشار، کرب اور وحشت کا سامنا کر رہے ہیں۔ ہمارے راہنماؤں کی سوچیں جوڑنے کے بجائے توڑنے کے سفر پر گامزن ہیں۔ اس خطرناک صورتِ حال میں ضرورت اس چیز کی ہے کہ حُبّ الوطنی کا درس دیتے ہوئے نئی نسل کو تحریر کے ذریعے ان بزرگوں کی سوچ سے روشناس کرایا جائے جنہوں نے اپنے عظیم کارناموں سے ایک تاریخ مرتب کی اور عظیم الشان قربانیاں دے کر اس عظیم وطن کی تخلیق کی۔ ہمیں آزادی جیسی نعمت عطا کی۔ ہمیں اس تاریخ کو از سرِ نو مرتب کر کے ایک پیغام کی صورت میں پہنچانا چاہیے۔



آرمی ائر ڈیفنس لیڈیز کلب کے ایک فنکشن میں
ساجدہ حبیب مسز صدف خالد کے ساتھ

پاکیزہ ✧...... آپ نے بہت کچھ لکھا، اب کیا لکھنے کی خواہش ہے؟

ساجدہ حبیب ✧...... جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ میں کسی خواہش پر نہیں بلکہ آمد کی ایک خاص کیفیت کے تحت لکھتی ہوں چونکہ یہ صلاحیت قدرت کی طرف سے ایک خاص عطیہ ہے، مستقبل میں صحت سلامت رہی اور آمد کا یہ سلسلہ جاری رہا تو انشاء اللہ ان ہی موضوعات پر لکھوں گی جو میری پہچان ہیں یعنی کہ کشمیر، مشرقی پاکستان اور پاک آرمی۔

پاکیزہ ✧...... کالم نگاری کی جانب آنے کا کبھی خیال آیا؟

ساجدہ حبیب ✧...... جی نہیں، میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا حالانکہ کالم نگاری ایک پسندیدہ صنف ضرور ہے لیکن الحمدللہ میں اپنی ہی فیلڈ میں مطمئن ہوں۔

پاکیزہ ✧...... آج کل آپ کی کیا روٹین اور مصروفیات ہیں؟

ساجدہ حبیب ✧...... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی روٹین بدلتی رہتی ہے، ہمارے ساتھ دوست احباب، مہربان اور قدر دانوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ جس نے ہمیں کبھی تنہا نہیں چھوڑا۔ ہمہ وقت سب سے رابطہ رہتا ہے۔ مطالعہ میری زندگی کی اولین ترجیح ہے۔ میرے قارئین مجھے یاد رکھتے ہیں مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے۔ یہاں کی سوشل لائف میں ”گیریژن لیڈیز کلب“ اور ”ائر ڈیفنس لیڈیز کلب“ کی بہت اہمیت ہے۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد ربِّ کریم نے پرانے دوستوں کے علاوہ نئے قدر دانوں کا ایک گروپ عنایت فرمایا ہے۔ ماشاء اللہ میرے بھائیوں کی اولاد مجھے مصروف رکھتی ہے۔ گزشتہ سال فقط گیارہ ماہ کے عرصے میں ہمارے ہاں دو بچوں کی شادیاں ہوئیں لہٰذا پہلے عمر فاروق اور پھر عالیہ سعید کی شادی کے سلسلے میں بے حد مصروفیت رہی۔ البتہ ایک خلش ضرور بے چین رکھتی ہے۔ یہی کہ گزشتہ دور کی نسبت اب میں زیادہ لکھ نہیں سکتی اور کبھی کبھار یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ میں وقت ضائع کر رہی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... آپ اپنے اس سفر سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

ساجدہ حبیب ✧...... شکر الحمدللہ کہ میں بہت مطمئن ہوں گزشتہ تین دہائیوں میں بہت کچھ لکھا جو سراہا بھی گیا۔ تعریف کا عمل لکھاری کو مطمئن رکھتا ہے۔ مجھے اپنے ادبی کیریئر میں تنقید کی نسبت تعریف

کی نعمت زیادہ نصیب ہوئی لہٰذا میں مطمئن ہوں۔

پاکیزہ ✧......حبیب صاحب کی طرف سے آپ کو لکھنے میں تعاون ملا؟

ساجدہ حبیب ✧......جی ہاں، بلاشبہ یہ ان کے تعاون ہی کا نتیجہ ہے کہ وطنِ عزیز کے ایک حساس ادارے، سانحہ مشرقی پاکستان اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر جیسے اہم موضوعات پر مبنی میری تحریروں کو پسندیدگی کی سند ملی۔ میں نے ان موضوعات پر باقاعدہ ریسرچ ورک کرنے کے بعد قلم اٹھایا اور اس ضمن میں حبیب صاحب کا تعاون ہمیشہ شاملِ حال رہا۔

پاکیزہ ✧......رشتے داریاں نبھانا کیسا لگتا ہے؟

ساجدہ حبیب ✧......رشتے داریاں نبھانا بہت پسند ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں نہایت عاجزی اور محبت کے ساتھ تمام رشتے داریاں اچھے طرزِ عمل سے نبھائی ہیں لیکن آج نفسا نفسی کے اس دور میں بعض رشتے داروں کے رویّے جب تکلیف پہنچاتے ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧......کس سوچ کے حامل لوگوں سے جلدی گھل مل جاتی ہیں؟

ساجدہ حبیب ✧......اپنی معاشرتی زندگی میں بہت جلدی بے تکلفی میری فطرت کا حصہ ہے۔ میں محبِ وطن اور دین دار سوچ کے حامل لوگوں سے جلدی گھل مل جاتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......کیا عمر کے اس حصے میں بچوں اور نوجوان نسل سے دوستی ہے یا پھر اپنی بزرگی کا رعب رکھتی ہیں؟

ساجدہ حبیب ✧......میں عرض کر چکی ہوں کہ بے تکلفی میری فطرت کا حصہ ہے تو پھر پیاری نزہت کہاں کی بزرگی اور کیسا رعب......؟ عمر کے اس حصے میں میری نوجوان لڑکیوں اور بچوں سے دوستی کا ایک بہت پیارا رشتہ قائم ہے۔

پاکیزہ ✧......آج کے ملکی حالات کے بارے میں کیا اظہارِ خیال کریں گی؟

ساجدہ حبیب ✧...... پیاری نزہت اس ضمن میں کیا عرض کروں، آج جو صورتِ حال ہے وہ ہر ذی شعور پاکستانی مسلمان کو خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ پیارے اور قابلِ احترام قائداعظم کے پاکستان کا یہ حشر کس نے کیا؟ وہ کون سی نادیدہ قوتیں ہیں جو ہمیں آپس میں لڑا رہی ہیں؟ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مذہب کے نام پر دہشت گردی کا کھیل کن قوتوں کے اشارے پر کھیلا جا رہا ہے؟ آج کے پاکستان میں پاکستانی قوم متحد کیوں نہیں ہے؟ اقوامِ عالم کی برادری میں ہم نفرت کی نشانی کیوں بن چکے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب شاید کسی کے پاس نہیں، ہم وہی قوم ہیں ناں کہ سن ساٹھ کی دہائی میں جن کے پاس کورین ماہرین ملکی ترقی کا راستہ پوچھنے کے لیے تشریف لائے تھے، آج کوریا کہاں ہے اور ہم کہاں ہیں؟ ہم نصف صدی سے زائد کا سفر طے کرنے کے بعد زوال پذیر ہیں، ہمارا روشنیوں کا شہر تاریکی کا شکار ہو چکا لاء اینڈ آرڈر کی سچویشن بگڑ چکی، قوم کی زندگی سے سکون رخصت ہو گیا اور ہم اِک خوف و دہشت کی فضا میں جی رہے ہیں، ہمیں نئے پاکستان کے خواب دکھائے جا رہے ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ قائداعظم کے پاکستان کا کیا بنے گا....آج ہم لوڈ شیڈنگ کا عذاب جھیلتے ہوئے کسی خضرِ راہ کی تلاش میں ہیں جو ہمیں چراغوں کی روشنی میں ہی سہی کوئی سیدھی سمت تو دکھائے مگر...... افسوس کہ ہر طرف مایوسی ہے ایسے میں رب العزت سے التجا ہے کہ وہ ہماری خطاؤں کو معاف فرما کر ہمارے حال پر رحم و کرم فرمائے۔ (آمین ثم آمین)۔

پاکیزہ ✧......اگر پاکیزہ کے حوالے سے بات کی جائے تو بتائیں کہ اس ادارے سے وابستگی کیسی رہی؟

ساجدہ حبیب ✧...... ماہنامہ پاکیزہ کراچی سے میری وابستگی کوئی دو چار دن کی بات نہیں بلکہ اس

ادارے سے وابستہ ہوئے چالیس سال کا طویل عرصہ گزر گیا اس ادارے سے وابستہ ہر دور کے افراد نے بے حد عزت افزائی بخشی اور شروعات ہی سے حوصلہ افزائی کا عمل جاری رکھا۔ اس طرزِ عمل نے ہی رائٹرز کے قلم کو روانی عطا فرمائی اور ڈائجسٹ کی دنیا میں کئی نام آئے۔ صفیہ ملک جب تک ادارے میں موجود رہیں انہوں نے بڑی بہنوں جیسا احترام بخشا۔ انجم انصار اور نزہت اصغر کے ساتھ محترمہ عذرا رسول صاحبہ نے اپنے کردار اور عمل سے ہمیں اپنائے رکھا اتنے طویل عرصے تک اپنوں جیسی محبت اور خلوص عنایت فرمانا واقعی بڑی اعلیٰ ظرفی کی مثال ہے۔

پاکیزہ ✧......آپ ایک حد درجہ حساس دل و دماغ رکھتی ہیں تو ایسے میں کون سا طرزِ عمل ناگوارِ خاطر گزرتا ہے؟

ساجدہ حبیب ✧......اپنے اردگرد بسنے والوں اور اپنے پیاروں پر طنز کرنا بے حد باعثِ تکلیف ثابت ہوتا ہے۔ دوسرا عمل ہے غیبت کرنا، جو ہم اکثر اوقات کسی بھی قسم کا تکلف روا رکھے بغیر کرتے ہیں، آج کل کے دور میں اپنوں کے رویّے بے حد پریشان کرنے لگے ہیں بعض اوقات اپنوں کی بے رخی اور غلط طرزِ عمل دل و دماغ میں اِک قیامت برپا کیے رکھتا ہے۔

پاکیزہ ✧......ایک فوجی شوہر کے ساتھ زندگی گزارنا کیسا لگتا ہے؟

ساجدہ حبیب ✧......شکر الحمدللہ کہ فوج آپ کو ایک شاندار اور بہترین زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ گزشتہ چالیس برس قدرے سکون اور امن کے ساتھ گزرے اور اب ربِّ کریم کی مہربانی سے حال بھی بہت اچھا جا رہا ہے چونکہ میری تربیت ایک فوجی ماحول میں ہوئی لہٰذا ڈسپلن اور پابندیٔ وقت جیسی عادات ہماری سرشت میں شامل تھیں۔ شادی کے بعد ایک فوجی شوہر کی عادات قبول کرنے میں مجھے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ اس لیے کہ زندگی میں سمجھوتوں کے ساتھ جینا میری فطرت ہے۔

پاکیزہ ✧......کیا اچھی افسانہ نگاری سیکھی جا سکتی ہے؟

ساجدہ حبیب ✧......میرے خیال کے مطابق یہ صنف ایک عطیۂ خداوندی ہے۔ آپ ایک اسکول آف تھاٹ کے مطابق عمل تو کر سکتے ہیں سیکھنا.... بہرحال مشکل ہے۔

پاکیزہ ✧......قارئینِ پاکیزہ کے لیے اپنی نئی تحریر کب دے رہی ہیں؟

ساجدہ حبیب ✧......انشاءاللہ بہت جلد......ان ہی صفحات میں ایک ناولٹ کے ساتھ حاضری دوں گی۔

پاکیزہ ✧......سیر و تفریح کے لیے کہاں جانا پسند ہے؟

ساجدہ حبیب ✧...... اپنی جائے پیدائش کوہِ مری، سوات اور کشمیر۔

پاکیزہ ✧......شعر و شاعری سے کس حد تک دلچسپی ہے؟ کوئی پسندیدہ شعر اور پسندیدہ شاعر؟

ساجدہ حبیب ✧...... مجھے شاعری پڑھنا پسند ہے، پسندیدہ شعروں میں سرِفہرست ہے۔

شہرِ خموشاں دیکھ کے جی دنگ رہ گیا
ہر سر کے سرہانے فقط سنگ رہ گیا

☆☆☆

انگارے تھے عذاب آشنائی کی انگیٹھی میں
مگر گوشہ نشین سمجھا گوہر و لعل رکھے ہیں

☆☆☆

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

ساغر صدیقی

مجھے ذاتی طور پر ساغر صدیقی، احمد فراز، ناصر کاظمی اور امجد اسلام امجد کا کلام پسند ہے۔

پاکیزہ ✧......ہر نئی لکھنے والی فوراً ساجدہ حبیب جیسی رائٹر بننا چاہتی ہے جبکہ یہ ایک طویل سفر ہے۔ اس بارے میں آپ کیا کہیں گی؟

ساجدہ حبیب ✧......زندگی میں اِک طویل سفر طے کرنے کے بعد ہی منزل نصیب ہوتی ہے، نئی لکھنے والی بچیوں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے برسوں کی محنت اور ریاضت درکار ہوتی ہے۔ اس سفر کو ایک ہی جست میں طے نہیں کیا جاسکتا۔

پاکیزہ ✧......امورِ خانہ داری سے دل چسپی کس حد تک رہی؟

ساجدہ حبیب ✧......بس صرف اس حد تک کہ گھر بہت زیادہ صاف ستھرا ہو، ہر چیز سلیقے اور قرینے سے اپنی جگہ رہے، کچن لش لش چمکتا ہوا نظر آئے۔ باقی رہے کچن سے متعلق امورِ خانہ داری تو میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی خوش خبری یہ ہے کہ ”آئیے جی کھانا تیار ہے۔“

پاکیزہ ✧...... سنا ہے کہ افواجِ پاکستان سے متعلق بیگمات بہت اچھی بیکنگ کرتی ہیں، مہمان نواز ہوتی ہیں، آپ اپنے مہمانوں کی خاطر کے بارے میں کس بات کا خیال رکھتی ہیں؟

ساجدہ حبیب ✧...... پیاری نزہت آپ نے بالکل صحیح سنا ہے، ہمارے ہاں گھریلو امور کی تربیت میں لیڈیز کلب ایک انسٹیٹوٹ کا فریضہ انجام دیتے ہیں، جہاں کوکنگ، بیکنگ، فلاور ارینج منٹ اور سیونگ جیسے اہم کاموں کی سکھلائی کے لیے نہ صرف یہ کہ باقاعدہ کلاسز ہوتی ہیں بلکہ اکثر اوقات میٹنگ میں باقاعدہ demonstration دی جاتی ہے بے شک ہماری خواتین مہمان نواز ہوتی ہیں اب رہی بات میری مہمان نوازی کی تو اس ضمن میں آپ انجم انصار اور عظمیٰ آفاق سے پوچھ لیجیے۔ میری زندگی کے اس رخ کی وہ بہترین چشم دید گواہ ہیں۔

پاکیزہ ✧......موسیقی سننا کس حد تک پسند ہے؟ اور کون سا گلوکار پسند ہے؟

ساجدہ حبیب ✧...... بیتے برسوں کی بات ہے کہ موسیقی روح کی غذا تھی۔ لہٰذا باقاعدہ سنی جاتی تھی۔ اب عارفانہ کلام پسند ہے لیکن کبھی کبھار یا پھر دورانِ سفر سنتی ہوں، پرانے گلوکار تو ابھی تک ذہن پر چھائے ہوئے ہیں، اس دور کی موسیقی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ پاک بخشش نصیب فرمائے (آمین) بہتے جھرنوں جیسی آواز کی مالک مہناز بہت پسند تھیں۔

پاکیزہ ✧...... کیا فلمیں دیکھنے کا کبھی شوق رہا، کوئی تازہ فلم جو دیکھی ہو؟

ساجدہ حبیب ✧......زمانۂ طالب علمی میں یہ شوق عرشِ معلیٰ سے بس کچھ ہی ادھر واقع تھا۔ اس زمانے کے اداکار محمد علی، زیبا بیگم، وحید مراد اور صبیحہ خانم سنتوش کے نہ صرف یہ کہ ہم لوگ باجماعت عاشق تھے بلکہ ان پر جان قربان کرنے کا عزم لے کر سینما ہاؤس میں تشریف لے جایا کرتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ بزرگوں کی طرف سے فعل کو انجام دینے کی قطعی اجازت نہیں تھی لہٰذا اس بارے میں سہیلیوں کے ساتھ باقاعدہ مشاورت کے بعد پروگرام بننے کی صورت میں ہمیں گھر سے تین گھنٹے کی غیر حاضری کے لیے بعض اوقات کسی کے گھر میلاد یا قرآن خوانی کروانی پڑتی تھی پھر بھی اگر اجازت نہ ملنے کا مشکل مرحلہ درپیش آتا تو ہمیں اپنی کسی بھی کلاس فیلو کی قریبی رشتے دار کو خواہ مخواہ فوت کروانا پڑتا یا پھر بتایا جاتا کہ بس اب وہ اپنے آخری دموں پر ہیں اور ہمیں بلا رہی ہیں کہ جلدی آکر اپنا دیدار کروا جائیں ورنہ پچھتاوے ساری زندگی پیچھا کرتے رہیں گے۔ پیاری نزہت یہ تو سنہرے دنوں کی خوشگوار یادیں ہیں، اب تو وقت کے ساتھ ساتھ یہ شوق بھی ختم ہوگیا۔ چند برس قبل گیریژن لیڈیز کلب کے زیرِ اہتمام فلم اسٹار شان اور زارا شیخ کی فلم تیرے پیار میں دکھائی گئی تھی۔ یہ فلم کشمیر کے موضوع پر تھی اور اس کے بارے میں پیاری بہن مسز صدف خالد کا خیال یہ تھا کہ اس فلم کا اصل نام بارڈروں پار محبت ہونا چاہیے تھا۔

پاکیزہ ✧......کوئی ایسی شخصیت جس نے آپ

کی شخصیت بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہوا؟

ساجدہ حبیب ✧...... میرے محترم دادا جان جیسا کہ پہلے بھی بتا چکی ہوں ان کی شخصیت، ان کی تربیت نے میری زندگی بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ میں روز فجر میں نماز کے بعد ان کی بخشش کے لیے خصوصی دعا کرتی ہوں اور شکر ادا کرتی ہوں کہ ان کی اعلیٰ تربیت کے باعث میں اس مقام پر پہنچی ہوں۔

پاکیزہ ✧......آج کے بچے پاکستانی تاریخی کرداروں سے واقف نہیں لیکن غیر ملکی اداکاروں سے بخوبی واقف ہیں، اس بارے میں آپ کیا کہیں گی؟

ساجدہ حبیب ✧......میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں ہماری نئی نسل کچھ زیادہ قصوروار نہیں، بحیثیت بزرگوں کے کیا ہم نے انہیں اس آگہی کا شعور بخشا؟ ہم نے انہیں اپنی تاریخ سے آگاہ کیا؟ یا پھر ہم نے انہیں غیر ملکی کلچر کی طرف راغب ہونے سے روکا؟ جب ہم لوگ خود ہی بزرگی کو دوستی کی سطح پر لے آئے تو پھر یہی کچھ ہونا تھا جو ہو رہا ہے۔ نزہت، حال ہی میں پاکستان کے ایک قومی ہیرو ائر کموڈور (ریٹائرڈ) ایم، ایم عالم کا وصال ہوا یہ وہ عظیم ہستی تھی جس نے 1965ء کی جنگ میں فقط چند سیکنڈز کے اندر دشمن کے پانچ جہاز مار گرائے ہم اس قومی ہیرو کی رحلت پر رنجیدہ تھے اور کسی نوجوان کی جانب سے کیا جانے والا یہ سوال کہ یہ ایم ایم عالم کون تھے؟ اس وقت مجھے اپنے آپ سے ندامت محسوس ہوئی لیکن پھر وہیں ایسے بھی نوجوان تھے کہ جنہیں معلوم تھا کہ یہ ہستی کون تھی۔ ہمیں ہمارے بزرگوں نے بتایا تھا کہ پاکستان کیسے وجود میں آیا اور کن جلیل القدر ہستیوں نے اس میں اہم کردار ادا کیا۔ جناب حضرت قائداعظم کی زندگی کے ایک ایک گوشے سے روشناس کرایا مگر افسوس آج ہمارے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ ہم اپنی نئی نسل کو پاکستانی تاریخی کرداروں سے آگاہ کرسکیں۔ کبھی کبھار ہمیں خود اپنا محاسبہ بھی کر لینا چاہیے۔

پاکیزہ ✧......آج کل لکھنے والی لڑکیاں اپنی پہلی تحریر کو ہی شاندار قرار دیتی ہیں، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

ساجدہ حبیب ✧...... نئی لکھنے والی بچیاں اور نئی نسل کی اکثریت اگر مائنڈ نہ کرے تو میں بصد ادب عرض کروں گی کہ آج کل کی بچیوں میں خود پسندی کا عنصر بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی پہلی تحریر کے ذریعے ہی اوجِ ثریا تک پہنچ جانا چاہتی ہیں۔

پاکیزہ ✧......اپنے قارئین کے نام کوئی بات، کوئی پیغام، کوئی نصیحت؟

ساجدہ حبیب: فقط یہی کہ محبِّ وطن بنیے تاکہ وقت اور زندگی آپ کی اپنی رہے۔

☆☆☆

پیارے دوستوں! امید ہے ساجدہ حبیب سے پُرلطف مگر ساتھ ساتھ کھری اور حقیقت پر مبنی تلخ گفتگو آپ کو بے حد پسند آئی ہوگی۔ ساجدہ آپی کا از حد شکریہ کہ انہوں نے ہماری اور تمام قارئین کی فرمائش کو عزت بخشی اور ڈپریشن اور اضمحلال کی کیفیت کے باوجود بھرپور باتیں ہماری ذوقِ بصارت وبصیرت کی نذر کیں تو قارئین میری طرح آپ بھی یقیناً ساجدہ آپی کی نئی تحریر کا آج سے ہی انتظار شروع کردیں گے۔ اس دعا کے ساتھ کہ پروردگار وطنِ عزیز کے ان پُرخلوص اور پُرمحبت باسیوں کو وطن کے سائے میں سلامت رکھے تاکہ ہم ان ہستیوں کے افکار سے مستفید ہوتے رہیں۔ چھوٹی سی بات کے ساتھ آپ سے اجازت کہ خوش رہنا اور خوش رکھنا سیکھیں۔ اللہ حافظ!

ان صفحات کے لیے آپ کی قیمتی آرا کا انتظار رہے گا۔

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

سالگرہ کا اہتمام

شائستہ زریں

چھوٹی چھوٹی خوشیاں زندگی کو کتنا حسین بنا دیتی ہیں اس کا احساس اس وقت شدت سے ہوتا ہے جب ہمارے قریبی عزیز، دوست احباب سب بلاکسی غرض کے ہماری خوشی میں شریک ہو کر اس کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں۔ نوعیت خواہ کوئی بھی ہو خوشی بغیر اہتمام کے منائی نہیں جا سکتی، بالخصوص اپنے جنم دن کی خوشی تو ہر ایک کو ہوتی ہے، بس اس خوشی کے اظہار کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اپنے جنم دن کے موقع پر بعض لوگ بہت اہتمام کرتے ہیں، بعض بالکل ہی بے نیاز ہوتے ہیں، کسی بھی قسم کے عملی اہتمام کو ضروری نہیں سمجھتے اور بعض لوگ اس لیے بھی مطمئن رہتے ہیں کہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ان کے چاہنے والے ان کے جنم دن کا اہتمام ان سے زیادہ خوش اسلوبی سے کرلیں گے۔

اپنے جنم دن کے موقع پر آپ کیا اہتمام کرتی ہیں، یہ جاننے کے لیے ہم نے پاکیزہ کے سالگرہ نمبر 2 کے لیے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کیا ہے۔

راحیلہ فردوس

(سابق نیوز کاسٹر پی ٹی وی، نعت خواں۔ نیوجرسی)

میری سالگرہ کا اہتمام ...... مجھ سے بڑھ کر میرے گھر والے اور دوست احباب کرتے ہیں۔ رات بارہ بجے سے کچھ پہلے ہمارے گھر میں اندھیرا چھا جاتا ہے اور پُر اسرار سرگرمیوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور پھر رات کے بارہ بجتے ہی جہاں کیلنڈر کی تاریخ بدلتی ہے وہاں ہمارا سارا گھر روشن ہو جاتا ہے اور پھر کیک کاٹا جاتا ہے مجھے تحائف دیے جاتے ہیں۔ یہ اہتمام میرے بچے اپنے والدِ محترم کے ساتھ مل کر کرتے ہیں۔ اس کے



راحیلہ فردوس

علاوہ ہر سالگرہ پر میرے لیے کچھ نہ کچھ سرپرائز ہوتا ہے۔ چھوٹا بیٹا میرے لیے کمپیوٹر سے پیارے پیارے کارڈ نکالتا ہے۔ ایک سالگرہ پر اس نے کارڈ پر میری تصویر بنائی تھی۔ میری بیٹی نے میرے لیے نظم کہہ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ میرے بچوں کی یہ تخلیقی کاوشیں میرے لیے بیش قیمت سوغات ہیں۔ میرے شوہر مجھے میری پسند کا پرفیوم دیتے ہیں۔ سالگرہ کی صبح ان کی جانب سے سالگرہ کا خاص الخاص تحفہ ملتا ہے یعنی ناشتا جو وہ مجھے ہر سالگرہ پر خود اپنے ہاتھ سے بنا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد میری کسٹمرز اور

فرینڈز مجھے وش کرتی ہیں۔ قریبی فرینڈز میرے لیے پھولوں کے تحائف لاتی ہیں، وہ جانتی ہیں کہ پھولوں کی مہک مجھے بہت بھاتی ہے۔ ان کی آمد میرے لیے ہمیشہ اچانک اور خوشگوار ہوتی ہے۔ اگر میری سالگرہ چھٹی کے دن آ جائے تو VIP ٹریٹمینٹ کے لیے ہم کہیں باہر ضرور جاتے ہیں۔ ریسٹورنٹ کا کھانا سالگرہ کا لطف بڑھا دیتا ہے۔

ربیعہ اکرم

(پروگرام منیجر ریڈیو پاکستان کراچی)

میری سالگرہ 13 اگست یعنی وطنِ عزیز کی سالگرہ سے ایک دن پہلے آتی ہے لہٰذا ملک بھر میں



ربیعہ اکرم

سبز ہلالی پرچموں کی بہار اور عمارتوں میں چراغاں ہوتا ہے۔ جس سے میری خوشی بڑھ جاتی ہے۔ میں اپنی سالگرہ پر نیا سوٹ ضرور پہنتی ہوں۔ بقیہ اہتمام میرے شوہر اور بچے کرتے ہیں۔ اتفاق سے گزشتہ تین سال سے میری سالگرہ رمضان میں آ رہی ہے اس لیے میرے بچے وفا اور فیضی اسپیشل افطاری تیار کرتے ہیں، مجھے کچن میں جانے کی اجازت تک نہیں دیتے۔ کیک کا اہتمام ضرور ہوتا ہے جو اکرم ارینج کرتے ہیں، بہت سے تحائف ملتے ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ انتظار اپنے شوہر کے تحفے کا رہتا ہے جسے پا کر ہمیشہ مجھے دلی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ایک سالگرہ پر اکرم نے موبائل گفٹ کیا تھا۔ جب میں FM101 میں ہوا کرتی تھی تو میرے لسنرز اور کالرز مجھے بہت پیارے، پیارے کارڈز اور SMS بھیجا کرتے تھے، بے شمار کالز آتیں۔ دفتر کے دیگر ساتھی بھی میری سالگرہ مناتے تھے ڈی جیز مل کر میرے لیے کیک لاتے۔ بے پایاں محبتیں اور خلوص مجھے ناقابلِ بیان مسرت سے سرشار کر دیتے ہیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ ہر سال 13 اگست کو مجھے اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

نصرت حارث

(ہوسٹ پروگرام صبح نو پی ٹی وی نیوز کراچی مرکز)

ہر سال مختلف لوگوں کے ساتھ سالگرہ کے موقع پر تین چار کیک تو کٹ ہی جاتے ہیں، میری سالگرہ 18 نومبر کو آتی ہے جو 17 سے 19 نومبر تک منائی جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنی سالگرہ کا اہتمام میں نہیں کرتی۔ گھر والے، آفس والے،



نصرت حارث

دوست احباب مختلف وقتوں میں سالگرہ مناتے ہیں۔ سب سے پہلے 17 نومبر کی شب میاں اور

بچوں کی طرف سے کیک کٹتا ہے جس کا اہتمام بھی وہی کرتے ہیں اس کے بعد فون کالز اور sms کی صورت میں مبارکباد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو رات گئے تک جاری رہتا ہے 18 نومبر کو آفس میں کیک کٹتا ہے اور اہتمام بھی ان لوگوں کا ہی ہوتا ہے اور میں بے لوث محبتوں، پھولوں اور تحائف کے حصار میں ناقابل بیان خوشی محسوس کرتی ہوں۔ شام کو گھر پر قریبی عزیزوں کی موجودگی میں کیک کٹتا ہے۔ 19 نومبر تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اپنی شادی کی سالگرہ کا اہتمام میں خاص طور پر کرتی ہوں لیکن وہ ''خالص پرسنل گیدرنگ'' ہوتی ہے۔ جس میں ہم دونوں اور بچے ہوتے ہیں۔ ہمارے درمیان تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے اور ہم خاص طور پر باہر کھانا کھانے جاتے ہیں۔ بہت خاص اہتمام میں اپنے شوہر اور بچوں کی سالگرہ کا کرتی ہوں اور کوئی نہ کوئی سرپرائز ضرور رکھتی ہوں مثلاً شوہر کی سالگرہ پر بچوں کی طرف سے ان کے لیے کوئی نہ کوئی سرپرائز گفٹ ضرور لیتی ہوں۔ بچوں کی طرف سے انہیں sms بھیجتی ہوں۔ بیٹا فرمائش کر کے اپنی پسند کے تحفے لیتا ہے جس پر ان کی چھوٹی بہن بھی حق جتاتی ہیں اکلوتی بہن جو ٹھہریں۔

ڈاکٹر رفیعہ رفیق

(ڈینٹل سرجن ۔ ہوسٹ مارننگ شو۔ میٹرو ون)

اپنی سالگرہ کا میں کوئی اہتمام نہیں کرتی گھر والوں اور دوستوں کے ہوتے ہوئے مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ امی کا تحفہ اور اہتمام دونوں ہی بہت خاص ہوتے ہیں خاص کر وہ کیک جو امی خود میرے لیے بناتی ہیں اس کا تو جواب ہی نہیں۔ سالگرہ کا لطف بڑھ جاتا ہے امی کا بنایا کیک کھا کے۔ دنیا میں میرے والدین کے بعد میرے دوست ہی میرے لیے سب سے بڑی نعمت ہیں۔ میرے دوست عموماً سالگرہ پر مجھے سرپرائز دینے کے لیے کچھ نہ کچھ پلان



ڈاکٹر رفیعہ رفیق

کرتے ہیں جو ہمیشہ بہت انوکھا، پیارا اور میری سالگرہ کی خوشی دوبالا کرنے والا ہوتا ہے۔ مثلاً گزشتہ برس میں اپنے کلینک میں مصروف تھی کہ اچانک میرے دوستوں نے دھاوا بول دیا۔ تمام دوست سالگرہ کا گیت گاتے بہت سے غبارے اور کیک لیے کلینک میں داخل ہوئے تو میرے ساتھ میرے مریض بھی خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ کیک کاٹا گیا، غبارے پھاڑے گئے، خوب ہلا گلا کیا۔

ماورا

(ٹی وی آرٹسٹ)

میری سالگرہ 28 ستمبر کو آتی ہے اور میں اس کا اہتمام بہت زور شور سے کرتی ہوں۔ سالگرہ کے لیے خاص ڈریس بنواتی ہوں جو عموماً میری خالہ جرمنی سے بھیجتی ہیں اور کبھی میں یہاں سے اسپیشل ڈریس تیار کرواتی ہوں۔ کسٹمرائز کیک بنواتی ہوں۔ پچھلے سال جب میں 19 سال کی ہوئی تو میں نے پرپل کلر کا کیک بنوایا تھا، اس سال چونکہ میں پورے 20 سال کی ہوگئی تو مجھے اس کی بہت خوشی تھی اس لیے میں سالگرہ کا انتظار بھی بہت پہلے سے کر رہی تھی۔ اس سالگرہ پر میرے دوستوں نے مجھے زبردست سرپرائز دیا اور ''میں گنہگار نہیں'' کے سیٹ پر میرے لیے



ماورا

سرخ رنگ کا کسٹمرائز کیک لے کر آئے۔ خوب ہلا گلا ہوا میرے ڈائریکٹر صاحب بھی موجود تھے۔ بابر جاوید صاحب اور دیگر لوگ بھی تھے سب نے بہت انجوائے کیا، اس سے قبل جیو کے مارننگ شو میں مجھے سرپرائز دیا گیا۔ میری سالگرہ منائی میرے دوستوں کو مدعو کیا، جنید خاص طور پر لاہور سے آیا تھا پروگرام میں شرکت کرنے۔ اپنی بیسویں سالگرہ پر میں جتنی ایکسائٹڈ تھی اتنی ہی اللہ نے مجھے خوشیاں بھی دیں، مما نے بھی گھر میں سالگرہ کا اہتمام کیا سب نے تحائف دیے بہت مزہ آیا اور ہمیشہ کی طرح سب سے زیادہ اچھا تحفہ میری بہن عروہ نے دیا۔ اور مما کی دعاؤں کا تو کوئی مول ہی نہیں ہے۔ میرے تمام چاہنے والوں کی دعاؤں اور پیار کا بہت شکریہ۔

فاطمہ تنویر

(طالبہ میڈیکل)

سالگرہ کا دن ہر انسان کے لیے خاص موقع ہوتا ہے کیونکہ اس روز وہ سب کے لیے سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ زندگی کا ایک سال کامیابی سے گزر چکا ہوتا ہے اور آئندہ سال کے لیے وہ پُرامید ہوتا ہے کہ آنے والا سال بھی کامیابیاں اور خوشیاں لے کر آئے گا، اسی احساس کے تحت میں اپنی سالگرہ کا اہتمام نہایت زور شور سے کرتی ہوں۔ جس میں دوستوں اور رشتے داروں دونوں کو شامل کرتی ہوں اور سب سے تحائف وصول کر کے بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ دوپہر کو اپنی دوستوں کو لنچ کے لیے لے جاتی ہوں وہاں ہم بہت انجوائے کرتے ہیں رات کو امی گھر پر ڈنر پر کزنز کو مدعو کرتی ہیں اور ہم سب مل کر



فاطمہ تنویر

بہت ہلا گلا کرتے ہیں۔ یوں تو امی کھانے میں بہت کچھ اہتمام کرتی ہیں لیکن میری خصوصی فرمائش پر ''لزانیہ'' ضرور بناتی ہیں جسے اس روز کھانے میں جو لطف آتا ہے وہ سال کے اور کسی دن کھانے میں نہیں آتا۔ جب تک میری مومو خالہ (نیلوفر عباسی) پاکستان میں تھیں میری سالگرہ کے اہتمام میں پیش، پیش رہتی تھیں۔ اب بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں سب سے پہلے بارہ بجے شب مومو خالہ اور ان کے بچوں ہی کا فون نیویارک سے آتا ہے مجھے وش کرنے کے لیے۔ مومو خالہ میری ہر سالگرہ پر مجھے میری پسند کا سرپرائز گفٹ بھیج کر میری سالگرہ کی خوشی میں کئی گنا اضافہ کر دیتی ہیں، آپ کی محبتوں کا بہت شکریہ مومو خالہ۔

یسریٰ مرسلین

(طالبہ ایم بی اے)

اپنی سالگرہ کے دن غالباً ہر ایک کی خواہش یہ ہوتی



یسریٰ مرسلین

ہے کہ اسے خصوصی توجہ دی جائے، وہ سب کی آنکھ کا تارہ ہو اور اس کی خواہشات بن کہے پوری ہو جائیں، کچھ یہی کیفیت میری بھی ہوتی ہے اور میری خوش بختی کہ یہ خوشی میرے حصے میں آتی بھی ہے یہی وجہ ہے کہ اپنی سالگرہ والے دن میں خود کو کسی شاہزادی سے کم نہیں سمجھتی۔ اس دن میں جتنی مصروف اور اپنے خاندان اور حلقۂ احباب میں جتنی مشہور ہوتی ہوں اتنا تو امریکا کا صدر بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ ایک دن قبل بارہ بجے شب سے ہی جو دوستوں، کزنز اور دوسرے رشتے داروں کے فون، sms آتے ہیں تو صبح ہو جاتی ہے سب کا شکریہ ادا کرتے کرتے۔ سالگرہ کے دن دُہری خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ایک طرف میں اپنی دوستوں کے ساتھ سالگرہ کی بھرپور خوشی مناتی ہوں تو رات کو گھر میں رشتے داروں کی محبتیں اور تحائف سمیٹتی ہوں، امی اپنے ہاتھ سے میرے لیے میری پسند کی ڈشز بنا کر میری سالگرہ کا خاص اہتمام کرتی ہیں تو سالگرہ کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ یوں سالگرہ کے دن کے اختتام تک میں مصروف کے ساتھ معروف بھی ہو جاتی ہوں۔

نگہت آرا

(طالبہ بی بی اے)

سالگرہ کوئی اسلامی رسم نہیں ہے جس کو منایا جائے، خوشیاں منانے کے بہت سے دن ہیں۔ ہمارے خوب صورت تہوار ہیں اور کسی خاص ہی دن کیوں...... محبت کا اور خوشی کا ہر دن ہو سکتا ہے، ہمارے ہاں خوشیاں ڈھونڈی نہیں جاتیں بلکہ خوشیاں پیدا کی جاتی ہیں۔ جیسے آج میں لزانیہ بناؤں گی سب سہیلیوں کو بلا لیتے ہیں یا آج سب کو موسم گرما کا جوڑا گفٹ کرتے ہیں۔ رمضان اور عید کے مواقع پر جتنے بھی تحائف دیے جائیں وہ کم ہیں۔

دانیہ احمد



دانیہ احمد

(طالبہ ابلاغ عامہ)

سالگرہ کا دن محبت اور بھرپور طریقے سے منانا چاہیے۔ اپنی سالگرہ کے خیال ہی سے مجھے بے چینی شروع ہو جاتی ہے کہ یہ وہ خوش قسمت دن ہے جب میں نے دنیا میں آکر تصویرِ کائنات میں مزید خوب صورت رنگ بھر دیے تھے۔ اسی لیے میری سالگرہ کا دن جوں جوں قریب آتا ہے میری خوشی بڑھ جاتی ہے کیونکہ اپنی سالگرہ کی تیاری میں نہیں میرے بہت سے چاہنے والے کرتے ہیں اور حسبِ معمول میں ایک، ایک کو یاد دلاتی ہوں تیاری شروع کرو میری سالگرہ آنے ہی والی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ تیاری سب کرتے ہیں لیکن انجان بنے رہتے ہیں

خاص طور پر بھائی مجھے جی بھر کر ستائے بنا تیاری کرے یہ ممکن ہی نہیں۔ میری سالگرہ کا اہتمام امی، ابو ہمیشہ گھر پر ہی کرتے ہیں اور اس کا لطف ہی اور ہوتا ہے، امی، ابو اور بھائی میرے لیے زبردست پارٹی ارینج کرتے ہیں۔ ایسے میں میری دوستوں کے آنے کے بعد خوب ہلا گلا ہوتا ہے۔ دوستوں کی جانب سے ملنے والے تحائف بھی ان کی اور بھی میری پسند کے ہوتے ہیں۔ چونکہ مجھے چائنیز بہت پسند ہے اس لیے امی خاص طور پر میرے لیے چائنیز بناتی ہیں اور بھائی میری اس خوشی میں مجھ سے بڑھ کر حصہ لیتا ہے اور زبردست گفٹ دے کر میری سالگرہ کی خوشیوں کو دوبالا کر دیتا ہے۔ گھر والے نہایت محبت سے میری سالگرہ کا اہتمام کر کے میرا مان بڑھا دیتے ہیں یوں میری ہر سالگرہ میرے لیے بہت اہم اور یادگار بن جاتی ہے۔ اسی لیے تو میں اپنی سالگرہ کا انتظار سالگرہ ختم ہوتے ہی شروع کر دیتی ہوں۔

زویا عامر

(طالبہ)

میری سالگرہ 18 ستمبر اور مما کی 15 ستمبر کو آتی ہے اور ہم 16 ستمبر کو مشترکہ سالگرہ مناتے ہیں لیکن کسی بہت بڑی تقریب کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ بس رات کو کھانا فیملی کے ساتھ کسی پسندیدہ ریسٹورنٹ میں کھایا جاتا ہے۔ سالگرہ کا اہتمام خود بخود اس وقت ہو جاتا ہے۔ جب کبھی کبھی خالہ اپنی فیملی کے ساتھ اچانک آکر ہمارا موڈ خوشگوار کر دیتی ہیں اور یہ مسرت مزید بڑھ جاتی ہے جب خالہ اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا کیک اور کوکیز وغیرہ ساتھ لے آتی ہیں ان کے بچے بھی اپنے ہاتھوں سے بنے ہوئے گفٹ جیسے فلاور، بیگز یا بینگلز وغیرہ لے آتے ہیں، میرا چھوٹا بھائی بھی پوری کوشش کرتا ہے کہ مجھے اور مما کو ہماری پسند کے مطابق تحفے دے۔ ایک مرتبہ ہم مال میں تھے ہمارا پارلر جو اسی مال میں ہے ہمیں وہاں چھوڑ کر



زویا عامر

بھائی ہمارے لیے گفٹ لینے گیا اور ہمارے لیے نیل پالش لے آیا اور خوشی کی بات یہ تھی کہ وہ بالکل ویسا ہی..... کلر تھا جیسا کہ مما عام طور پر لگاتی ہیں، ہمیں حیرت اور خوشی ہوئی کہ دس سال کا بچہ ایسا تحفہ لایا جو نہ صرف ہماری پسند بلکہ ہمارے استعمال کا بھی تھا۔ اس مشترکہ سالگرہ کی خاص بات یہ ہے کہ مما کا گفٹ ہمیشہ میرے گفٹ سے بازی لے جاتا ہے۔ مما اور ان کی ممتا زندہ باد۔ جہاں تک دوستوں کی بات ہے تو ان کا تو اپنا ہی طریقہ ہے کہ گفٹ دینا تو دور کی بات خود دعوت مانگ کر کھاتے ہیں، اسی طرح ہنسی مذاق میں یہ دن گزر جاتا ہے۔

قارئین: کتنا بھلا لگتا ہے ناں جب خوشی ہماری ہو اور اہتمام ہمارے اپنوں کی جانب سے ہو۔ بالخصوص جنم دن کے خاص موقع پر جب ہمارے اپنے ہماری خوشی میں ہم سے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اپنوں کی جانب سے ملنے والی یہ سالانہ سوغات ہمارے لیے قیمتی اثاثہ اور آنے والے کل میں ماضی کی وہ خوشگوار یاد جس کا تصور ہمیں ہمیشہ خوشی سے سرشار رکھے گا۔ ایسے میں دل سے یہی دعا نکلتی ہے خدا اس محبت کو آباد رکھے، آمین!





بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ!

☆ حمد وستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود وسلام حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ پیاری بہنو! آپ سب کی تہ دل سے ممنون ہوں کہ پاکیزہ کا سالگرہ نمبر ایک آپ کے معیار پر پورا اترا اور پاکیزہ محل کی شہزادیوں سے مل کر سب کو ہی خوشی ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ہونی ہی تھی کہ وہ عام شہزادیوں سے کہیں ارفع واعلیٰ شہزادیاں ہیں بلکہ قلم کی اصل ہیروئن ہیں اور اب آیئے ایک بہن کے فون کی جانب ہماری ایک قاری بہن نے اپنا مسئلہ ہم سے شیئر کیا تو ہمیں لگا کہ ایسے مسائل ہمارے اکثر گھروں میں بھی موجود ہیں۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کو جب اس کی طرح تعلیم یافتہ بر نہیں ملتا یا اس کے مقابلے میں کم ہوتا ہے تو وہ شادی سے ہی انکار کردیتی ہے۔ کیا اس کا یہ اقدام صحیح ہے یا غلط اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہوں گی کہ اب وہ وقت نہیں رہا ہے کہ کسی لڑکی کی شادی زبردستی کردی جائے یا اس کی پسند ناپسند کو اہمیت ہی نہ دی جائے مگر صرف اتنا کہوں گی کہ جب ایک مرد اپنے سے کم تعلیم یافتہ لڑکی سے خوشی، خوشی شادی کرلیتا ہے تو ایک لڑکی اپنے سے کم تعلیم یافتہ شخص سے شادی کیوں نہیں کرسکتی۔ اس دور میں لڑکے، لڑکیاں دونوں کما رہے ہیں زیادہ تر اب اگر لڑکے کی تعلیم یا اس کی جاب لڑکی کے مقابلے میں کم بھی ہے تو اس میں کوئی برائی تو نہیں ہے۔ ہاں اگر لڑکا اخلاقی لحاظ سے کم ہے، کردار کے حوالے سے پست ہے تو وہ بے شک کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو کتنا ہی صاحب حیثیت کیوں نہ ہو اسے ری جیکٹ کیا جاسکتا ہے لیکن صرف تعلیم اور جاب کی وجہ سے مسترد کردینا میرے خیال سے کوئی عقل مندی نہیں ہے۔

☆ پیاری بہنوں گزشتہ ماہ پاکیزہ محل میں آپ کی شہزادیوں سے تو ملاقات ہوئی تھی اب آپ آجائیں پاکیزہ محل کی بارہ دری میں۔ یہاں خوب صورت باغ کے ساتھ ساتھ دونوں جانب نہریں بھی چل رہی ہیں اور یہاں ہنستی مسکراتی جو راج کماریاں نظر آرہی ہیں وہ سب پاکیزہ کی تبصرہ نگار ہیں یا کسی نہ کسی حوالے سے پاکیزہ سے جڑی ہوئی ہیں۔

☆ آیئے سب سے پہلے جس شہزادی سے ہم آپ کی ملاقات کروائیں گے انہیں لمبی شہزادی بھی کہہ سکتی ہیں۔ جی ہاں ڈاکٹر ممتاز ضیا کا قد چھ فٹ کے قریب، قریب تو ہوگا۔ بے حد سادہ مزاج کی ہیں، جس وقت بھی فون کریں پہلے یہ پوچھتی ہیں کہ انجم تم مصروف تو نہیں ہو، کیا میں بات کرسکتی ہوں۔ اپنے تبصروں میں دوستیاں نہیں نبھاتی بلکہ ان کا تبصرہ بے لاگ ہوتا ہے اور اکثر مصنفات کی تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ ڈاکٹر ممتاز ان کے افسانے کے بارے میں رائے دیں۔

☆ یہ ہنستی مسکراتی خوب صورت سی خاتون بے حد گورے رنگ کی مسز عظمیٰ خورشید ہیں۔ شوہر اور پھر جوان بیٹے کی رحلت کے بعد وہ ٹوٹ کر رہ گئی ہیں مگر پاکیزہ اور مجھ سے رابطے میں رہتی ہیں۔ عمیرہ احمد کی دل سے عاشق ہیں، ان کے تبصرے کھرے ہوا کرتے ہیں۔

☆ شہزادی صفیہ بیگم جب لالہ موسیٰ سے مجھے فون کرتی ہیں تو سب سے پہلے سارے گھر کی فرداً فرداً خیریت پوچھتی ہیں اور پھر اپنی خیریت بتاتی ہیں۔ مجھے ان کے بھانجوں کی باتیں سن کر خوشی ہوتی ہے جو وہ اپنی خالہ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ انہیں اپنے پاس جرمنی بلا کر وہاں کی سیر تک کروانا چاہتے ہیں۔ صفیہ چونکہ گڑ کی ڈلی ہیں اس لیے سب لوگ ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔

☆ شہزادی عرشیہ جنید اب فون کم کرتی ہیں تبصرے آنے بھی کم ہوگئے ہیں مگر تقریبات میں اکثر ملاقات ہوجاتی

ہے۔ جتنی خوب صورت ان کی ہنسی ہے اتنی ہی خوب صورت وہ خود بھی ہیں۔ کپڑے بھی خوب صورت پہنتی ہیں۔ اکثر ہم سے کہتی ہیں کہ اگر ان کے گھر جاؤں تو وہ برنس روڈ کے دہی بڑے کھلائیں گی مگر کہیں جانا کہاں آسان ہے میرے لیے۔

☆ اور یہ دبلی پتلی نازک سی بوٹے سے قد والی شہزادی جو خراماں خراماں چلی آرہی ہیں یہ شائلہ سہیل جاوید ہیں۔ یہ شاعرہ بھی ہیں اور پاکیزہ کی تبصرہ نگار بھی ہیں، ان کی باتیں بھی بڑی محبت بھری ہوتی ہیں۔

☆ اب جس شہزادی کی باری ہے اسے محکمۂ انفارمیشن میں کسی اچھی پوسٹ پر ہونا چاہیے۔ کوئی بھی رائٹر کسی بھی چینل پر نظر آجائے زریں زبیر کا فون اسی لمحے میرے پاس آجائے گا۔ انجم باجی اس وقت شیریں حیدر آئی ہوئی ہیں۔ نیلوفر عباسی باتیں کررہی ہیں وغیرہ وغیرہ یہ ہماری میمن بہن بے حد محبت کرنے والی ہیں۔

☆ شازیہ صدیقی بھی سینئر تبصرہ نگار شہزادی ہیں مگر کافی عرصے سے لاپتا ہیں۔ یہ سطور پڑھ کر فوراً آجائیں ان کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔

☆ شہزادی سویرا فلک اپنی شادی سے پہلے پاکیزہ میں خوب ان تھیں اور اب آؤٹ ہیں۔ ظاہر ہے بچے اور میاں کو سنبھالنا فل ٹائم جاب ہے۔

☆ شہزادی فرزانہ مسعود راولپنڈی میں افشاں کالونی میں رہتی ہیں۔ سرخ وسفید رنگت والی کشمیری شہزادی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ تبصرے بھی باقاعدگی سے آتے تھے اور فون بھی اب دونوں ہی غائب ہیں، کیا بات ہے فرزانہ، خیریت سے تو ہو نا؟

☆ شہزادی نجمہ ابراہیم داؤد پہلے اسلام آباد میں رہا کرتی تھیں تو ان سے میل ملاقات رہا کرتی تھی مگر یہ جب سے منتقل گئی ہیں نہ تبصرے آرہے ہیں اور نہ ہی فون۔ ہاں نجمہ میں نے مارچ اور اپریل کے پاکیزہ تمہارے ایڈریس پر پوسٹ کرادیے ہیں مل جائیں تو بتا دینا۔

☆ شہزادی نرگس نسیم کچھ عرصہ پہلے بڑی باقاعدگی سے تبصرے بھیجا کرتی تھیں۔ اب یہ بھی غائب ہیں۔ یہ ہنستے ہوئے بات کرتی ہیں اور خاصی گاڑھی پنجابی میں بات کرتی ہیں اور میں ان کو ہلکی پھلکی پنجابی میں جواب دے پاتی ہوں۔

☆ شہزادی ناہید بنت نور واہ سیمنٹ ورکس میں رہتی ہیں۔ ایک مرتبہ ان سے ملاقات بھی ہوچکی ہے۔ بے حد دین دار لڑکی ہے۔ اتنی سادہ اور بھولی لڑکیاں کم کم ہی دیکھی ہیں جو سب کی تعریف کرتی ہیں اور سب سے بے انتہا محبت۔ ہاں ان کا تکیہ کلام نہیں جی ہے۔

☆ شہزادی فیروزہ بیگم سخت اور کھری تبصرہ نگار ہیں۔ اردو اور انگریزی دونوں میں لکھتی ہیں۔ ان کا زیادہ وقت عبادت کرنے میں گزرتا ہے۔ صبح تین بجے اٹھ جاتی ہیں مگر یہ ایسی شہزادی ہیں جو تمام رائٹرز اور تبصرہ نگار تو کیا قاری بہنوں تک کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں، ماشاء اللہ۔

☆ شہزادی نزہت اشفاق، کراچی میں رہتی ہیں۔ ان کے تبصرے بھی قدرے سخت ہوتے ہیں۔ بات چیت میں بے حد دھیمے مزاج کی ہیں۔ ہم سے تو بہت محبت کرتی ہیں۔ ان کی پسندیدہ مصنفہ ناہید سلطانہ اختر، قیصرہ حیات، سکینہ فرخ، شیریں حیدر اور ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی ہیں۔

☆ شہزادی رخسانہ امجد، پنجاب میں رہتی ہیں۔ اچھی تبصرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محبت کرنے والی لڑکی ہیں۔ بے حد جذباتی سی ہیں۔ جب خوش ہوتی ہیں تو جلدی، جلدی بات کرتی ہیں، ان کے بولنے کی رفتار 250 میل فی سیکنڈ کے حساب سے ہوگی۔

☆ شہزادی ذکیہ ایوب، کراچی کی رہائشی ہیں، پاکیزہ اور اس کی تمام مصنفات کی فین ہیں۔ لکھنے اور پڑھنے سے بے حد دلچسپی ہے ان کی فیملی میں ان کی بہو اور بیٹا شاہد بھی بے حد شوق ذوق سے پڑھتے ہیں۔ ذکیہ ایوب کا تبصرہ جاندار ہوتا ہے۔ وہ ہر تحریر کو اس کی خوبی وخامی کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ ذکیہ اسٹک کی مدد سے چلتی ہیں مگر اس کے

باوجود وہ مجھ سے ملنے آئیں، بے حد محبت کرنے والی خاتون ہیں اور بے حد دعائیں دینے والی۔ اللہ انہیں سلامت رکھے، آمین۔

☆شہزادی پروین افضل شاہین کے بارے میں دو رائے ہیں۔ پچاس فیصد بہنوں کا خیال ہے کہ یہ پروین کے شوہر افضل شاہین لکھتے ہیں، پچاس فیصد کا خیال ہے کہ یہ پروین خود لکھتی ہیں چونکہ یہ ہمیں پروین کے نام سے موصول ہوتے ہیں اس لیے ہم اول الذکر خیال کے حامی ہونے کے باوجود اسے پروین کا ہی سمجھا کرتے ہیں۔ وہ بڑی باقاعدگی سے تبصرہ ارسال کرتی ہیں۔ وہ وقت کا اتنا خیال رکھنے والی ہیں کہ ان کا بس چلے تو آئندہ ماہ کا شمارہ آنے سے پہلے بھی اس پر بھرپور تبصرہ ارسال کرسکتی ہیں۔ یہ تو خیر مذاق ہے مگر یہ شہزادہ یا شہزادی بے حد ایکٹیو ہے۔

☆شہزادی نور افشاں، شکارپور میں رہتی ہیں مگر بے حد ذہین اور ٹیلنٹڈ ہیں۔ سندھی طرز تحریر میں خط لکھا کرتی ہیں۔ لہجہ ایسا ہے جیسے شربت کے گلاس میں کوئی 20 چمچے چینی ڈال دے۔ تبصرہ اپنے منفرد انداز میں کرتی ہیں اور لطائف ایسے بھیجا کرتی ہیں جس کو پڑھ کر آپ کو کسی سے گدگدی کروانی پڑے گی۔

☆اب آیئے آکسفورڈ کی شہزادی سے ملتے ہیں۔ ان کا نام تانی چوہدری ہے۔ یہ سمپل سے تبصرے اور نظمیں ارسال کرتی ہیں اور بالکل ایسا ہی انداز نگینہ ضیا بنگش، نسرین خالد اور انجم گلزار کا ہوا کرتا ہے۔

☆شہزادی عنبر وسیم، گوجرانوالہ کی شہزادی ہیں۔ صفحے کے انتہائی بائیں جانب خط یا مراسلات لکھا کرتی ہیں۔ شروع کا صفحہ خالی رہتا ہے۔ تبصرے کے مقابلے میں مراسلات بہت اچھے ہوتے ہیں۔ تبصرہ لکھتے وقت شاید سنجیدگی سے کام نہیں لیتیں۔ یہ میرا خیال ہے جو ہوسکتا ہے کہ غلط بھی ہو۔

☆صائمہ شاہ یہ شہزادی راولپنڈی کی ہیں اور ہماری بہت پرانی تبصرہ نگار ہیں۔

☆یاسمین کنول، پسرور کی شہزادی ہیں اور اچھی شاعر ہونے کے ساتھ اچھی تبصرہ نگار بھی ہیں۔

☆شہزادی صائمہ سلیم اچھی تبصرہ نگار ہیں۔

☆شہزادی ردا حسین ہماری نئی تبصرہ نگار ہیں۔ دعا زہرہ بھی ہماری نئی تبصرہ نگار ہیں۔ نفیسہ آرا اور سعدیہ اسکاٹ لینڈ بھی ہماری نئی تبصرہ نگار ہیں۔ ہاں ثمینہ زاہد یہ شہزادی ہماری سینئر تبصرہ نگار ہیں۔

☆شہزادی نوشابہ رئیس کا تعلق لاہور سے ہے، وہ اور ان کی امریکا میں مقیم بیٹی ڈاکٹر عظمیٰ کم کم ہی اس محفل میں حاضر ہوتی ہیں۔ ہاں نوشابہ اب آپ کے شوہر کی طبیعت کیسی ہے؟ بہت دنوں سے آپ کا فون بھی نہیں آیا۔

☆منور شہزادی کو میں شہزادی نہ بھی لکھوں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ شہزادی تو ان کے نام کا حصہ ہے۔ ہماری یہ شہزادی لہجے میں ذائقہ بھر کر بات کرتی ہے اور تبصرہ صرف اپنی من پسند تحریر پر کرتی ہیں۔ شہزادی طلعت رانا، چیچہ وطنی بھی ایسی ہی ہیں۔

☆شہزادی مسرت خلیل کا تعلق کراچی سے ہے۔ بہت اچھے تبصرے بھیجتی ہیں اور وہ یا ان کی فیملی کا کوئی بھی فرد عمرے یا حج کے لیے جائے، ہمارے لیے اور پاکیزہ میں شامل تمام مصنفات اور قارئین بہنوں کے لیے دعا کیا کرتا ہے۔ جس کے لیے میں ان کی واقعی احسان مند ہوں اور ایسی ہی ایک پیاری تبصرہ نگار حال ہی میں پاکیزہ محفل میں شامل ہوئی ہیں۔ اس شہزادی کا نام شہزادی افشین شاہد ہے جو جدہ میں رہتی ہے اور اپنے ہر عمرے اور طواف میں مجھے اور پاکیزہ بہنوں کو یاد رکھتی ہیں۔ سمیرا حمید فاروق بھی بے حد سادہ اور محبت کرنے والی شہزادی ہیں جو اکثر تبصرے کرتی ہیں اور اپنا موقف خوبی سے بیان کرتی ہیں۔

☆شہزادی شمع حسین تو واقعی میں شہزادی ہیں۔ جب دل چاہتا ہے تبصرہ کرتی ہیں اور جب دل نہیں چاہتا نہیں کرتیں۔ شمع کی یادداشت بہت شاندار ہے اگر کوئی رائٹر اپنا 25 سال پرانا افسانہ دوبارہ دے دے تو شمع فوراً مجھے بتاتی ہے کہ یہ فلاں جگہ شائع ہوا ہے۔

☆شہزادی روبینہ اسلم، لیاری کی معروف شخصیت ہیں۔ لوگوں کے کام آنا ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ تبصرے تو

زیادہ شائع نہیں ہوتے، ہاں ان کے ایس ایم ایس میرے پاس بہت آتے ہیں۔ کبھی ملاقات نہیں ہوئی مگر ان سے باتیں کر کے لگتا ہے کہ بے حد دین دار اور نیک خاتون ہیں لہجہ بھی دعائیہ ہوتا ہے۔

☆ڈاکٹر راضیہ فوجدار سے میری ملاقات مکے میں حرم شریف میں ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ بہت بیمار تھیں مگر ان سے ایک ٹیلی فونک رابطہ رہتا تھا جو کئی سالوں سے منقطع ہے۔ راضیہ شہزادی اپنی خیریت سے مجھے آگاہ کرو۔

☆شہزادی صاعقہ ریاض کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ تبصرے اور شاعری دونوں حربے کی کرتی تھیں اب گم شدہ ہیں ڈھونڈ کرلانے والے کو ان کی نظمیں سنائی جائیں گی۔

☆شہزادی شمیم ناز صدیقی اچھی تبصرہ نگار، اچھی شاعرہ ہیں۔ ایک طویل عرصے تک رابطے میں تھیں مگر اب غیر حاضر ہیں۔

☆شہزادی صدف رضوان، اسلام آباد میں ہوا کرتی تھیں، بہت خوب صورت لکھائی ہے۔ ان کے تبصرے بڑے جامع ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب فائزہ افتخار چندا اور صائمہ اکرم کے تبصروں کا ڈنکا بجا کرتا تھا۔ پیاری صدف دوبارہ رابطہ کرو۔

☆شہزادی گلشاد نذیر من موجی شہزادی ہے۔ جب دل چاہے گا تبصرہ لکھے گی مگر ابھی گلشاد سے حال ہی میں ملاقات ہوئی ہے۔ یہ مری میں رہتی ہیں۔ گزشتہ دنوں میں اپنی بھتیجی کی شادی میں اسلام آباد گئی تو ان کا اصرار تھا کہ میں مری ضرور آؤں۔ میں نے کہا کہ شادی کے گھر سے نکلنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ تو یہ شہزادی مری سے اسلام آباد آئی۔ ایک گھنٹے میرے پاس رکی اور واپس مری چلی گئی۔ سارا وقت اپنے سسرال والوں کی تعریفیں کرتی رہی۔ جو اس کے شوہر کے انتقال کے بعد اس کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ ہمیشہ خوش رہو، آمین۔

☆شہزادی قیصر قدیر کینیڈا میں رہتی مگر پاکیزہ اور ہم سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ ان کے تبصرے بھی خوب کھرے ہوتے ہیں۔ قیصر کی پسندیدہ مصنفہ رفعت سراج اور ذکیہ بلگرامی ہیں۔

☆شہزادی یاسمین رشید کے تبصرے تو بہت زیادہ شائع نہیں ہوئے مگر ان سے بات چیت زیادہ رہتی ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والی ہیں۔ بے حد ایکٹیو اور اپنی پیاری عادات کی وجہ سے دوستوں کے دل میں گھر کرنے والی ہیں۔

☆شہزادی شائستہ اعجاز کے بھی تبصرے بہت زیادہ شائع نہیں ہوئے مگر وہ رابطے میں رہتی ہیں اور ان سے باتیں کر کے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ انہیں لکھنے اور مطالعہ کرنے کا شوق زمانۂ طالب علمی سے رہا ہے اس لیے یہ کبھی بھی دھماکا کرسکتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ یہ کبھی بھی کہیں بھی ایڈیٹر یا افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھر سکتی ہیں۔

☆شہزادی سائرہ سعید، جرمنی میں رہتی ہیں۔ اپنے طالب علمی کے دور سے شادی ہونے تک باقاعدگی سے پاکیزہ میں تبصرے اور اپنی نظمیں بھیجتی رہیں۔ اب سال میں ایک آدھ مرتبہ بھیج دیتی ہیں اپنے گھر کی مصروفیات اور بچوں میں انہیں وقت ہی نہیں ملتا مگر آج میں تمہیں پکار رہی ہوں کہ سائرہ واپس آجاؤ۔

☆شہزادی شمسہ الماس، ناروے میں رہتی ہیں اور انہیں اعزاز حاصل ہے کہ پاکیزہ میں رجسٹر کے 85 صفحات کا طویل ترین تبصرہ لکھ کر بھیجا تھا۔ شاعری بھی ٹھیک ٹھاک کرلیتی تھیں مگر اب تین بیٹوں کی ماما بن جانے کے بعد ان کا زیادہ وقت بچوں کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا ہے۔ اب تبصرے کم کم آتے ہیں۔ شمسہ اس محفل میں پہلے کی طرح ان رہا کرو ناں۔

☆شہزادی عذرا کنول کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے ہے۔ بہت ٹرسٹ کرتی ہیں مجھ پر۔ اپنے دل کی ہر بات مجھ سے کرتی ہیں۔ عذرا باقاعدگی سے ہمیں تبصرے بھیجتی ہیں جو بے حد طویل ہوتے ہیں اور انہیں لگانے سے پہلے ہمیں تبصرے کا چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑتا ہے۔

☆شہزادی ارم احتشام ان دنوں ملتان میں ہوتی ہیں۔ انہیں پاکیزہ اور ہم سے بے حد پیار ہے۔ ان کی پسندیدہ مصنفہ ناہید سلطانہ اختر ہیں۔ یہ پاکستان کے مختلف شہروں میں گھومتی رہتی ہیں کہ بریگیڈیر کی بیگم ہیں مگر ان کے تبصرے ہمیں وقتاً فوقتاً ملتے رہتے ہیں ان کے تبصرے قدرے کھٹے ہوتے ہیں۔

☆ ڈاکٹر شازیہ جمال کے تبصرے ان کے موڈ کے حساب سے آتے ہیں۔ ہم ان کو ڈاکٹر اس لیے کہتے اور لکھتے ہیں کہ یہ معروف سرجن ڈاکٹر جمال الدین کی بیگم ہیں مگر دورانِ گفتگو اس قدر ادویات تجویز کرتی ہیں کہ مجبوراً ہم نے ان کو بھی ڈاکٹر شازیہ کہنا شروع کر دیا ہے۔ بے حد پیاری شخصیت ہیں جوان بچوں کی ماں کے اندر ایک نٹ کھٹ اور شوخ لڑکی چھپی ہوئی ہے۔

☆ شہزادی قمر جہاں خلیل بڑے جاندار تبصرے لکھتی ہیں۔ پروفیسر صاحبہ اس وقت سے لکھ رہی ہیں جب وہ سرسید گرلز کالج میں پڑھایا کرتی تھیں۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد ان کے تبصرے باقاعدگی سے تو نہیں آتے مگر آتے رہتے ہیں۔ بے حد دھیمے مزاج کی خاتون ہیں۔ ان سے ہماری دوستی ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے توسط سے ہوئی تھی۔

☆ قمر شمس الحق یہ ہمارے جھنگ کی شہزادی ہیں۔ ان کے تبصرے باقاعدگی سے آتے ہیں اور بے حد تفصیلی آتے ہیں۔ فون پر بھی بات ہوتی رہتی ہے۔ بے حد نفیس سی خاتون ہیں۔

☆ سمیرا مجاہد، یہ شہزادی بہت محبت کرنے والی ہے۔ اس کا لہجہ دعائیہ ہوتا ہے۔ پاکیزہ پہلے ان کی امی کے گھر آتا ہے پھر وہاں سے ان کے گھر اس لیے تبصرہ بھیجنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ اس شہزادی کے لہجے اور تبصروں میں مٹھاس ہی مٹھاس ہوتی ہے اور یہی انداز عائشہ خالد کا ہوتا ہے۔

☆ ڈاکٹر شہلا عامر یہ شہزادی تو حقیقی زندگی میں بھی شہزادی ہیں۔ ڈاکٹر عشرت العباد کی بھاوج ہیں۔ اپنے گھر کی آئے دن کی تقاریب میں ہمیشہ مدعو کرتی ہیں مگر مجھ جیسی کہیں نہ جانے والی ان سے ہمیشہ معذرت ہی کرتی ہے۔ بے حد پیار سے بات کرتی ہیں لہجہ کسی براڈ کاسٹر کا سا ہے اور دیکھنے میں ہیروئن سی لگتی ہیں۔ ہاں پاکیزہ کی بہنوں کی محفل کو پاکیزہ کی فیس بک کا نام شہلا نے ہی دیا تھا۔

☆ شہزادی نوخیز انجم جب تک پاکستان میں تھیں ان کے تبصرے اور شاعری باقاعدگی سے آتی رہی مگر جب وہ لندن شفٹ ہو گئیں تو ان کی ڈاک آنا بند ہو گئی۔ نوخیز تم اپنی تحریریں بذریعہ فیکس بھی بھیج سکتی ہو۔

☆ شہزادی رفعت مبین رفی ہماری باقاعدہ تبصرہ اور مراسلہ نگار ہیں۔ ان دنوں وہ امریکا میں ہیں۔ اس لیے ان کی غیر حاضری لگ رہی ہے۔ رفعت ہم تمہاری کمی محسوس کر رہے ہیں وہاں سے اپنے تبصرے بھیجو۔

☆ شہزادی زینیا حسن پہلے شہزادی ثروت کے نام سے لکھا کرتی تھیں اور یہ بیوٹی کلینک کی انچارج ہوا کرتی تھیں بعد میں تبصرے لکھنے شروع کیے اور اب جوان بیٹی کے انتقال کے بعد وہ سب کچھ بھول گئی ہیں۔ پیاری زینیا اپنے آپ کو سنبھالو اور دوبارہ لکھنے کی جانب آؤ۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔

☆ نیر خان شہزادی، تم تبصرے بھی کڑوے بھیجتی ہو اور مراسلے بھی، افسانے خاصے بہتر ہوا کرتے تھے۔ شادی کی اطلاع دی تھی تو وقفہ پڑا تھا پھر بیٹے کی اطلاع تو وقفہ بڑا ہو گیا اب ماشاء اللہ آبادی کہاں تک پہنچی؟ پڑھنے لکھنے کی فرصت ملتی ہے یا نہیں؟

☆ شہزادی افشاں کوثر، ملیر آخری مرتبہ تم نے فون پر بات کی تھی۔ وہ بات مجھے یاد ہے مگر گڑیا تم تو بہت خوب صورت تبصرے لکھا کرتی تھیں وہ لکھنے کیوں چھوڑ دیے چلو جلدی سے آجاؤ، میں انتظار کر رہی ہوں۔

☆ شہزادی مہ جبیں شہزاد غالباً پی آئی بی کالونی کراچی سے مجھے تبصرے ارسال کیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھار فون پر بات بھی ہو جایا کرتی تھی مگر پھر ایک دم ہی کھو گئیں، میں تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں جلدی سے آجاؤ۔

☆ شہزادی عینی، کانگڑہ کالونی بے حد مختصر تبصرہ لکھتی ہیں۔ بے حد لائٹ کلر کا قلم استعمال کرتی ہیں۔ بے بی پنک یا لائٹ گرین کلر سے لکھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ اور لکھتی ہوں مگر ہمیں جو سمجھ میں آتا ہے وہی شائع کر دیتے ہیں۔

☆ تہنیت عبدالرحمن پاکیزہ کی لاپتا شہزادی ہیں جنہوں نے ایک دم تبصرے بھیجنے بند کر دیے۔ کہاں ہو رابطہ تو کرو؟

☆ شہزادی عالیہ بشیر طویل عرصے سے غائب تھیں پتا چلا کہ بیرون ملک میں تھیں۔ اب آئی ہیں تو انہوں نے رابطہ کیا ہے۔ یہ اچھی تبصرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ ایک دو بار ملاقات بھی ہوئی ہے۔ یہ گلوکارہ

نور جہاں کی دل سے عاشق ہیں۔

☆ شہزادی تبسم حفیظ الرحمن بمبئی میں رہتی ہیں۔ دو چار بار تبصرے بھی شائع ہوئے ہیں۔ پہلے فون بہت کرتی تھیں مگر اب گاہے بہ گاہے کر لیتی ہیں۔ پاکیزہ سے اور ہم سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ اپنے بیٹے کی بیماری کی وجہ سے بے حد پریشان رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے بیٹے کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔

☆ شہزادی نادیہ فاطمہ رضوی پاکیزہ کی اچھی تبصرہ نگار بھی تھیں اور مصنفہ بھی۔ اچانک ہی غائب ہو گئی ہیں۔ اب کس سے پوچھیں کہ تم کہاں ہو؟ آخری ملاقات ان سے ریڈیو اسٹیشن پر ہوئی تھی۔ جب وہ ہمارا انٹرویو لے رہی تھیں۔

☆ شہزادی کوثر خان تو کئی بار میرے گھر تک آئی ہیں۔ تبصرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی شاعرہ بھی ہیں مگر جب سے یہ اپنے شوہر کو پیاری ہوئی ہیں وہ سب کو بھول گئی ہیں، خوش رہو۔

☆ شہزادی روحیلہ خان بھی غائب ہو جانے والوں میں ہیں۔ یہ اچھی تبصرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی افسانہ نگار بھی ہیں۔ نازک سی لڑکی فون پر بڑی آہنی قسم کی باتیں کیا کرتی تھی مگر پتا نہیں کہاں ہے یہ؟

☆ مسز نگہت غفار من موجی شہزادی ہیں۔ تبصرے میں پتے پتے بوٹے بوٹے کو دعائیں دیتی ہیں۔ اس دور میں دعائیں دینے والے عنقا ہیں مگر ان کے پاس ہر وقت ٹوکرے بھرے رہتے ہیں۔ شاعرہ بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی مگر ان کے تبصرے سب کو بہت پسند آتے ہیں کہ یہ صرف دل کی آنکھ سے پڑھتی ہیں۔ فی زمانہ ایسے لوگ کمیاب ہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے، آمین۔

☆ شہزادی نیر رانی تبصرہ نگار، شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ کہانیاں بھی لکھتی ہیں۔ کئی کتابوں پر ملکی سطح پر ایوارڈ تک مل چکے ہیں۔ آج کل ان کا قلم آرام کر رہا ہے۔

☆ شہزادی مریم، لاہور میں رہتی ہیں۔ جوان، خوب صورت لڑکی مگر بے حد دین دار۔ روحانی مشورے کے صفحات فوٹو اسٹیٹ کروا کے اپنی فرینڈز میں بانٹتی رہتی ہیں۔ تبصرے تو کم کم ہی شائع ہوتے ہیں مگر رابطے میں رہتی ہیں۔ عمیرہ احمد کی بہت بڑی عاشق ہیں۔ آواز میں بے حد دلکشی ہے۔

☆ شہزادی حرا انور ملاقات تو ایک ہی بار ہوئی ہے مگر فون پر رابطہ عرصے سے قائم ہے۔ تبصرہ کبھی شائع کروانے کے لیے نہیں بھیجا مگر پاکیزہ کی مصنفات کی تحریریں بے حد شوق سے پڑھتی ہیں۔ عمیرہ احمد، عنیقہ محمد بیگ، فائزہ افتخار کی تحریریں پڑھتی ہیں۔ یہ لڑکی بے حد سادہ، معصوم اور پیاری عادتوں کی ہے۔

☆ شہزادی مہ جبیں صفدر ان سے بھی ملاقات ایک ہی بار ہوئی ہے مگر یہ پاکیزہ کی مصنفات کی تحریروں کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتی ہیں۔ نگہت سیما کے افسانے پسند ہیں۔ عمیرہ احمد کے افسانے اور ڈرامے دونوں ہی پسند ہیں۔ نمرہ احمد اتنی چھپی ہوئی کیوں رہتی ہیں۔ ہمارا ناول چاندنی اچھا لگا تھا مگر اس کا بنا ہوا سوپ انہیں بالکل پسند نہیں آیا۔ سوپ میں جو اضافہ اور ترمیم کی گئی اس نے سوپ کا حسن ختم کر دیا۔ مہ جبیں بے لاگ اور کھری رائے دینے کی عادی ہیں اور ایسی لڑکیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔

☆ شہزادی سنبل ملک ہماری نئی تبصرہ نگار ہیں۔ بے حد جذباتی سی ہیں۔ ان کا تبصرہ کئی مہینوں سے متواتر لگ رہا ہے مگر ان کا شکایتی خط ہر ماہ ہمارے پاس موجود ہوتا ہے۔ لگتا ہے جلد بازی میں ان سے بہنوں کی محفل پوری پڑھی تک نہیں جاتی۔

☆ شہزادی سدرہ یاسین بہت ٹیلنٹ ہے اس لڑکی میں۔ تبصرے بھی دلچسپ ہوتے ہیں اور مراسلات بھی اور ایک دفعہ تو حد ہی ہو گئی اس لڑکی نے افسانہ تک لکھ کر بھیجا تھا۔

☆ شہزادی افتخار شوق، میاں چنوں میں رہتی ہیں۔ ہنستی مسکراتی خاتون ایک بڑی سرکاری افسر بھی ہیں مگر لہجے میں انکسار ہوتا ہے۔ تبصرہ بھی کبھی بھیجتی ہیں، موڈی ہیں۔

☆ شہزادی تسنیم علوی، دبئی میں رہتی ہیں۔ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ تبصرے بھی کرتی ہیں۔ اگر وہ

ہر ماہ ایک دلچسپ خط ہمیں ارسال کریں تو ان کا خط یقیناً خصوصی نوعیت کا ہوگا۔

☆ شہزادی گیتی آرا افسانہ نگار بھی ہیں اور تبصرہ نگار بھی۔ انہوں نے ہمیں بتایا تو نہیں مگر ہمارا خیال ہے کہ شاید وہ ڈاکٹر ہیں۔ اس لیے ان کا تبصرہ ہم مشکل سے پڑھ پاتے ہیں۔

☆ شہزادی سدرہ کلثوم، لکی مروت سے تعلق ہے۔ تبصرہ لکھتے ہوئے اپنے ہاتھ میں تین چار رنگ برنگے مارکر رکھتی ہیں۔ تبصرے پر پھول بھی ہوتے ہیں اور تبصرہ بھی قوسِ قزح کا حامل ہوتا ہے۔

☆ اب پائیں باغ کے اس گوشے میں آجائیں جہاں شہزادیاں بڑے سلیقے سے گجرے بنارہی ہیں حالانکہ یہ کام مالنوں کا ہے مگر ہماری شہزادیاں لفظوں سے پھول کھلانا چاہتی ہیں۔ ان بہنوں کی لکھائی ایسی ہے جیسے موتی بکھرے ہوں۔ یہ شہزادیاں انیقہ رانا، چکوال کی ہیں۔ فضا بتول، بہارہ کہو کی ہیں۔ سامعہ تبسم کا تعلق ملتان سے ہے۔ ارم کمال کا فیصل آباد سے۔ جبیں ہاشمی کا بھیرہ سے۔ انعم حنیف کا بھکر سے۔ ایشل شادیان اور شبانہ کا گولارچی سے اور شازیہ رباب کا نندپور کا مونگی سے۔

☆ شہزادی شگفتہ ناصر کا اپنا بیوٹی پارلر بھی ہے۔ وہ جب بھی مجھے فون کرتی ہیں وہ بجی سنوری سی نظر آتی ہیں۔ وہ اور ان کے شوہر ایک جیسے کڑھائی والے سوٹ پہنا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شہرت کپل آف پنجاب تک تو پہنچ چکی ہے مگر وہ وقت دور نہیں کہ وہ کپل آف پاکستان بھی بن جائیں۔ ماشاءاللہ اللہ ہر شوہر کو اپنی بیوی کا ایسا ہی عاشق بنا کر رکھے۔

☆ شہزادی نجمہ ناز اصغر ہماری نئی تبصرہ نگار ہیں اور ایسے محبت بھرے لہجے میں بات کرتی ہیں کہ لگتا ہے کہ یہ تو ہمیں اپنی کوئی بچھڑی ہوئی بہن ملی ہے، پتا نہیں کب ہم سے جدا ہوگئی تھی۔

☆ سچی بات تو یہ ہے کہ تبصرہ نگار بہنوں کی تعداد ہماری مصنفات کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور اس وقت میرے قلم کے دماغ میں سب کے نام بھی نہیں آرہے ہیں مگر مجھے آپ کی خفگی کا ڈر بھی ہے اس لیے ان شہزادیوں کا ذکر جو باغ کی غلام گردشوں میں گھومنے کے باعث پکڑ میں نہیں آرہی ہیں ان کا ذکر پھر کبھی بلکہ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے کیسا......؟ اب کوئی ناراض ہوکر تو دکھائے۔ آخر ہوں ناں آپ کی باجی' اللہ آپ سب کو پل پل خوشیاں عطا فرمائے، صحتِ کاملہ کے ساتھ۔ آمین، ثم آمین اور آیئے اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا کریں۔ ابھی پڑھ لیں۔

لا اله الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین

☆☆☆

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ نئی نسل کی معروف مصنفہ عنیقہ محمد بیگ کے افسانوں کا مجموعہ دل کے آئینے شائع ہوگیا ہے۔ جس میں ان کے بہترین افسانے اور ناولٹ شامل ہیں۔ اس ضخیم کتاب کی قیمت صرف تین سو روپے ہے۔ جسے خزینۂ علم وادب الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری جناب و بیگم ڈاکٹر محمد ارشد کی پیاری بیٹی وجیہہ ارشد کی شادی محسن جاوید سے خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ جس میں ہم نے بھی شرکت کی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور شاعرہ مسز شمع حسین اپنی بیٹی نازیہ حسین کے ساتھ ٹورنٹو سے کراچی ایک شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے آئیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار مسز قیصر قدیر گزشتہ دنوں کینیڈا سے لاہور آئیں۔ اپنے عزیز واقارب سے ملاقات کے لیے۔

☆ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سہیل انصار اور بھابی نادرہ امریکا سے واپسی پر عمرے کی سعادت حاصل کرتے ہوئے اسلام آباد آگئے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری افشین شاہد، جدہ نے ہماری مصنفہ لبنیٰ عروج مرحومہ کے نام کا عمرہ ادا کیا۔ (جزاک اللہ)

☆ مصنف رامس تنویر، کراچی ایک پیاری سی بیٹی کے پاپا بن گئے۔ (مبارک باد)

☆ انٹرنیشنل پوکر فیڈریشن سوئٹزرلینڈ نے ہمارے ادارے کے نمائندہ لاہور سید افراز علی تازش کو پاکستان پوکر ایسوسی ایشن کا بانی جنرل سیکریٹری منتخب کرلیا ہے۔ پاکستان پہلا اسلامی ملک ہے جو انٹرنیشنل مائنڈ اسپورٹس ایسوسی ایشن کا ممبر بنا ہے۔ (مبارک باد)

☆ ہماری شاعرہ پروین عذرا تشنہ ان دنوں علیل ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شہلا ظفر، کراچی کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ اس ماہ ہماری ان پیاری بہنوں کی سالگرہ ہے۔

☆ رفاقت جاوید، تبصرہ نگار تمثیلہ زاہد کی بیٹی آئرہ سعدیہ کی سالگرہ۔

☆☆☆

✿ رخ چوہدری، کراچی سے۔ ''پاکیزہ کی روحِ رواں محترمہ عذرا رسول کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو اور ان کے شریکِ حیات محترم جناب معراج رسول کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حفظ وامان میں رکھے، آمین۔ انجم پاکیزہ کی سالگرہ ہر سال بہت اہتمام سے نئے رنگوں کی قوسِ قزح میں اور آئندہ کے لیے نئے خوابوں، نئے ارمانوں کی جلترنگ میں مناتی ہیں، ہر سال ایک نیا رنگ ہوتا ہے مگر اس بار تو آپ نے نئے پن اور خوب صورتی کی حد کردی۔ ایجی، اپنی تحریر کی ہیروئنز کو اپنی رائٹرز کو اپنی شہزادیاں بنا کر اپنے دربار میں حاضر کرلیا۔ تو یہ کنیز رخ چوہدری جس کو آپ نے اپنی محبت کا تاج پہنایا اور اپنے ٹرسٹ کا اعزاز اس کے ہاتھ میں دیا تو یہ کنیز جو آپ کا اعزاز پانے کے لیے شہزادی بن چکی ہے۔ آپ کے دربارِ عالیہ میں بے حد پیار، محبت، عقیدت واحترام اور دعاؤں کے نذرانے لے کر حاضر ہوئی ہے اور آپ کی فراخ دلی سے توقع کرتی ہے کہ آپ اس نذرانے کو قبول فرما کر اپنی شہزادی کی عزت افزائی فرمائیں گی۔ شکریہ۔ ماشاءاللہ، ماشاءاللہ آپ کا دربار تو آپ کی حسین شہزادیوں سے سجا ہوا ہے۔ سب کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔ آداب شمیم فضل خالق آپا، تسلیمات شوکت آپا، رضوانہ پرنس آپ تو ہیں ہی پرنس۔ ملکۂ عالیہ آپ کی طرح ہم بھی آپ کی چند شہزادیوں کو جانتے ہیں باقی شہزادیوں کو ہم نے آپ کی نظر سے دیکھا۔ آپ کے میٹھے شہد آگیں لہجے سے ان کے لہجوں کو سنا۔ آپ کی محبتوں کے پیراہن میں دیکھا تو ہمیں سب کی سب مس ورلڈ لگیں۔ اسی لیے تو پاکیزہ کا آنگن ہر نگر میں چودھویں کا چاند بن کر اترتا ہے۔ ملکۂ عالیہ ہمیں آپ کی کچھ شہزادیوں سے کچھ شکایت بھی ہے اور چونکہ آپ محبت کا دربار سجائے بیٹھی ہیں تو ہمیں پورا یقین ہے کہ آپ انصاف کریں گی اور ہماری ان ساتھی شہزادیوں کو اپنے دربار میں حاضر فرمائیں گی اور نرم سے نرم الفاظ میں ان سے کہیں گی کہ پیاری شہزادیوں ٹی وی چینل سے وابستہ ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ دوستوں کو بھول جائیں...... ناں جی ناں بری بات ہے ایسا نہیں کرتے۔ پیارے قارئین ہماری انجم ادیب کو ایک ماہر طبیب سمجھتی ہیں جبکہ ان کو اندازہ نہیں کہ ان کا میٹھا لہجہ' ان کی محبت بھری تسلی اور نصیحتیں ہم جیسوں کے لیے ہائی پاور وٹامن کا اثر رکھتی ہیں۔ آج کی محفل کا سب سے خوب صورت اور مختصر عذرا رسول صاحبہ کا سالانہ خطاب ہے۔ مختصر الفاظ میں انہوں نے اپنی رائٹرز کی تعریف بھی کی اور اصلاحی کلمات میں تحریر سنوارنے کا مشورہ بھی دیا۔ انہوں نے سالانہ خطاب میں انجم انصار کو پاکیزہ کی کپتان قرار دیا اور جب کسی پرواز کا کپتان اتنا نیک نیت، محنتی، مخلص ہو جس کا لہجہ شہد آگیں، لفظ کلیوں سے ہوں تو پرواز بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ انجم آپ نے اپنی ہر شہزادی کی اتنی تعریف کی ہے کہ ہر ایک سے بات کرنے اور دوستی کرنے کو دل چاہنے لگا ہے۔ آپ کا اقبال بلند ہو ملکۂ عالیہ آپ کی اس محفل میں بہت سے نئے نام یعنی نئی نئی شہزادیاں لکھ رہی ہیں بہت اچھا لکھ رہی ہیں جیسے عنیقہ محمد بیگ بہت اچھا اور خوب صورت اضافہ ہیں۔ پلاٹ میں انفرادیت بھی ہے اور تحریر میں سادگی کا حسن بھی مگر جیسے آپ نے کہا کہ سیکھنے کا عمل بھی

رکتا نہیں ہے ہمیں ہر وقت سیکھنا ہے۔ بڑوں سے چھوٹوں سے۔ غور کریں تو ماحول سے چرند پرند سے۔ ملکۂ عالیہ مجھے تو اب بہت کچھ کہنا ہے مگر ڈرتی ہوں کہ کہیں چھٹی طوالت کی سزا نہ پائے اور آپ نے میرے لیے جس اعتماد، جس ٹرسٹ کا اظہار کیا ہے یہ میرا ایوارڈ ہے سالانہ ایوارڈ۔ یہ میری زندگی کا سب سے قیمتی ایوارڈ ہے۔ کسی کا اعتماد حاصل کرنا کسی ایوارڈ سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ اللہ کا احسان اور شکر ہے کہ اس نے یہ ایوارڈ مجھے آپ سے دلوایا۔ تبصرے کی پہلی قسط ہے باقی آئندہ ماہ انشاءاللہ بشرطِ زندگی۔ اللہ نگہبان۔ اللہ تعالیٰ کرے کہ آپ ہر سال ایسا دربار سجائیں، آمین۔'' (شہزادی صاحبہ! میں ملکۂ عالیہ نہیں بلکہ اس دربار کی ایک کنیز ہوں جو ہاتھ جوڑ کر معافی بھی مانگا کرتی ہوں۔ اللہ ہم سب کو خوشیوں اور صحت کے ساتھ سلامت رکھے، آمین)

٭ اقبال بانو، وہاڑی سے۔ ''پاکیزہ محل میں شہزادیوں سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ انجم تم کو یہ کیسے پتا چلا کہ میرا فیورٹ کلر سرخ اور بلیک ہے۔ پُرمحبت جملوں کا شکریہ۔ اپریل کے شمارے میں عنیزہ سید کے ناول کی پہلی قسط نے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ شیریں حیدر کا افسانہ بھی بہت اچھا لگا۔ قیصرہ حیات کے ناول کی قسط بھی ٹھیک رہی۔ رفعت سراج کے ناول مجھے ہمیشہ سے پسند رہے ہیں مگر معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گی کہ اس دفعہ پڑھ کر مزہ نہیں آیا۔ تمام ٹی وی چینلز اور تمام رسائل میں سازشی قسم کی کہانیاں نظر آ رہی ہیں۔ کیا اب ہر طرف سازشوں کے ہی جال بُنے جاتے ہیں۔ ہاں حسینہ معین کا انٹرویو اور تصاویر دیکھ کر کچھ خاص نہیں لگا۔ نفسا نفسی کے اس دور میں ایسا تو ہو رہا ہے اور جہاں نہیں ہو رہا ہے وہ اس ٹائپ کے ڈرامے دیکھ کر ایسا بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

٭ سیما مناف، کراچی سے۔ ''محترمہ عذرا رسول کا پیغام بے حد محبت بھرا اور دل کو چھو لینے والا تھا۔ پاکیزہ محل کی تمام شہزادیوں سے مل کر بہت مزہ آیا۔ رفعت سراج تمہارا ناول بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس کی ہر قسط بھرپور ہے۔ عنیزہ سید کا ناول دیکھ کر بھی خوشی ہوئی۔ دیگر تحریریں بھی بہت اچھی تھیں اور ایک خاص بات پاکیزہ شہزادیوں کے بارے میں انجم تم نے بڑی سچی باتیں لکھی ہیں۔ ہماری شائستہ عزیز فون کٹ جانے کو واقعی خدا حافظ سمجھ لیتی ہیں۔'' (ہاں یہ تو ہے)

٭ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''سالگرہ نمبر بہت شاندار ہے۔ پورا ہی پرچا منفرد تھا مگر پاکیزہ محل کی شہزادیوں سے ملاقات کا بہت مزہ آیا۔ ہر شہزادی کے بارے میں تمہارے جملے دل کو چھوتے رہے۔ مجھے اس شمارے میں تمہارے افسانے یا ناولٹ کا انتظار تھا مگر تم نے پاکیزہ محل کی سیر کروا کر اس کمی کو پورا کر دیا، جیتی رہو اور اس طرح کے نئے اور منفرد آئیڈیے لے کر پاکیزہ کو سجاتی رہو۔ حسینہ معین سے ملاقات بھی مناسب تھی۔ عنیزہ کی پہلی قسط پسند آئی۔ رفعت سراج کا ناول بھی اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے ان کے دیگر ناولوں کی طرح یہ بھی تجسس سے بھرپور ہے۔ سکینہ فرخ کی سرپرائز بہت اچھی کہانی تھی۔ قیصرہ حیات کا ناولٹ بھی ٹھیک چل رہا ہے۔ راحت وفا لاہور والی نے مذاق لکھ کر لڑکیوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ صائمہ اکرم نے بہت محظوظ کیا۔ کرداروں کے نام ہم کو بھی پچھلے دور میں لے گئے۔ بہت عرصے کے بعد صائمہ اپنے پرانے رنگ میں نظر آئیں۔ شیریں حیدر نے اسپیشل بچوں پر لکھا مگر ہر لڑکی نگار جیسی مضبوط نہیں ہوسکتی۔ ثریا انجم نے بھی اچھا لکھا۔ جلترنگ کے تمام خاکوں نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ ہمیں یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ تم نے اپنے ناول کا نچ سی لڑکی کا انتساب امینہ عندلیب کے نام کیا ہے۔ ہم امینہ عندلیب کی صحت اور زندگی کے لیے دعا گو ہیں۔'' (آمین)

٭ اختر شجاعت، کراچی سے۔ ''آپ کی خوب صورت محفل جس میں محبتوں کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں اور یہ آپ کی بے حد محبت ہے کہ ہم جیسی کم علم ہستی کی باتیں سن لیتی ہیں ورنہ آپ اور آپ کا مطالعہ...... بس خیر کیا کہیں ماشاءاللہ ... اٹھارویں کتاب کی اشاعت پر بہت مبارک باد۔ آپ کو پاکیزہ کی سالگرہ کی بے حد مبارک باد۔ عذرا رسول صاحبہ اور ان کے تمام اراکین کو میری جانب سے دلی مبارک باد۔ پاکیزہ ہمیشہ سے میرا اپنا ڈائجسٹ رہا ہے۔ اس لیے بھی کہ اس میں دل کو چھو لینے والی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ اس بار اداریہ ہمیشہ کی طرح بہت شاندار اور بے حد جاندار رہا اور آپ کا پاکیزہ محل اور ہماری شہزادیاں سب بے حد زبردست رہا۔ پڑھ کر ڈھیروں لطف آیا بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔ حسینہ معین سے

ملاقات بھرپور رہی ان کا انٹرویو اچھا رہا۔ پاکیزہ ڈائری بہت اچھا سلسلہ ہے جس میں بہت کچھ ملتا ہے۔ بس آپ جب جب ہمیں یاد کریں گی ہمیں ساتھ پائیں گی پاکیزہ کے لیے اور بہنوں کے لیے ڈھیروں ڈھیر دعائیں۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ رب العزت ہمیشہ اپنے ذکر میں مشغول.... رکھے اور ہمیں اپنے حبیب پاک ﷺ اور آلِ رسول ﷺ کی محبت عطا فرمائے، آمین۔'' (جزاک اللہ)

٭ شمیم فضلِ خالق، پشاور سے۔ ''سب سے پہلے تو میں آپ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے مجھے بہنوں کی محفل میں اس محبت سے، اتنی عزت سے پکارا۔ واقعی جو لوگ خود قابلِ عزت ہوں وہ دوسروں کو بھی اتنی ہی عزت دیتے ہیں۔ آپ ہمارے لیے ایسی شہزادی ہیں جو تمام شہزادیوں کے دلوں پر راج کرتی ہیں۔ خدا آپ کو صحت اور زندگی دے اور پاکیزہ کے اوراق پر ہمیشہ آپ کا قلم راج کرتا نظر آئے، آمین۔ میں نے اس بار پاکیزہ جلدی ختم کیا تو سوچا اس بار تبصرہ کر دوں۔ امانت، رفعت سراج کا ناول ہے تو یقیناً اچھا ہوگا لیکن ابھی اس کی شکل نہیں نکلی دو چار قسطوں کے بعد ہی صحیح صورتِ حال سامنے آئے گی۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل' قیصرہ حیات کی ساتویں قسط اچھی تھی۔ سرپرائز میں سکینہ فرخ نے ساسوں کو بڑا خوب صورت سبق دیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو بیٹے کا گھر اجڑنے سے بچ سکتا ہے۔ عنیزہ سید کا شامِ شہر یاراں کی پہلی قسط بہت پسند آئی آگے چل کر یہ مزید نکھر جائے گی۔ کالا شاہ کالا صائمہ اکرم کی تحریر تو اس شمارے کی جان تھی۔ پڑھتے پڑھتے کئی بار ہونٹوں سے ہنسی کا فوارہ چھوٹا بڑے مزے کی تحریر تھی۔ شیریں حیدر کی تحریریں مجھے ہمیشہ سے پسند ہیں میں بڑے شوق سے سب سے پہلے ان کی تحریر پڑھتی ہوں لیکن ان کی تحریر پیار تم سے ہے ایسا پڑھ کر جہاں مجھے نگار کی تنگ و دو اچھی لگی۔ اس کا جذبہ اسپیشل بچوں کے لیے کاوشیں سب ٹھیک تھا لیکن اسے گھر سے بھاگنے کی ماں باپ کا دل دکھانے اور ان کی عزت پامال کرنے کی سزا ضرور ملنی چاہیے تھی جو کہ شیریں نے نہیں دی۔ شاید میری طرح اور بہنوں نے بھی ایسا محسوس کیا ہو، سوری شیریں۔ مکمل ناول بہار راہ میں ہے ثریا انجم کا بے مثال ناول ہے۔ تیمور کا کردار بہت پسند آیا۔ تھوڑی سی تشنگی اس حوالے سے قائم رہی کہ لاسٹ میں تیمور بھی کہیں سے آجاتا اور بیٹی اور بیٹے کے ملاپ پر خوش ہو جاتا۔ وہ آئے بزم میں، میں حسینہ معین سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ تصویروں میں ایک ماڈرن لباس میں ملبوس حسینہ کو دیکھ کر ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ نزہت اصغر آپ کا شکریہ کہ آپ ہم سے اتنے اچھے، اچھے لوگوں کی اچھے طریقے سے ملاقات کرواتی ہیں۔ جلترنگ تو حسبِ معمول جلترنگ ہی بجا رہا تھا۔ سب سے اچھا اس مرتبہ اور یہ دن لگا۔ انجم میرے نوکر کو ہمیشہ میری سہیلیوں سے یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ کبھی کوئی ریسپی اسے ٹھیک سے نہیں بتاتیں جبکہ میں اسے کہتی ہوں کہ تم ہی کوئی چیز مس کرتے ہو گے ورنہ وہ کیوں غلط بتائیں گی۔ بہر حال جلترنگ بہترین تھا۔'' (تبصرے کا شکریہ)

٭ سعدیہ رئیس، کراچی سے۔ ''شہزادیوں کی محفل پڑھ کر کچھ چلبلے خیالات دماغ میں آئے تو انہیں لکھنے کو دل چاہا۔ سب سے پہلے تو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ عرصہ ہوا اپنے لیے اس قسم کے الفاظ سنے ہوئے کہ اب تو اپنے بچوں کی ماں اور میاں جی کی بیگم ہیں۔ کسی کی پھپو، کسی کی خالہ، کسی کی بھاوج وغیرہ وغیرہ۔ یہ شہزادی، گڑیا اور ننھی کے الفاظ تو میری امی ہی بولا کرتی تھیں سو بڑے عرصے کے بعد یہ گمشدہ لفظ اپنے لیے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور دوسرا خیال بڑا کھٹا میٹھا تھا وہ یہ کہ جس وقت شہزادی کا لقب اپنے لیے پڑھا تو اس وقت موصوفہ شہزادی صاحبہ کچن کی گرمی سے بے حال پسینوں میں ڈوبی اس انتظار میں تھیں کہ کب پسینہ خشک ہو اور نہانے کے لیے جاؤں۔ سو میلی کچیلی شہزادی کا تصور مزہ دے گیا اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ باقی ساری شہزادیاں اس وقت کیا، کیا کر رہی ہوں گی جب ان کے ہاتھ میں اپنا شہزادی کا ایوارڈ آیا ہوگا۔ کیوں نہ ان سب شہزادیوں کی ایک محفل ایسی سجائی جائے جس میں.. سب یہ بتائیں کہ جب انہیں شہزادی کا خطاب ملا تو وہ اس وقت کیا کر رہی تھیں اور آخر میں جس طرح آپ نے ساری شہزادیوں سے معافی طلب کی اس میں بے شک آپ کی عاجزی و انکساری شامل ہے مگر مجھے لگا کہ آپ نے انہیں ہلکے پھلکے انداز میں وارننگ سی دی ہے کہ شہزادیوں اپنے مزاج کو قابو میں رکھو زیادہ سر پر مت چڑھو جیسے بچپن میں ہماری کسی بات پر بڑے ڈانٹتے ہیں کہ لو بھئی شہزادی صاحبہ کا مزاج ہی نہیں مل رہا۔ شہزادیوں کی طرح نخرے ہو رہے ہیں۔ خیر یہ ایک مذاق تھا۔ یہ آپ کا بڑا پن ہے کہ آپ نے سب مصنفات کو محبت سے یاد کیا۔ آپ کا بہت، بہت شکریہ۔'' (پسندیدگی کا شکریہ۔ میری لیے تمام

شہزادیاں باعث تکریم ہیں)

نجمہ جبیں علیزئی، ڈی آئی خان سے۔ ''تازہ شمارہ حسب معمول بے حد اچھا لگا۔ مجھے کچھ کہنا ہے تو دل موہ لیتا ہے۔ رفعت سراج کی امانت دھیرے دھیرے ہمیں اپنے سحر میں جکڑ رہی ہے۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل، قیصرہ حیات کی خوب صورت تحریر اپنا آپ منوا رہی ہے۔ باقی افسانے اچھے تھے۔ نئے ناول کا شدت سے انتظار ہے۔ انٹرویو بہترین تھا۔ آپ کی تحریر کا انتظار رہتا ہے گو کہ جلترنگ کی صورت میں ہر ماہ قاری بہنوں کے لبوں پر مسکراہٹیں تو آپ بکھیرتی ہی رہتی ہیں۔'' (شکریہ)

مسز عظمیٰ خورشید، لاہور سے۔ ''اپریل کا سالگرہ نمبر بہت پسند آیا ساری شہزادیوں سے مل کر بہت مزہ آیا اور ہم کو بھی ایسا لگا جیسے کسی محل میں موجود ہوں۔ کمال کی منظر نگاری تھی۔ عنیزہ سید بہت اچھی رائٹر ہیں ان کے ناول کی پہلی قسط نے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ بہت اچھا لکھا انہوں نے، بہت مبارک باد۔ اس ماہ تقریباً سارے ہی افسانے اچھے تھے مگر سکینہ فرخ کے سرپرائز نے تو بازی جیت لی۔ اب واقعی ایسی ہی ساسوں کی ضرورت ہے، ویل ڈن۔ روحانی مشورے اور جلترنگ کی تو تعریف ہی نہیں کرسکتی۔ ہاں انجم میں بھی تمہاری اس رائے سے متفق ہوں کہ ترکی کے ڈرامے فوراً بند ہونے چاہئیں ورنہ یہ معاشرے میں گند پھیلا دیں گے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

سمیرا حمید فاروقی، کراچی سے۔ ''پاکیزہ کا سالگرہ نمبر ون بہت کیوٹ سا لگا۔ سب سے زیادہ خوشی پاکیزہ محل میں آکر شہزادیوں سے مل کر ہوئی۔ اس ماہ سب سے اچھا ناولٹ صائمہ اکرم کا رہا۔ بہت عرصے کے بعد صائمہ نے اپنے رنگ میں لکھا ہے۔ شیریں حیدر کی تحریر میں ہمیشہ ایک پیغام ہوتا ہے اور انہوں نے بہت عمدگی سے اپنا افسانہ لکھا ہے۔ عنیزہ سید کے ناول کی پہلی قسط پسند آئی۔ قیصرہ حیات بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ہاں حسینہ معین کا انٹرویو بھی بہت اچھا لگا۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ''محل کی سب شہزادیوں کو سلام، دعا، پیار۔ سب سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ نے جس محبت سے اپنی مصنفات اور شاعرات کا ذکر کیا ہے۔ وہ تحریر سے چھن کر دکھائی بھی دے رہا ہے۔ سکینہ فرخ کا افسانہ سب سے زیادہ پسند آیا۔ شیریں حیدر نے اچھا تو لکھا ہے مگر مجھے اس کے اختتام سے اختلاف ہے...... ہر ایک کی رائے مختلف ہی ہوتی ہے۔ صائمہ اکرم کی تحریر بہت اچھی رہی۔ قیصرہ حیات کی قسط اس ماہ بھی جاندار تھی۔ رفعت سراج کا ناول بھی اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوچکا ہے۔ ہاں حسینہ معین کی تصاویر پسند نہیں آئیں۔ انٹرویو بھی بس ٹھیک ہی لگا۔'' (تبصرے کا شکریہ)

افتخار شوق، میاں چنوں سے۔ ''پاکیزہ سے میری جذباتی وابستگی ہے۔ اس کے بغیر زندگی میں پھیکا پن لگتا ہے۔ پاکیزہ محل میں ڈھیر ساری شہزادیاں ہیں، جن کے بارے میں آپ نے بڑی محبت سے جملے لکھے تھے اور آپ مجھے بھول گئیں مگر آپ نے پہلے ہی معذرت کرلی ہے اس لیے معاف تو کرنا پڑے گا مگر اپنی شکایت بھی تو آپ سے ہی کرنی ہے تا کہ آئندہ نہ بھول سکیں۔'' (آپ کی شکایت برحق ہے)

شائستہ انجم، کراچی سے۔ ''انجم آپ کا بے حد شکریہ...... آپ نے پاکیزہ محل میں مجھے جگہ دی۔'' (ارے شکریہ تو آپ سب کا ہے آپ شہزادیوں کی خوب صورت تحریروں کی وجہ سے پاکیزہ محل کی دلکشی قائم ہے)

پروین حمید، پنجاب سے۔ ''شکر ہے کہ میں نے یہ سطور پڑھ لیں کہ پاکیزہ محل میں تبصرہ نگاروں کا ذکر نہیں کیا گیا...... ورنہ تو میں آپ کا کیا حشر کرتی؟'' (شکریہ تو مجھے کرنا چاہیے کہ میرا کیا ہوتا)

انیلا ناہید، لیہ سے۔ ''شہزادیوں کی اتنی بڑی تعداد سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، ویسے یہ اتنا منفرد اور خوب صورت آئیڈیا کس نے دیا تھا آپ کو؟ (میرے دل نے دیا تھا) اس ماہ تمام افسانے اور ناولٹ شاندار رہے۔ شیریں حیدر، سکینہ فرخ، قیصرہ حیات نے کمال کردیا۔ حسینہ معین کا انٹرویو تو اچھا ہی تھا مگر ان کی جوانی سے بڑھاپے تک کی تصاویر بہت شاندار رہیں۔'' (شکریہ)

سیدہ برجیس رباب، ٹیکسلا۔ خوش آمدید تمہاری شاعری نظر سے گزری ہے اور اچھی لگی ہے اور میرا یہ پکا خیال ہے کہ تمہارے اندر ایک شاعرہ چھپی ہوئی ہے۔ ابھی افسانہ نہیں پڑھا ہے جب پڑھ لوں گی تو رائے دے دوں گی' ہاں...... آپ سب بہنیں گھر کے فرد جتنی ہی اہمیت کی حامل ہیں۔ آپ مجھے دن کے گیارہ سے شام چار تک اس نمبر پر فون کرسکتی ہیں۔ 021-36981952

نجمہ، نیویارک سے۔ ''یہاں کی سب سے بڑی شاپ منصور بکسٹال ہے۔ یہاں سب رسائل آتے ہیں مگر اس میں پاکیزہ نمبر ون ہے۔ مجھے سب سے زیادہ اچھا عذرا رسول کا انٹرویو لگا تھا۔ اب انجم آپ ایسا انٹرویو ضرور دیجیے...... پاکیزہ میں اپنا خط پاکر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی یہ محفل واقعی ہر فیملی کا لاؤنج ہے۔ آپ کی سب سے اچھی بات درود پاک پڑھنے کی تلقین ہے اور یوں ہر ماہ لاکھوں کروڑوں مرتبہ درود پاک اور آیت کریمہ پڑھا جاتا ہوگا۔ میں پاکیزہ کے کس، کس سلسلے کی تعریف کروں، سب ہی تحریریں مجھے پسند آتی ہیں مگر اس میں سب سے نمایاں آپ کا اپنا پن ہے جس نے ہمیں ایک ہی ڈوری میں باندھ رکھا ہے۔'' (پیاری نجمہ، اب اس محبت کو قائم رکھنے کے لیے آپ بھی باقاعدگی سے شرکت کریں، اپنے تجربات سے بہنوں کو مستفید کریں، مجھے خوشی ہوگی)

تسنیم، ناروے سے۔ ''سالگرہ مبارک، پاکیزہ کی تحریریں ہمارے لیے ایک اچھے سبق کا درجہ رکھتی ہیں۔ انجم باجی آپ اداریہ لکھیں یا جلترنگ...... آپ کا پیغام بڑا زبردست ہوتا ہے۔ اب آپ کے افسانے اور ناول کا انتظار ہے۔ عمیرہ احمد کے عکس کا اثر ابھی تک دل و دماغ پر ہے۔ بس ان سے ایک چھوٹی سی بات پوچھنی تھی انہوں نے شاید ابتدائی قسط میں لکھا تھا اس میں ایک پہیلی ہے تو اس میں کون سی پہیلی تھی......؟'' (مجھے نہیں یاد کہ عمیرہ نے ایسی کون سی بات لکھی تھی)

انیسہ حامد، کراچی سے۔ ''پاکیزہ وقتاً فوقتاً پڑھتی ہوں اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ سب سے زیادہ جلترنگ پسند ہے اس کے بعد بہنوں کی محفل...... انجم باجی آپ عموماً ذاتی باتوں کے جواب نہیں دیا کرتی ہیں مگر پڑھنے والوں کو اپنی رائٹرز کی ذاتیات سے بھی گہری دلچسپی ہوا کرتی ہے۔ آج صرف ایک چھوٹا سا سوال پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے اپنی زندگی میں کیا کھویا اور کیا پایا۔'' (پیاری انیسہ...... جو میں نے کھویا وہ میری نادانی تھی اور جو میں نے پایا وہ میرے رب کی مہربانی ہے)

صبا نور، لیہ سے۔ ''پاکیزہ محل میں رائٹرز شہزادیوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر خوشی ہوئی اور حیرت اس بات پر ہوئی کہ ہر شہزادی کے بارے میں آپ کی رائے مختلف تھی۔ کسی رائے میں تکرار تک نہیں تھی...... سب سے مل کر یوں لگا جیسے ہم کسی محل میں آگئے ہوں اور انہیں روبرو دیکھ رہے ہوں۔ عمیرہ احمد تو بہت ہی پیاری لگ رہی تھیں۔ قیصرہ حیات کی ہنسی تک سنائی دے رہی تھی۔ سیما مناف کا کڑھائی والا سوٹ تک دکھائی دے رہا تھا مگر آپی آپ ایک شہزادی کا ذکر کرنا بھول گئیں جو برسوں سے ہمارے ساتھ ہے۔ میرا مطلب ہے شہزادی عظمیٰ آفاق، آپ نے اپنی شہزادی کو کیوں نہیں شامل کیا؟'' (پیاری صبا! مجھے اس بات کا پکا یقین تھا کہ میں بہت سے نام لکھنے بھول جاؤں گی۔ اس لیے عظمیٰ کا نام قصداً نہیں لکھا تا کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اپنی بیٹی کا نام یاد رہا اور ہمارا نہیں جبکہ دیگر بھی میرے لیے میری بیٹیوں سے کم نہیں ہیں)

ایشل شادیان، گولارچی سے۔ ''آپ نے میری نظم، مجھے محبت کی تلاش ہے کو مرسلہ کے طور پر شائع کیا جبکہ وہ میری اپنی محنت تھی' میں نے خود لکھی تھی۔ ناہید سلطانہ اختر کا زندگی بہت ہی زبردست ناول تھا۔ اس کا اینڈ بہت زبردست رہا۔ حجاب اور سیف علی کے ملن نے ہمیں حیران کردیا۔ بہت زبردست ناول تھا حقیقت سے بھرپور اور سبق آموز۔ میری طرف سے ڈھیروں ڈھیر مبارک باد قبول کیجیے۔ رفعت سراج کا نیا شروع ہونے والا ناول امانت جس کے بارے میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی کیونکہ ابھی کچھ رازوں سے پردہ اٹھنا باقی ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ روما اور کائناز کی دوستی سے مجھے ایک لڑکی یاد آگئی اس نے بھی کالج میں ایک لڑکی سے دوستی کی تھی دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر تھوڑی دیر بھی رہنا مشکل تھا۔ سائرہ رضا کی ہارے بھی تو بازی مات نہیں پڑھ کر لوگوں کی عقلوں پر دکھ ہوا۔ حدیث دل نے دل کو چھولیا بہت ہی اچھی تحریر تھی بلکہ بہترین تھی۔ یہ پاکیزہ کی بیسٹ تحریر لگی مجھے۔ عظمیٰ افتخار جی مبارک باد کا ٹوکرا نہیں بلکہ

ٹرک قبول کیجیے۔" (تبصرے کا شکریہ)

✎ شائستہ عزیز، کراچی سے۔ "اس مرتبہ آپ نے ہم جیسے نالائقوں اور نکموں کو اتنے پیار سے شہزادیوں میں شمار کیا کہ قلم اور ہاتھ رک نہ سکے۔ بڑی نوازش کہ آپ اور عظمیٰ مجھے ہر سروے میں یاد رکھتی ہیں۔ دراصل ڈراما لکھتے، لکھتے میں افسانہ گویا لکھنا بھول سی گئی ہوں۔ عنیزہ سید کا ناول ضرور پڑھوں گی۔ وہ شہزادی کیا ملکہ ہیں، رفعت سراج سے لفظ کا ناز کے معنی دریافت کرنا ہیں کہ فون کر کے تھک گئی شاید واشنگ مشین لگا رکھی ہو (رفعت مشین اور کچن ضرور سنبھالتی ہیں) محفل میں جو بہنیں مجرب نسخے اور ٹوٹکے بتاتی ہیں ان کے لیے جزاک اللہ، میں بھی لڑکیوں کی شادی کے لیے ایک مجرب آزمودہ طریقہ بتا رہی ہوں کہ جس لڑکی کی شادی مطلوب ہو وہ رات کو تمام کاموں سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹ کر کچھ اوڑھنے سے قبل دو مرتبہ سورۂ قریش پڑھ کر چادر یا لحاف جو بھی اوڑھنا مقصود ہو اوڑھ کر لیٹ جائے پھر کسی سے بات کیے بغیر سو جائے۔ انشاء اللہ بہتری کے آثار جلد نظر آئیں گے۔" (جزاک اللہ)

☒ ڈاکٹر زاہدہ پروین، بہاول پور۔ آپ کا طویل خط ملا توجہ دلانے کا شکریہ...... اللہ تعالیٰ ہماری غلطیوں کو معاف کرے...... جو جانے انجانے میں ہو جاتی ہیں مگر آپ جیسی بہنوں کے خطوط ہمیں مزید الرٹ کر دیا کرتے ہیں۔ رہی بات ناولٹ جانِ جاں کی تو وہ ایک نئی مصنفہ کی تحریر تھی اب وہ یقیناً بہت اچھی کہانیاں لکھیں گی۔

✎ سمیرا کنول، ڈیرا غازی خان سے۔ "ٹائٹل سالگرہ کی مناسبت کے حساب سے مجھے کچھ خاص نہیں لگا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ کی پُراثر باتیں پڑھیں جو کہ سالگرہ نمبر کے حوالے سے اچھی تھیں۔ کہانیوں میں امانت، رفعت سراج تجسس و سسپنس سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اصیل خان ہی رابی وغیرہ کے والدِ محترم ہیں۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل' قیصرہ حیات نہ جانے کیوں اس میں روحیل اور ردا کی شادی کے بارے میں پڑھ کر اچھا نہیں لگا۔ ثریا انجم کا مکمل ناول اس ماہ کا بہترین ناول تھا جو کہ سالگرہ کا خاص تحفہ سمجھا میں نے، عنیزہ سید آتے ہی چھا گئیں...شامِ شہر یاراں کے ساتھ' افسانے تو تمام اچھے تھے لیکن سرپرائز سکینہ فرخ نے کمال کا لکھا۔ باجی افسانے زیادہ سے زیادہ شاملِ اشاعت کیا کریں کیونکہ مجھے افسانے پڑھنا ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے۔ صائمہ اکرم کا ناولٹ کالا شاہ کالا منفرد عنوان منفرد کرداروں کے ناموں سمیت پسند آیا۔ انجم باجی آپ بھی افسانہ یا ناول لے کر جلد آئیں یا وہ آئے بزم میں آئیں پلیز ہمیں شدت سے انتظار ہے۔ وہ آئے بزم میں نزہت اصغر نے میری فیورٹ رائٹر حسینہ معین کا انٹرویو لے کر سالگرہ نمبر کو چار چاند لگا دیے۔ نزہت جی ویری ویلڈن (شکریہ) اور اب آتی ہوں اپنی فیورٹ محفل میں جس کے لیے آج خط لکھا ہے۔ جی ہاں آپ بالکل ٹھیک سمجھیں۔ میں بہنوں کی محفل ہی کی بات کر رہی ہوں۔ پاکیزہ اکتالیسویں سال میں پہنچ گیا۔ گریٹ یعنی مجھے پاکیزہ پڑھتے ہوئے قریباً دس سال ہو گئے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکیزہ کا معیار ہمیشہ اچھا ہی رہا۔ کبھی بھی پاکیزہ کو چھوڑنے کا خیال نہیں آیا۔ انجم باجی بہنوں کی محفل میں آپ کی گفتگو اور محترمہ عذرا رسول کا پیغام پڑھا۔ مجھے اس میں یہ بات پسند آئی کہ آپ آنے والی تمام تحریروں کو انتہائی توجہ سے پڑھتے ہیں۔" (بالکل)

✎ فصیحہ آصف خان، ملتان سے...... "کس قدر نئے اور اچھوتے انداز میں آپ نے سب کو شہزادی کہا، مان بڑھ گیا۔ اتنی پزیرائی اور آپ کی محبت پر آنکھیں نم ہو گئیں۔ محبتوں کی انتہا تو آپ پر ہے۔ کاش میں آ کر آپ کے گلے لگ جاتی اور ہاتھ چوم لیتی، ویسے گال بھی چوم لیتی ناراض تو نہیں ہوں گی۔ آپ کی محبت اور شفقت اور توجہ، پیار اور خلوص ہے کہ پاکیزہ نو سال سے نوے سال کی عمر والے لڑکے، لڑکیاں مرد، عورتیں اور بزرگ پڑھتے ہیں۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ رسالوں میں پاکیزہ کا کوئی ثانی نہیں اور آپ جیسی شخصیات کا بھی کوئی ثانی نہیں۔ بخدا یہ لفاظی یا مبالغہ آرائی ہرگز نہیں۔ یہ میرے دل کی سچی آواز ہے اور پلیز یہ کاٹیے گا نہیں...... ضرور لگائیے گا۔ سالگرہ نمبر کا... سرورق نظروں میں سمایا نہیں۔ بہت زیادہ سرخ رنگ اسے ناپسندیدہ بنا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے باقی بہنوں کو پسند آیا ہو...... خیر جی آگے چلتے ہیں۔ ادب' حق و سچائی زندگی کا لازمی جزو ہیں۔ بعض تحاریر افسانوی رنگ سے بھی ماورا ہوتی ہیں۔ معاشرہ خبروں سے پرورش پاتا ہے اور خبر سوچ کے در وا کرتی ہے۔ یہی خبر افسانوی رنگ اوڑھ لے تو دلچسپ کہانی کی شکل میں

ڈھل جاتی ہے سو آپ کی دل آویز باتیں دل میں اتر گئیں۔ امانت میں رابی کا جانا حسبِ توقع تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کہاں جاتی ہے اور ڈاکٹر مہر کی جان پہ کیا بنتا ہے، کہانی دلچسپ موڑ پر آ گئی ہے تاہم کچھ الجھاؤ باقی ہے۔ سکینہ فرخ کی تخیلاتی ساس، معاشرے میں خال خال ملتی ہے، میرا ذاتی خیال ہے کہ بہوئیں تو رسالے پڑھتی ہیں اور ساس، بیماری اور کمزور نظری کے سبب کم مطالعہ کرتی ہیں، چلیں جن بہنوں نے ساس بننا ہے ان کے لیے کارآمد رہے گی۔ شامِ شہر یاراں پر تبصرہ محفوظ ہے۔ مذاق بچگانہ تحریر لگی کالا شاہ کالا نے بھی زیادہ متاثر نہیں کیا۔ اسٹیج ڈراما جیسی تحریر لگی۔ شیریں حیدر نے بے حد خوب صورت تحریر لکھی جاندار اور شاندار۔" (شکریہ)

☆ عزیز بہنو! ہمارے لیے تمام مصنفات، شاعرات، تبصرہ نگار اور تمام قارئین بے حد اہم ہیں بلکہ خاص الخاص ہیں اور ہم کسی کو بھی کسی پر فوقیت دینے کے قائل نہیں ہیں مگر بعض مرتبہ...... ایسی صورتِ حال بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ دماغ گھوم جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ شمارے میں بتایا تھا کہ راحت وفا کے نام سے دو مصنفات لکھ رہی ہیں۔ اب ان دونوں بہنوں کے ناراضی میں رچے خطوط ہمارے پاس آئے ہیں اور میں چاہتی ہوں اس کا فیصلہ بہنوں کی عدالت میں کیا جائے۔ آپ اس بارے میں اپنی مختصر آرائے دیں کہ ہم کیا کریں مگر اس کے لیے آپ کو ان دونوں کے خطوط پڑھنے ہوں گے اور یہ پہلا خط ہے لاہور والی راحت وفا کا۔

✎ راحت وفا، لاہور سے۔ "ایک بات جو میں کرنا چاہتی ہوں اپنی ہم نام راحت وفا، ملتان سے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ بہت ناراض ہیں مجھ سے۔ یہ انہوں نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میں نے مشہور ہونے کے لیے ان کا نام وفا اپنے نام کے ساتھ لگایا ہے۔ میری بہن' میں بہت سالوں سے لکھ رہی ہوں، شاعری، مزاحیہ کہانیاں، بچی کہانیاں اور افسانے' اگست 1999ء میں لاہور کے ایک میگزین کی طرف سے مجھے بیسٹ رائٹر ایوارڈ دیا گیا ہے۔ سب لوگ جو بھی مجھے جانتے ہیں یا پڑھتے ہیں وہ راحت وفا کو ہی پڑھ رہے ہیں۔ میں نے آپ کا نام استعمال نہیں کیا، وفا بچپن سے میرے نام کے ساتھ ہے، میرے والدِ مرحوم نے بہت محبت سے مجھے ایک نظم لکھنے پر تخلص دیا تھا اور تب سے لے کر آج تک یہ میرے نام کا حصہ ہے۔ اب آپ کا نام منظرِ عام پر آیا ہے اور گلہ تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے کہ آپ نے بعد میں آ کر یہ نام استعمال کیا ہے پھر بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کا ناول ایک تھی نیناں، پاکیزہ میں آ رہا تھا تو میرے جاننے والے مجھ سے پوچھتے تھے کہ یہ آپ کا ناول ہے تو میں انہیں بڑی خوشی سے بتاتی تھی کہ یہ ایک اور راحت وفا ہیں جو کہ ملتان میں رہتی ہیں۔ میری بہن میں لاہور اردو بازار میں رہتی ہوں اردگرد بہت سے پبلی کیشنز ادارے ہیں، روزانہ ڈھیروں کتابیں مارکیٹ میں آتی ہیں، ان لوگوں کی بھی جن کا نام کوئی جانتا بھی نہیں ہے، کوئی بھی چودہ بیس ہزار لگا کر صاحبِ کتاب بن سکتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے پھر بھی میں نے آپ کی خاطر اور میڈم انجم کے کہنے پر اپنے نام کے ساتھ راحت وفا راجپوت لکھوا لیا پھر بھی آپ ناراض ہیں۔ میں نے آپ کا کوئی افسانہ چوری کیا ہے جو آپ برا مان رہی ہیں۔ میرا اپنا انداز ہے، آپ تو شاید شاعری نہیں کرتیں اور میری انشاء اللہ افسانوں سے پہلے شاعری کی کتاب چھپے گی، میں نے انجم انصار کو ثبوت کے طور پر اپنے پرانے افسانوں کا حوالہ بھیجا ہے۔ ہم کون سے بین الاقوامی رائٹر ہیں جو ایک دوسرے کا نام استعمال کر کے فائدہ حاصل کریں گے۔ بڑے بڑے ناموں والے بھی گزر گئے آج کوئی ان کا ذکر بھی نہیں کرتا۔ یاد رکھیے طرزِ تحریر اور معیارِ تحریر ہماری پہچان ہونی چاہیے۔ لہٰذا میڈم انجم آپ سے گزارش ہے کہ میرا نام راحت وفا ہی لکھا کریں، جس طرح اس ماہ نظم اور کہانی پر لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکیزہ کو اور ترقی دے۔"

☆ اب آئیں ملتان والی راحت وفا کا بھی خط پڑھ لیں۔

✎ راحت وفا، ملتان سے۔ "میرا قلمی سفر 1979ء سے شروع ہوا۔ پاکیزہ سے میرا تعلق 1980ء سے ہے۔ الحمدللہ اپنا نام، مقام بنانے کے لیے میں نے طویل جدوجہد کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیو پاکستان، ملتان، ایف ایم ملتان، وسیب ٹی وی چینل، پی ٹی وی ملتان، اس کے علاوہ اخبارات، جرائد میں آنچل، خواتین، شعاع، نازنین، فنون، اردو ڈائجسٹ، شمع اور پاکیزہ کے لیے لکھا ہے۔ افسانہ میری شناخت ہے، نوائے وقت ملتان میں ہفتہ وار کالم لکھتی ہوں، گرلز کالج میں لیکچرار ہوں، سات کتابیں مارکیٹ میں ہیں، آٹھویں زیرِ طبع ہے۔ دو ٹی وی چینلز سے ڈرامے کا معاہدہ ہوا ہے...... یہ سب باتیں آپ کو اس

لیے بتا رہی ہوں کہ آپ سمجھ سکتی ہیں نام اور ساکھ دونوں کتنے قیمتی ہوتے ہیں۔ محترمہ راحت وفا جو کہ لاہور سے تعلق رکھتی ہیں...... میری گزارش یہ ہے کہ وہ کسی صورت بھی اس پورے نام کے ساتھ نہیں چھپ سکتیں...... آپ سوچیں، عمیرہ احمد کے نام سے کوئی آپ کے پاس چھپنا چاہیے تو کیا آپ چھاپیں گی، رفعت سراج، حسینہ معین وغیرہ وغیرہ ان ناموں سے کوئی لکھے تو کوئی بھی ادارہ انہیں چھاپے گا۔ آپ سے گزارش ہے کہ لاہور والی محترمہ کا نام اور کام آپ چھاپیں مگر صرف راحت راجپوت کے نام سے راحت وفا کے نام سے نہیں کیونکہ یہ کسی لحاظ سے بھی جائز نہیں...... آپ کا ادارہ مجھے اخلاقی، قانونی طور پر سپورٹ کرے گا۔ ان کو مسلسل راحت وفا کے نام سے چھاپا جا رہا ہے۔ آپ پلیز اس پر ایکشن لیں، میرے قاری مجھ سے کیا پوچھیں گے؟ یہ آپ جانتی ہیں وہ کچھ لکھ دیں، ساکھ تو میری مجروح ہوگی...... لہٰذا آپ تردیدی بیان شائع کریں اور ان کا نام راحت راجپوت کے نام سے بے شک چھاپیں۔"

ام طیفور، گوجرانوالہ سے۔ "اس ماہ شائستہ انجم کا افسانہ آئیڈیل بہت اچھا لگا۔ سائرہ جی کا ہارے بھی تو بازی مات نہیں زبردست تھا۔ عظمیٰ افتخار صاحبہ کا حدیث دل بے حد اثر انگیز ناولٹ تھا۔ مجھے اس ناولٹ کا نام حدیث دل بہت بھایا۔" (شکریہ)

بنتِ عزیز الرحمن، راولپنڈی سے۔ "آپ کو پہلی بار خط لکھا اور جواب مل گیا۔ بخدا اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتی جی باغ باغ ہوگیا۔ حوصلہ ہوا۔ میں پاکیزہ میں پہلے جلترنگ پڑھتی ہوں، یہ صفحات میرے پسندیدہ صفحات ہیں۔ پاکیزہ کے سلسلے بہت خوب ہیں، کس کس کی تعریف کروں اللہ ان سب مصنفات کا زورِ قلم اور زیادہ کرے۔ کچھ اشعار آپ سے متعلق بھیج رہی ہوں۔ اگر پسند آئیں تو اپنی ڈائری میں نوٹ کرلیں۔ جب کبھی ڈائری پڑھیں تو ہم بھی یاد آجائیں۔" (میں نے نوٹ کرلیے ہیں، شکریہ)

فریدہ فری یوسف زئی، لاہور سے۔ "سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا، بے حد اچھا لکھا پھر حمد و نعت سے فیضیاب ہوئے پھر افسانے پڑھے تقاضے دلوں کے، سرپرائز، مذاق راحت وفا نے اچھا لکھا۔ صائمہ اکرم کے ناولٹ کالا شاہ کالا نے بے حد ہنسایا شکریہ صائمہ جی مکمل ناول بے حد پسند آیا ثریا انجم جی ویلڈن۔ مجھ سے ملیے میں شازیہ عمران کا انٹرویو اچھا لگا مگر ان کی امی کی وفات کا پڑھ کر دکھ بھی ہوا۔ اوہ آئیے بزم میں حسینہ معین کا تعارف بہت پسند آیا، پاکیزہ کی مصنفات کے پیغامات تمام بہت اچھے تھے تصویریں بھی پیاری تھیں مگر یہ شگفتہ شفیق تو نہیں لگ رہی تھیں۔ بہنوں کی محفل میں سب کے خطوط موجود تھے سوائے میرے، پاکیزہ ڈائری میں سب نے اچھا لکھا۔ واہ واہ جلترنگ پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔" (شکریہ)

صدف نورین، لاہور سے۔ "پاکیزہ کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ پاکیزہ کا ٹائٹل ہمیشہ سے اچھا رہا ہے۔ امانت کی پہلی قسط نے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ بہت ہی درد بھری تحریر ہے۔ زندگی کا اختتام بھی اچھا رہا۔ باقی تمام سلسلے بھی اپنی مثال آپ ہیں، بہنوں کی محفل بھی لاجواب ہے۔ آنٹی جی اگر میرا خط بھی پاکیزہ کی زینت بن جائے تو میں اپنے آپ کو بھی خوش قسمت تصور کروں گی۔" (پیاری بھاگ بھری اس محفل میں خوش آمدید)

تمثیلہ زاہد، کراچی سے۔ "سب سے پہلے عنیزہ سید کے سلسلے وار ناول کی پہلی قسط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ انہوں نے ہمیں پہلی قسط میں ہی اپنی تحریر کے سحر میں جکڑ لیا ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ سرپرائز میں سکینہ فرخ نے ساس کا اپنی بہو کے ساتھ جو منفرد رویہ دکھایا تو سوچا کاش ایسی تحمل مزاج اور صاحب فراست ساس ہر گھر میں موجود ہوں تو ہر بہو اور ساس کی زندگیاں سکون کا گہوارہ بن جائیں۔ صائمہ اکرم کا مسکراتا ناولٹ کافی دنوں بعد پڑھنے کو ملا۔ شیریں حیدر کا پیار تم سے ہے ایسا اسپیشل بچوں کو موضوع بناتے ہوئے نگار نامی لڑکی کی زندگی کو کئی مشکل موڑ پر اترتے چڑھتے دکھایا گیا تھا۔ انجم آنٹی! میری سب سے چھوٹی بہن ایک اسپیشل چائلڈ ہے میرا ذاتی تجربہ ہے اللہ تعالیٰ ایسے گھر میں اپنا خاص فضل اور برکتیں نازل کرتا ہے جہاں ایسا کوئی بچہ ہو اور اس کی پرورش بہت توجہ اور محبت سے کی جائے۔ باقی تمام کہانیاں اپنی جگہ اچھی تھیں۔ ہاں آپ نے بہنوں کی محفل میں سالگرہ کے اس موقع پر جس انداز میں اپنے پاکیزہ محل کی شہزادیوں کا جس انداز میں ذکر کیا ہے پڑھ کر مزہ آیا۔ عاشفہ مسعود کا خط توجہ طلب تھا۔ ان کا شکریہ جنہوں نے ماؤں کو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف راغب کیا۔" (تبصرے کا شکریہ)

غزالہ عزیز، کراچی سے۔ "مارچ کا پاکیزہ کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی آپ کا اداریہ مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا اور آپ کی سوچ اور خیال کی صداقت پر دل تائید کے لیے بے ساختہ مسکرا اٹھا کہ جوانی اور بڑھاپے کی حقیقت کے تناظر میں ماضی اور حال کی مثال صادق تھی کہ ہم ماضی کو نہیں دراصل اپنی جوانی کو یاد کرتے ہیں اور حال یعنی بڑھاپے کو جوان امنگوں کے ساتھ خوش آمدید نہیں کہتے۔ اگر امنگیں جوان رہیں تو بہاریں تادیر قائم رہتی ہیں۔ اب شمارے کے دیگر سلسلوں کی طرف آتے ہیں۔ شائستہ انجم نے آئیڈیل کی شکل میں مختصر اور پُراثر تحریر لکھی۔ قول و فعل کے تضاد کی بہترین نقاشی کی گئی۔ پہلا قدم میں فاطمہ خان نے بہت اچھا پیغام دیا کہ اندھیروں میں راستہ ڈھونڈنے کے لیے راستے میں دیا جلانا پڑتا ہے چاہے اسے اپنے راستے میں بچھے کانٹوں سے الجھنا پڑے مگر جیت سچ کی ہوتی ہے۔ عقیلہ حق نے ایک خواہش لاحاصل میں پرانے موضوع کو اپنے قلم کی پُراثر جدت طرازی سے اثر انگیز بنایا۔ واقعی ہم انسان کبھی کبھی تقدیر سے تدبیر کا مقابلہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ زہر، نگہت اعظمی نے بھی اچھا لکھا۔ اس ماہ کی بہترین تحریر سائرہ رضا کی ہارے بھی تو بازی مات نہیں رہی فرسودہ روایتوں کے بند دریچوں میں گھٹن بڑھ جائے تو چور دروازے کھل جاتے ہیں۔ ضرورت فرسودہ روایتوں کو ختم کرنے کی ہے۔ وہ آئے بزم میں مہناز مرحومہ کی سچی اور کھری باتوں نے بحیثیت قوم کے ایک فرد کے شرمندگی میں مبتلا کردیا کہ ہم اپنے گوہر نایاب لوگوں کی قدر نہیں کرنے والی قوم ہیں، یہ بات ہی نہیں مقام بھی قابل افسوس ہے۔ پاکیزہ کے باقی مستقل سلسلے بھی اچھے رہے۔ خاص طور پر انجم آپی کا جلترنگ کراچی میں سردی سے متعلق خیال آفرینی زبردست رہی۔" (تبصرے کا شکریہ)

غزالہ شاہد، کراچی سے۔ "خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ ایک اچھا شمارہ لگا۔ سب ہی تحریریں کم و بیش اچھی تھیں مگر سکینہ فرخ، شیریں حیدر اور ثریا انجم کی تحریریں بازی لے گئیں۔ مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔ کارنرز بھی آپ نے سالگرہ کی مناسبت سے متاثر کن لگائے مگر یہاں پر مجھے آپ کے ہاں چلنے والے قسط وار سلسلوں پر ضروری بات کرنی ہے۔ عنیزہ سید کا ناول تو خیر ابھی شروع ہوا ہے۔ چار اقساط کے بعد پتا چلے گا مگر رفعت سراج اور قیصرہ حیات کی تحریریں زیادہ متاثر نہیں کر رہی ہیں۔ رفعت سراج نے بے شک ہمیشہ بہت اچھا لکھا مگر موجودہ تحریر عجیب بوجھل انداز لیے ہوئے ہے۔ اس قدر سخت گیر ڈاکٹر مہر جان وہ بھی نیورو سرجن اپنے مریضوں کا کیا حشر کرتی ہوگی بار بار ان کی شخصیت کے منفی اوصاف کا تذکرہ نہایت گراں گزر رہا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ ان کے نوکر یا ملازم اصیل خان کا کردار بھی واضح نہیں ہو پا رہا۔ ایسے مکالمے بار بار آرہے ہیں جسے ذہن برداشت نہیں کر پا رہا، اس سلسلے میں رائٹر کی جانب سے بھی کچھ ضرور کلیئرنس ہونی چاہیے کہ وہ کیا بیان کرنا چاہ رہی ہیں۔ معلوم نہیں آپ اتنی تنقید شامل کریں گی یا نہیں بہرحال قیصرہ حیات کا ناولٹ بھی ربڑ کی طرح کھنچا جا رہا ہے۔ اس کا پیغام ابھی تک واضح نہیں ہوا سوائے ساس بہو کی نفرت کے یا موبائل فون کا دھڑا دھڑ استعمال...... معذرت کے ساتھ۔" (غزالہ بہن اس محفل میں خوش آمدید، رفعت سراج اور قیصرہ حیات ہماری مایہ ناز مصنفات میں شامل ہیں۔ ناول میں بعض مرتبہ ایسے مواقع بھی آجاتے ہیں جہاں کسی بات کو تفصیل سے بھی بیان کرنا ہوتا ہے۔ آپ جلد ہی یہ دیکھیں گی کہ وہ کس طرح اپنی بات کے ساتھ کہانی کو آگے بڑھائیں گی تنقیدی خط کا شکریہ آپ بہنوں کے تبصرے ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں)

پاکیزہ کی محفل کے صفحات کا کوٹہ ختم ہوا۔ اب آئیے ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں یاارحم الرحمین! میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک زندہ رہوں! اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرمادے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یارب العالمین تو مجھ سے میری آل، اولاد سے ہمیشہ راضی رہنا، بے شک ہمارا رب برکت اور بلندی والا ہے، آمین ثم آمین!

یامجیب، یامجیب، یامجیب۔

دعاگو آپ کی باجی
انجم انصار

لگی۔
"میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ تم کسی اور سے بھی عشق کررہے ہو، اب تو ثبوت بھی مل گیا ہے میرے اور تمہارے دو ووٹوں کے علاوہ تیسرا ووٹ اسی کلموہی کا ہی ہوسکتا ہے۔"

☆☆☆

نشے کی جھونک میں ایک شرابی شوہر نے اپنی بیوی سے کہا۔"تم دنیا کی سب سے بری اور بدصورت عورت ہو۔"

اس کی بیوی جل کر بولی۔"اورتم دنیا کے سب سے زیادہ، اودھم باز، بدمست شرابی۔"

شرابی نے ہنس کر کہا۔"مگر میں تو کل صبح بالکل ہوش مند نظر آؤں گا اورتم......؟"

مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

غزل

کیا تو کیا نہ کیا اُس کی اِک خوشی کے لیے
مگر یہ دل ہے کہ روتا رہا اُسی کے لیے
تمہیں مائل بہ کرم کرنے کی خاطر جاناں
میں نے ہر در پہ صدا دی ہے منصفی کے لیے
کیا ضروری ہے محبت میں فنا ہو جانا......؟
طریقے اور بھی رائج ہیں خودکشی کے لیے
گر میرے درد کی تشہیر تیری شہرت ہے
تو یہ تشہیر کریں گے تیری خوشی کے لیے
وہ اپنے اشک تمہیں دان کر گیا ہے کرن
تم نے ہر غم کو سہا جس کی اِک ہنسی کے لیے

شاعرہ: مہناز کرن، پشاور

ظالم

مدت ہوئی تیری
بے وفائی پر میری آنکھوں
نے رونا چھوڑ دیا ہے
مگر ظالم!
میرا دل اب بھی روتا رہتا ہے

شاعرہ: بشریٰ باجوہ......اوکاڑہ

بات ہے کام کی

معافی مانگنا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ آپ غلط اور دوسرا فریق صحیح ہے بلکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کے رشتے کی اہمیت آپ کی انا سے بڑھ کر ہے۔

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

کامنی لڑکی

وہ رنگ برنگی
تتلی جیسی
نازک پھول کی
خوشبو جیسی
خوابوں جیسی آنکھوں والی
کلیوں سی مسکان والی
ہنستی کھیلتی
لڑتی جھگڑتی
ہوا کے چنچل جھونکے جیسی
گھبرائی ہوئی اِک ہرنی جیسی
کسی مندر کی گھنٹی جیسی، کامنی لڑکی
پریم نگر کی سیر کو جاکے
کچھ دنوں سے
چپ چپ سی ہے
پیا ملن کے سپنوں کا
انجام نہ جانے
خوش خوش سی ہے

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

کوئی تو ہو

کوئی تو ہو جو
میری ہتھیلی پہ اپنی چاہت کے گلاب رکھ دے
کوئی تو ہو جو
میری پلکوں پہ اپنی رفاقت کے خواب رکھ دے
کوئی تو ہو جو
میری حیات کے سب دُکھوں کو
اِک حرفِ تسلی سے ماند کردے
کوئی تو ہو جو
میری سیاہ راتوں کو اپنے چہرے کی
روشنی سے چاند کردے
کوئی تو ہو
کوئی تو ہو......

شاعرہ: راحت وفا، لاہور

موتی مالا

☆ آنسوؤں کو بہہ جانے دو، یہ غموں کو مایوسیوں میں تبدیل ہونے سے روکتے ہیں۔

☆ خوشی صرف ہنسنے ہنسانے اور قہقہے لگانے کا نام نہیں بلکہ رگ وپے میں طمانیت بس جانے کا نام ہے۔

☆ غصہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسروں کا انتقام اپنے آپ سے لیتے ہیں۔

مرسلہ: سارہ کلثوم، ضلع لکی مروت

نظم

میرے چارہ گر!
میرے درد کی تجھے کیا خبر
تو میرے سفر کا شریک ہے
نہیں ہم سفر
میرے چارہ گر، میرے چارہ گر
میرے ہاتھ سے تیرے ہاتھ تک
وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
کئی موسموں میں بدل گیا
اسے ناپتے، اسے کاٹتے
میرا سارا وقت نکل گیا
نہیں جس پہ کوئی نشانِ پا
میرے سامنے وہ رہگزر
میرے چارہ گر
میرے درد کی تجھے کیا خبر

شاعر: امجد اسلام امجد

مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

گلدستۂ زندگی

☆ بھروسا ایک ایسا پھول ہے جو شک کی بو سونگھتے ہی مُرجھا جاتا ہے

☆ جو لوگ تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں وہ باصلاحیت نہیں ہوتے۔

☆ محبت دور کے لوگوں کو قریب اور قریب کے لوگوں کو دور کردیتی ہے۔

☆ دنیا تمہیں اس وقت تک نہیں ہرا سکتی جب تک تم اپنے آپ سے نہ ہار جاؤ۔

☆ کتابوں کی قیمت جواہرات سے بھی زیادہ ہے کیونکہ جواہرات ظاہری چمک دمک دکھاتے ہیں جبکہ کتابیں باطن کو مضبوط کرتی ہیں۔

☆ زندگی......دوستی، خوشبو اور اجالے کا نام ہے۔

مرسلہ: ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس

سعدیہ کے لیے

سرسبز رکھے تم کو میرا رب خزاؤں میں
چادر سکھ کی رہے تم پر تندو تیز ہواؤں میں
روشن اس طرح سے ہو تیرا گھر ہمیشہ
اِک چاند کا ہالہ ہو کالی گھٹاؤں میں
کچھ پھول تیرے گلشن کے مہکتے رہیں سدا
بسی رہے خوشبو تیرے من کی فضاؤں میں
کبھی نہ بجھنے پائے تیرے پیار کا جلتا دیپ
روشنی رہے دائم تیرے بیت کی وفاؤں میں
موتی سجتے رہیں تیرے تن کے ساگر پہ
چوڑیاں کھنکتی رہیں تیری دونوں بانہوں میں
تاروں سے بھرا ہو تیرے گھر کا امبر
کرنوں کی ندا ہو میرے دل کی دعاؤں میں

مرسلہ: صدف جاوید، ہری پور ہزارہ

⌘



جلترنگ

انجم انصار

مشورے والیاں

فاکہہ اپنے شوہر کو اپنی انگلیوں پر نچا کر اس حد تک لے آئیں کہ انہوں نے اپنی ماں سے از خود کہہ دیا کہ اب وہ سب بھائیوں کے ساتھ اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

''کوئی تکلیف ہے ساتھ رہنے میں؟'' باپ نے پوچھا۔

''ہاں، بچوں پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ یہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی آتا رہتا ہے۔ بہنوں کے بچوں کو جتنی گالیاں آتی ہیں ان سب کی گالیاں میرے بچے سیکھ گئے ہیں اور وہ آپس میں بہن بھائیوں سے لڑتے ہوئے ادا کرتے ہیں۔''

''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اپنے گھر میں تمہاری بہنوں کا آنا جانا روک دیں؟'' ماں نے پوچھا۔

''وہ تو کسی طرح بھی نہیں روکا جا سکتا ہے نہ روکنا ہے اور نہ ہی وہ لوگ رُک سکتی ہیں۔ کہیں دوسری جگہ بھی جانا ہو تو پہلے ہمارے گھر اس وجہ سے آتی ہیں کہ یہاں سے ڈرائیور اور گاڑی مل جائے گی تو انہیں جانے میں آسانی رہے گی۔''

''اپنی غریب بہنوں پر طنز کر رہے ہو؟''

''نہیں، یہ طنز نہیں ہے حقیقت ہے جو بہن امیر ہے ان کا بھی یہی وتیرا ہے۔''

''بیٹیاں اگر والدین کے ہاں نہیں آئیں گی تو پھر بیٹیاں کہاں جائیں گی تمہیں چونکہ یہاں تکلیف ہے اس لیے چلے جاؤ۔''

ذکی اپنے آفس کی جانب سے ملے ہوئے شاندار بینگلو میں چلے گئے اور اسے انتہائی خوب صورتی سے سجایا۔ عزیز احباب آتے تو وہ مکان کی سجاوٹ کی تعریف کا اصل مستحق اپنی بیگم کو ٹھہراتے اور فاکہہ نفاست سے اپنے شانے اچکا کر ایک اچھلتا کودتا قہقہہ لگاتیں۔ فاکہہ کا خیال تھا ذکی علیحدہ ہو جانے کے بعد انگلیوں سے ہٹ کر ان کی ابرو کے اشارے پر ناچا کریں گے مگر ذکی کی حالت تو ایسی ہو گئی جیسے کسی چھوٹے بچے کو ماں سے علیحدہ کر دیا جائے۔

آفس جاتے تو پہلے ماں کے پاس جاتے، آفس سے اٹھتے تو پہلے ماں، باپ کے پاس آتے اور وہاں ایک دو گھنٹے بیٹھ کر گھر کی راہ لیتے۔ چھٹی کا دن آتا تو بیوی بچوں کو لے کر اماں کے گھر آ جاتے۔ بیوی شروع شروع میں تو آتی رہیں بعد میں وہ جل کر بولیں۔

''علیحدہ رہنے کا فائدہ ہی کیا ہے کہ آپ ہر دوسرے دن کھینچ کر ہمیں اسی جنجال پورے میں لے جاتے ہیں۔''

''اب کیا تکلیف ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''آپ کے بھائیوں اور بہنوں کے بچے میرے بچوں کو تنگ کرتے ہیں۔ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور نئے گھر کا طعنہ دیتے ہیں جیسے یہاں سے جا کر ہم نے کوئی گناہ کیا ہو۔''

''ٹھیک ہے تم مت جاؤ، بچے نہ جائیں مگر میں تو ضرور جاؤں گا۔'' ذکی نے کہا۔

''ہاں، ہاں شوق سے جائیں۔'' فاکہہ نے غصے سے کہا اور سسرال جانا بند کر دیا۔ اب ذکی صبح شام کے ساتھ ساتھ چھٹی کا دن بھی وہیں گزارنے

لگے۔

''کچھ پتا بھی ہے تمہارے سسرال والے ذکی بھائی کے لیے رشتہ دیکھ رہے ہیں۔'' ایک شام فاکہہ کی سہیلی نے بتایا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم؟'' وہ پریشان ہو گئی۔

''ہاں، تمہاری بڑی نند کا فون آیا تھا وہ کہہ رہی تھیں کہ کوئی اچھی سی لڑکی ذکی بھائی کے لیے بتاؤ۔ میں نے کہا کہ ان کی تو شادی ہو چکی ہے تو وہ بولیں ان کی پہلی بیوی، بچے ہمارے گھر آتے جاتے نہیں ہیں..... کوئی ایسی لڑکی بتاؤ جو سسرال میں رہے۔ ہاں ہماری گارنٹی ہو گی کہ ذکی اپنا زیادہ وقت یہاں گزاریں گے۔ دوسری بیوی کا پہلی بیوی سے کوئی لینا دینا نہیں ہوگا اور ہمارے لیے دوسری ہی اصل بھابی ہو گی۔''

''اچھا یہ بات ہے۔'' فاکہہ کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ رات گئے ذکی آئے تو وہ بولیں۔

''یہ کیا بات ہوئی آپ خود تو اماں، ابا کے پاس چلے جاتے ہیں اور مجھے اس اجاڑ گھر میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اب میں آپ کے ساتھ ساتھ چلا کروں گی۔''

''میں تو صبح آفس جانے سے پہلے بھی جاتا ہوں۔'' ذکی مسکراہٹ دبا کر بولے۔

''کوئی بات نہیں، میں صبح بھی آپ کے ساتھ چلا کروں گی واپسی پر ڈرائیور مجھے گھر چھوڑ دیا کرے گا۔''

''ارے میری بہنوں کے بچے بہت بدتمیز ہیں..... بہت گالیاں دیتے ہیں اور ساری بری عادتیں تمہارے بچوں کو اگر سکھا دیں تو؟''

''کوئی بھی نہیں، آپ کی بہنوں کے بچے تو سب اچھے ہیں۔ ہمارے بچوں کو کمپیوٹر میں اور پڑھنے میں کس قدر مدد تو کرتے ہیں اور بڑے بچوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے چھوٹے بچے کچھ سیکھتے ہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔'' ذکی نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا کہ ان کی ذرا سی چالاکی کام آ گئی تھی کہ فاکہہ اپنی سہیلی کے ہر مشورے پر جی جان سے عمل کیا کرتی تھیں اور وہ یہ بات خوب اچھی طرح جانتے تھے۔

وہ آئیں گھر ہمارے

''نجمہ وہ پھر کب تک چکر لگائیں گی؟'' میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ بات فون پر ہو رہی تھی مگر میرا لہجہ یقیناً للچایا ہوا سا تھا۔

''دیکھو ویسے تو وہ بڑی بزی ہیں، میں نے ذکر کیا تھا تمہارا ان سے۔''

''تو کیا بولیں وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''سلمٰی ویسے میں ان کے زیادہ پیچھے نہیں لگتی۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہیں جہاں دل چاہتا ہے وہاں جاتی ہیں اور جہاں ان کا دل راضی نہیں ہوتا وہاں انہیں لاکھ بولو وہ اس گلی سے نہیں گزریں گی۔'' اب نجمہ تفصیلی بات کر رہی تھی۔

''خیر اب میں فون رکھ رہی ہوں۔ ابھی ابھی وہ آئی ہیں اگر انہیں فوراً ریسیو نہ کرو تو ناراض ہو جاتی ہیں۔'' نجمہ نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

''سنیں.....''

''ہوں، سن رہا ہوں۔''

''میں نے آج نجمہ سے بات کی تھی ان کے لیے۔'' اپنے شوہر سے رات کے وقت سرگوشی کرتے ہوئے بتایا۔

''ارے سلمٰی چپ ہو جاؤ۔ زور سے مت بولو۔ دیواروں کے کان ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے سن لیا ناں کہ تم نے اُن کو اپنے گھر بلانے کے لیے بات چلائی ہے تو تمہیں پتا ہے ناں کیا ہوگا۔ سب کے سب ان کے پیچھے پڑ جائیں گے اور تمہارا کام رہ جائے گا جو اُن کے آنے سے ہو سکتا ہے۔'' میرے شوہر مجھے بڑے چپ

کی بات سمجھا رہے تھے۔

"سلمٰی تم دراصل بے وقوف عورت ہو۔ اسلم بھائی، اشرف بھائی ہر ایک کے گھر لڑکی بیٹھی ہے اور لڑکیاں بھی ایسی کہ پھلی بھی توڑ کر نہ دیں۔ سو اگر وہ ہماری پروین کو بھی ایسا سمجھیں پھر......؟" شوہر کی باتیں اب آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آ رہی تھیں اور پھر آخر کار میرے بار بار اصرار پر نجمہ نے انہیں میرے گھر آنے پر راضی کر ہی لیا تھا۔

"سنو بچو، آج وہ ہمارے گھر آنے والی ہیں سب گھر صاف کر کے رکھنا، کپڑے ذرا ڈھنگ کے پہننا۔" میں نے بچوں کو آہستہ سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"امی، ناشتے میں کیا ہوگا؟" بڑی بیٹی نے سمجھداری کا سوال کیا جو میں گھبراہٹ میں بھولے ہی جا رہی تھی۔

"بیٹا ہر چیز گھر کی ہو تو سلیقے کا پتا چلتا ہے تو دہی بڑے، چھولے، بروسٹ اور لسی ٹھیک رہے گی۔" میں نے ہدایات دیں اور پھر وہ ہمارے گھر آ ہی گئیں۔ ان کو عزت سے بٹھایا گیا۔ بڑی بیٹی ناشتا لے کر آئی پورے گھر کو چمکا کر رکھا تھا سو ایک، ایک جگہ دکھائی گئی۔

"بہن ابھی نیا ہی ہم نے گھر بنوایا ہے، اللہ کا شکر ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ بچیاں سلیقہ شعار، تمیز دار اور تہذیب والی ہیں۔ گھر کو چندن سا بنا سنوار کر رکھتی ہیں۔" میں نے تعریفیں کرنا شروع کیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے سلمٰی بہن لیکن پھر بھی ہر چیز دیکھنا ہوتی ہے۔ لوگ کہاں کے ہیں، شوہر کہاں کام کرتے ہیں، گھر اپنا ہے یا کرائے کا۔ ہر بات کا پتا چلانا ضروری ہوتا ہے۔"

"نہیں، نہیں بہن گھر ہمارا اپنا ہے، میاں بھی سرکاری ملازم ہیں، نوکری پکی ہے۔" میں نے تسلی دی۔

"کتنے لوگ ہیں آپ کے خاندان میں یعنی نندیں، دیور......؟"

"ارے، ارے اس کی تو پروا ہی نہ کریں۔" میں نے بات کاٹتے ہوئے انہیں سمجھایا۔ "ہماری سب سے لڑائی ہے اور ہماری دشمنیاں تو نسل در نسل چلتی ہیں۔"

"میں یہی جاننا چاہ رہی تھی کہ ملنے جلنے والے کتنے لوگ ہیں، آنا جانا کیسا ہے آپ کے گھر؟"

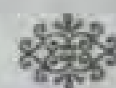
"ارے اس کی تو فکر ہی نہیں کریں آپ۔" میں نے ہنستے ہوئے انہیں سمجھایا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، میں کل سے آپ کے گھر صفائی کرنے اور برتن دھونے آ جاؤں گی پر ٹائم میری مرضی کا ہوگا۔" انہوں نے ہامی بھرلی۔

"ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے۔" اور میں تائید میں سر ہلا رہی تھی۔

کوفت

خوب صورت مکانوں خوب صورت چہروں میں ایک مماثلت ضرور ہوتی ہے کہ دونوں شاندار ہوتے ہیں۔ فرق ہوتا ہے تو صرف اتنا کہ کسی بھی شاندار مکان کو دیکھ کر اطلاعی گھنٹی بجانے سے قبل اس کے مکینوں کا شجرہ از خود معلوم ہو جاتا ہے۔ مکان سے متعلقہ مکین کتنے پانی میں ہیں، اس کا اندازہ صرف مکان کی بیرونی لوکیشن کو دیکھ کر ہو جاتا ہے مگر چہرے چغل خور ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ کائیاں بھی ہوتے ہیں بعض چہرے جن کی شکلیں دیکھ کر "معاف کرو" کہنے کو دل چاہتا ہے...... وہ پوتڑوں کے رئیس نکل آتے ہیں۔ اپنی ان غلطیوں کو دیکھ کر بعض دفعہ متعلقہ لوگوں کے حسب نسب تک تبدیل کرنے کو دل چاہتا ہے اور جب نہیں کر پاتی تو مت پوچھیے کہ کتنی کوفت ہوتی ہے مجھے۔





میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ارم کمال...... فیصل آباد
مخلوقِ بے نوا کو نہ یوں بے کسی میں چھوڑ
ایسا نہ ہو کہ لوگ کہیں تو خدا نہیں
کتنے نگر ہیں جو کبھی اجڑے کبھی بسے
اُجڑا جو ایک بار یہ دل پھر بسا نہیں

☆بنتِ عزیز الرحمٰن...... راولپنڈی
اُن کے آنے کی خبر پھول کے کھلنے سے ملی
چاندنی آج میرے آنگن میں اتر آئی ہے
بادِ صبا پھرتی ہے اٹھلاتی ہوئی لہراتی ہوئی
پھول رقصاں ہیں گلشن میں بہار آئی ہے

☆نگہت زیدی...... بہارہ کہو
تیری الجھی ہوئی زلفوں کو سنواریں کیسے
زندگی تو ہی بتا تجھ کو گزاریں کیسے

☆نگہت آصف...... اسلام آباد
میرا احساس ہے گھائل میری آنکھیں نم ہیں
میرے چہرے پہ لکھا ہے مجھے کیا، کیا غم ہیں
اپنے مسکن سے نہیں ترکِ تعلق ممکن
ورنہ اس شہر میں جینے کے مواقع کم ہیں

☆غزالہ شاہد...... کراچی
یہ آہ و زاری یہ سوگواری، ہر اک چہرے پہ موت طاری
لٹی محبت، لٹا سکوں ہے، ہمارے ہاتھوں ہمارا خوں ہے

☆غزالہ طارق...... سرگودھا
اب نہ مژگاں میں وہ زد ہے نہ نگاہوں میں توڑ
ترکشِ حسن میں اس کے نہ رہا تیر کوئی

☆عروبہ ناز...... کوٹلی
کم بضاعت جتنے ہیں کرتے ہیں وہ جوش و خروش
توڑ ہوتا ہے کسی دریا میں کب سیلاب کا

☆فریدہ فری یوسف زئی...... لاہور
جی رہی ہوں اس اعتماد کے ساتھ
کہ زندگی کو میری ضرورت ہے

☆راحت وفا...... لاہور
تم اتنے قریب سے ہم کو نہ دیکھ پاؤ گے
کہ دیکھنے کے لیے فاصلہ ضروری ہے
تم اپنے بارے میں ہم سے بھی پوچھ سکتے ہو
تمہیں یہ کس نے کہا آئینہ ضروری ہے

☆کائنات عبدالحلیم...... میرپور خاص
وہ درد بے اثر ہے جو سینے میں گھٹ گیا
چرچا ہی غم وہی ہے جو دیوانہ وار ہو
مقتول فرد جرم ہے توہینِ عشق کی
شاید ہی اب جواز میں کوئی پکار ہو

☆نفیسہ آرا...... یو اے ای
یہ کھیل ایسا نہیں یونہی جیت ہو جائے
کسی مقام پہ ہستی کو ہارنا ہوگا
عجیب لوگ ہیں کہتے ہیں خوش لگی کے لیے
تمہاری یاد کو دل سے اتارنا ہوگا

☆ایلیا عباس...... لاہور
ٹھہرے پانی میں یہ پتھر کس طرف سے آ گیا
ہر طرف بے چینی سے کچھ دائرے بڑھتے گئے
چاک داماں نے ہمیں کچھ پُرکشش سا کر دیا
اس گلی سے اس گلی تک رابطے بڑھتے گئے

☆ ماہ نور قیصر......راولپنڈی

وہ پھول تھا مگر اس کی سرشت میں تھا یہ
وہ آگ ہی کو ہوا میں اچھال کر رکھتا

☆ صبا سجاد......دبئی

کلی کا پھول بننا اور بکھر جانا مقدر ہے
یہ قانونِ فطرت ہے تو فطرت کب بدلتی ہے
جو دل پہ نقش کر جائے اور آنکھوں میں سمٹ آئے
علامت ہے یہ چاہت کی تو چاہت کب بدلتی ہے

☆ فضہ بتول......اسلام آباد

گئے دنوں کی محبت کا واسطہ تجھ کو
پلٹ کے آ جا کوئی تیرے انتظار میں ہے
تلاشتے ہیں اسے لوگ کیوں عداوت میں
وہ اِک خوشی جو محبت میں ہے جو پیار میں ہے

☆ سائرہ عباس......کراچی

ہم کو اندازہ نہیں ہے اس کا
وہ بدلتا ہے لبادے کتنے
کتنی باریک ہیں چالیں اس کی
اور ہم لوگ ہیں سادے کتنے

☆ رابعہ شاہد......یو اے ای

ہر چند اختلاف کے پہلو بہت سے ہیں
دل ہے کہ اختلاف کی باتوں سے دور ہے
تم جانتے ہو کوئی ہمارا نہیں قصور
ہم پھر بھی مانتے ہیں ہمارا قصور ہے

☆ زینب نقوی......پنوں عاقل

تو قد و قامت سے شخصیت کا اندازہ نہ کر
جتنا اونچا پیڑ تھا اتنا گھنا سایہ نہ تھا

☆ فصیحہ آصف خان......ملتان

دیکھنے کا انداز بھی کیا خوب ہے اس کا
دل دھڑک جاتا ہے، آنچل سرک جاتا ہے

☆ شبنم کنول......حافظ آباد

کاش تمہیں غیروں کی چاہ نہ ہوتی
تمہارے دل میں میری بھی کوئی راہ ہوتی
تمہارے راستے میں بیٹھ جاتی پھول بن کر
ہماری تو قدر نہیں ان پھولوں ہی کی چاہ ہوتی

☆ عرشیہ جنید......کراچی

کس کونپل کی آس میں اب تک ویسے ہی سرسبز ہو تم
اب تو دھوپ کا موسم ہے برسات گزر گئی جاناں

☆ عنبر وسیم......گوجرانوالہ

ہم یاد تو نہ آئیں گے لیکن بچھڑتے وقت
تارہ سا اِک خیال تری چشم تر پہ تھا

☆ اینہ مشیر......نئی دہلی، بھارت

حیرت سے دیکھتا ہے سمندر مری طرف
کشتی میں کوئی بات ہے یا بادباں میں ہے
بیٹھے رہیں گے شام تلک تیرے شیشہ گر
یہ جانتے ہوئے کہ خسارہ دکاں میں ہے

☆ لالہ رخ......پشاور

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا
پتھر مجھے کہتا ہے میرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

☆ نزہت جبیں ضیا......کراچی

مجھے منزلوں سے عزیز ہیں تری راہ گزر کی مسافتیں
کہ لکھی ہیں میرے نصیب میں ابھی عمر بھر کی مسافتیں
بس ایک پل کی تلاش میں جسے لوگ کہتے ہیں زندگی
تری راہ گزر میں بکھر گئیں میری عمر بھر کی مسافتیں

☆ صائمہ امین......لاہور

اب کے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں
مل کے ایک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں
خزاں کی اجاڑ شامیں نہ آئیں اگلے سال
اس بہار رُت کو زنجیر کرتے ہیں

☆ ممتاز خانم......کراچی

میں تیری یاد سے نکلوں تو اور کچھ سوچوں
قدم قدم پہ یہ دل تیرے اختیار میں ہے

☆☆☆

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



چاکلیٹ کی برفی

اشیا: کھویا، دو پیالی۔ شکر، ایک پیالی۔ چاکلیٹ (کوکو)، ایک کھانے کا چمچ۔ الائچی چھوٹی، بارہ عدد۔ (دانے نکال کر چل لیں) دودھ، کھانے کا ایک چمچ۔ گھی، چائے کا ایک چمچ۔

برفی بنانے کی ترکیب: کڑاہی میں کھویا اور شکر ملا کر ہلکی آنچ پر پکائیں جب آمیزہ کڑاہی کی دیواریں چھوڑنے لگے تو الائچی بھی ملا لیں۔ ایک تھال میں ڈالڈا گھی لگا کر اسے اس میں ڈالیں اور ٹھنڈا ہونے دیں۔ جمانے سے پہلے اندازاً ایک بڑا چمچ الگ کر لیجیے۔

چاکلیٹ کی تہہ جمانے کی ترکیب: اب بچائی ہوئی برفی کڑاہی میں ڈال کر کوکو اور دودھ ملائیں اور ہلکی آنچ پر پکائیں، جب ایک جان لیپ بن جائے تو پتلی کوکو کی تہہ برفی پر جما دیں۔ چھوٹے چھوٹے ہیروں کی شکل میں کاٹ لیجیے۔

حنا عزیز......کراچی

بگھارے بینگن

اشیا: بینگن گول، آدھا کلو۔ (ہر بینگن کو پون حصے تک چار، چار شگاف دے دیں) پیاز، ایک عدد۔ (باریک کاٹ لیں) لہسن، چھ جوئے۔ (پیس لیں) ادرک، دو انچ کا ٹکڑا۔ لال مرچ، حسبِ منشا۔ خشخاش، ایک چمچ۔ ہلدی پسی، آدھا چمچ۔ (توے پر سینک کر الگ الگ پیس لیں) کھوپرا سوکھا، دو انچ کا ٹکڑا۔ دھنیا، چار چمچ۔ سفید زیرہ، دو چمچ۔ تل، دو چمچ۔ مونگ پھلی، دو چمچ۔ املی، حسبِ منشا (ایک پیالی پانی میں بھگو دیں) ہری مرچ، چھ عدد۔ ہرا دھنیا، چند ڈنڈیاں۔ (باریک کاٹ لیں) پودینا، چند ڈنڈیاں۔ کڑی پتا، چند پتے۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: پہلے تھوڑا سا سینکا ہوا مسالا اور نمک بینگن کے اندر بھر کر ایک گھنٹے تک رکھ دیں۔ اب گھی میں پیاز بادامی رنگ کی تل لیں اور سارا پسا ہوا کچا مسالا ملا کر تین منٹ تک بھونیں پھر باقی ماندہ سینکا ہوا مسالا ڈال کر ہلائیں پھر بینگن ڈال کر ڈھکن بند کر دیں اور اسے ہلکی آنچ پر پکا لیں۔ جب بینگن گل جائیں تو کٹا ہوا ہرا مسالا اور ثابت ہری مرچ ڈال دیں اور ڈھکن بند کر کے ہلکی آنچ پر رکھیں۔ گھی چھوٹنے لگے تو اتار لیں۔

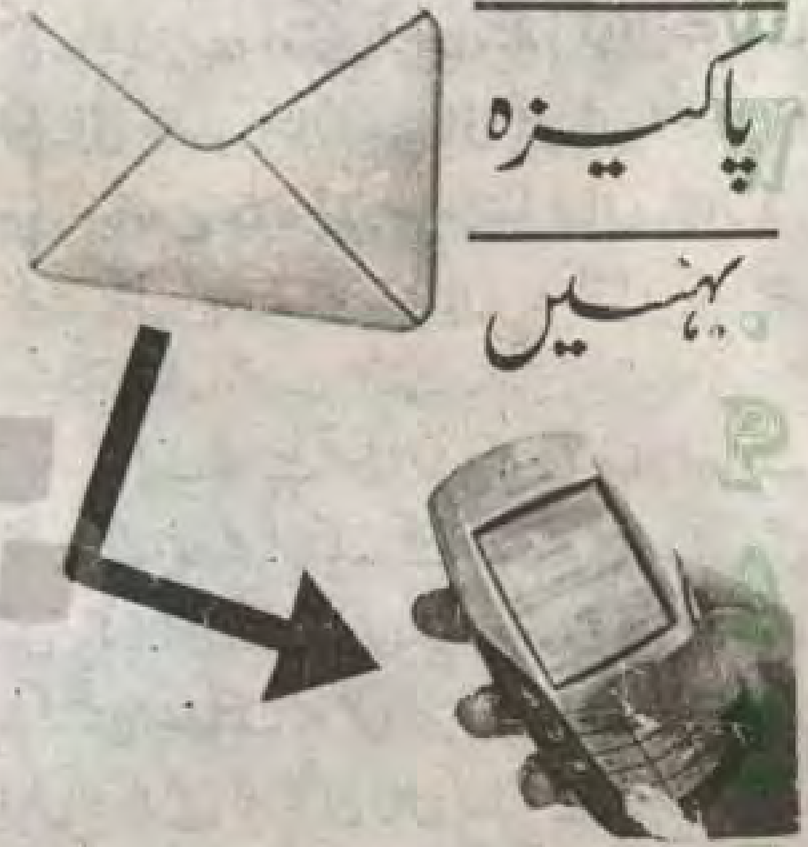
فائزہ احمد......سیالکوٹ

مونگرے گوشت

اشیا: گوشت، آدھا کلو۔ مونگرے، ایک پاؤ۔ (چھوٹے چھوٹے) پیاز، ایک پاؤ۔ لہسن، آدھی گٹھی۔ ٹماٹر، آدھا پاؤ۔ نمک، مرچ، حسبِ ذائقہ۔ گرم مسالا پسا ہوا، ایک چمچ۔ ہرا دھنیا، ایک گٹھی۔

ترکیب: گوشت کو پیاز لہسن ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ جب سب مسالوں کے ساتھ بھن کر تیار ہو جائے تو مونگرے دونوں طرف سے کاٹ کر اور دھو کر اس میں ڈال دیں اور بھونتے رہیں یہاں تک کہ مونگروں کا رنگ پیلا ہو جائے، اب اس میں ٹماٹر ڈال دیں اور اتنا پانی ڈالیں کہ گل جائیں۔ جب مونگرے گل جائیں اور پانی خشک ہو جائے تو تھوڑا سا بھون لیں تا کہ گھی چھوڑ دے۔ اب اس میں ہرا دھنیا اور پسا ہوا گرم مسالا ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ چند منٹ بعد اتار لیں۔

رفعت رضا......راولپنڈی



تحفہ

یاد کر سکھی
درجن بھر چوڑیاں اور سرخ پراندہ
تیری سالگرہ پر دیا تھا میں نے
اور تو نے صرف ایک میلا سا
رومال دیا ہے مجھے
جس میں تیرے پسینے کی مہک رچی ہوئی ہے
کیا تو مجھے، اپناوہ موبائل نہیں دے سکتی
جو تجھے تیرے بھائی نے لا کر دیا ہے
اور تجھے اس کو استعمال کرنا بھی نہیں آتا
شاعرہ: عظمیٰ آفاق سعید
مرسلہ: انیلا ناہید، لیہ

میری باجی کے نام

بھر دے ایک، ایک موتی
خوشیوں کا اس کی زندگی کی
مالا میں یارب
کہ کبھی بکھر بھی جائے ٹوٹ کے تو
خوشیاں اس کے قدموں میں ہوں
آمین
مرسلہ: ذوالنورین، ہری پور ہزارہ

سالگرہ مبارک ہو

کوئی تو ہو جو
دل کا درد جان سکے
ان رشتوں کے ہجوم میں
یہ عالم تنہائی
ہے دل انتظار میں
دو بول تسلی کے
کوئی پیار سے
لبوں کی مسکان سے
نرم گرم لہجے میں
دھیرے سے کہہ دے
کہ!
سالگرہ مبارک ہو
مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

افسوس

افسوس انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ انسان کے جاگنے سے پہلے یہ پرندے جاگ جاتے ہیں اور انسان سوتے رہ جاتے ہیں۔
مرسلہ: مسز فرح امجد، ٹاؤن شپ، لاہور

مشورہ

جاتے ہوئے رک کر کہا تھا
اس نے
سنو!
تم بہت سادہ اور معصوم ہو
میرا اک مشورہ ہے
ہمیشہ ایسی ہی رہنا
شاید! کہ کبھی میں لوٹ آؤں پھر سے۔
شاعرہ: بشریٰ باجوہ، اوکاڑہ

ماں کے نام

☆ دنیا کی سب سے خوب صورت اور شیریں شے ماں کا پیار ہے۔
☆ میری ہر تکلیف اور ہر غم میں میری ماں کا تصور میرے لیے فرشتۂ نجات بن کر آتا ہے۔
☆ ہر شخص انسانیت کی حقیقی تصویر اپنی ماں کے چہرے میں دیکھ سکتا ہے۔
☆ ماں کے قدموں کی خاک چوم لو دونوں جہانوں میں شہرت نصیب ہوگی۔
☆ ماں کی چاہت میں اپنی انا کو بھول جاؤ تمہارا دامن خوشیوں سے بھر جائے گا۔
☆ ماں کے قدموں میں جھک جاؤ، رفعت و بلندی ملے گی۔
مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

دعا کے لیے

بدنصیب ہے وہ شخص جو ماں باپ کی خدمت کر کے دعائیں نہ لے اور لوگوں سے کہتا پھرے کہ میرے لیے دعا کرو۔ بدنصیب ہے وہ جو عشا کی نماز نہ پڑھے اور دوائیوں میں نیند تلاش کرے۔
مرسلہ: سنبل ملک، شاہدرہ

آنکھیں

ابھی جو تم روندتے گزرے ہو رہ گزر پہ بچھی آنکھیں
کسی اور کی نہیں میری تھیں وہ آنکھیں
پھر میں مسکرانا بھول جاتی ہوں بختاور
آتی ہیں تصور میں کسی مظلوم کی بھیگی آنکھیں
شاعرہ: بختاور بلوچ، لوہی بلوچستان

درد

ایک سکھ درخت پر الٹا لٹکا ہوا تھا۔
بیوی: تم درخت پر کیوں لٹک رہے ہو؟
سکھ: سر درد کی گولی کھائی تھی کہیں پیٹ میں نہ چلی جائے۔
مصباح رضا سعید، فیصل آباد

جھوٹا ہاتھی

ایک گاہک غصے کی حالت میں شوپیس کی دکان میں داخل ہوا اور دکان دار سے کہا۔
''میں نے آپ کی دکان سے ہاتھی دانت کی بنی ہوئی کچھ چیزیں خریدی تھیں لیکن گھر جا کر دیکھا تو وہ سب پلاسٹک کی تھیں۔''
دکان دار نے مکاری سے کہا۔
''جناب غصہ نہ ہوں، اصل بات یہ ہے کہ ہاتھی نے مصنوعی دانت لگائے ہوئے تھے۔''
مرسلہ: ذکیہ خانم، اورنگی ٹاؤن، کراچی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

1۔ آپ کے ساتھ اچھی گاڑی میں سواری کرنے کے لیے بہت سے لوگوں کی خواہش ہوگی مگر آپ کی زندگی میں کوئی ایسا شخص ہے جو گاڑی خراب ہونے پر آپ کے ساتھ بس میں سفر کر سکے۔
2۔ بیماری نے دولت سے کہا تم کتنی خوش نصیب ہو کہ ہر کوئی تمہاری تمنا کرتا ہے اور میں کتنی بد نصیب ہوں کہ ہر کوئی مجھ سے دور بھاگتا ہے۔
دولت بولی۔ خوش نصیب تو تم ہو کہ جب تم آتی ہو تو لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں، میری بدنصیبی کہ مجھے پا کر لوگ اللہ کو بھول جاتے ہیں۔
مرسلہ: عروج حسن، بفرزون، کراچی

جرم

1۔ اپنی خوشی کے لیے دوسروں کی مسرت کو خاک میں نہ ملاؤ۔
2۔ کردار ایک ایسی کتاب ہے جسے اندھے اور جاہل بھی پڑھ سکتے ہیں۔
3۔ کسی کی کردار کشی قتل سے بھی بڑا جرم ہے۔
مرسلہ: آمنہ عندلیب، سلانوالی

روحانی مشورے

ادارہ



میاں بیوی میں محبت پیدا کرنے کے وظیفے

میاں بیوی میں یا گھر کے دیگر افراد میں کہیں بھی اختلاف ہو تو اس کے لیے کچھ وظیفے لکھے جاتے ہیں۔ اہتمام سے ان پر عمل کریں اور پھر خوب عاجزی کے ساتھ دعا مانگیں کہ اے اللہ! ہم دو میں یا ان دو میں سچی محبت پیدا فرما۔

1۔ دو مسلمانوں میں اختلاف یا جھگڑا شیطان کی سب سے بڑی کامیابی ہے، جھگڑا نیکیوں کو ایسے ہی مونڈتا ہے جیسے استرا بالوں کو مونڈتا ہے، بڑے سے بڑے سمندر اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے خشک ہو جایا کرتے ہیں، اس لیے جھگڑے سے بچنے کے لیے شیطان مردود سے بچنے کی بہت فکر کی جائے، جن چیزوں سے گھروں میں شیاطین آتے ہیں ان سے بچا جائے اور جن اعمال سے شیطان سے حفاظت ہوتی ہے ان اعمال کا اہتمام کیا جائے، اس لیے ایک عمل یہ ہے کہ گھر میں سورۂ بقرہ کا ختم کرے، جن میاں بیوی میں جھگڑا ہو تو شوہر یا بیوی کوئی بھی گھر میں سورۂ بقرہ پڑھ کر اپنے اوپر اور اپنے پورے کمرے پر دم کر دے۔

حدیث ہے۔ ”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ شیطان اس گھر میں ٹھہر نہیں سکتا جس میں سورۂ بقرہ تلاوت کی جائے۔“

2۔ گھر میں کثرت سے تلاوت کا اہتمام کریں، حدیث میں آتا ہے۔ جس گھر میں قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے اس میں خیر و برکت زیادہ ہوتی ہے، ملائکہ اس میں حاضر ہوتے ہیں اور شیطان نکل جاتا ہے اور جس گھر میں تلاوت نہ ہو وہ گھر لوگوں پر تنگ ہو جاتا ہے، اس میں خیر و برکت کم ہوتی ہے، شیطان اس گھر میں اپنا مسکن بنا لیتا ہے، فرشتے وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے ہر مسلمان مرد عورت کو چاہیے کہ گھر میں روزانہ تلاوت کا خوب اہتمام کریں۔

3۔ شوہر اس بات کا اہتمام کرے کہ گھر میں جب بھی داخل ہو تو پہلے دو رکعت پڑھے، اسی طرح گھر سے باہر جانا ہو تو دو رکعت پڑھ کر باہر نکلے، اس سے بھی... انشا اللہ تعالیٰ بہت ہی فائدہ ہوگا، ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی وفات کے بعد ان کی بیوی سے نکاح کیا اور فرمایا: تم جانتی ہو میں نے تم سے نکاح کیوں کیا؟ پھر فرمایا۔ میں نے تم سے نکاح اس لیے کیا کہ تم مجھے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے عمل کے بارے میں بتاؤ کہ ان کے گھر میں کیا معاملات تھے تو ان کی اہلیہ نے فرمایا۔

”جب وہ گھر سے نکلنے کا ارادہ کرتے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور جب گھر میں داخل ہوتے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور جب سونے کے لیے جاتے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور اس پر عمل پر ہمیشگی فرماتے تھے۔“

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

”حضور اکرم ﷺ جب بھی گھر سے نکلتے ہیں تو دو رکعت پڑھ کر نکلتے ہیں۔“

لہٰذا دو رکعت کا اہتمام ہر مرد و عورت کو کرنا چاہیے، فرض کے اہتمام کے ساتھ ساتھ ان نوافل کا اہتمام خیر و برکت کا سبب ہوگا اور گھروں سے جھگڑوں کے ختم ہونے کا ذریعہ ہوگا، شوہر اور والد کو چاہیے کہ گھر میں داخل ہوتے ہی سلام کر کے پہلے دو رکعت نفل پڑھے پھر کوئی بات کرے، اسی طرح گھر سے نکلتے ہوئے دو رکعت نفل پڑھے۔ انشا اللہ تعالیٰ اس کے اہتمام سے گھروں کی بہت سی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔

4۔ آیت کریمہ سو مرتبہ پڑھ کر محبت کے لیے دعا مانگیں۔

5۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ“ 40 مرتبہ پڑھ کر دعا مانگیں۔

6۔ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْن... پانچ سو مرتبہ یا ستر مرتبہ یا سات مرتبہ پڑھ کر دعا مانگے، اے اللہ! ہم دونوں میاں بیوی میں محبت پیدا فرما۔

ان وظائف کے اہتمام سے بہت ہی فائدہ ہوگا۔ مستقل پابندی سے پڑھیں اور اہتمام سے گناہوں سے بچیں اور کوشش کریں کہ کسی طرح کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ ناراض ہو جائے۔ اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناراضی کے ساتھ دنیا و آخرت کی کوئی نعمت حاصل نہیں ہوسکتی اور بشری تقاضے سے اگر کبھی گناہ ہو بھی جائے تو فوراً توبہ استغفار کرے۔

7۔ بیوی کو چاہیے کہ وہ تحفۂ دلہن اور مثالی ماں ان دونوں کتابوں کا مطالعہ کرے اور شوہر تحفۂ دولھا اور مثالی باپ کا مطالعہ کرتا رہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے اور ہدایات پر عمل کرنے سے... انشا اللہ تعالیٰ بہت ہی فائدہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے اولاد مانگنے کی دعائیں

1۔ جس شخص کی اولاد نہ ہو یا نرینہ اولاد نہ ہو، وہ ذیل کی دعا کثرت سے مانگا کرے۔ حضرت زکریاؑ نے طلب اولاد کے لیے دعا مانگی تھی جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قبول فرما کر ان کو حضرت یحییٰؑ جیسا بیٹا عطا فرمایا۔ (دعا موجود ہے، پارہ ۱۷، سورۂ انبیا آیت ۔ ۸۹)

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

ترجمہ: اے میرے پروردگار! مجھے تنہا نہ چھوڑ دو تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اگر ہو سکے تو دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ کی نیت سے پڑھے اور پھر دعا مانگے، اس لیے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص تنہائی میں دو رکعت نماز پڑھے، جس کو اللہ اور اس کے فرشتوں کے سوا کوئی نہ دیکھے تو اس کو جہنم کی آگ سے بری ہونے کا پروانہ مل جاتا ہے۔

اور جو شخص دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تبارک و تعالیٰ سے کوئی دعا مانگتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ وہ دعا قبول فرماتا ہے خواہ فوراً یا کسی مصلحت سے کچھ دیر کے بعد مگر قبول ضرور فرماتا ہے۔

ایک پیاری دعا

وَاجْعَلْ ھِمَّتِیْ وَھَوَایَ فِیْمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

آپ ﷺ ایسی ایسی دعائیں تلقین فرما گئے ہیں کہ انسان ان کا تصور نہیں کرسکتا۔ یعنی ”اے اللہ! میرے دل میں آنے والے خیالات کو اپنی خشیت اور اپنے ذکر میں تبدیل فرمادے۔“

انسان کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا دماغ کبھی خیالات سے خالی نہیں ہوتا، کوئی نہ کوئی خیال اس کے ذہن میں ہر وقت رہتا ہے۔ مثلاً ہاتھوں سے کچھ کام کر رہا ہے لیکن دماغ کہیں اور لگا ہوا ہے اور خیالات مسلسل آ رہے ہیں، کوئی لمحہ خیالات سے خالی نہیں ہوتا، لہٰذا یہ دعا کرو کہ یہ جو فضول خیالات آ رہے ہیں، جن کا کوئی فائدہ نہیں ہے، یا اللہ یہ خیالات بدل کر ترا ذکر اور تیری خشیت میں تبدیل ہو جائیں، جو خیال بھی آئے وہ یا ترا ہو یا تیری خشیت کا ہو، تری یاد کا ہو، ترے سامنے حاضر ہونے کا ہو، تری جنت کی نعمتوں کا ہو، دوزخ کے عذاب کا ہو اور تیرے دین کے احکام کا خیال ہو اور اے اللہ! میرے دل کے خیالات اور میری خواہشات کا رخ موڑ کر ان چیزوں کی طرف کر دے جو تجھے پسند ہوں، یہ دعا نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائی اور ساتھ ساتھ یہ دعا بکثرت کرنی چاہیے۔

2۔ رَبِّ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ ھَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ وَاَعُوْذُ بِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ

ترجمہ: اے میرے پروردگار! میں شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اے میرے پروردگار! میں اس بات سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ یہ شیاطین میرے پاس آئیں۔

☆☆☆

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں' پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

بال، لیکوریا، بواسیر

نام شائع نہ کریں، شجاع آباد

سوال:۔ میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ایک سال پہلے میرے بال گرنا شروع ہوئے تھے اور اتنے گرے کہ میرا گنج پن ظاہر ہونے لگا اور پھر رفتہ رفتہ سارے بال گر گئے۔ پہلے ڈاکٹر سے علاج کروایا مگر کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا، پھر میں نے حکیم کی میڈیسن لیں اس سے میرے بال تو آگئے مگر ان کی جڑیں بہت کمزور ہیں۔ نیچے سے بال سفید ہوتے ہیں اور اُوپر جا کر کالے۔ میرے بالوں کی چٹیا ایک انگلی کے برابر ہوتی ہے۔ بالوں کی گروتھ بھی کم ہے۔ پلیز اس کا کوئی حل بتائیں۔

میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے لیکوریا ہے۔ اور میرے مینسز آتے تو صحیح ٹائم پر ہیں مگر شروع ہونے سے پہلے دو دن ایسے آتے ہیں جیسے آخری دنوں میں آتے ہیں اور دو دن بعد نارمل شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بارہ سال سے بواسیر ہے۔ مستقل تو مجھے نہیں رہتی مگر جب میں بد احتیاطی کرلوں تو ہو جاتی ہے۔ میں اس کے لیے اسپغول کا چھلکا استعمال کرتی ہوں۔ مجھے بواسیر بادی اور خونی دونوں ہوتی ہے۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

جون 2013

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____

جواب:۔ آپ کے احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غذائی قلت کا شکار رہتی ہیں۔ اس لیے یہ تمام مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ سر کے بال گرنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں جن کو دیکھ کر ہی دوا کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ لیکوریا کمزوری سے ہوتا ہے (لیکوریا کا رنگ، خارش، جلن، کب زیادہ ہوتی ہے، لکھیں) اور بواسیر کی عمومی وجہ قبض ہوتی ہے اس لیے پہلے تو متوازن غذا استعمال شروع کریں اور سبزیاں اور فروٹ کا استعمال بڑھائیں۔ ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔

Natr Mur 30 Acid Phos 30
Kreosote 30 Aesculus 30
Hamamelis 30

ہر دوا کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔

مٹاپا اور آنکھوں کے گرد حلقے

صائمہ.........کراچی

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب میرے مسائل تو بہت زیادہ ہیں۔ لیکن پاکیزہ ڈائجسٹ میں آپ کے بہت سارے اچھے مشورے دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ میں بھی آپ سے اپنے مسائل کا حل پوچھوں اور اُمید کرتی ہوں کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے اور حل بتا کر شکریہ کا موقع فراہم کریں گے۔

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں جو ختم ہی نہیں ہوتے اور نہ مجھ کو نیند آتی ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے نیند کی گولیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایک گولی لیتی ہوں اور کبھی کبھی دو بھی ہو جاتی ہیں تب کہیں جا کر نیند آتی ہے۔



میرا دوسرا مسئلہ روز بروز بڑھتا ہوا مٹاپا ہے۔ سب سے زیادہ میرا پیٹ بڑھا ہوا ہے اور کولہے ضرورت سے زیادہ بھاری ہو گئے ہیں اور پسینا کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میرے چار بچے ہیں اور میں جاب کرتی ہوں۔ جاب پر سب لوگ موٹا ہونے کی وجہ سے مجھے پسند نہیں کرتے جو کہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اور سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد بھی بھوک لگتی ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ میرے ان مسئلوں کا کوئی حل بتائیں تاکہ میں بھی ایک عام عورت کی طرح دکھائی دوں۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی۔ ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گئی کہ میرے پاؤں میں بہت درد رہتا ہے۔ ان تمام مسائل کے جواب کا انتظار کروں گی۔

جواب:۔ بی بی! لگتا ہے کہ آپ کو ڈپریشن ہے۔ نیند نہ آنے کی وجوہات پر غور کریں۔ ذہنی طور پر بہت تھک جاتی ہیں، رات کو کھانا کھانے کے فوراً بعد بستر پر چلی جاتی ہیں۔ گھریلو ماحول کیسا ہے (شوہر، بچے، ساس، آفس والے، وغیرہ وغیرہ) نیند نہ آنے سے یا مناسب نیند نہ لینے سے آنکھوں کے گرد حلقے بڑھتے ہیں اور مٹاپا بھی ہو جاتا ہے۔ جب بھی بھوک لگے تو کھیرے کا استعمال کیا کریں۔ ڈپریشن کے مریض کھانا زیادہ کھاتے ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی **Laikan** کی ایک گولی تین مرتبہ صبح، دوپہر، شام لیں۔ جبکہ سونے سے آدھا گھنٹا پہلے **Velaxan** کی دو گولیاں تھوڑے پانی کے ساتھ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

ناک کا مسئلہ

مسز نوازش علی
ضلع اٹک

سوال:۔ آپ کے کالم میں، میں پہلے بھی خط لکھ چکی ہوں لیکن جواب نہیں آیا، دوبارہ جسارت کررہی ہوں۔ اُمید ہے کہ اس بار آپ شنوائی ضرور کریں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے نزلہ گلے میں گرتا ہے۔ پہلے سے بہت زیادہ، کبھی ایک طرف سے تو کبھی دوسری طرف سے اور کبھی کبھی دونوں طرف سے۔ پہلے ناک بند ہوجاتی تھی اب ناک تو بند نہیں ہوتی مگر نزلہ مسلسل گرتا ہے۔ بہت پہلے ڈاکٹر نے آپریشن بتایا تھا جو کہ معاشی تنگی کے باعث نہیں کرواسکے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ناک کی ہڈی بڑھ گئی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ایک تو گلے میں ریشہ ہر وقت گرتا ہے اور دوسرا منہ سے بہت زیادہ بدبو بھی آتی ہے۔ منہ کا ذائقہ ہر وقت خراب رہتا ہے، کسی کے پاس بیٹھ کر بات نہیں کرسکتی۔ معدہ اور نظامِ ہاضمہ دونوں خراب رہتے ہیں، جسم میں خون نہیں بنتا، اعصابی کمزوری بہت زیادہ ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ میرے لیے اچھی سی دوا لکھ دیں تاکہ میں بھی صحت مند زندگی گزار سکوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

دوسرا مسئلہ میرے بیٹے کا ہے جس کی عمر تقریباً چودہ سال کے لگ بھگ ہے۔ اس کی ناک بھی کبھی ایک طرف سے تو کبھی دونوں طرف سے بند رہتی ہے۔ ریشہ گلے میں گرتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس کا قد عمر کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہے اور کمزوری بھی بہت زیادہ ہے۔ دانت ہر وقت صاف کرتا ہے لیکن دانت صاف نہیں ہوتے۔ رات کو سوتے ہوئے منہ سے رال بہتی ہے۔ منہ سے پانی آتا ہے جو کہ بدبودار ہوتا ہے، ساتویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ پڑھائی میں ماشاءاللہ بہت اچھا ہے۔ اس کی صحت کے بارے میں، میں ہر وقت فکر مند رہتی ہوں۔ بچّے کے لیے بھی کوئی اچھی سی دوا لکھ دیں جس سے اس کی ناک بھی ٹھیک ہوجائے اور اس کے قد میں بھی اضافہ ہوجائے۔ ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔

جواب:۔ ہمیں جب بھی کوئی خط ملتا ہے ہم جواب ضرور دیتے ہیں۔ لیٹ بے شک ہوجاتا ہے لیکن اس کا جواب ضرور دیا جاتا ہے۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوبے جرمنی کی Teucrium mar 30 Merc sol 30 ʻNux vomica30 کے 5,5 قطرے ہر کھانے کے بعد آدھا کپ پانی میں استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ بیٹے کے لیے بھی

ɪeucrium mar 30

Merc.sol 30 Staphysagria 30

Baryta carb 30

دوا کے پانچ پانچ قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر تین مرتبہ دن میں استعمال کریں اور ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔ یاد رکھیں ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ہی ہوں۔ ٹھنڈی اور کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔

بریسٹ میں گلٹی

مس فردوس .... کوہاٹ

سوال:۔ میں پاکیزہ کی مستقل اور پرانی قاری ہوں۔ پاکیزہ کے توسط سے اکثر ہومیو کلینک میں اپنے مسائل کے لیے شرکت کرتی رہتی ہوں۔ پاکیزہ میں ہومیو ڈاکٹر نے ہومیو بورڈ کا سلسلہ بہت اچھا اور مفید شروع کیا ہے۔ یہ دکھی

انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس نیک کام کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

ڈاکٹر صاحب مجھے آپ سے ایک گلہ ہے۔ وہ یہ کہ آپ قارئین کے خطوط کے جوابات بہت کم دیتے ہیں یا پھر دیتے ہی نہیں ہیں۔ حالانکہ آپ کے خطوط کے جواب سے ہزاروں لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں اور صحت مند زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرا یہ آپ کو پانچواں خط ہے۔ اس سے پہلے چار خط آپ کو ارسال کرچکی ہوں لیکن آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس دفعہ پھر بڑی اُمید کے ساتھ آپ کو خط لکھ رہی ہوں کہ مایوس نہیں کریں گے اور میرے خط کا جواب ضرور دیں گے۔

ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری عمر تقریباً 26-27 سال کے درمیان ہے اور میں غیر شادی شدہ ہوں۔ تقریباً آج سے پانچ سال پہلے ایک دن نہانے کے دوران مجھے اپنی سیدھی طرف والے بریسٹ میں گلٹی سی محسوس ہوئی۔ یہ گلٹی کافی سخت اور چوڑی سی ہے۔ چمڑے کے اندر ہے اُوپر سے نظر نہیں آتی۔ ہاتھ لگانے سے یا دبانے سے اس میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ زور سے دبانے سے اگر جسم میں کوئی چیز زیادہ ہو تو ضرور اس میں تھوڑی بہت تکلیف ہوگی۔

میں اسی ہاتھ سے گھر کے سارے کام کرتی ہوں۔ اسی طرف سوتی ہوں لیکن کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی۔ ہاں مینسز شروع ہونے سے پہلے اور کبھی کبھی مینسز شروع ہونے کے بعد کے دنوں میں اس میں اکثر تکلیف، چبھن اور جلن سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ گلٹی جتنی نمودار ہوئی تھی اُتنی ہی ہے۔ یعنی بڑی کچھ بھی نہیں ہوئی۔ اتنے سالوں میں اس میں کچھ بھی تبدیلی نہیں آئی۔ گلٹی کی جگہ اور اس کے ارد



گرد بریسٹ کی بالکل صاف ستھری اور نارمل اسکن ہے۔ میں اس گلٹی کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج کل کے زمانے میں نئے نئے موذی امراض پیدا ہورہے ہیں۔ میرے دل میں بھی طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ کہیں یہ نہ ہوجائے، کہیں وہ نہ ہوجائے۔

میں نے ایک ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں یہ گلٹی نقصان دہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب سچی بات یہ ہے کہ میں نے اس گلٹی کا ابھی تک جم کر علاج نہیں کروایا۔ یعنی مستقل علاج نہیں کروایا، تھوڑا بہت کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں نے ہومیو پیتھک کی بہت تعریف سن رکھی ہے کہ ہومیو پیتھک میں ان گلٹیوں کا کامیاب علاج موجود ہے۔ ایلو پیتھک میں ان گلٹیوں کا سوائے چیر پھاڑ یعنی آپریشن کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی علاج نہیں ہے۔ میں آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔ کیونکہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ آپریشن کے بعد گلٹیاں موذی امراض میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میری آپ سے درخواست ہے کہ پلیز میرے لیے کوئی بہت اچھا اور تیر بہدف نسخہ تجویز کردیجیے کہ میری یہ گلٹی ختم ہوجائے۔ جتنے عرصے علاج کروانا پڑے گا میں کرواؤں گی جو پرہیز ہے وہ بھی کروں گی مگر میری یہ گلٹی جڑ سے ختم ہوجائے۔

جواب:۔ ہمیں یہ پہلی دفعہ آپ کا خط ملا ہے اور اس کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ آپ بہت بڑی غلطی کررہی ہیں۔ آپ کو اپنے گھر والوں کو یا پھر کم از کم اپنی ماں کو اس کے متعلق ضرور بتانا چاہیے تاکہ علاج صحیح طور پر ہوسکے۔ الٹرا ساؤنڈ کرا کر رپورٹ بھیجیں

تا کہ حتمی طور پر تشخیص ہو سکے۔اس وقت تک Calc Fluor 30 ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دن میں تین مرتبہ پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔

قد کا مسئلہ

ایمان ضمیر............کراچی

سوال:۔میری بیٹی کا نام ایمان ہے۔اس کی عمر چودہ سال ہے۔اس کا قد پانچ فٹ دو انچ ہے۔اور وزن 35 کلو ہے۔بھوک بہت کم لگتی ہے اور کھانا بھی بہت کم کھاتی ہے۔چہرہ بھی خراب ہوتا جا رہا ہے۔برائے مہربانی کوئی دوا تجویز فرما دیجیے جس سے میری بیٹی کا قد بڑھ سکے۔

جواب:۔بی بی قد بڑھانے میں خاندانی قد و قامت کی بڑی اہمیت ہے۔وہ آپ نے نہیں بتایا۔اچھی غذا، مناسب ورزش اور ذہنی سکون بھی قد بڑھانے میں بڑے معاون ہوتے ہیں۔فی الحال آپ Alfalfa-Q کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں تین مرتبہ کھانے سے پہلے اور Calc Phos 30 کے 5,5 قطرے دن میں تین مرتبہ کھانے کے بعد لیں۔یہ ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی لیں پھر ایک ماہ بعد آ کر ملیں۔نمبر ڈائجسٹ والوں سے لے لیں۔

گھٹنوں کا درد

جمیلہ بیگم............کراچی

سوال:۔آپ نے پاکیزہ ڈائجسٹ کے ذریعے جواب دیا تھا۔عرض ہے کہ گھٹنوں کا ابھی ایکسرے کروایا تھا اور اس کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا تھا کہ گھٹنے بالکل ناکارہ ہو چکے ہیں اور آپ کو آپریشن کروانا پڑے گا، مگر میں نے انکار کر دیا تھا۔اب اس عمر میں کیا آپریشن کرواؤں گی۔آج ہوں، کل نہیں۔آپ نے بلڈ ٹیسٹ کے لیے پوچھا وہ ابھی تو نہیں کروایا مگر 2009 میں آغا خان اسپتال سے کروایا تھا جس کی ڈپلی کیٹ آپ کو بھجوا رہی ہوں۔

ڈاکٹر صاحب آپ سے گزارش ہے کہ مہربانی فرما کر کوئی ایسا نسخہ لکھ دیں کہ جب زیادہ درد ہو تو میں وہ کھا لوں تا کہ کچھ افاقہ ہو جائے کیونکہ اب گھٹنوں کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

جواب:۔ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc Carb 30

Arnica 30 اور Bryonia 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔چہل قدمی ضرور کیجیے گا اور دودھ کا استعمال بھی کیجیے گا۔پانی ہمیشہ بیٹھ کر پئیں۔

پانی پینے کے اوقات

صبح نہار منہ
کھانا کھانے سے قبل
کھانا کھانے کے ۲ گھنٹے بعد

پانی پینے کا طریقہ

بسم اللہ پڑھ کر
بیٹھ کر
3 سانس میں

احتیاط کریں

گرمی سے یا لُو سے آ کر یا بھاگ دوڑ کر اور ورزش کے بعد پانی بالکل بھی نہ پئیں۔